حیات و عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تصنیف

جنرل گلب پاشا

ترجمہ

حبیب حیدرآبادی

Marfat.com

Marfat.com

حیات وعہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

تصنیف : جنرل سر جان گلب پاشا

ترجمہ : حبیب حیدر آبادی

بیکن بُکس

• قذافی مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور فون: 042 - 7351662

• گلگشت، ملتان فون : 061 - 520790, 520791

BEACON BOOKS

E-mail:beaconbookspakistan@hotmail.com

ENTERED

Marfat.com

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ بیکن بکس/مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت لئے بغیر کہیں بھی شائع نہ کیا جائے۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو پبلشر/مصنف کو قانونی کارروائی کا حق حاصل ہوگا۔

69837

اشاعت : 2003ء

عبدالجبار نے
شرکت پرنٹنگ پریس سے
چھپوا کر بیکن بکس ملتان-لاہور
سے شائع کی۔

قیمت : -/375 روپے

ISBN 969 - 534 - 020 - 2

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

فہرست

۱- تعارف	۱۳
۲- عرضِ مصنف	۱۹
۳- عرب اور اس کے لوگ	۳۱
۴- شاہانِ عرب	۴۸
۵- مکہ اور قریش	۶۷
۶- پیغمبرانہ دعوت	۸۳
۷- آزمائش کا زمانہ	۹۸
۸- حبشہ کو ہجرت	۱۲۱
۹- بیعتِ عقبہ	۱۵۱
۱۰- انصار اور مہاجرین	۱۷۷
۱۱- غزوہ بدر	۲۰۳
۱۲- جنگِ اُحد	۲۳۷
۱۳- حملے اور مسلمانوں کے لیے قواعد و ضوابط	۲۶۹

۱۴- خندق	۲۹۷
۱۵- حدیبیہ	۳۳۴
۱۶- خیبر اور موتہ	۳۶۵
۱۷- مکہ پر قبضہ	۳۹۸
۱۸- یوم حنین	۴۲۵
۱۹- ہجرت مدینہ	۴۴۴
۲۰- بت پرستوں کو انتباہ	۴۶۶
۲۱- فتوحات	۴۹۳
۲۲- اسلام کا پھیلاؤ بحیثیت مذہب	۵۱۸
۲۳- اختتام	۵۵۲

Marfat.com

تمہید و تعارف

پہلی جنگ عظیم کے بعد مشرق وسطیٰ اور عرب کی سیاست میں جن انگریز سفارت کاروں اور مصنفین کا نام چمکا، ان میں لارنس آف عربیہ اور سر جان گلب پاشا سر فہرست ہیں۔ گلب پاشا نے مشرق وسطیٰ اور خصوصاً اردن و عراق کی سیاست و بادشاہت کو تہہ و بالا کرنے میں جو کردار ادا کیا، وہ الگ بات ہے۔ یہاں ان کی مشہور تصنیف ''حیات و عہد نبویؐ'' کا ذکر مقصود ہے۔

یہ کتاب ظاہر ہے، انہوں نے انگریزی زبان میں تصنیف کی تھی اور پہلی بار 1970ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں سیرت طیبہ کے موضوع پر ایک معیاری کتاب ہونے کی وجہ سے بار بار چھپتی رہی۔ یہاں تک کہ برطانیہ میں مقیم مسلمانوں میں بھی مقبول ہونے لگی۔ حبیب حیدر آبادی صاحب کی دختر سلمیٰ نے ایک پبلک لائبریری سے جاری کروائی۔ مطالعہ کیا اور پسند آئی تو اپنے بزرگ والد کو بھی پڑھنے کو دی۔ حبیب صاحب کو گلب پاشا کا اسلوب بیان اور طرز استدلال پسند آیا، خاص طور پر انہیں مصنف کی یہ ادا اچھی لگی کہ وہ اپنے عیسائی ہونے پر بھی نازاں ہیں اور اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے بھی مدح سرا ہیں۔ سلمیٰ بیٹی نے اپنے والد سے فرمائش کی کہ اس کا ترجمہ اردو میں ہونا چاہیے۔

حبیب صاحب نے اپنے حیدر آباد (دکن) کے دوست ڈاکٹر محمد حمید اللہ کو خط لکھا جو پیرس میں قیام پذیر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مشورہ دیا کہ ہاں اچھی کتاب ہے، اس کا اردو ترجمہ ہونا چاہیے، لیکن ترجمے میں کوئی تحریف اور تصرف نہ کرو۔ ایسا کرنا بددیانتی ہے۔ جو کچھ بھی اصل کتاب میں بیان کیا گیا ہے، من و عن پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کی روشنی میں حبیب صاحب نے پوری کتاب کا اردو میں ترجمہ کر دیا۔

Marfat.com

اب انہوں نے پورا مسودہ کراچی میں اپنے ایک اور حیدر آبادی دوست شاہ مصباح الدین شکیل کو بھیجا، کہ ''سپردم بتو مایۂ خویش را'' پاکستان میں اس کی اشاعت کا بندوبست ہو جائے تو محنت ٹھکانے لگے۔ شاہ صاحب اُن دنوں پی ایس او کی جانب سے شائع ہونے والی ''سیرت پاک'' کی تصنیف و تالیف میں مشغول تھے جو تین جلدوں میں شائع ہو کر اس قدر مقبول ہوئی کہ آج تک اُس کی طباعت و اشاعت کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے دوست سید قاسم محمود سے فرمائش کی کہ وہ کتاب اپنے ادارے ''شاہکار بک فاؤنڈیشن'' کے زیرِ اہتمام شائع کریں۔ سید صاحب نے فی الفور آمادگی ظاہر کی اور کہا کہ قرآن اور سیرتؐ و حدیث کے موضوع پر کتابیں چھاپنا کاروبار سے زیادہ ثواب کا کام ہے۔ چنانچہ انہوں نے اُردو میں اس کا پہلا ایڈیشن ''محمدؐ رسول اللہ'' کے نام سے شائع کیا۔

دوسرا ایڈیشن طبع کرنے کی سعادت ''بیکن بکس'' کو حاصل ہو رہی ہے۔ ہم اس کا نام تبدیل کرنے کی جسارت اس لیے کر رہے ہیں کہ ''محمدؐ رسول اللہ'' کے عنوان سے کئی تصانیف پہلے سے موجود ہیں۔ نیز یہ نام اصل انگریزی کتاب کے مرکزی موضوع کے مطابق بھی نہیں ہے۔ جنرل گلب پاشا نے اپنی کتاب میں آنحضورؐ کے عہد اور اُس عہد کے معاشرتی حالات و کوائف پر خاص زور دیا ہے۔ اس لیے ہم نے اصل انگریزی نام "The Life and Times of Muhammad" کی پیروی کرتے ہوئے اُردو میں نئے ایڈیشن کا نام ''حیات و عہدِ نبویؐ'' رکھا ہے۔

ہم سید قاسم محمود صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کا حق ''بیکن بکس'' کو دیا ہے۔ انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کے مترجم جناب حبیب حیدر آبادی در یں اثنا رحلت فرما گئے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اُن کی دختر سلمیٰ کی فرمائش پر اُردو ایڈیشن وجود میں آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزاء دے گا۔

عبدالجبار

بیکن بکس

Marfat.com

پیش لفظ

۱۹۱۹ء کی جنگ عظیم کے بعد مشرقِ وسطی اور عربوں کی سیاست میں لارنس آف عربیہ LAWRENCE OF ARABIA کی طرح گلب پاشا کا نام بھی ایک افسانوی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

گلب پاشا پیدائشی انگریز ہیں۔ ۱۶ اپریل ۱۸۹۷ء میں انگلستان کے ایک شہر پرسٹن میں پیدا ہوئے اور ۱۷ مارچ ۱۹۸۶ء میں اپنے ہی پیدائشی ملک میں انتقال کر گئے۔ اُن کا اصلی نام جان بیگٹ (JOHN BAGOT) تھا۔ عربوں کا دیا ہوا خطاب گلب پاشا ان کے نام پر حاوی ہو گیا اور زندگی بھر گلب پاشا کے نام ہی سے جانے پہچانے گئے۔ ان کے والد برطانوی فوجی افسر تھے جنہوں نے اپنے بیٹے جان بیگٹ کو بھی رائل ملٹری اکیڈمی میں فوجی تعلیم دلوائی۔ تعلیم اور فوجی تربیت کے اختتام پر ان کو برطانوی فوج میں شریک کروا دیا گیا۔ جنگ عظیم کے دوران برطانوی حکومت نے ان کو پہلے یورپ روانہ کیا اور پھر عراق میں ان کو متعین کیا۔

۱۹۲۶ء میں انہوں نے برطانوی فوج سے علیحدگی اختیار کی اور عراقی حکومت نے ان کو اپنی انتظامیہ میں جگہ دی۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے اس خدمت سے بھی سبکدوشی اختیار کی اور ٹرانس جورڈن عرب لیجن میں بہ حیثیت کمانڈر کام کرنے لگے۔ دوسری جنگ عظیم سے کچھ عرصہ قبل اُنہوں نے قبائلی علاقوں پر مشتمل غیر تربیت یافتہ افراد کی فوج کو ایسی جنگی اور فوجی تربیت دی کہ فوج کے اس دستے نے جنگ کے دوران انگریزوں اور اتحادیوں کی دل کھول کر مدد کی۔ اسرائیل کے وجود میں آنے کے بعد گلب پاشا کی ساری وفاداریاں اور ہمدردیاں عربوں کے ساتھ رہیں۔

۱۹۵۱ء میں اُنہوں نے اُردن کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے ایک قومی رضاکارانہ فوج کی تشکیل دی۔ اُردن کو ایک خود مختار ریاست کی حیثیت ۱۹۴۶ء میں حاصل ہوئی اور انگریزوں نے ریاست میں بادشاہت کے قیام اور شاہی کی برقراری کی ضمانت دی۔ اُردن کو بہ حیثیت ایک آزاد سلطنت دنیا کے نقشے لانے اور اس سلطنت کو مستحکم بنانے میں عرب حکمرانوں نے گلب پاشا سے خوب کام لیا۔ شاہ حسین ابن طلال ۱۹۵۳ء میں تخت نشین ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں شاہ عبداللہ کے قتل کے بعد گلب پاشا کی مقبولیت میں بتدریج کمی ہوتی گئی۔

عربوں کو اپنی سیاست میں انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے کافی رخنہ پڑچکا تھا۔ دنیا کے نقشے پر اسرائیل کا وجود برطانوی سیاست ہی کا شاخسانہ تھا۔ عرب سرزمین کے حصے بخرے کئے گئے۔ عربوں کی زمین پر باہر سے لے جا کر یہودیوں کو بسایا گیا۔ اس قومی نفرت کا نشانہ گلب پاشا بھی بنے۔

۱۹۵۶ء میں شاہ حسین نے دو گھنٹے کا نوٹس دے کر گلب پاشا کو نہ صرف اُن کی خدمت سے برطرف کیا بلکہ اپنے ملک سے باہر نکلوا دیا۔ جب وہ انگلستان واپس آئے تو نہ اُن کے پاس پیسہ تھا اور نہ ہی جائداد۔ کتابیں لکھ لکھ کر اور امریکہ میں اسلام اور عربوں پر لیکچر دے کر گزارہ کیا۔

۱۹۵۶ء ہی میں برطانوی حکومت نے انہیں سر کا خطاب دیا۔ گلب پاشا کی زندگی کا بڑا حصہ عرب سرزمین پر گزرا۔ اُردن یوں بھی جغرافیائی طور پر شام اور سعودی عرب کے درمیان واقع ہے۔ عربوں کے تجارتی قافلے اُردن ہی سے ہو کر گزرتے تھے۔

عرب سرزمین کا یہ خطہ ہمیشہ سے خانہ بدوشوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ آج بھی وہاں ہزاروں کی تعداد میں خانہ بدوش موجود ہیں۔ اُردن چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں پر مشتمل ہے جن کی تعداد اٹھارہ سو کے قریب ہے۔ سینکڑوں قبیلے وہاں آباد ہیں۔ ان ہی خانہ بدوشوں اور بدوی قبیلوں کے درمیان گلب پاشا نے اپنی زندگی گزاری۔ اُن کو عرب بادشاہوں، قبیلے کے سرداروں، مذہبی رہنماؤں، عالموں کے ساتھ ساتھ عرب عوام کے ساتھ بھی گھل مل کر رہنے کا موقع ملا۔ ۱۹۵۶ء میں جب ان کو محلاتی سازشوں نے ملک بدر کروایا تو عربوں کی اُس فوج نے (جس کی یہ رہنمائی کرتے تھے) شاہ حسین کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ گلب پاشا نے فوجوں سے درخواست کی کہ وہ اپنے ملک اور شاہ کے وفادار رہیں اور بغاوت سے باز رہیں۔

لیلیٰ خالد نے جب اپنی آپ بیتی لکھی تو کتاب کے پیش لفظ کے لیے گلب پاشا سے درخواست کی۔ برطانیہ میں رہتے ہوئے یہودی پریس کی مخالفت کے باوجود گلب پاشا نے اس پیش لفظ میں عربوں کی تائید کی۔

جس سرزمین نے اُن کو عزت بخشی، اُن کے نام کو اپنی تاریخ میں محفوظ کیا، اُن کے نام کو مشاہیر عالم کی فہرست میں رکھوایا، اُس سرزمین سے وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک وفادار رہے۔ اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات، اور علم کو اپنی تصانیف میں قلمبند کیا۔ اُن کی حسب ذیل کتابیں عربوں کی زندگی، ثقافت، تہذیب اور فکر کو سمجھنے میں مدد کرتی ہیں۔

Marfat.com

۱۔ عرب دستے کی کہانی۔ ۱۹۴۸ء
۲۔ برطانیہ اور عرب صحرائی جنگ میں۔ ۱۹۵۹ء
۳۔ عرب سلطنتیں۔ ۱۹۶۳ء
۴۔ شام، لبنان اور اُردن۔ ۱۹۶۷ء
۵۔ رسول اللہ کا زمانہ اور زندگی۔ ۱۹۷۰ء
۶۔ امن اور مقامات مقدسہ۔ ۱۹۷۱ء
۷۔ قسمت کے دہنی فوجی۔ ۱۹۷۳ء

۱۹۷۲ء کی بات ہے میری بیٹی سلمیٰ مقامی کتب خانے سے ایک کتاب لے آئی جس کا عنوان تھا۔ THE LIFE AND TIMES OF MUHAMMAD۔ پڑھنے کے بعد مجھ سے کہا کہ میں بھی اس کتاب کو پڑھوں۔ مجھے اُن کا طرز اظہار پسند آیا۔ عیسائی ہونے پر نازاں بھی ہیں اور اسلام کے بھی مدح سرا۔ سلمیٰ بیٹی جو انگلستان ہی میں پیدا ہوئی اب اس بات پر مصر تھی کہ میں اس کتاب کو اُردو میں پیش کروں۔

غیر مسلم جب بھی اسلام یا پیغمبرؐ اسلام پر کچھ لکھتے ہیں تو علاوہ اور باتوں کے ایک بات واضح نظر آتی ہے کہ ان کی تحریروں میں اسلام یا پیغمبرؐ اسلام سے محبت یا عقیدت کی آنچ کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ وہ تاریخ کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ دوسروں کے نقطہ نظر سے واقفیت یوں بھی ہمارے لیے سودمند ہے کہ ہم نہ صرف عقیدتوں اور محبتوں ہی کے سہارے اپنے مذہب اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور سیرت سے واقف ہوں بلکہ اُن لوگوں کی تحریروں کو بھی پڑھیں جو اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کی عظمت کے قائل نہیں مگر محبتوں اور عقیدتوں کو اپنی تحریروں میں نہیں آنے دیتے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے پیرس سے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں اپنے ترجمہ میں کوئی تحریف و تصرف نہ کروں۔ ایسا کرنا بددیانتی ہے۔ جو کچھ بھی اصل کتاب میں بیان کیا گیا ہے من و عن پیش کردوں۔ اُن کے اس مشورے کی روشنی میں کتاب کا ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ واضح رہے کہ کتاب ایک عیسائی کی لکھی ہوئی ہے۔

Marfat.com

گلب پاشا نے اپنی زندگی ہی میں مجھے اس کتاب کو اُردو میں ترجمہ کرنے کی بہ خوشی اجازت دے دی تھی۔ اُس کتاب کے پبلشرز HODDER AND STOUGHTON کا میں شکر گزار ہوں جنہوں نے اس ترجمے کی اشاعت کے لیے باقاعدہ اجازت دی۔ احسان فراموشی ہوگی اگر میں اپنے بچپن کے دوست اور کرم فرما شاہ مصباح الدین شکیل کا شکریہ ادا نہ کروں اس ترجمے کی اشاعت صدفی صد ان ہی کی رہینِ منت ہے۔ اللہ پاک ان کو جزائے خیر دے۔ میں پاکستان کے ممتاز دانشور اور ادیب سید قاسم محمود صاحب کا ممنون ہوں کہ اُنھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں غیر معمولی خلوص اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

حبیب حیدر آبادی۔ لندن

Marfat.com

تعارف

اپنی کتاب "عربوں کی فتوحات عظیم" کے مقدمہ میں مَیں نے یہ شکایت کی تھی کہ انگریزی پڑھنے والوں کو عربوں کی تاریخ پر بہت ہی کم کتابیں دستیاب ہوتی ہیں۔ حالانکہ عرب سلطنت اپنے وقت کی سلطنت روما کے مقابلہ میں دگنی تھی اور عربوں کا زمانہ ہمارے اپنے زمانہ سے چھ سو سال قریب تر بھی رہا ہے۔

میری اس شکایت کا اطلاق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح پر نہیں ہو سکتا۔

حضورؐ کی زندگی پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ فرانسیسی، جرمن، اطالوی، انگریزی اور یورپ کی کئی اور زبانوں میں حضورؐ کی سوانح لکھی گئی ہیں۔

موجودہ سوانح عمریوں میں ایک اور کا اضافہ کرنا میرا منشاء نہیں ہے۔ بلکہ اُس موضوع پر قلم اٹھانا ہے جس پر اب تک بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ میرا یہ مقصد اور بھی اچھے طریقے سے حل ہو سکتا ہے اگر میں اس بات کو پیش نظر رکھوں کہ موجودہ سوانح عمریاں ان لوگوں کے قلم سے نکلی ہوئی ہیں جو علم و فضل میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات ان کے علم و فضل کی بھی ترجمانی کرتی رہی ہیں۔ میں قطعی ان علماء کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہ کہنے کی ضرور جراءت کروں گا کہ ایسے لوگ یقیناً اپنے علم و فضل میں باکمال تھے اور اُن کا یہ کمال عام لوگوں سے اُن کی اپنی علمیت، لیاقت اور فضیلت کا اعتراف بھی کرواتا رہا ہے۔ عام طور پر ایک عالم اس ارادہ سے اپنا قلم اٹھاتا ہے کہ دوسرا عالم اس کے علم اور اس کی معلومات سے استفادہ کرے اور ساتھ ہی وہ ان تصنیفات کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے جو محض شہرت اور عوام کو خوش کرنے کے لیے منظر عام پر لائی جاتی ہیں۔

Marfat.com

آج کے زمانے میں عوام کی خواہش ہوتی ہے کہ عوامی معاملات سے اپنے آپ کو اس طرح وابستہ رکھیں کہ عوامی مسائل کو حل کرنے میں ایک حد تک اُن کی مرضی و منشاء کو دخل حاصل رہے اسی لیے میرا بھی مقصدِ تصنیف اس کتاب کو لکھنے کا یہ ہے کہ یہ کتاب پڑھی جائے۔ کتاب ایسی ہو جس سے ایک عام سمجھ بوجھ رکھنے والے پڑھے لکھے مرد اور عورت کو نفسِ مضمون سے ضروری واقفیت ہو جائے۔ میں نے کتاب میں عالمانہ قسم کے بحث و مباحث سے گریز کیا ہے۔ فاضلانہ قسم کی حاشیہ آرائی سے بھی احتراز ہے۔ کتاب کے صفحات میں کافی بچت کی ہے۔

تحصیلِ علم کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا اور ساتھ ہی ریگستان کے اَن پڑھ بدوی قبیلوں کے ساتھ ان کی روزمرہ زندگی میں گھل مل کر رہنا ناممکنات میں سے ہے۔ اپنی زندگی کی اٹھتویں منزل میں قدم رکھنے تک میری زندگی عرب ممالک میں ایسی گزری جس میں عربوں کے ساتھ ساتھ عملی کام کرنے کا مجھے موقع ملا۔ بہت سارے کام وہ تھے جو بیرونِ خانہ کی تعریف میں آتے ہیں۔ یہ بات میری استعداد اور طاقت سے باہر ہے کہ ساٹھ سال کی عمر میں کتاب لکھنا شروع کروں اور ان علماء و فضلاء سے آگے بڑھنے کی کوشش کروں جنہوں نے تحصیلِ علم کے لیے اپنی پوری زندگی کو وقف کر دیا تھا۔

اگرچہ کہ ماضی کی تاریخ کتابوں ہی کے ذریعے ہم تک پہنچتی رہی لیکن تاریخ لکھنا اس کا نام نہیں ہے کہ ہم پرانی کتابوں کی جلدوں ہی کی ورق گردانی کریں اور ان ہی باتوں کو چھپ کر اپنی کتابوں میں دہرائیں جو ضبطِ تحریر میں آ چکی ہیں۔

میری ناچیز رائے میں مورخ کا سب سے اہم کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس مقام پر لے جائے جہاں پر وہ خود کو اُسی ملک کے ذہنی اور روحانی ماحول میں پائے جس ملک اور جس دور کی وہ تاریخ لکھ رہا ہے اس لحاظ سے وہ مورخین جنہوں نے حضورؐ کے عہد کی تاریخ لکھی ہے خاص طور پر خوش قسمت ہیں۔

جب کبھی ہم قدیم یونان یا قدیم روم حتیٰ کہ چھٹی صدی سے پندرھویں صدی تک کے یورپ کے تعلق سے کچھ لکھنا چاہتے ہیں تو ہماری معلومات کے لیے صرف اُن دستاویزات کا سہارا رہ جاتا ہے

Marfat.com

جو زمانہ کے خُرد بُرد سے محفوظ رہیں۔ اس طرح ہماری معلومات کی حد بندی ہو جاتی ہے اور معلوماتی وسائل کا فقدان نظر آتا ہے۔

زمانے نے نہ تو یونان کے اُن قدیم شہروں کو باقی رکھا نہ ہی رومیوں کی مشہورِ عالم مجلسِ مشاورت کو۔ نہ ہی یورپ کے ماضی قریب کے پُرشوکت فوجی افسر یا حکمران رہے جن سے ہم بالمشافہ مل کر دریافت کریں کہ بتاؤ تمہارے اپنے عہد کے تعلق سے تمہارے کیا تاثرات ہیں۔ لیکن عرب کے ریگستان میں آج کی بیسویں صدی میں بھی اُسی قسم کے بدوی اور خانہ بدوش پائے جاتے ہیں جیسے آج سے دو ہزار سال پہلے موجود تھے۔

زندگی کے اتنے سال ان لوگوں میں گزارتے ہوئے جب کبھی میں عربی کتابوں میں ابتدائی عربوں کے حالات پڑھتا ہوں تو موجودہ عرب اور اُن کے آباؤ اجداد کی زندگی میں ایک تطابق نظر آتا ہے اس سرزمین پر اب جو لوگ پائے جاتے ہیں ان میں اور ان کے آباؤ اجداد میں ذہنی طور پر مجھے تو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

خوش قسمتی سے مجھے ان لوگوں کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جن کی تاریخ آج میں لکھ رہا ہوں اُن لوگوں کے ساتھ میرا رہنا بسنا ہوا جن کی زندگیوں میں گزشتہ تیرہ سو برسوں میں وقت کے دھارے بہت ہی کم تبدیلیاں لاسکے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بات میری علمی بے بضاعتی کا پردہ رکھ لے گی۔

موجودہ نئے نئے ذرائع آمد و رفت اور عرب میں تیل کی دریافت نے گزشتہ بیس برسوں میں بدویوں اور خانہ بدوش عربوں کی دنیا کو درہم برہم کر دیا۔ مستقبل کا طالب علم لندن، نیویارک اور ماسکو سے پرواز کر کے چند گھنٹوں میں جزیرہ نمائے عرب کے بیچوں بیچ پہنچ جاتے تو اب اُس کو اونٹوں پر سوار وہ قافلے نظر نہیں آئیں گے جن کی تاریخ اسلام سے پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ بدویوں کی اپنی دنیا بڑی پرانی دنیا رہی ہے۔

جس ذہنی اور روحانی ماحول کو انہوں نے گزشتہ تیرہ سو برس سے برقرار رکھا تھا وہ اس طرح سے ختم ہوا کہ اب اُس کا تصور بھی مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم موضوع کو شروع کریں ایک بات وضاحت طلب ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مذہب اسلام کے بانی ہیں۔ گزشتہ تیرہ سو سال سے آپ کو مسیحیت کا دشمن سمجھا جاتا رہا ہے اس عداوت اور نفرت کی بنیاد سیاسی نوعیت کی رہی ہے نہ کہ مذہبی۔ سیاسی رقابتوں نے عداوت اور نفرت کا روپ اختیار کیا۔ مذہبی عقائد اور ان کے درمیان اختلافات کبھی بھی بغض و عناد کا باعث اس لیے نہیں بنے کہ اسلام اور عیسائیت بہ حیثیت مذہب ایک دوسرے سے بہت ہی قریب ہیں۔

مذہبی تعصبات نے حضورؐ کی سوانح کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ حضورؐ کی زندگی پر لکھی ہوئی تقریباً تمام کتابوں میں تعصبات نے جگہ لی۔ مغربی مصنفین بذاتِ خود مذہبی نہیں تھے۔ لیکن لاشعوری طور پر تعصب کا اس لیے شکار ہوئے کہ انہیں مسلمانوں سے بغض و عناد وراثت میں ملا تھا۔ اس کی تہہ میں یورپ کی ابھرتی تہذیب اپنا کام کر رہی تھی۔

دوسری طرف مسلمان مورخین کے لیے مغربی مصنفین کے یہ شاہکار تازیانہ کا کام کر رہے تھے۔ حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر مغرب کی طرف سے من مانے اعتراضات کی جو بوچھاڑ شروع ہو گئی تھی اُس کا جواب مسلم مورخین نے بھی ترکی بہ ترکی دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فریقین نے نہ صرف تاریخی حقائق کو مکمل طریقے سے توڑ مروڑ کر پیش کیا بلکہ ایک دوسرے کے خلاف وہ نفرت پیدا کی جو مختلف قوموں، نسلوں اور ثقافتوں کے درمیان تقسیم، پھوٹ اور علیحدگی کا باعث بنتی ہے۔

میں ایک عیسائی ہوں۔ اپنی زندگی کا آدھے سے زیادہ حصہ مسلمانوں کے درمیان گزار چکا ہوں۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ میرے ارد گرد مسلمان ہی مسلمان رہے اور کسی عیسائی کا کوسوں پتہ نہ رہتا تھا۔

میں یہ جانتا ہوں کہ اسلام بہترین آدمیوں کو وجود میں لا سکتا ہے۔ آدمی کو خوب سے خوب تر بنا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اوتار اور ولی کے درجہ تک پہنچا سکتا ہے۔ اس کے باوجود مغرب کے لوگوں کا مسلمانوں کے تعلق سے غلط خیال اور ان کا اپنے ذہنوں میں غلط خاکہ حقیقت سے انحراف کا باعث بنتا ہے۔

Marfat.com

یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام مجھے اپنی طرف مائل نہ کر سکا اور میں مسلمان نہ بن سکا۔

موجودہ سائنس نے کئی عجائبات اور حیرت انگیز باتوں پر اپنا تصرّف قائم کر لیا ہے اور باتوں کے علاوہ اس نے فضا کی وسعت کا کھوج بھی لگایا۔ ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہماری یہ دنیا۔ یہ سارا عالم جو ہماری نظروں کے سامنے ہے فضا کی وسعت کے مقابلہ میں اس ذرّے سے بڑا نہیں جو گرد کی صورت میں لندن کے واٹرلو اسٹیشن پر ہوا میں اڑتا رہتا ہے۔ عالم کی وسعت کا اندازہ بھی اُسی حد تک ہو سکتا ہے جہاں تک دوربین کے ذریعہ ہماری حدنظر ہے۔ اس سے آگے کیا ہے قطعیت کے ساتھ ہم میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں۔

زمانہ وسطیٰ میں رہنے والے یہ خیال کرتے تھے کہ سارے عالم کا مرکز یہ زمین ہے اور انسان اس زمین پر خدائی کرتا ہے۔ اسی خدائی کے تصور نے ان کو اپنی ذات پر نازاں کر رکھا تھا۔ اب ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہماری زمین گرد کے ایک ذرّہ جیسی ہے اور فضا میں اڑتی رہتی ہے۔ ہم کو اپنی ذات پر ناز کرنے کے لیے اب باقی کیا رہ گیا ہے۔

ساری تاریخ میں بہت کم قومیں ایسی گزری ہیں جو ہماری طرح مغرور اور خود پسند ہوں۔ ہم حقیر اور فرومایہ جیسے ایک جرثومہ جسے دیکھنے کے لیے بھی خوردبین کی ضرورت ہو اور جو ہوا کی گرد میں اپنے آپ کو ملوث کیے ہوئے ہو۔ اپنی حقارت اور بے بضاعتی کا یہ عالم اور اس پر یہ دماغ کہ اپنی غفلت بے تعلقی اور بے پرواہی پر زعم اور اس کی تحقیر کرنے کی جرأت جو ساری کائنات کا پالن ہار ہے۔ جو ہر چیز کو عدم سے وجود میں لے آیا ہے۔ واہ ری عجیب و غریب مخلوق!

انسان اپنے ذہنی دیوالیہ پن کی جن جن صورتوں کو اختیار کر سکتا ہے ان میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز اور جگر سوز صورت وہ ہے جسے اختیار کر کے وہ اپنے آپ کو خالقِ کائنات کے ساتھ بالکل ہی بے تکلف ظاہر کرے۔ بحث کتنی آسانی سے یہ کہہ کر آگے بڑھائی جا سکتی ہے کہ میرا اس بارے میں یہ خیال ہے خدا عاقل و دانا ہے۔ اس کے ہر حکم میں منطقیت اور واجبیت ہوتی ہے۔ چونکہ میرا اندازِ فکر واجبی اور منطقی ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ مجھے تائیدِ الٰہی حاصل ہو۔ لہٰذا یقیناً وہ میری تائید کرتا ہے۔ چونکہ

Marfat.com

خدا میری تائید کرتا ہے اس لیے ہر وہ شخص جو مجھ سے اختلاف کرے خدا کا دشمن ہے۔

ہو سکتا ہے کہ پڑھنے والے میرے ان جملوں کو کلمۂ کفر سے تشبیہ دیں۔ یہاں ان جملوں کے لکھنے کا واحد مقصد خدا کی عظمت اور اس کی بلندی اور انسان کی اپنی بے ہودگی اور ہیچ مندی کو ظاہر کرنا ہے۔

میرا اپنا موقف یہ ہے کہ میں اپنے عیسائی ہونے پر خوش ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ مجھے ہمیشہ سے اُنس رہا ہے۔ ہمیشہ سے میں نے مسلمانوں سے محبت کی ہے۔ خدائی منصب کو اپنے آپ پر مسلط کر کے دوسروں کے تعلق سے فیصلے صادر کرنا میرا کام نہیں ہے۔ میری کوشش یہی رہی ہے کہ عربوں کے تعلق سے جو کچھ بھی میں جانتا ہوں اُسے بیان کر دوں، فیصلے صادر کرنے سے میں نے احتراز کیا ہے اس لیے کہ میں اپنے آپ کو اس کام کے لیے ناموزوں سمجھتا ہوں۔

حاکمِ اصلی اور مختارِ کُل کا حکم ہے۔

"انگشت نمائی مت کرو تاکہ تم پر انگشت نمائی نہ ہو"

Marfat.com

عرضِ مصنّف

انگریزی پڑھنے والوں کو عرب ناموں کے تعلق سے دشواری پیش آتی ہے اس لیے کہ ان میں سے بعض نام بہت ہی بڑے اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اسلامی مورخین نے ناموں کی بڑی ہی لمبی چوڑی فہرست دی ہے میں نے ان ناموں کو گھٹا کر صرف ضروری ناموں پر ہی اکتفا کیا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو اہم ناموں کے یاد رکھنے میں آسانی ہو۔ عربوں میں مختلف قسم کے نام ہوتے ہیں جن کی وضاحت یہاں کر دینی ضروری ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اپنے ہیرو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے نام سے اس وضاحت کو شروع کریں۔ اس نام کا مصدر یا اس کی اصل حمد ہے، جس کے معنی ہوتے ہیں اس نے تعریف کی۔ یہی مصدر قرآن کے مشہور اور مقبول سورہ فاتحہ میں بھی الحمد للہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ محمدؐ کے معنی ہوتے ہیں وہ جس کی تعریف کی گئی ہو۔

ساتویں صدی عیسوی میں ایک عرب اپنے نام کے علاوہ اپنے باپ کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ عربی لفظ ابن کے معنی بیٹے کے ہوتے ہیں۔ زید ابن عمر سے مراد عمر کا بیٹا زید ہوگا۔ معروف اور اہم خاندان اپنے مورثِ اعلیٰ کے نام کو اپنا خاندانی نام بنا لیتے ہیں۔ اس کی مثال سعودی عرب کے حکمران ابن سعود کی ہے۔ سعود موجودہ حکمران کے والد کا نام نہیں تھا بلکہ دو سو سال قبل ان کے جو مورثِ اعلیٰ تھے یہ اُن کا نام تھا۔ اُن کے زمانے سے اس حکمران خاندان کے افراد اپنے نام کے ساتھ ابن سعود کی نسبت کا اضافہ کرتے ہیں اور سعودی کہلاتے ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی عرب کے ہاں پہلا لڑکا پیدا ہوتا ہے تو لڑکے کا باپ لڑکے کے نام کو اپنی کنیت یا نام کا جزو بنا لیتا ہے جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

Marfat.com

صاحبزادہ قاسمؓ کے پیدا ہونے کے بعد حضورؐ نے اپنی کنیت ابوالقاسم یعنی قاسمؓ کا باپ قرار دی تھی۔

بعض اوقات کنیت نام پر ایسی حاوی ہو جاتی ہے کہ ذاتی نام کو لوگ بالکل بھول جاتے ہیں، اور کنیت نام پر غالب ہو جاتی ہے اس کی مثال حضرت ابوبکرؓ ہیں۔ جن کا اصلی نام غالباً عتیق تھا عتیق کے نام سے حضرت ابوبکرؓ کو کوئی بھی نہیں جانتا۔

عورت اپنے نام کے ساتھ بنت استعمال کرتی ہے۔ بنت کے معنی لڑکی یا بیٹی کے ہیں۔ رقیہؓ بنت محمدؐ کے لفظی معنی ہوتے محمدؐ کی صاحبزادی رقیہؓ۔

میں نے جان بوجھ کر اس کتاب میں آیاتِ قرآنی اور عربی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا ہے۔ صرف اُن آیات یا عربی الفاظ کا ترجمہ دے دیا ہے جن کی ضرورت محسوس کی گئی۔

مختلف اسباب کی بناء پر واقعات کے سنہ اور تاریخوں کی صحت پر صد فی صد اعتماد نہیں کیا جاسکتا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں عرب چاند کے مہینوں یا قمری سال کو استعمال کرتے تھے ان کے ہاں شمسی مہینوں یا شمسی سال کا رواج نہیں تھا۔

دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ ابتدائی عرب مورخین کے درمیان تاریخوں اور سنہ میں ابتدا ہی سے بحث چلی آرہی ہے۔ ایک ہی مورخ اپنے اندازہ کے مطابق ایک ہی واقعہ کے لیے دو دو تین تین تاریخیں یا سنہ لکھتا چلا گیا ہے۔ بعضوں نے برملا اعتراف کیا ہے کہ ان تاریخوں اور سنوں میں جن کو انہوں نے خود بیان کیا ہے کونسی تاریخ اور کونسا سنہ صد فی صد صحیح ہے پورے یقین سے نہیں کہہ سکتے۔

اس کی تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض مواقع پر مورخین نے صرف قمری مہینہ ہی کا ذکر کیا ہے اور دن اور تاریخ کے لیے خاموشی اختیار کی ہے مثلاً کسی نے لکھا ہے کہ جب کے مہینہ میں کوئی مخصوص واقعہ ہوا۔ نہ یہاں تاریخ لکھی اور نہ ہی دن۔

جہاں تک اہم واقعات کا تعلق ہے تاریخوں میں اختلاف نسبتاً ذرا کم ہی واقع ہوا ہے۔ چھوٹے اور جزوی واقعات کا جہاں تک تعلق ہے مورخین کے بیانات میں ایک ایک دو دو سال کا فرق پڑ جاتا ہے۔

عرب مورخین نے تاریخوں کی صحت پر اتنی اہمیت نہیں دی جتنی اہمیت واقعات کی صحت پر۔ ایک ہی واقعہ کو اگر کسی مورخ نے مختلف راویوں سے سنا ہے تو وہ بے تکلف تمام راویوں کا بیان جن کو وہ ثقہ سمجھتا ہے اپنی تاریخ میں لکھ دیتا ہے اور پڑھنے والوں کو آزادی دے دی جاتی ہے کہ وہ جس راوی کی روایت کو صحیح سمجھے اُسے مان لے۔

مسلم مورخین اس بات کے بڑے ہی والہ و شیدا تھے کہ اپنے بزرگوں سے جو بات بھی سن لیں اسے تحریر میں لے آئیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چشم دید واقعات اور سنی سنائی باتیں تحریر میں آنے لگیں چونکہ اس زمانہ میں لکھنے لکھانے کی وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں جیسی آج ہیں اس لیے سنی ہوئی بات بھی فوراً قلمبند نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس کے باوجود ان لوگوں کے حافظے کی داد دینی چاہیئے جو واقعات کو نسلاً بعد نسلٍ ایک دوسرے کو منتقل کرتے رہے۔

تیرہ سو سالہ پرانی باتیں آج بھی بدوی اور بغیر پڑھے لکھے لوگوں کی زبانی اُسی صورت میں سنی جا سکتی ہیں جیسی کئی سو سال قبل کتابوں میں لکھی جاچکی تھیں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات ہم تک تین ذرائع سے پہنچے ہیں۔

پہلا ذریعہ قرآن ہے، دوسرا ذریعہ سوانح ہے اور تیسرا ذریعہ احادیث اور روایات ہیں۔

حضورؐ نے اپنے آپ پر نزولِ قرآن کا دعویٰ کیا تھا۔ قرآن کے نازل ہونے کی مختلف صورتیں تھیں، جن میں سے ایک صورت یہ بھی تھی کہ حضرت جبرئیل اللہ کا کلام لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے جیسے ہی حضورؐ پر قرآن نازل ہوتا آپ اپنے صحابہ سے بیان کرتے اور صحابہ ان آیات کو حفظ کر لیتے اور بعض موقعوں پر اسے مختلف لکھی جانے والی چیزوں پر لکھ لیتے۔

ساری قرآنی سورتیں اور آیات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بیس سال بعد ایک کتابی صورت میں یکجا کی گئیں جسے قرآن کہا جاتا ہے اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں کہ قرآن میں جو کچھ محفوظ ہو چکا ہے وہ کم و بیش وہی الفاظ ہیں جن کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے سامنے بیان فرمایا تھا۔

قرآن واقعات کو مختصر انداز میں یکجا کرنے یا بیان کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اخلاقیات، دینیات

Marfat.com

مذہب اور خدائے عزوجل کی تعریف و توصیف کا مجموعہ ہے۔

قرآن کریم نے حضورؐ کی زندگی کو جہاں ہمارے آگے پیش کیا ہے وہیں اس سلسلہ میں دوسرا ذریعہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر لکھی گئی وہ کتابیں ہیں جو ابتدائی عرب سوانح نگاروں اور مورخین نے لکھیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی کتاب جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک پر لکھی گئی وہ ابن اسحٰق کی ہے یہ حضورؐ کی وفات کے ایک سو بیس برس بعد لکھی گئی۔

موجودہ زمانے میں ابن اسحٰق کی مرتب کی ہوئی تاریخ وہی ہے جسے ابن ہشام نے ترتیب دیا تھا ابن ہشام کا انتقال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تقریباً دو سو سال بعد ہوا۔

اس سلسلے میں دوسری قابل ذکر کتاب واقدی کی مغازی ہے مورخ واقدی کا انتقال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ایک سو ستیانوے سال بعد ہوا۔ ان کے علاوہ چند اور کتب بھی حضورؐ کی زندگی پر لکھی گئیں لیکن ان میں سے کوئی کتاب بھی ایسی نہیں ہے جو حضورؐ کی وفات کے ایک سو سال کے اندر لکھی گئی ہو۔

حضورؐ کی زندگی سے واقف ہونے کا تیسرا ذریعہ احادیث ہیں، حدیث کے لفظی معنی مباحثہ، آپس کی گفتگو یا زبانی یادداشت ہے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہ کرام اس بات میں بڑی خوشی اور فخر محسوس کرتے تھے کہ حضورؐ کی زندگی کے ہر بڑے اور چھوٹے جزو کو لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے۔ یہ بیان اُن کے اپنے چشم دید واقعات، کیفیات، حالات، مشاہدات اور تجربات پر مشتمل ہوتا تھا جو لوگ نئے نئے مسلمان ہونے تھے ان بزرگوں کی باتوں کو بڑے ہی شوق اور دلچسپی سے سنتے تھے۔ اپنی سنی ہوئی باتیں دوسروں تک پہنچاتے تھے اسی طرح ایک کی کہی ہوئی بات دوسرے نے سنی اور دوسرے نے تیسرے کو سنائی اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔

زندگی کے مختلف موضوعات پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات ارشاد فرمائی یا عمل فرمایا وہی بات لوگوں نے دوسروں کو بتائی اور یہی کہی سنی اتنی اہمیت اختیار کر گئی کہ زندگی کے بہت سے گوشوں میں حضورؐ کے ارشادات و افعال اسلامی قانون کی بنیاد قرار دیے گئے۔

69837

Marfat.com

آج بھی اسلامی ممالک میں کسی بھی جج کے سامنے حضورؐ کا ارشاد یا عمل بطور سند پیش کیا جاسکتا ہے اور یہ سند اسلامی قانون کی نظر میں قابلِ قبول ہوتی ہے۔ اس اچھی بات کا بدقسمتی سے یہ نتیجہ نکلا کہ بے ایمان اور ضمیر فروش لوگ ہر اس بات کو جس میں ان کا اپنا مفاد وابستہ تھا حضورؐ کی ذات گرامی سے منسوب کرتے گئے۔ تاکہ ایک طرف قانون کی گرفت سے آزاد ہوں اور دوسری طرف عوام کی نظروں میں باعزت رہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ سیاسی جماعتوں نے اپنی وضع کردہ پالیسیوں کو روبہ عمل لانے کے لیے بہت سی باتیں جو ان کی اپنی من مانی تھیں حضورؐ کی ذاتِ گرامی سے منسوب کر دیں تاکہ حضورؐ کا نام لے کر وہ اپنی ہوسِ اقتدار کی آگ کو تیز سے تیز تر کریں۔ اس کا لازمی نتیجہ جو نکلا وہ یہ کہ حضورؐ کے ارشادات کو لوگ جانچنے لگے۔ اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ واقعی جو بات حضورؐ سے منسوب کی جا رہی ہے، حضورؐ نے ارشاد فرمائی بھی تھی یا نہیں اس بات کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے ایک خاص فن کی ابتداء ہوئی جس کو فنِ حدیث کہا جاتا ہے فنِ حدیث کے علماء اور اماموں نے اس بات کی سخت کوشش کی کہ وضع کردہ اور جھوٹی باتیں جو حضورؐ سے منسوب کر دی گئی ہیں ان کو حضورؐ کے ارشادات سے الگ کر دیا جائے۔

اس کوشش میں سخت محنت کر کے ایک حد تک کامیاب ہونے والوں میں بخاری اور مسلم ہیں جو بیحد قابلِ اعتبار اور انتہائی مشہور اور مقبول ہوئے ہیں۔

بخاری نے اس سلسلے میں قابلِ قدر کام کیا ہے۔ بڑی ہی کاوشوں سے انہوں نے کتاب لکھی یہ کام ۹۵ ابواب پر مشتمل تھا۔ امام بخاری کا زمانہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے دو سو بیس برس بعد کا ہے۔

امام بخاری کے کام کی تکمیل کے پانچ یا چھ سال بعد مسلم اپنے کام کو منظرِ عام پر لائے۔ ان کے علاوہ بھی حدیث کے فن میں کئی بزرگوں نے کام کیا اور ان کا کام بھی قابلِ قدر ہے۔ میرے نزدیک صرف بخاری اور مسلم ہی قابلِ قبول ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں ان ہی کی روایات پر اکتفا کیا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک پر نظر ڈالنے کے لیے ابتداء ہی سے یہی

Marfat.com

تین ذرائع رہے ہیں۔ ان ہی ذرائع کو آج سے سینکڑوں برس پہلے لکھنے والے مورخین مصنفین سیرت نگاروں اور تذکرہ نگاروں نے استعمال کیا تھا۔ وہی ذرائع آج بھی موجود ہیں۔ ان ہی کو میں بھی استعمال کر رہا ہوں اور ہر وہ شخص جو اس موضوع پر قلم اٹھانا چاہے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ ان ہی ذرائع کی طرف رجوع ہو۔

(سیرت کے قدیم ماخذ کے عنوان کے تحت پروفیسر سید نواب علی نے اپنی کتاب سیرت رسول اللہ میں لکھا ہے۔

"گزشتہ صدی میں یورپ نے علوم و فنون میں حیرت انگیز ترقی کے ساتھ مذاہب عالم کے متعلق معلومات کا ذخیرہ قدیم اور نایاب کتب کو تلاش کر کے اور ان کے متن اور تراجم شائع کر کے جمع کر دیا، جس سے تحقیق کا راستہ کھل گیا۔ ہم یورپ کے اس احسان کو کبھی بھول نہیں سکتے کہ اس کے مایہ ناز فرزندوں نے ہمارے اسلاف کے علمی کارنامے، جو دست برد زمانہ سے فراموش ہو چکے تھے ہمارے سامنے پیش کر دیئے۔ کتب مغازی و سیر کے اصل ماخذ جو ہمارے قلمی کتب خانوں کی بربادی اور ہمارے ذوقِ علمی کے فقدان سے قریب قریب مفقود ہو چکے تھے مستشرقین یورپ کی مساعی جمیلہ کی بدولت پھر ہم کو ملے۔

سب سے قدیم ماخذ محمد ابن اسحٰق کی کتاب "المغازی" ہے، اصل کتاب تو ایک مدت سے مفقود ہو چکی ہے لیکن اس کو جس شکل میں ابن ہشام (وفات ۲۱۳ھ ۸۲۹ء) نے ابن اسحٰق کے ایک شاگرد زیاد ابن عبداللہ البکائی (وفات سنہ ۱۸۳ھ) کی روایت سے حذف و اضافہ کے ساتھ مرتب کیا اور جس کا نام "سیرت رسول اللہ" رکھا اس کو وستنفلد نے سنہ ۱۸۶۰ء میں گوٹنگن سے شائع کیا جس کا جرمن ترجمہ گستاودیل نے سنہ ۱۸۶۴ء میں طبع کرایا۔

دوسرا قدیم ماخذ طبقات ابن سعد ہے۔ رسول کریمؐ صحابہ اور تابعین کے حالات میں محمد ابن سعد (وفات ۲۳۰ھ/۸۴۵ء) کاتب واقدی نے ایک کتاب بارہ جلدوں میں لکھی تھی جو تقریباً

Marfat.com

نایاب ہو چکی تھی مگر قیصر ولیم نے ایک کثیر رقم عطا کر کے قسطنطنیہ اور مصر وغیرہ سے اس کتاب کے اجزا فراہم کر کے ایک کامل نسخہ تیار کرالیا، پھر پروفیسر ساخو اور سات مستشرقین کے زیر اہتمام ۱۹۰۱ء میں اس کو طبع کرانا شروع کیا۔ اس سلسلے میں واقدی کی کتاب "المغازی" کو بھی یاد رکھنا چاہیے جس کو سنہ ۱۸۵۵ء میں کریمر نے کلکتہ سے شائع کیا مگر یہ نسخہ ناقص تھا۔ ۱۸۸۲ء میں ولہاسن نے ایک دوسرے نسخے کا ترجمہ برلن سے شائع کیا۔

تیسرا قدیم ماخذ محمد ابن جریر الطبری (وفات ۳۱۰ھ/۹۲۳ء) کی "تاریخ الامم والملوک" ہے جس میں واقعاتِ عالم کے ساتھ آنحضرت صلعم اور خلفاء کے حالات بھی مذکور ہیں۔ آنحضرتؐ کے حالات زیادہ تر ابنِ اسحٰق سے منقول ہیں۔ اس طور سے ابنِ اسحٰق کی کتاب کا معتدبہ حصہ طبری میں محفوظ ہے۔ اس مبسوط اور مشہور تاریخ کو نولڈکی اور جے بارتھ نے چودہ برس کی محنت میں ۱۸۸۵ء میں جرمنی کے شہر لیدن سے شائع کیا۔ اس سلسلے میں تاریخ یعقوبی ابن واضح (وفات ۲۹۲ھ ۹۰۵ء) بھی قابلِ ذکر ہے جس کو ہوتسما نے اسی شہر لیدن سے دو برس پیشتر شائع کیا تھا۔ اس میں آنحضرتؐ کے حالات جزء دوم میں مذکور ہیں۔ مغازی وسیر کے علاوہ علم رجال میں ابن حجر کی مشہور کتاب "اصابہ" کو اسپرنگر نے کلکتہ سے ۱۸۵۶ء میں شائع کیا۔

ان ماخذات کی اشاعت سے مستشرقین یورپ کی معلومات وسیع ہو گئیں اور اب انہوں نے عالمانہ رنگ میں سیرت نبوی اور اسلام پر قلم اٹھایا۔ لیکن صدیوں کی قومی منافرت اور سیاسی تفوق کا غرور سنگِ راہ ہو گیا۔ سوءِ اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اسلام کی سیاسی قوت پامال ہو رہی تھی — ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا چراغ گُل ہو گیا تھا۔ ایران میں قاچاریہ آفتاب لبِ بام تھا۔ یورپ کا مردِ بیمار (ترکی) ۱۸۷۷ء کی جنگ میں حریفِ روس سے بُری طرح زخمی ہو گیا تھا، مصر شیر برطانیہ کے پنجے میں تھا۔ مراکش کی پگڑی رندِ فرانسہ نے اُچھال دی تھی۔ ۱۸۶۱ء میں سر ولیم میور نے سیرتِ نبوی پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر شائع کی اور اسی سال اسپرنگر نے برلن میں اپنی تصنیف شائع کی۔

۱۸۶۰ء میں مشہور جرمن مستشرق نولڈکی نے قرآن مجید اور تیسرے سال سیرت پاک پر اپنی

Marfat.com

معلومات شائع کیں۔

۱۸۸۴ء میں ڈاکٹر کراہل نے لپزک سے سیرت نبویؐ پر ایک علمی تصنیف شائع کی۔

۱۸۹۶ء میں علی گڑھ کالج کے پروفیسر ڈاکٹر آرنلڈ نے اپنی مشہور کتاب "پریچنگ آف اسلام" ویسٹ منسٹر سے شائع کی۔

۱۹۰۵ء میں پروفیسر مارگولیتھ نے اپنی کتاب "محمد" شائع کروائی۔

جس طرح تورات و انجیل میں انبیائے بنی اسرائیل کے متعلق بہت سی لغو اور شرمناک روایات منقول ہیں اسی طرح آنحضرتؐ کی سیرت کے متعلق ہمارے قدیم ماخذ کتب مغازی و سیر میں ویسی ہی روایات مندرج تھیں۔ ان اکاذیب باطلہ کو جنہیں مورخین مابعد نے تقلیداً نقل کر دیا مستشرقین یورپ نے تنقیص رسول اور تضحیک اسلام کے لیے ایک سہل الوصول ذریعہ سمجھ کر خوشی سے تسلیم کر لیا اور پھر اپنے زور قلم سے رائی کا پہاڑ بنا دیا اس لیے ہم پہلے ان قدیم ماخذوں اور ان کے مصنفین پر نظر ڈالتے ہیں۔

قرآنِ مجید سیرت رسول اللہ کا سب سے پہلا ماخذ ہے۔ اس کی ۱۱۴ سورتوں میں آنحضرتؐ کے ابتدائی حالات، بعثت، عہدِ رسالت کی تعلیمات، خانگی زندگی اور غزوات جستہ جستہ مذکور ہیں مغازی اور سیر کا یہ سب سے پہلا ماخذ رسول اللہ کی حیات ہی میں ۲۳ سال کے اندر حفظ اور تحریر دونوں ذریعے سے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ آپؐ کی وفات کے ایک سال بعد حضرت ابوبکرؓ نے پورا قرآن مجید ایک کامل نسخے میں قلم بند کروا لیا، جس کی چھ نقلیں حضرت عثمانؓ نے ۲۵ھ میں بلادِ اسلامیہ میں بھیج دیں۔ پچاس سال تک یہی قرآن تھا جس میں سیرتِ رسول اللہ کا مطالعہ اُن آنکھوں سے ہوتا رہا جنہوں نے پیکرِ قدسی کو اس عالم رنگ و بو میں چلتے پھرتے دیکھا تھا۔

اس کے بعد سیرتِ پاک پر رطب و یابس روایات کا پردہ پڑنے لگا۔ اس خرابی کی ابتدا عبدالملک ابن مروان کے عہد سے شروع ہوئی جو ۷۳ھ میں حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو کعبے میں شہید کر کے دنیائے اسلام کے سیاہ و سفید کا مستقل حاکم بن بیٹھا۔ عبدالملک بحیثیت ایک حکمران بڑا بیدار مغز اور مدبر تھا۔ اس نے اسلام کی دنیاوی سلطنت کا پایہ مضبوط کیا۔ دفتر سلطنت کو سب سے پہلے عربی زبان میں منتقل

Marfat.com

کیا اور اپنا سکہ (درہم و دینار) قلمروئے اسلام میں جاری کیا۔ چونکہ سلاطین میں شاہی خاندان کی تاریخ لکھنے کا

دستور تھا۔ مغازی کی طرف توجہ کی اور حضرت عروہؓ بن زبیرؓ کو جو حضرت عائشہؓ کے تربیت یافتہ اور سیرت نبویؐ کے عالم تھے خطوط لکھ کر واقعات جمع کرنے شروع کیے۔ بعضوں کا قول ہے کہ عروہؓ نے فنِ مغازی میں سب سے پہلی کتاب لکھی۔ اسی زمانے میں مشہور محدث زہری پیدا ہوئے جنہوں نے فنِ مغازی میں تصنیف کا سلسلہ قائم کیا۔

زہری کا نام محمد بن مسلم تھا۔ قریش کے قبیلہ بنی زہرہ سے تھے۔ زہری ۵۰ھ میں پیدا ہوئے ہشام ابن عبدالملک نے جو ۱۰۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ زہری کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیا تھا وہ درباداری کی برائیوں سے بچ کر نشرِ حدیث اور خدمتِ دین میں مصروف رہے۔ زہری کا انتقال ۱۲۳ھ میں ہوا۔

محمد ابنِ اسحٰق کے دادا الیسار کو حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں خالد ابن ولید نے شہر انبار کے ایک مقام عین التمر سے گرفتار کیا تھا۔ جب سے ان کا خاندان مدینہ میں قیس مطلبی کے موالیوں میں داخل ہو کر رہنے لگا۔ ان کی ولادت کی تاریخ معلوم نہیں۔ ابتدائی زندگی مدینہ میں طلبِ علم میں گزاری مگر امام مالک سے جو ان کے ہم عصر تھے، مخالفت ہو جانے سے سیاحت اختیار کی۔ ان کو آثار و سیر کا شوق تھا اور اس شوق میں وہ مسلم اور غیر مسلم سب کی روایات لے لیتے تھے۔ امام مالک نے ان کے تعلق سے کہا تھا۔

”دجالوں میں سے ایک دجّال کو دیکھو“

مدینہ سے نکل کر ۱۱۹ھ میں ابن اسحٰق اسکندریہ پہنچے پھر کوفہ، جزیرہ، اور رے میں پھرتے پھراتے آخر بغداد میں سکونت اختیار کی۔ سفاح کے بعد اس کا بھائی منصور ۱۳۶ھ میں تخت نشین ہوا، اس نے عباسیوں کی حکومت کی عمارت ایسی مستحکم کر دی کہ چھ سو برس تک قائم رہی۔ وہ مدبر، متقن اور علم دوست تھا۔ اس کی سرپرستی میں ابن اسحٰق نے اپنی وسیع معلومات اور مجموعہ روایات کو قلم بند کرنا

Marfat.com

شروع کیا۔ اس وقت تک سیرت نبوی پر کوئی مستقل اور مفصل کتاب نہیں تھی۔

قرآن مجید اگرچہ حضورؐ کے خلقِ عظیم اور اسوۂ حسنہ کا آئینہ تھا لیکن اب تفسیر اور شانِ نزول کی تشریح کا محتاج تھا۔ اسلام کی فتوحات چین سے اندلس تک اور نومسلموں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی، جن میں یہود، نصاریٰ، مجوس سب ہی تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے مناوی و سیر کتبِ عہد عتیق میں اور حضرت عیسیٰؑ کے حالات اناجیل میں موجود تھے۔ زرتشت اور بزرگانِ عجم کی داستانیں اساطیر اور پہلوی کتابوں میں متداول تھیں جن میں سے بعض کا عربی ترجمہ بھی ہو چکا تھا۔

ہشام ابن عبدالملک کے میر منشی جبلہ بن سالم نے ۱۱۳ھ میں عجم کی ایک مفصل اور مبسوط تاریخ کا ترجمہ کیا تھا جس میں سلاطین کی تصاویر بھی ان کی خاص وضع قطع، زیور و لباس کے ساتھ شامل تھیں، اسی طرح عبداللہ بن المقفع نے جو پہلوی کا عالم اور عربی کا مستند استاد تھا، منصور کے عہد میں ایران کی ایک دوسری مفصل اور مقبول کتاب السیر خدائی کا ترجمہ کیا تھا جس کا نام تاریخ ملوک الفرس رکھا۔ غرض کہ گرد و پیش کے یہ حالات تھے جب کہ ابن اسحٰق نے منصور کو قدرداں اور مہرباں پاکر سیرت نبوی دو حصوں میں لکھی۔

۱۔ کتاب المبتدأ و قصص الانبیاء ۲۔ کتاب المغازی

مگر یہ قابلِ قدر کتاب مدت ہوئی مفقود ہو گئی ہے۔ ہاں ابن ہشام نے جس طور سے اس کو مرتب کیا اور طبری نے جو اقتباسات اپنی تاریخ میں نقل کیے وہ موجود ہیں۔

ابن اسحٰق اگرچہ جدتِ تحریر، طرزِ ادا اور جامعیت کے لحاظ سے سیرت نبوی کے پہلے مصنف اور امام المغازی کہلاتے ہیں، چونکہ اکثر منقطع روایات اور اہل کتاب کے باطل اقوال اور سیکڑوں اشعار جن میں بہت سے جعلی ہیں کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے درج کر دیئے اس لیے فنِ حدیث کے ثقہ علماء کی نظروں سے گر گئے۔ اگرچہ بعضوں نے تعریف بھی کی ہے۔ محدث دار قطنی (وفات ۳۸۵ھ/ ۹۹۵ء) نے خوب فیصلہ کیا ہے۔

"وہ حدیث میں صالح ہے۔ میرے نزدیک اس میں کوئی برائی نہیں سوائے اس کے کہ

وہ سیرت میں منکر اور منقطع باتیں اور جھوٹے اشعار ملا دیا کرتا تھا،،

واقعی ابن اسحٰق نے ایک ایسا تختۂ گلاب تیار کیا تھا جہاں پھول چننے کے لیے کانٹے ہٹانے کی ضرورت ہے۔ انہیں کانٹوں کو مخالفین اسلام زہر آلود کر کے چبھوتے ہیں۔ ابن اسحٰق نے یہودِ خیبر اور اس کی اولاد کے اقوال نقل کیے۔ ابوجہل اور عتبہ وغیرہ کفارِ قریش کے جو مرثیے مکہ میں لکھے گئے تھے، ان کو بھی نقل کیا۔ مرثیوں میں کس قدر اور کس طرح جذبات برانگیختہ کیے جاتے ہیں یہ سب پر ظاہر ہے۔ لیکن ابن اسحٰق کی یہ دیانت تھی کہ سیرت پاک لکھتے وقت مخالفین کے اقوال کے سیاہ بادل بھی دکھا دیتے تاکہ آفتاب حقیقت اور زیادہ تاباں ہو جائے۔

محمد ابن عمر الواقدی بھی بنی ہشام کے موالیوں میں ہے۔ ۱۳۰ھ، ۷۴۷ء میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوا اور وہیں علم دین حاصل کیا۔ ان کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ پچاس سال کی عمر میں بغداد آیا جو اس وقت ہارون الرشید کی علم دوستی اور قدر شناسی کے باعث علم و فضل کا مرکز تھا۔ واقدی نے وہیں سکونت اختیار کی اور جب مامون الرشید کا زمانہ آیا اور خراسان سے وہ بغداد میں داخل ہوا تو واقدی کی بڑی قدر کی اور جانب شرقی کا قاضی مقرر کیا۔ جہاں انہوں نے تا دمِ مرگ اس عہدہ پر فائز رہ کر ۲۰۷ھ میں انتقال کیا۔

انہوں نے سیرت میں کتاب المغازی لکھی ایک اور کتاب "الردۃ" جس میں آنحضرتؐ کی وفات کے بعد مرتدین عرب کے حالات قلم بند کیے۔ فتوحاتِ اسلامی کی بھی تاریخ لکھی۔ غرض کہ واقدی نقل روایات کا ایک دریائے ذخار تھا لیکن ساتھ ہی سیرت پاک میں جس بے احتیاطی سے انہوں نے رطب و یابس کو مخلوط کر کے واقعات تحریر کیے وہ ان کے دامن علم پر ایک بدنما داغ ہے، یہی وجہ تھی کہ ائمہ دین نے ان کو سخت الفاظ میں یاد کیا۔ امام احمد حنبل نے ان کو کذاب کہا اور امام بخاری نے متروک الحدیث۔ نسائی نے کہا کہ رسول اللہ پر جھوٹ بولنے والوں میں مدینہ میں واقدی تھا اور خراسان میں مقاتل بن سلیمان۔ حالانکہ مقاتل کو امام المفسرین کا بھی لقب دیا گیا ہے جن کا انتقال ۷۶۵ء میں ہوا واقدی کے اکاذیب باطلہ کے جھوٹے موتیوں کو مستشرقین نے ایک بیش بہا تاج بنا کر اپنی تحقیق

کے سر پر رکھ لیا ہے۔

محمد ابن جریر الطبری طبرستان کے کوہستانی مقام امل میں ۲۲۴ھ/۸۳۸ء میں پیدا ہوئے تحصیل علم کے شوق میں بغداد گئے۔ پھر شام و مصر کا سفر کیا اور حدیث، تفسیر، فقہ اور تاریخ میں خاص طور سے کمال حاصل کیا۔ ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔ تاریخ الامم اور تفسیر ابن جریر دونوں ضخیم اور مبسوط تصانیف ان کے بے مثل علمی کارنامے ہیں جو قیامت تک یادگار رہیں گے۔

طبری کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہے۔ ابن خلکان نے ان کی تاریخ کو اصح التاریخ کا لقب دیا ہے۔ نقل روایات میں نہایت ثقہ تھے۔

طبری کی یہ معرکۃ الآرا تاریخ اس قدر مقبول ہوئی کہ مشہور مورخین مابعد ابن اثیر، ابن خلدون، ابوالفدا کی تاریخیں سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ طبری نے عمر کے ۸۶ مرحلے طے کر کے ۳۱۰ھ میں بغداد میں انتقال کیا۔)

Marfat.com

عرب اور اُس کے لوگ

۶۳۲ سنہ عیسوی سن اور مہینہ مارچ کا تھا۔ عرفات کا میدان تھا۔ ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے کوئی اونٹ پر سوار تھا تو کوئی زمین پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ مطلع صاف تھا۔ سورج اپنی منور شعاعوں سے لوگوں کے لیے فیض کا سامان فراہم کر رہا تھا۔ عرفات کے اطراف پہاڑیاں ہی پہاڑیاں تھیں، ان پہاڑیوں کے درمیان ساری دنیا سے الگ تھلگ ایک اجتماع اپنے مخصوص مشاغل میں منہمک تھا۔ اللہ کا ایک بندہ اونٹ پر آگے بڑھتا ہے۔ تھوڑی سی بلندی پر اپنا اونٹ لے جاتا ہے، میانہ قد، ریش مبارک میں چند سفید بال، زلفِ سیاہ میں بھی کچھ سپیدی کے آثار، آنکھیں شاید عرب کی گرمی کی وجہ سے سرخ، چہرہ کشادہ، مسکراتے تو ایسے جیسے فضا مسکرا رہی ہو اور جاذبِ نظر اتنا کہ ہر ایک کا دل موہ لے۔

اونٹ پر بیٹھنے والا اب اس اجتماع سے مخاطب ہے جو اس کے ارد گرد ہے۔ مخاطب یوں ہوتا ہے کہ آپس میں شیر و شکر کی طرح مل جل کر رہو۔ اپنے ہمسایوں کے حقوق کی حفاظت اور نگرانی کرو، ان کی جائداد اور ان کی عزت و آبرو کا ہمیشہ خیال رکھو۔ آپس کی دشمنی اور آپس کے اختلافات کو بھول جاؤ۔ عربی اور عجمی میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ استحصال چاہے کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو بہرحال ختم ہو جانا چاہیے۔ عورتوں کا پورا پورا خیال رکھو۔ ان عورتوں پر مہربان رہو جن کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے تمہارے سپرد کر رکھی ہے۔ ان کے لیے جن کے تم ذمہ دار ہو ضروریاتِ زندگی کی

Marfat.com

کمالت کرتے رہو۔ میں تمہارے درمیان خدا کی کتاب قرآن چھوڑ رہا ہوں۔ اگر تم اس کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامے رکھو تو خدا تم کو کبھی گمراہ نہیں کرے گا۔ اس کے بعد مجمع سے پوچھا جاتا ہے کہ کہو کیا میں نے اپنے مشن کی تکمیل کر دی ہے؟ کیا میں نے اپنے مشن کو پورا کر دیا ہے؟ مجمع سے جواب ملتا ہے کہ ہاں آپ نے اپنے مشن کی تکمیل کر دی ہے۔

لوگوں سے یہ جواب ملنے پر مجمع کو مخاطب کرنے والے نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور فرمایا "خدایا تو بھی گواہ رہیو" تین بار آپ نے اسی جملے کو دہرایا۔ ایک لمحے کے لیے عرفات کے میدان پر سناٹا چھا گیا اور اس کے بعد ایک قد آور حبشی نے نماز کے لیے اذان دینی شروع کر دی۔

خدا کے اس پیغمبر نے اپنے آخری پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے حج کے دن کا انتخاب کیا تھا۔ آپ نے اپنے مشن کی تکمیل کر دی۔ اس واقعہ کے تین مہینے بعد رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ جس نئے نظام اور نئے عقیدہ کی شمع آپ نے لوگوں کے سینوں میں روشن کر دی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کے ماننے والے ریگستان سے نکل کر اب دنیا پر خدائی حکومت قائم کرنے کے خواہاں نظر آنے لگے۔

جزیرہ نمائے عرب تین طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے۔ مغرب میں بحر احمر ہے مشرق میں خلیج فارس اور جنوب میں بحیرۂ عرب پہاڑوں کی ایک لمبی قطار ہے جو مشرقی جانب بڑھتی چلی گئی ہے اس کا دو تہائی حصہ عدن سے ہوتے ہوئے مسقط کی جانب چل نکلا ہے۔ دوسری طرف حجازی پہاڑوں کا سلسلہ شمال کی طرف بڑھتا چلا گیا اور موجودہ اُردن، شام اور لبنان سے ہوتے ہوئے بحیرۂ روم کے مشرقی کونے تک پہنچ گیا۔

بارش کے لیے آسمان پر بادل عموماً دو رُخ سے آتے ہیں۔ ایک تو اٹلانٹک اور بحیرۂ روم کی طرف سے جس کا سلسلہ نومبر سے مارچ تک چلتا رہتا ہے۔ دوسرا رُخ بحیرۂ ہند کی طرف ہے جس کی وجہ سے جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی ساحلوں پر بارش ہوا کرتی ہے۔

بدقسمتی سے اُردن، شام، لبنان اور فلسطین کے پہاڑی سلسلے اُن بادلوں کو جو بحیرۂ روم کی طرف سے آتے ہیں عرب کے اندر جانے سے روک لیتے ہیں۔ بحیرۂ ہند سے آنے والے بادلوں کی مزاحمت

جنوبی عرب کے پہاڑ کرتے ہیں۔

چونکہ مغرب اور جنوب دونوں طرف سے بادل عرب کے اندر داخل نہیں ہونے پاتے اس لیے سارے عرب میں بہت ہی کم بارش ہوتی ہے۔ میلوں ریگستان ہی ریگستان نظر آتا ہے۔ بارش کی کمی زراعت پر اثر انداز ہوتی ہے بہت ہی کم حصے زراعت کے قابل ہیں۔ لوگوں کی معیشت کا دارومدار جزوی طور پر زراعت پر ہے اور جزوی طور پر کھجوروں کے درختوں پر۔ جانوروں کی رکھوالی اور عام چیزوں کی خرید و فروخت بھی ان کی معیشت کا جزو ہیں۔

سارے عرب میں مختلف مقامات کی تقسیم کی بنیاد یا تو وہ ریگستان ہیں جو اُن مقامات کے درمیان حائل ہیں یا وہ پہاڑ ہیں جو دو مقامات کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ جہاں بارش ہوتی ہے وہاں وقتی طور پر سبزہ اُگ جاتا ہے۔

اس لق و دق ریگستانی صحرا کے مختلف حصوں میں اب بھی وہ خانہ بدوش قبائل مل جاتے ہیں، جن کا رہن سہن آج سے تیرہ سو سال قبل جیسا ہے اس قسم کے قبیلے اب بھی ان ہی خیموں میں قیام کرتے ہیں جن کو ان قبائل کی عورتوں نے اپنے جانوروں کے بالوں سے بُنا ہے۔ وہ اب بھی اپنی بکریوں کے دودھ پر گزارا کرتے ہیں۔ اپنے علاقے کے کھجور کے درختوں سے کھجور توڑ کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ اپنے جانوروں کے بالوں یا نمدوں کے عوض اگر کبھی آٹا اور چاول مل جاتے تو خوشی سے لے لیتے ہیں اپنی بکریوں کے بالوں یا نمدوں سے جو چیزیں وہ بنا سکتے ہیں بنایا کرتے ہیں اور ان کے عوض کوئی اور کام کی چیز تبادلہ میں لے لیتے ہیں۔ اب بھی ان کا گزارہ اونٹوں، بھیڑوں اور بکریوں کی نگہداشت پر ہوتا ہے تیل بھی وہ نکال لیتے ہیں۔

عرب میں بارش کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کبھی ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی۔ کہیں ہوتی ہے کہیں نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ سے وہ قبائل جن کی معیشت کا دارومدار بھیڑوں، بکریوں اور اونٹوں کی نگہداشت پر رہتا ہے ان کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے جانوروں کے ساتھ آج کہیں رہیں اور کل کہیں۔ جہاں جانوروں کے لیے چارہ ملنے کے امکانات نظر آتے ہیں وہاں وہ منتقل ہو جاتے ہیں۔ جب تک

Marfat.com

ان کے جانوروں کو وہاں چارا میسر رہے گا وہیں رہیں گے۔ جب چارہ ختم ہو جائے گا دوسری منزل کا رخ کریں گے۔ مناسب جگہ کی تلاش کے لیے خانہ بدوش قبائل کے رضاکار ہمیشہ گھومتے پھرتے رہتے ہیں جب بھی ان رضاکاروں میں سے کسی ایک کو بھی ایسی جگہ نظر آجائے جہاں ان کے جانوروں کے دانہ پانی کا انتظام ہو سکے وہ اپنے قبیلہ کو فوری اطلاع کر دے گا۔ سارا قبیلہ مع اپنا ساز و سامان اور جانوروں کے نئی تلاش کردہ جگہ پر اپنا ڈیرہ ڈال دے گا۔

ہر خانہ بدوش قبیلے کی یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ اپنے لیے ایک وسیع علاقہ مخصوص کر لے جہاں پر وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ قیام کر سکے۔ بارش کی کمی بیشی ان کے لیے کسی بھی قسم کی پابندی کو عملاً باقی نہیں رکھتی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قبیلہ جو علاقہ اپنے لیے مختص کر لیتا ہے وہاں سال بھر بارش کا ایک قطرہ بھی نہیں پڑتا جس کی وجہ سے ان کے جانوروں کی زندگی جو خود ان کی زندگی کا باعث ہوتی ہے خطرے میں پڑ جاتی ہے اور یہ نقل مقام شروع کر دیتے ہیں۔ کئی سو میل دور جا کر اتفاق سے اس علاقہ میں پہنچ جاتے ہیں جو کسی اور قبیلے نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ دونوں قبیلوں میں رقابت اختلاف اور رسہ کشی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

(خانہ بدوش قبائل کے آپس کے اختلافات اور ان کی رقابتیں اور ان کے آپس میں جھگڑے خانہ بدوش زندگی کا ایک عملی حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ان باتوں کو ان کی عملی زندگی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی رقابتیں اور ایک دوسرے سے دشمنی کا اظہار ایک دوسرے کے جانوروں کو چرانے سے شروع ہوتا ہے۔ کبھی ایک قبیلہ کے لوگ دوسرے قبیلے کے جانوروں کو غائب کر دیں گے تو کبھی دوسرے قبیلے کے لوگ پہلے قبیلے کے جانوروں کو کاٹ کھائیں گے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ پھر سے کہیں نہ کہیں بارش نہ ہو جائے اور ان کے جانوروں کے لیے چارہ میسر نہ ہو جائے۔

اس کے باوجود اس قسم کی رقابتیں ان خانہ بدوشوں میں نفرت کا جذبہ اتنا زیادہ نہیں پیدا کرتیں جتنا آج کل کی تمدن یافتہ اور مہذب سے آراستہ قومیں ایک دوسرے کے خلاف پیدا کرنے میں کامیاب

Marfat.com

نظر آتی ہیں۔)

خانہ بدوش زندگی گزارنے کے باوجود بھی اُن خانہ بدوشوں کو اپنی عزت کا پورا پورا احساس ہوا کرتا ہے۔ وہ اپنی خودی کے محافظ اور انسانیت کی عظمت کے عکاس نظر آتے ہیں۔ قناعت ان کی زندگی کا شعار ہے۔ اپنی قناعت پسندی میں وہ مست ہیں۔

مصر، شام اور عراق کی زرخیز زمینیں ہمیشہ حملہ آوروں کی لالچی نگاہوں کا مرکز بنی رہیں بہت سی اقوام اور بہت سے مذاہب کے لوگ ان ممالک پر قبضہ کرتے رہے۔ ان علاقوں میں اپنی زندگی کی بنیادوں کو استوار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مقامی لوگوں سے باہر سے آنے والوں نے شادی بیاہ کیا۔ ان علاقوں کی اولاد مخلوط النسل ہونے لگی۔ باہر سے آنے والوں میں آریہ بھی تھے، سامی بھی، افریقی، ترکی اور ایرانی بھی۔

صحرائے عرب میں کوئی بات ایسی نہیں تھی جو حملہ آوروں کے لیے کشش کا باعث بنتے اس لیے یہ حصہ باہر والوں کے حملوں سے بچا رہا۔ نتیجے کے طور پر اس علاقہ کے لوگ خالصتاً عرب ہی رہے ان کی نسل میں کسی قسم کا کوئی اختلاط نہ ہو سکا۔

تمام دنیا سے الگ تھلگ رہنے والی یہ عرب قوم اپنی تہذیب و ثقافت میں بھی تمام دنیا سے الگ تھی۔ اس کی اپنی تہذیب تھی۔ اس کے اپنے رسم ورواج تھے۔ دوسری تہذیبیں نہ وہاں پہنچ سکیں اور نہ ہی ان عربوں نے دوسروں کی تہذیب کو اپنانے کی کبھی کوشش کی۔

لق و دق صحرا میں کھڑے ہوئے تمام دن جانوروں کی نگرانی کرنا ان کے لیے یقیناً ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ کا باعث بنتا تھا۔ اسی تھکاوٹ کو دور کرنے شاید وہ قبیلہ داری جنگوں میں حصہ لیتے تھے۔ یہ جنگیں ان کی زندگی کی عظمت کے اظہار کا ذریعہ ہوا کرتی تھیں۔ ان کی آپس کی قبیلہ داری جنگوں کا مقصد ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا اتنا نہیں ہوتا تھا جتنا ان جنگوں سے اپنی بہادری اور شجاعت کی داد حاصل کرنا، ہمت، جوانمردی اور شجاعت کی داد جب ہی مل سکتی ہے جب کہ چند ایسے اصول بھی وضع کیے جائیں جن پر عمل کرتے ہوئے وہ اپنے بہادرانہ صفات کا مظاہرہ کر سکیں۔ اسی شخصی اور خاندانی عظمت

کے اظہار کے لیے یہ لوگ رضا کارانہ طور پر چند قوانین کی پابندی بھی سختی سے کرتے تھے۔ مثلاً دھوکہ دینا یا کسی کو دھوکے سے مارنا ان کے ہاں شرم انگیز بات تھی۔

(اگر دو قبائل کو آپس میں جنگ کرنی ہوتی تھی تو وہ ایک دوسرے کو بہت پہلے دن، تاریخ، مہینے اور مقام اور حتیٰ کہ وقت تک سے مطلع کر دیتے تھے تاکہ حریف مقابل بھی مقابلہ کے لیے تیار رہے۔ کسی بھی قبیلے کے لیے یہ بات انتہائی شرمناک تھی کہ وہ بغیر اطلاع دیئے اپنے دشمن کو کسی بھی قسم کا کوئی نقصان پہنچائے۔ ان کی آپس کی جنگوں کا مقصد فتح نہیں ہوتا تھا بلکہ عزت کا حصول تھا۔ ان کے ہاں فاتحانہ امن ایک مہمل سی بات تھی۔ عزت کا حصول ان کی زندگی کا مطمح نظر تھا۔ جدوجہد اور اضطراب کو وہ جمود کی زندگی پر ہزار بار ترجیح دیتے تھے۔)

خانہ بدوش بدویوں کے لیے شاعری ان کی زندگی کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ وقت ان کے لیے اللہ کی دین تھا۔ کام کرنے کو کم تھا۔ زندہ رہنے کے لیے وقت زیادہ تھا۔ قدرت نے ان کو سحر انگیز زبان دی تھی۔ اسی شیریں زبان میں وہ اپنے پیش روؤں اور بزرگوں کے کارناموں کو شعر کی صورت میں ڈھالتے تھے۔

جنگوں سے ہٹ کر ان لوگوں کو جو چیز سب سے زیادہ عزیز تھی وہ اعتراف حقائق تھا۔ اپنے بزرگوں کی خصوصیات جیسے فیاضی، سخاوت، مہمان نوازی، میزبانی، بہادری اور کمزوروں کی حمایت پر نازاں ہوا کرتے اور برملا اس کا اعلان، اعتراف اور ان خصوصیات کو اپنانے کی کوشش کرتے۔

بلاشبہ مہمان نوازی اور صحرائی زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ دنیا کا کوئی سیاح شاید ہی ایسا گزرا ہو جو ان علاقوں سے گزرا ہو جہاں قبائلی باشندوں کے ڈیرے پڑا کرتے ہیں اور وہ ان کی خاطر مدارات سے نوازا نہ گیا ہو۔

امن کی حالت ہو یا جنگ کی، خوش حالی ہو یا تنگ دستی، ان قبائلیوں کا دستور رہا ہے کہ اپنے مہمان کی تواضع نہ صرف کھانے پلانے سے کریں بلکہ شاعری سے بھی اپنے مہمان کو لطف اندوز کریں۔ خوشی کے موقع پر قصیدے پڑھے جائیں گے۔ جنگ کے موقع پر رزمیہ ہو گا۔ غم کے موقع پر مرثیہ۔ خوشی کا

جزیرۃ العرب

بعثت کے وقت مذہبی حالت

▲ بت پرستی ✦ ستارہ پرستی ○ یہودیت

+ عیسائیت

جن بتوں اور ستاروں کی پوجا ہوتی تھی ان کے نام قوسین میں
لکھے ہیں

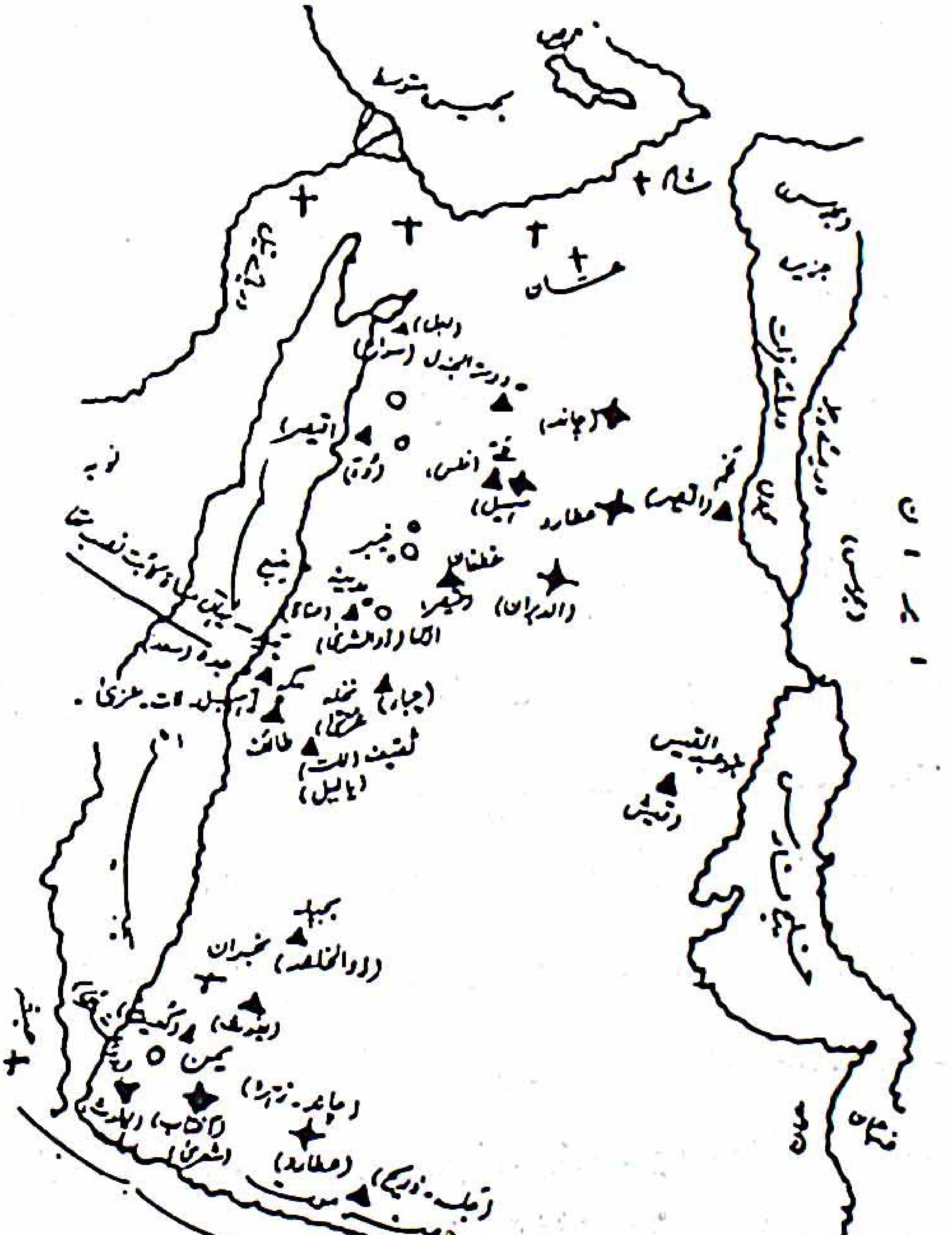

Marfat.com

موقع ہو یا غم کا، جنگ کی حالت ہو یا امن کی ہر موقع پر شاعر اپنے فن کا اظہار کرتا رہے گا اور فن کار کے فن کی قدر کی جاتی رہے گی"۔

صحرائے عرب کی غربت نے اس بات کا کبھی موقع ہی نہیں دیا تھا کہ وہاں کوئی مستقل حکومت قائم ہو۔ نہ تو پولیس تھی اور نہ ہی قانون کی حکمرانی۔ طاقتور کمزور پر حکمرانی کرتا تھا۔ طاقتور قبیلوں نے آپس میں اشتراک کرکے ایک ایسی مشترکہ جماعت کی بنیاد ڈالی جس نے کمزوروں کا تحفظ اپنے ذمہ لیا۔

جب تک فرد کا تعلق قبیلے سے رہا اس کی عزت و ناموس محفوظ رہی۔ جیسے ہی اس کا تعلق قبیلے سے منقطع ہوا وہ بیچارہ کہیں کا نہ رہا۔

چونکہ کمزوروں کی حمایت قبیلوں کا قومی شعار رہا ہے اس لیے اگر کوئی فرد اپنے قبیلے سے کٹ جاتا ہوتا تو وہ کسی اور قبیلے کا دامن تھام لیتا۔ اگر دوسرے قبیلے والے اس کی درخواست کو قبول کرکے پناہ دے دیتے تو پھر اس کی زندگی محفوظ ہو جاتی تھی۔ جس کو پناہ دی جاتی تھی اس کی عزت و آبرو کی حفاظت ہر قیمت پر کی جاتی تھی۔ چاہے اس کے لیے پورے قبیلے پر بھی آفت کیوں نہ آجائے۔

خونی رشتے کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ خاندان اور قبیلہ کے ہر فرد کی عزت و عظمت اور عصمت کو سارا خاندان اپنی عزت سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خاندان کے سارے افراد خونی رشتے کی وجہ سے محفوظ سمجھے جاتے تھے۔ خاندان کے ایک فرد کو بھی نقصان پہنچانا پورے خاندان کو مخالفت کی دعوت دینا ہوتا تھا۔ خونی رشتے افراد کے جان و مال کی مکمل حفاظت کا باعث بنتے تھے۔ اگر کسی خاندان کے ایک بھی فرد کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچتا تھا تو پورے خاندان والوں پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ جس خاندان کے فرد نے ظلم و زیادتی کی ہے اس خاندان کے کسی بھی فرد کے ساتھ بدلہ لیں۔ اسی لیے ظالم چاہے کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو، جسمانی طور پر کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو، بہترین ہتھیاروں کا مالک کیوں نہ ہو، اس کی یہ مجال نہیں ہوتی تھی کہ دوسرے قبیلے کے غریب سے غریب آدمی کو بھی کسی قسم کا نقصان پہنچائے، وہ جانتا تھا کہ اس کے ظلم کا بدلہ بہرحال یا تو اس کی ذات سے لیا جائے گا یا اس کے خاندان کے کسی اور فرد سے۔

ظلم کا معاوضہ بھاری جرمانوں کی صورت میں لیا جاتا تھا بشرطیکہ مظلوم یا اس کے قریبی رشتہ دار

Marfat.com

اس بات کے لیے راضی ہوں۔ اگر مقتول کے رشتہ دار معاوضے کے لیے تیار ہوں ... تو انہیں اس بات کا اختیار تھا کہ ظالم سے اس کے ظلم کا پورا پورا انتقام لیں جس میں ظالم کی موت بھی شامل ہو سکتی تھی۔

بہادری، شجاعت، سخاوت، مہمان نوازی اور غریب کی حمایت۔ یہ وہ خصوصیات تھیں جو عربوں کے خمیر میں تھیں جہاں جہاں عرب گئے اپنی ان قومی خصوصیات کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔

اسپین، فرانس، سسلی اور دنیا کے دیگر خطوں میں جہاں بھی عربوں کے قدم پڑے اپنی قومی خصوصیات کے ساتھ پڑے۔

ایک عرب کے لیے یہ بات قابلِ فخر رہی ہے کہ وہ اپنی عزتِ نفس کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے۔ اس سلسلے میں اس کی کوتاہی خود اس کی اپنی نظر میں تحقیر اور ذلت کا باعث بنتی ہے

خطاؤں سے درگزر کرنا بنیادی طور پر عیسائیت کی تعلیم ہے۔ قدیم یونانیوں کی طرح عربوں کا بھی اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ دوستوں کے ساتھ دوستی اور دشمنوں کے ساتھ دشمنی۔ دوستوں کے ساتھ تلطف اور مدارات اور دشمنوں کے لیے دو دھاری تلوار۔

ان کے نقطۂ نظر سے آدمیوں میں آدمی وہ ہے جو پہلے یہ سوچتا ہے کہ دشمن کو نقصان اور اس کے بعد دوست کو فائدہ کس طرح پہنچایا جا سکتا ہے۔ بدویوں کی بہادری کو وحشیانہ پن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بدویوں کا اپنا نظم و نسق ہے۔ انصاف اور حقوق کی ادائیگی یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

بدوی اپنی عظمت کو شاعری میں پوشیدہ کرتے آئے ہیں۔ ہمیشہ وہ نغمات اُن کی زبانوں پر جاری رہتے ہیں جن میں ان کی اپنی عظمت کی داستانیں بھری پڑی ہیں۔ شاعری کا مرکز ان کی اپنی جنگیں رہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی شاعری میں مہمان نوازی، محبت اور دلنوازی کا بھی ذکر کرتے ہیں

بدوی عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ وہ ان پابندیوں سے آزاد ہیں جو عام طور سے مسلم عورتوں کے تعلق سے منسوب ہیں۔ عشق و محبت کے دام میں یہ بھی گرفتار ہوتی ہیں خصوصاً چھٹی صدی عیسوی میں بدوی عورتیں اپنی آزادی اور خودداری میں اپنا ایک مقام رکھتی تھیں۔ بیوہ عورتیں آزادی کے ساتھ اپنے علیحدہ خیموں میں قیام کرتی تھیں۔ جن کا وہ اپنے پاس آنا جانا پسند کرتی تھیں ان کو اس بات کی اجازت

Marfat.com

بھی تھی۔

ریگستان کے شاداب علاقوں میں رہنے والے دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک زراعت پیشہ اور دوسرے تجارت پیشہ۔ چونکہ عربوں کی عام غذا کھجور تھی اس لیے اکثر زراعت پیشہ کھجوروں کے درخت پر گزر بسر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ میوے۔ کچھ ترکاریاں بھی ان کے باغوں یا کھیتوں میں مل جایا کرتی تھیں۔ اپنے مویشیوں کے لیے چارہ بھی ان کو اگانا پڑتا تھا۔ غلہ کی کاشت بھی تھوڑی بہت ہو جاتی تھیں۔ طائف انگوروں کی کاشت کے لیے مشہور تھا۔ ذرائع آب پاشی کی کمی تھی پانی صرف کنوؤں سے دستیاب ہوتا تھا۔ زراعت کے علاقے بھی بہت ہی مخصوص ہوا کرتے تھے۔

زراعت پیشہ عام طور سے قبیلہ واری جنگوں میں یا آپس کی لوٹ مار میں حصہ نہیں لیتے تھے لیکن جنگوں میں حصہ لینے والوں کے قیام وطعام کا بندوبست ضرور کر دیتے تھے۔ زراعت پیشہ بہت ہی محنتی قسم کے لوگ تھے۔ لین دین میں بہت ہی محتاط رہا کرتے تھے۔ ان کی اپنی مہمان نوازی میں بجائے شان وشوکت کے اعتدال پسندی کا عنصر زیادہ نمایاں ہوا کرتا تھا۔ اکثر زراعت پیشہ اپنے قبیلہ اور خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے پاس خونی رشتے کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔

ریگستان کے شادابی علاقوں کا دوسرا گروہ تجارت پیشہ لوگوں پر مشتمل تھا۔ جزوی طور پر یہ لوگ زراعت میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ ان کے اپنے چھوٹے چھوٹے باغات ہوا کرتے تھے۔ تھوڑی بہت زراعت ان باغات میں ہوتی تھی لیکن معاش کا بڑا ذریعہ تجارت تھا۔ بعض قبیلے ایسے تھے جن میں کچھ لوگ زراعت میں مشغول رہتے تھے اور کچھ تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنائے ہوتے تھے۔

چھوٹے پیمانے پر تجارت کرنے والے عام طور سے خانہ بدوش قبیلوں کے ہاں تجارت کا سامان فروخت کرنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ خانہ بدوش ان لوگوں سے گھی، اون، بکریوں کے بال، نمدے اور اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدا کرتے تھے۔ متمول قسم کے تاجر اپنی تجارت کے لیے دور دراز کا سفر کرتے تھے۔ جزیرہ نمائے عرب سے متصل جو ممالک تھے ان میں ان کی آمد ورفت تھی۔ ان لوگوں کو تجارت کے سلسلے میں ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جانا پڑتا تھا۔ یہ کبھی مصر

Marfat.com

جاتے تو کبھی شام تو کبھی ایران۔ ان بڑے تاجروں کے لیے جو سیکڑوں ہزاروں میل کا سفر اپنے تجارتی سامان کے ساتھ کرتے تھے۔ امن وامان کی فضا ضروری تھی جہاں سے وہ بے روک ٹوک اور بے خطر گزر سکیں۔ اس کے لیے انہوں نے حفظ وامان اور سلامتی کے چند قانون وضع کر لیے تھے جس کی پابندی سب پر لازمی تھی۔

مرکزی حکومت کے فقدان نے ہر قبیلہ کو اپنی آزادی کا تصور دے دیا تھا۔ تجارت پیشہ اور زراعت پیشہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ ایک دوسرے کی معاشی اور معاشرتی اہمیت کو پوری طرح سے سمجھتے تھے۔ جہاں تجارت پیشہ اونٹوں کا چارہ اور اپنے کھانے پینے کا سامان زراعت پیشہ لوگوں سے خریدا کرتے تھے۔ وہیں ان لوگوں کو اسلحہ، کپڑے اور ضروریاتِ زندگی کا دوسرا سامان فراہم کرتے تھے۔

جب ایک بڑا تاجر اپنے کارواں کو ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک لے جانا چاہتا تھا اُس کے لیے یہ ضروری ہو جاتا تھا کہ ان تمام قبائل کے سرداروں سے رابطہ قائم کرے جن کے علاقوں سے اس کے کاروان کا گزرنا ناگزیر ہوتا تھا۔ ہر قبیلہ کے سردار کو تحفے تحائف دینے پڑتے تھے یا رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ ان تحائف اور رقوم کے عوض ہر قبیلہ کا سردار یہ ذمہ داری لیتا تھا کہ اُس کے اپنے علاقے سے تاجر کا کاروان بہ حفاظت تمام گزر جائے گا۔ اس قبیلے کے ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی تھی کہ وہ اس کاروان کے جان و مال کی پوری پوری نگرانی کرے۔ کوئی چھوٹی سی ناگوار بات بھی پیش نہ آنے پائے جب تک کہ کاروان اُن کے اپنے علاقے میں موجود رہے۔

عام طور سے جب کسی تاجر اور اس کے کاروان کو سلامتی کی ضمانت دے دی جاتی تو جس قبیلے کی طرف سے یہ پیش کش ہوتی تھی اُس قبیلے کا ایک آدمی کاروان کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا تاکہ جب تک کاروان اس قبیلے کے علاقے سے گزر نہ جائے اُس پر کوئی آفت نہ آئے۔ اس کے باوجود اگر کوئی فرد یا جماعت کاروان پر حملہ کر بیٹھے تو جس قبیلے کے سردار نے سلامتی کی ضمانت دی تھی اس کے لیے یہ بات باعثِ شرم ہوتی تھی۔ اسے وہ اپنے قبیلے کے لیے ذلت کا باعث سمجھتا تھا۔ اس کا انتقام پورے

Marfat.com

طریقے سے لیتا تھا۔

ہر قبیلے کا سردار صرف اپنے ہی علاقے اور اپنے ہی قبیلے کے لوگوں کی طرف سے سلامتی کی ذمہ داری لیا کرتا تھا۔ اگر کسی تاجر کو کسی بڑے سفر پر جانا ہوتا تھا تو بعض اوقات اُسے چھ یا آٹھ مختلف قبیلوں کے سرداروں سے حفاظت اور سلامتی کے عہد کی درخواست کرنی پڑتی تھی۔ گو یہ بات اس وقت بڑی عجیب معلوم ہوتی تھی لیکن اُس وقت کے تاجران باتوں کے عادی تھے۔ ان تاجروں کی رسم و راہ اُن سردارانِ قبیلہ سے رہا کرتی تھی جن کے علاقوں سے ان کے کاروان گزرا کرتے تھے۔ کاروانوں کی مختلف علاقوں سے روانگی اُن کے لیے نہ تو پریشانی کا باعث ہوا کرتی تھی اور نہ ہی کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ اُن کے آپس میں معاہدے ہوتے تھے۔ مقیم اور مسافر دونوں ایک دوسرے کی عزت اور سلامتی کا بے حد خیال رکھتے تھے۔

اسلام سے قبل سال کے تین مہینے انتہائی حرمت والے سمجھے جاتے تھے۔ ان مہینوں کا احترام اتنا کیا جاتا تھا کہ ان دنوں جنگ، لوٹ مار، غارت گری اور آپس میں مار پیٹ سب کچھ منع تھے۔ ان مہینوں میں سب سے مقدس مہینہ رجب کا سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے دو مہینے ذیقعد اور ذی الحجہ کے تھے بعض لوگ ایک اور مہینے کا بھی اس میں اضافہ کر دیتے ہیں جو محرم کا ہے۔ ان مقدس اور قابلِ احترام مہینوں میں کاروانوں اور تجارت پیشہ لوگوں کی حفاظت کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی تھی۔

گو مذہبی مہینوں کی اہمیت اُن کے پاس ضرور تھی لیکن ان لوگوں کا آپس کا مفاد اس بات میں پوشیدہ تھا کہ وہ اسی بہانے ایک دوسرے کے جان و مال کی حفاظت کریں۔

تیرہ سو برس سے آج تک بدویوں کی مہمان نوازی ضرب المثل رہی ہے۔ قبل اسلام ایک بدوی بنی طے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کا نام حاتم ابن عبداللہ تھا۔ یتیم ہونے کے باعث اپنے دادا کے زیرِ پرورش تھا۔ جب سنِ بلوغت کو پہنچا تو اپنے باپ کا ورثہ پایا۔ اس ورثہ میں بہت سے جانور شامل تھے، اپنے مہمانوں کو خوش کرنے کی خاطر جتنے جانور اُس کو اپنے ورثے میں ملے تھے ایک ایک کر کے ذبح کرتا گیا۔ اس کی زندگی کا سارا اثاثہ جو جانوروں کی شکل میں تھا۔ جلد ہی ختم ہو گیا اور وہ غریبوں میں شمار ہونے لگا

Marfat.com

ایک دن تین آدمی اس کے پاس آئے اور ان کی ضیافت کے لیے اس نے اپنے دادا کے تین اونٹ ذبح کر دیئے۔ اتفاق کی بات کہ وہ تینوں نووارد شاعر تھے۔ حاتم کی اس دریا دلی پر ان میں سے ایک مشہور شاعر نے میزبان اور اس کے قبیلے کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ ڈالا۔ اپنی مدح کو سن کر حاتم نے کہا کہ میرا مقصد آپ تینوں کے ساتھ لطف و کرم کے ساتھ پیش آنا تھا لیکن آپ کی مدح و ثنا نے مجھے آپ کا مقروض کر دیا ہے۔ یہ کہہ کر حاتم نے وہ سارے اونٹ جو اس کے دادا کی ملکیت تھے اور اس کی نگرانی میں تھے تینوں شاعروں کی نذر کر دیئے' اس واقعہ کے فوری بعد حاتم کے دادا تشریف لائے۔ جب اونٹوں کو اپنے مقام پر نہ پایا تو حیرت و استعجاب سے اپنے پوتے سے دریافت کیا کہ سارے اونٹ کہاں ہیں۔ حاتم نے سیدھا سا جواب دیا کہ ان اونٹوں کو تو اس نے شاعروں کے حوالے کر دیا ہے۔ حاتم نے کہا کہ اگر وہ اونٹوں کو اپنے پاس رکھتا بھی ہوتا تو وہ زیادہ سے زیادہ بیس سال تک جیتے ہوتے اور ہمارے استعمال میں آتے لیکن میں نے ان اونٹوں کے بدلے وہ لازوال شہرت حاصل کی ہے جو ابد تک ہمارے خاندان کے نام کو زندہ رکھے گی۔ حاتم کی اس فیاضی کا ذکر عمر خیام نے بھی اپنی رُباعیات میں کیا ہے۔

آج بھی بدویوں کی مہمان نوازی اور دریا دلی کے نظارے پورے عرب میں دیکھے جا سکتے ہیں صاحبِ خانہ آج بھی اپنے خیمے کے سامنے کھڑے ہو کر بہ آوازِ بلند اعلان کرتا ہے کہ کھانا تیار ہے۔ جس کو کھانا ہو وہ آئے اور اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو۔

حاتم کی خوبی یہ بھی رہی ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کا قتل نہیں کیا۔ وہ لوٹ مار میں حصہ لیا کرتا تھا لیکن جانوں کو نقصان کبھی نہیں پہنچاتا تھا۔ اگر کسی کو گرفتار کرتا تو بغیر معاوضہ لیے اپنے قیدی کو آزاد کر دیتا۔ اگر حاتم کو یہ معلوم ہوتا کہ اس کا مخالف بھی کسی کے قبضے میں ہے تو وہ اُسے بھی آزاد کروانے کی پوری کوشش کرتا حتیٰ کہ اگر اُسے اپنے مخالف کو آزاد کروانے کے لیے مالی معاوضہ دینا پڑتا تو وہ رقم دے کر اُسے دشمنوں سے نجات دلاتا اور اس کو حفاظت و سلامتی کے ساتھ اپنے قافلے میں روانہ کر دیتا۔

یہ وہ خصوصیات تھیں جو ان لوگوں میں پائی جاتی تھیں جن کے درمیان اسلام نے جنم لیا۔ ان

Marfat.com

بدویوں کی اُن اعلیٰ صفات اور بہترین خصوصیات کا رُخ اسلام نے جہاد کی طرف پھیرا اس طرح ان کی جفاکشی، محنت اور بہادری نے اسلام کا پرچم اسپین سے ہندوستان تک لہرا دیا۔

جہاں ان کی جنگیں بہادری میں اپنی مثال آپ ہوتی تھیں وہیں ان کی عصبیت اور قبیلہ پرستی ہر جگہ اُبھرتی رہتی تھی۔ اس معاملے میں وہ خونخواری کے درجے تک پہنچ چکے تھے۔ انتقام کے معاملے میں وہ ہر جگہ اپنے قدم مضبوط رکھتے تھے۔

اُن بدویوں کی حد سے زیادہ فیاضی اور سخاوت کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ان میں سے بہترین لوگ جن کو ہیرو کہا جا سکتا ہے غربت کی زندگی گزارتے تھے۔

ان کی زندگی کی زینت اور ان کی عظمت کا راز وہ اپنی شاعری میں پوشیدہ سمجھتے تھے، اکثر و بیشتر اپنی شاعری میں فخر و مباہات اور اپنی بڑائی کا اظہار کرتے تھے۔ بعض اوقات محبت، سلوک اور لطف و کرم کی داستانیں بھی شاعری میں جگہ پا جاتی تھیں۔ قبیلہ انطار کا عدی بن شداد ایک مشہور شاعر گزرا ہے۔ مکہ کے قریب عکاظ کے میلے میں اس نے اپنے فن میں ایک بہترین انعام بھی حاصل کیا تھا۔ اس وقت تک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کی ابتدا نہیں فرمائی تھی۔

شاعری کو کسی بھی اور زبان میں ترجمہ کرنا صرف الفاظ سے کھیلنا اور اشعار کی روح کو غارت کرنا ہوتا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم عدی بن شداد کی نظموں کے ترجمے سے احتراز کریں۔ اس کی نظمیں پڑھنے کے بعد وہی تاثر قائم ہوتا ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

عام طور سے کہا جاتا ہے کہ قبل اسلام عرب کے قبائل بُت پرست تھے۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ اُن قبائل کے لیے جب بھی کوئی مذہب آیا اس نے توحید ہی کی تعلیم دی۔ عیسائیت ہو کہ یہودیت یا پھر اسلام ان سب مذاہب نے توحید کی تعلیم دی۔ بُت پرستی سے اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ بت پرستی اپنے لیے کوئی جگہ مذکورہ بالا مذاہب میں کسی بھی صورت سے نہ نکال سکی خصوصاً وحدانیت کے پرستاروں کے نزدیک بت پرستی نہ صرف ناقابلِ برداشت تھی بلکہ معاشرہ کے لیے بہ حیثیت مجموعی ایک بہت بڑا خطرہ سمجھی جاتی تھی۔

جب ہم قبلِ اسلام کے عربوں کی زندگیوں کے مطالعہ کرتے ہیں تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں بھی سمجھدار، وضعدار اور حقیقت شناس لوگوں کی موجودگی اسی طرح تھی جیسی آج ہے۔ جب اس قسم کے لوگ اس زمانے میں موجود تھے تو تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر سادہ لوح اور بے وقوف کس طرح ان بتوں کی پوجا کرتے تھے جو خود اُن کے اپنے ہاتھوں بناتے ہوتے تھے اُن درختوں کو خدا مانتے تھے جو پہاڑیوں کی وادیوں میں سرسبز و شاداب نظر آتے تھے۔ سمجھدار اور صائب الرائے لوگوں کی موجودگی اور سادہ لوحوں کی بُت پرستی ان دونوں کے تضاد سے ایک بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ ان لوگوں کے ذہن میں ایک مافوق الفطرت اور عظیم ترین ہستی کا تصور تھا تو ضرور لیکن اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لیے وہ خدائی صفات کو بتوں، درختوں اور کنوؤں سے منسوب کر دیتے تھے تاکہ اپنی آنکھوں سے وہ خدا کی جلوہ گری کے مظاہر مادی صورتوں میں دیکھ سکیں اور اپنی عقیدت کا نذرانہ بھی مادی صورت میں غائب کی بجائے موجود کی خدمت میں پیش کریں۔

اُن کے درختوں یا کنوؤں یا بتوں کے پوجا کرنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ بذاتِ خود اُن چیزوں کو اہم یا خدا سمجھ کر اس کی پرستش کریں بلکہ منشا یہ تھا کہ ان چیزوں میں وہ خدائی صفات کے جلوے دیکھیں بتوں کے ابتدا کا منشا بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اَن دیکھی قوت کے مظاہر کو بتوں کی شکل میں اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرنا چاہتے تھے۔ عرب کے متمول گھرانے بتوں کو عزت و احترام کے ساتھ ایک خاص مقام پر رکھا کرتے تھے جو بت خانے کی شکل میں ان کے لیے عبادت کا مقام بن جاتے تھے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ عرب کے بُت یونانیوں اور رومیوں کے بتوں کی طرح انسانی صورتوں میں نہیں ہوا کرتے تھے۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ سنگ تراشی سے ناواقفیت یا اس فن میں عدمِ کمال غیر مثالی بتوں کا باعث ہوا ہو۔ ان کے بت عام طور سے پتھروں اور پتھر کے مختلف قسم کے ٹکڑوں کی شکل میں ہوتے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ ان ہی وقتوں میں دیگر اقوام مختلف فنون میں کمال پر تھیں، خصوصاً سنگ تراشی، عمارت سازی اور فنونِ لطیفہ میں اپنی آپ نظیر تھیں۔ عرب دوسری قوموں کے ان فنون سے ناواقف نہیں تھے۔ پھر کیا بات ہے کہ انہوں نے

Marfat.com

اپنے بتوں کو بے شکل رہنے دیا اور کسی بھی قسم کے جاندار کا تشبہ اپنے بتوں میں نہ آنے دیا۔

ہر زمانے میں بت پرستوں نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ وہ بتوں کی پوجا محض بتوں کی خاطر کرتے ہیں جو ان کے یا ان ہی کے جیسے اور لوگوں کے ہاتھوں کی صناعی ہوتے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ بت پرستی محض بہانہ ہوتا ہے اپنے خدا کو یاد کرنے کا۔

عربی زبان نے اس بات میں خوب تمیز کی ہے کہ بت پرستی جو جانداروں کے اشکال میں بتوں کو وجود میں لا کر کی جاتی ہے اس کی تمیز کیا جائے اس وجدانی جذبے سے جو کسی کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ کسی بھی شکل میں کسی بھی چیز کو سامنے رکھ کر اپنے جذبہ عبادت کی تسکین کرے۔

ابنِ ہشام نے کہا ہے کہ جانداروں کی شکل میں پہلی مرتبہ مکہ میں بت شام سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بعثت سے قبل لائے گئے۔ مسلم مؤرخین نے اکثر و بیشتر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس زمانے کے عرب بت پرست نہیں تھے۔ وہ مختلف چیزوں کا ناتا اپنے خدا سے جوڑ دیا کرتے تھے۔

ہر زمانے میں ہر مذہب کے لوگ اپنے اپنے طور پر مذہب کا ایک مخصوص تصور رکھتے ہیں۔ لوگ جتنے سادہ ہوں گے ان کا تصور بھی مذہب کے تعلق سے اتنا ہی سادہ ہوگا۔ وہ بے چارے عرب اتنے سادہ لوح تھے کہ انہوں نے بے شکل پتھروں کو مقدس سمجھنا شروع کر دیا اور یہ سمجھتے رہے کہ اُن بے جان پتھروں میں کوئی غیبی قوت ہے۔ ان سے زیادہ سمجھدار لوگوں نے ان دیکھی قوتوں کی پرستش شروع کر دی۔ عام طور سے اپنی اپنی مقدس چیزوں کو بوسہ دینا، اسے چھونا یا اس کے قریب جانا اپنے لیے وہ برکت کا باعث سمجھتے تھے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تین سو سال قبل رومی شہنشاہیت کے لیے مسیحیت سرکاری طور پر قابلِ قبول ہو گئی تھی۔ ۳۲۵ء میں مسیحیت رومی شہنشاہیت کا سرکاری مذہب قرار پائی۔ اس زمانے میں شام کے اکثر لوگ عیسائیت کے حلقے میں داخل ہوتے، لیکن یہ اثر صرف خارجی تھا۔ عیسائیت کی روح کو وہ اپنا نہ سکے۔ وہ لوگ جو انتقام کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتے تھے

Marfat.com

ان کے لیے مسیح کی یہ تعلیم کہ کوئی اگر ایک گال پر طمانچہ مارے تو اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دو بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

۴۲۰ء میں NESTORIOUS نامی ایک مذہبی رہنما نے عیسائیت میں تناسخ کا ایک نیا مسئلہ داخل کیا اس وقت کی مرکزی مذہبی عیسائی کونسل نے اُسے شد و مد سے رد کر دیا۔ نتیجے کے طور پر اس مذہبی رہنما کے ماننے والوں نے ایران کا رُخ کیا۔ یہ لوگ وادی فرات EUPHRATES VALLEY میں جا کر سکونت پذیر ہوتے اس کے کچھ سال بعد ایک اور مذہبی رہنما EUTYCHES نے مسئلہ تناسخ کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا۔ اس کی بھی مذمت مرکزی عیسائی کونسل نے کی۔ اس کے پیرو جو عیسیٰ مسیح کو بشریت اور الوہیت کا جامع قرار دیتے تھے مصر اور شام کی طرف کوچ کر گئے۔ یہی مذہب چھٹی سے پندرہویں صدی عیسوی تک بازنطینی سلطنت کا سرکاری مذہب رہا۔

یہودی بھی اس زمانے میں ہر جگہ پھیلے ہوتے تھے۔ ولادتِ مسیح سے چھ سو سال پہلے ہی سے یہودی اچھی خاصی تعداد میں عراق میں سکونت پذیر تھے۔ عرب کے زرخیز علاقوں میں بھی ان کی بستیاں پائی جاتی تھیں۔ ان میں سے بیشتر نے اپنے آپ کو عربوں کے سانچوں میں ڈھال لیا تھا۔ یہ ان میں مخلوط ہوتے چلے گئے۔ اپنی قومی یا مذہبی انفرادیت کو اتنی اہمیت نہیں دی۔

مختصر یہ کہ چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے زیادہ تر لوگ کسی خاص مذہب کے پیرو نہیں تھے مگر پھر بھی آہستہ آہستہ ان میں توحید کا شعور پیدا ہو رہا تھا۔ یہ زمانہ یقیناً ایک نئے عقیدے کے پرچار کے لیے موزوں ترین زمانہ تھا جس میں ایک خدا کا تصور جو ذہنی اور روحانی تسکین کا باعث ہو پیش کیا جاتے تاکہ لوگ توہمات کی دنیا سے باہر نکل آئیں۔

Marfat.com

شاہانِ عرب

عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تین ہزار سال قبل جب کہ دنیا کی تاریخ ابھی لکھنی شروع نہیں ہوئی تھی دنیا میں سب سے زیادہ تہذیب و تمدن کے مراکز جزیرہ نمائے عرب سے متصل علاقوں میں واقع ہوتے تھے۔ جنوب میں مصر کے فراعنہ، BABYLONIANS، ASSYRIANS بام عروج پر تھے اور ادھر ایران کی شہنشاہیت اپنے شباب پر تھی۔ عرب کے قبائل اپنے ہمسایوں کے عروج اور ان کی عظمت و شوکت سے یقیناً واقف ہوں گے

۳۳۰ قبل مسیح میں سکندر اعظم نے ایرانی شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد دو سو ستر سال (۲۷۰) تک یونانی تہذیب کا سکہ ان علاقوں میں رواں دواں رہا۔ ۶۴ قبل مسیح میں رومیوں نے شام اور فلسطین میں اپنے قدم جمائے اور اس کے بعد سات سو سال تک مصر، فلسطین اور شام پر رومیوں کا قبضہ رہا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ۵۷۰ء کی ہے۔ یہ زمانہ وہ ہے جس میں مقامی باشندوں کا رہن سہن اُس طریقہ کا تھا جس کا ذکر ہم پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں اور دوسری طرف ان کا سابقہ اُن اقوام سے بھی تھا جن کی عظمت اس زمانے میں مسلم تھی۔

خانہ بدوش زندگی ایک مستقل تہذیب کی بنیاد اور اس کے ارتقا کی راہ میں ایک قدرتی رکاوٹ تھی۔ دستاویزات، مخطوطات اور کتابوں کا فقدان، اور کتابیں مل بھی جائیں تو ان کی خیموں میں حفاظت

Marfat.com

یہ وہ مشکلات تھیں جن کے باعث تقریباً تمام بدوی پڑھنے اور لکھنے کے فن سے آشنا نہ ہو سکے حالاں کہ خطابت اور شاعری کے فن میں حافظہ کی بدولت وہ بہت آگے تھے۔

جزیرہ نمائے عرب کے اُن علاقوں میں جو شہری نوعیت کے تھے بہت سے خاندان ایسے تھے جو صاحبِ عزت، صاحبِ دولت اور صاحبِ ثروت تھے اور ان کا رابطہ یونان، روم اور ایران سے رہا کرتا تھا۔ وہ ان کی تہذیب و تمدن سے پوری طرح آشنا تھے۔ اسلام سے سینکڑوں برس پہلے ان میں سے چند نے عیسائیت یا یہودیت کو اپنا مذہب بھی بنالیا تھا۔

ساتویں صدی کی ابتدا میں جب کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع فرمائی جزیرہ نمائے عرب میں مختلف طبایع اور مختلف مذاہب کے لوگ پائے جاتے تھے۔ گر ان سب کی زبان عربی تھی لیکن ہر ایک کا اندازِ فکر جداگانہ تھا۔

جزیرہ نمائے عرب میں سب سے پہلا علاقہ جہاں نظم و نسق کے ساتھ حکومت کی ابتدا ہوئی وہ یمن تھا۔ یمن میں ایک باقاعدہ حکومت جو ایک ہی خاندان پر مشتمل تھی۔ پندرہ سو قبل مسیح سے ۰۰۰ قبل مسیح تک چلتی رہی۔ اس شاہی خاندان کا خاتمہ تقریباً سات سو قبل مسیح ہی ہوا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے دربار میں ۹۵۰ قبل مسیح میں جس ملکہ بلقیس یا ملکہ سبا نے حاضری دی تھی وہ اسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ یمن نے دولت اور تہذیب دو ذرائع سے حاصل کی۔ لوبان اور مصالحہ جات کی کاشت اور ان کی برآمد سے۔

مصر کے فراعنہ، ایران کے شہنشاہ اور دوسرے بڑے ممالک کے سیاسی اور مذہبی ادارے لوبان کو اپنی خانقاہوں اور درباروں میں جلانے کے لیے خاص طور سے یمن سے تعلقات رکھتے تھے۔ حجاز اور شام کو بھی یمنی عود اور لوبان روانہ کرتے تھے۔

ان کی آمدنی کا دوسرا ذریعہ وہ تجارت تھی جو ہندوستان، انڈونیشیا اور مشرقی افریقہ سے ہوتی تھی۔ ان مقامات سے آتے ہوتے مال کے جہازوں کو عدن پر رُکنا پڑتا تھا جہاں پر جنوبی عرب کے تاجر اس سامان کو خرید لیتے تھے اور پھر اس کو مصر، شام اور ایران فروخت کے لیے روانہ کر دیتے تھے۔

Marfat.com

پہلی قسم کی تجارت کا سلسلہ پندرہ سو سال قبل مسیح سے چلا آ رہا تھا اور دوسری قسم کی تجارت چھ سو سال قبل مسیح سے شروع ہوئی تھی۔

۰ ۰، قبل مسیح تک منائین کا تسلط تھا پھر سبائین نے ان کی جگہ لی ۱۵ ۲ قبل مسیح میں عرب کے جنوب میں نباتیین کا ظہور ہوا۔ یہ وہ عرب تھے جو تجارت میں پیش پیش تھے۔ ان کا دارالسلطنت پٹرا تھا جو جنوبی اردن میں واقع تھا۔

منائین اور سبائین کی جگہ قدرت نے حمیریوں کو دی۔ ان کا پہلا بادشاہ الحارث تھا جو تقریباً ۵۰، قبل مسیح میں حکومت کر رہا تھا۔ اس کے بعد الحارث ہی کے جانشین نے اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ یمن سے آگے تمدبران کا تسلط قائم ہو گیا اور پھر ایران پر بھی حملہ کیا۔

۲۴ قبل مسیح میں رومیوں نے ایک لشکر یمن پر چڑھائی کرنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ لشکر بحر احمر کے مشرقی ساحلوں سے ہوتا ہوا یمن تک پہنچا ضرور مگر گرمی کی شدت، پانی کی کمی اور نامناسب آب و ہوا نے پورے لشکر کے لشکر کا ستیاناس کر دیا۔ بغیر کسی کامیابی کے لشکر کے چند بچے کھچے خوش نصیب روم واپس پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور پھر کبھی حملے کی جرأت نہ کی۔

ایک روایت کے مطابق یمن کی آب پاشی ایک تالاب کے ذریعہ ہوا کرتی تھی۔ یہ تالاب مارب یا مار بہ پر بنایا گیا تھا۔ تقریباً ۱۲۰ عیسوی میں اس تالاب کا بند ٹوٹ گیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر بڑی تباہی مچی بڑے پیمانے پر یمن کے لوگ جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصوں میں ہجرت کر گئے اس غیر معمولی تباہی کے باوجود بھی یمن کی خوشحالی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ کیونکہ ان کی معیشت کا دارومدار درآمد اور پھر برآمد ہی پر ہوتا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یمن کی تہذیب و ثقافت اس زمانے میں اپنے عروج پر تھی۔ زراعت میں وہ آگے تھے۔ آب پاشی کی طرف وہ خاص توجہ دیتے تھے۔ پہاڑیوں پر کاشت کیا کرتے تھے۔ اپنی زراعت کو انہوں نے بہت فروغ دیا۔

فن تعمیر میں بھی یہ ممتاز تھے۔ بڑی بڑی عمارتیں اس طرح سے بناتے کہ دو پتھروں کے درمیان

Marfat.com

کوئی جوڑ تک نظر نہ آتا۔

۲۰۰ سے ۲۲۶ تک کا زمانہ ایک یمنی بادشاہ اسد ابو القارب کے لیے مشہور ہے۔ اس بادشاہ نے سارے عرب کو فتح کر لیا۔ یثرب اس کے قبضہ میں جا چکا تھا۔ حجاز کے شاداب حصوں پر اس کا تسلط تھا۔ حجاز میں اس وقت اکثریت یہودیوں کی تھی۔ یہودی ترجیحات سے یہ بادشاہ بہت متاثر ہوا۔ واپس جاتے ہوئے دو یہودی عالموں کو اپنے ساتھ یمن لے گیا۔ ان دونوں یہودی علماء کی تعلیم و تدریس کا اس بادشاہ پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے یہودیت اختیار کر لی اور بت پرستی سے توبہ کی۔ اس کی تقلید اس کی رعایا نے بھی کی۔

ابھی ابھی نباتین اور ان کے دارالسلطنت پٹرا کا ذکر ہو چکا ہے۔ یمن سے جو کارواں یہاں پہنچتے تھے ان کے لیے آگے بڑھنے کے تین رُخ تھے۔ ایک راستہ تو مغرب کی طرف مصر کے لیے جاتا تھا دوسرا راستہ بندرگاہِ غزہ کو لے جاتا تھا اور تیسرا دمشق کو۔

تاریخ میں نباتین کا ذکر عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تین سو سال قبل ملتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یمن میں بے چینی تھی۔

مشرقی تجارت اور مشرقی سامان کی خرید و فروخت نے ان کو بہت ہی متمول بنا دیا تھا۔ کچھ صدیوں تک تو ان لوگوں نے شام کے مشرقی حصے کو بھی اپنے قبضے میں رکھا جس میں دمشق بھی شامل تھا۔

۱۰۶ عیسوی میں نباتین کی سلطنت کو زوال ہوا۔ ایک فوجی نے جس کا نام TRAJAN تھا اپنی شہنشاہیت کا اعلان کر دیا۔ اپنے مقبوضہ علاقے کو رومی سلطنت کا ایک حصہ قرار دیا۔ بادشاہت کی تبدیلی نے ان کی تجارت پر بھی اثر ڈالا۔ نباتین اونٹوں کے ذریعہ سامان لاتے لیجاتے تھے۔ یہ رومنوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

تجارت میں نباتین کے جانشین پالمرین ہوئے جنہوں نے شام کے ریگستان کو اپنا مرکز قرار دیا۔ یہ لوگ بھی تجارت کے وہی طریقے اختیار کیے ہوئے تھے جن کو ان کے پیش رو اپنائے ہوئے تھے۔

TRAJAN کا جانشین UDHAINA ہوا۔ اس نے تجارت کی طرف خاص توجہ کی۔ تجارتی امور میں

Marfat.com

پیٹرا ان خصوصیات کا حامل تھا اس نے کوشش کی کہ اپنے زیر تسلط علاقے کو ان ہی تجارتی خصوصیات کا حامل کر دے۔ اس کا زمانہ ۱۵۰ عیسوی کا ہوا ہے۔ اس بادشاہ نے بڑی ہی شان و شوکت کے ساتھ مشرقی شام اور الجزیرہ پر حکومت کی۔

۱۹۳ء سے ۲۱۱ عیسوی تک رومی شہنشاہیت اٰلی کے لوگوں پر مشتمل نہ تھی۔ بحیرۂ روم کے آس پاس جو مختلف سلطنتیں پھیلی ہوئی تھیں ان کے اشتراک اور باہمی تعاون سے رومی شہنشاہیت نے ایک نیا روپ دھار لیا تھا۔ ODHAINA کا پوتا جب برسراقتدار ہوا تو اس ملی مجلس نے اس کی سرپرستی کی۔ اس بادشاہ نے کافی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

تقریباً چھ سو سال تک جنوبی شام اور الجزیرہ کی خوش حالی اور آسودگی روم اور ایران کی باہمی رقابت کا شکار رہی۔ ۲۵۰ء میں SAPOR I شہنشاہ ایران نے شام پر حملہ کیا۔ رومیوں کو شکست فاش دی رومیوں کے شہنشاہ کو قیدی بنا کر ایران کے دار الخلافے لے آیا۔ فتح کے نشے سے مست ہو کر ایران کے شہنشاہ نے پھر اس طرف کا رُخ کیا۔ انطاکیہ کو فتح کیا۔ اس عرصے میں اُدھینہ اور اس کے لوگ ان تمام حالات سے بے خبر ہو کر خاموشی سے اپنے اپنے کاموں میں لگے رہے۔ ان ایرانی اور رومی جنگوں میں کسی بھی قسم کا کوئی حصّہ نہیں لیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ رہی کہ جن مقامات سے ایرانی افواج گزرا کرتی تھیں اُن مقامات سے ان لوگوں کا رہائشی ریگستانی علاقہ کافی دور تھا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے جب SAPOR اپنی مہم سے کامیابی کے ساتھ واپس ہو رہا تھا تو حبشہ کی وادیوں میں پالمیرا کے عربوں نے اس کی افواج پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس کی تمام فوج کو حواس باختہ کر کے تتر بتر کر دیا حتیٰ کہ اس ایرانی شہنشاہ کی بیویوں کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ کوئی اتفاقی سرحدی تنازعہ نہیں بلکہ ایک سوچی سمجھی سازش تھی۔ اُدھینہ نے ایرانی شہنشاہ کو مقابلے کی دعوت دی اور دو بار اس کے دار السلطنت کا محاصرہ کیا۔

گبن لکھتا ہے کہ روم کی عظمت جو ایرانیوں کے ہاتھوں پامال ہو رہی تھی۔ اس کو باقی اور سلامت رکھنے میں پالمیرا کے عربوں نے حصّہ لیا۔

رومیوں نے پالمیرا کے عربوں کی حمایت کی قدر کی۔ ان کے بادشاہ کو خطاب اور تمغوں سے

Marfat.com

نوازا۔ جس بادشاہ کی سرکردگی میں یہ ساری باتیں ہوئی تھیں اس کے اقبال کا ستارہ بہت جلد ڈوب گیا وہ اپنے بھتیجے یا بھانجے کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کی بیوی زینب اس کی جانشین ہوئی۔ زینب کی سرکردگی میں شام، ایشیائے کوچک اور مصر فتح ہوتے۔ اس کی حکمرانی کے دوران روم کی شہنشاہیت میں تبدیلیاں ہوئیں شہنشاہ AURELIANO نے اس بات کی کوشش کی کہ تمام رومی سلطنتوں پر مشتمل ایک وفاق بنایا جائے تاکہ منظم طریقے سے رومن ایمپائر اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہناتے۔ زینب کو کسی بھی قسم کی مصالحت ناپسند تھی وہ ایک آزاد اور خود مختار ملکہ کی حیثیت سے حکومت کرنا چاہتی تھی۔ یہ بات روم کے شہنشاہ کو ناگوار گزری، اس نے زینب کے ملک پر حملہ کر دیا۔ زینب کی فوج کو شکست ہوئی۔ زینب کو گرفتار کیا گیا۔ سونے کی زنجیروں میں اُسے باندھ کر روم لے جایا گیا۔ سونے کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی ملکہ کو رومی شہنشاہ کے شکار کے طور پر روم کی شاہراہوں پر گشت کروایا گیا۔

عربوں کے تعلق سے یہ جو تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ قبل اسلام یا حضورؐ کے ابتدائی زمانے میں وحشی اور درندہ صفت تھے بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ روم کے شہنشاہوں میں چھ شہنشاہ ایسے گزرے ہیں جن کا تعلق جزیرہ نمائے عرب سے تھا۔ اگر وہ بہ حیثیت ایک قوم درندہ صفت ہوتے تو روم جیسی سلطنت جو اپنی تہذیب اپنے تمدن اور نظم و نسق میں قابلِ مثال تھی ان لوگوں کو اپنا شہنشاہ نہیں بناتی۔ چار کا تعلق تو شام سے تھا اور فلپ اور SEPTIMINS عرب کے ریگستانی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

یمن کے ایک تالاب کے بند کے ٹوٹنے کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ اس حادثے کے بعد جن یمنی قبیلوں نے ترکِ وطن کیا ان میں سے ایک قبیلہ غسّان تھا جو شام کے بنجر علاقوں میں پہنچا۔ یہ زمانہ ۲۵۰ عیسوی کا تھا جب کہ پالمیرا خاندان کے فرمانروا عروج پر تھے۔ ODENATHUS کے خاندان کا زوال رومن حکمرانوں کے ہاتھوں ہوا۔ ۲۹۲ء میں رومنوں نے بنی غسّان کے فرد ثعلبہ ابن عمر کو مشرقی شام کا حکمران بنایا۔ ۶۳۶ء تک جب کہ مسلمانوں نے اُسے فتح نہ کر لیا اس خاندان میں حکمرانی باقی رہی۔ اسی زمانے میں جب کہ بنی غسّان نے شام کا رُخ کیا یمن کے دوسرے قبیلے حبشہ کے مغربی ریگستانی علاقوں میں جا بسے۔

۲۶۸ء میں شہنشاہ ایران SAPOR I نے قبیلہ لخم کے ایک نوجوان عمر ابن عدی کو اس علاقے کا

Marfat.com

حکمران بنایا۔ اس نے ۲۶۸ء سے ۲۸۸ء تک حکمرانی کی۔ اپنا پایہ تخت EUPHRATES حبشہ کے ایک شہر حیرا کو بنایا۔ بنی غسان کی طرح ان کا خاتمہ بھی اسلامی فوجوں کے ہاتھوں ۶۳۰ء میں ہوا۔

اس تمام عرصے میں روم اور ایران کے درمیان گرم و سرد جنگ جاری رہی ۴۷۵ء میں مغربی رومی شہنشاہیت کو زوال ہوا۔ لٹیروں اور وحشیوں نے ان کی جگہ لی۔ آدھا مشرقی حصہ رومیوں کے تسلط ہی میں رہا جس کی راجدھانی استنبول تھی۔ اس سیاسی تقسیم کے بعد مشرقی حصے پر رومیوں کی حکمرانی بازنطینی شہنشاہیت کے نام سے باقی رہی۔ ملک کے آدھے حصے پر لٹیروں اور وحشیوں کا قبضہ تھا اور آدھے حصے پر رومی قابض تھے۔ ان کے مقبوضہ علاقوں کے لیے مقامی ریگستان ہی جغرافیائی سرحد کا کام دے رہے تھے۔ ان دونوں بڑی سیاسی گروہ نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے عربوں کو استعمال کیا۔ ایک طرف بنی غسان کی حمایت رومی کیا کرتے تھے تو دوسری طرف ایران نے لخمیوں کو اپنا وسیلہ کار بنا رکھا تھا۔

استنبول، ایران اور دوسرے ممالک کے درباروں میں عرب شاہی خاندانوں کی کافی عزت ہوا کرتی تھی۔ ان ہی عرب شاہی خاندانوں کے ذریعے متمدن ممالک کی تہذیب اور ثقافت کا پتہ مقامی عرب قبیلوں کو ہوا کرتا تھا۔ بنی غسان اور لخم جس وقت حکمرانی کر رہے تھے اسی دوران حمیری یمن کے ایک بڑے حصے پر بڑی ہی شان و شوکت کے ساتھ حکمران تھے۔ ان کے قبضے میں جزیرہ نمائے عرب کا ایک بڑا حصہ تھا۔ تیسری صدی عیسوی کے اختتام پر ان ہی تین خاندانوں کی سارے عرب پر حکمرانی تھی۔ ان کے اپنے اپنے مقبوضہ علاقے تھے جہاں وہ بادشاہت کر رہے تھے۔ یمن میں حمیری، شام میں بنی غسان اور حیرا میں لخمد

لخمد خاندان کا ایک نامور بادشاہ نعمان اوّل گزرا ہے۔ یہ کانا تھا۔ اس نے ۳۹۰ء سے ۴۱۸ء تک حکومت کی۔ اُس کے عہد حکومت میں خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ حیرا اپنی ثقافت اور تہذیب کے باعث کافی مشہور ہوا۔ ایران کے شہنشاہ یزدگیر اوّل نے اپنے بیٹے بہرام کو نعمان کے دربار میں روانہ کیا تاکہ نعمان اپنی نگرانی اور سرپرستی میں اُسے رموز مملکت سکھائے۔ بادشاہت کے طور طریقے بتائے۔ یہ واقعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس وقت عرب اپنی تہذیب اور ثقافت میں کس درجے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ ۴۲۰ء میں جب یزدگیر اوّل شاہ ایران کا انتقال ہوا تو اس کا ولی عہد بہرام اُس وقت حیرا میں نعمان

Marfat.com

کے زیر تربیت تھا۔ بہرام کی ایران میں غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یزدگرد اوّل کے دوسرے شہزادے خسرو نے اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اس کے فوری بعد نعمان اوّل کا انتقال ہو گیا اس کا بیٹا منذر اوّل بہرام کو اپنے ساتھ لے کر ایران پر حملہ آور ہوا۔ ایران کے تخت کو حاصل کر کے بہرام کو اس پر مسند نشین کر دیا بہرام شکار کا بہت شوقین تھا۔ خاص طور پر وہ شکار کھیلا کرتا تھا جس کو اس نے اپنے عرب کے قیام کے دوران سیکھا تھا۔ اس کے شکار کے شوق کا ذکر عمر خیام نے بھی اپنی رباعیات میں کیا ہے۔ جبکہ بنی غسان اور لخمنز جزیرہ نمائے عرب کے جنوب میں اپنی بادشاہت میں مصروف تھے اسی دوران یمن میں اسد ابو قارب یہودیت کی اشاعت میں مصروف تھا۔ چھٹی صدی عیسوی کی ابتدا میں یمن کا فرمانروا ذوالنواس یہودیت کو جنون کی حد تک اپنا چکا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے یمن کے قریب نجران میں شام کا ایک پادری عیسائیت کو پیش کر چکا تھا نجران میں عیسائیت کافی پھیل چکی تھی۔ اس کا نتیجہ دونوں مذاہب کے تصادم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہودیوں نے نجران پر حملہ کر کے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہودی بادشاہ نے ایک بڑی خندق کھدوائی۔ خندق کو آگ سے بھروا دیا۔ اُس آگ سے بھری ہوئی خندق میں عیسائیوں کو پھینکتا گیا۔ مذہبی تعصب نے اس کو اتنا دیوانہ بنا دیا تھا کہ عیسائی زندہ جلنے کے لیے آگ سے بھری ہوئی خندق میں پھینکے جا رہے تھے۔ ان مظلوم عیسائیوں میں سے ایک عیسائی کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا۔ سیدھے استنبول پہنچا۔ بازنطینی شہنشاہ کو یہودی بادشاہ کے ظلم و ستم کی روداد سنائی مدد کا طلب گار ہوا۔ اُس وقت بازنطینی شہنشاہ تھا۔ اس کی اپنی سلطنت اس موقف میں نہیں تھی کہ وہ عملی طور پر مظلوموں کی مدد کر سکے یا اپنی افواج مقابلے کے لیے روانہ کر سکتے۔ اس نے یہ کام ضرور کیا کہ حبشہ کے بادشاہ کے نام ایک خط لکھا۔ حبشہ کا بادشاہ عیسائی تھا۔ خط میں درخواست کی گئی تھی کہ مظلوم اور شہید عیسائیوں کا بدلہ لیا جائے۔ گو مذہب کے نام پر حبشہ کے بادشاہ کو یمن پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا گیا تھا لیکن اس کے پیچھے عیسائیوں کا اپنا معاشی مفاد وابستہ تھا۔ جنوبی عرب نے تجارت کے لیے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر رکھی تھی۔ مشرق یعنی ہندوستان، انڈونیشیا، چین وغیرہ سے سامان وہاں جمع ہو کر فروخت کے لیے پھر آگے بڑھتا تھا۔ اس لیے بازنطینی عیسائی حکومت نے حبشہ کی عیسائی حکومت کو اس طرح سے اکسایا

Marfat.com

کہ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ یہودیوں کی حکومت نے جو بے رحمانہ سلوک کیا تھا اس کا اسے پورا پورا بدلہ اس طرح سے دیا جائے کہ ایک طرف عیسائیت پر احسان بھی ہو جائے۔ اور دوسری طرف ان کے دل کی مراد بھی بر آجائے جو تجارتی مرکز پر قبضہ کرنے کی صورت میں تھی۔

۵۲۵ء میں حبشہ نے یمن پر قبضہ کیا۔ ذوالنواس مارا گیا۔ حمیریوں کے خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ حبشی افواج نے یمن کو اس کے بعد پچاس سال تک اپنے قبضے میں رکھا اور وہاں حکومت کرتے رہے۔ حبشہ کا ایک مشہور وائسرائے یا گورنر جو یمن پر مامور کیا گیا تھا اُس کا نام ابرہہ تھا۔ ابرہہ نے یمن میں ۵۳۷ء سے ۵۷۰ء تک گورنری کی۔ اپنی گورنری کے آخری زمانے میں اس نے مکہ پر حملہ کرنے اور خانہ کعبہ کو اپنے قبضے میں لے لینے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں بھی مذہب اپنا کام کر رہا تھا۔ بات یہ تھی کہ مکہ ایک زمانہ سے مذہبی مرکز بنا ہوا تھا عرب کعبہ کی زیارت کے لیے دور دور سے وہاں جایا کرتے تھے۔ ابرہہ نے اپنے صوبہ میں ایک بڑا اور بہت ہی خوب صورت کلیسا بنایا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بنائے ہوئے کلیسا کو وہ اہمیت دے جو اس زمانے میں کعبہ کو حاصل تھی۔ عربوں کی مذہبی عقیدت کا مرجع کعبہ تھا۔ ابرہہ چاہتا تھا کہ کعبہ کی عظمت اس کے گرجا کو حاصل ہو جائے۔

مسلم مورخین نے لکھا ہے کہ ابرہہ قریب تھا کہ مکہ کو اپنے قبضے میں لے لے کہ ہزاروں پرندوں نے جو اپنی چونچوں میں چھوٹے نوک دار پتھر دبائے ہوئے تھے اس طرح ابرہہ کی فوجوں پر پتھر برسائے کہ تمام افواج وہیں ڈھیر ہو گئیں۔ ابرہہ خود بھی اپنے مستقر یمن پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چیچک کی وبا اس کی فوجوں میں ایسی پھیلی کہ ساری فوج ہلاکت کی نذر ہو گئی۔

روایات اس بات کی شاہد ہیں کہ ایک ہاتھی پر سوار ہو کر ابرہہ نے مکہ کا رُخ کیا تھا۔ یہ سال ۵۷۰ء کا تھا جس کو اہل حجاز "سال فیل" کے نام سے ایک زمانے تک موسوم کرتے رہے۔ اسی سال یعنی ۵۷۰ء میں ہمارے ہیرو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے۔ ابرہہ کی اس ذلت آمیز شکست سے حبشہ کا وقار یمنیوں کی نظر سے گر گیا۔ یمنی اس واقعہ کے بعد بار بار بغاوت کی طرف مائل ہوتے گئے۔ ۵۷۵ء میں الحمیری خاندان کا ایک شہزادہ سیف ذی یزن حیرا گیا۔ اس نے حبشیوں کے ظلم و ستم کی داستان لخمید شہزادے

کے آگے بیان کی۔ لہٰذا شہزادہ اُسے اپنے ساتھ لے کر ایران کے دربار میں گیا۔ ایران کے بادشاہ خسرو ابن نوشیروان نے ان کی فریاد سُنی۔ اپنے مشیروں کو طلب کر کے اُن سے مشورہ مانگا۔ مشیروں نے کہا کہ یمن بہت دور ہے۔ حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ یمن پر حملہ کیا جائے۔

سیف ذی یزن کو ایران کی سرکار نے چاندی کے دس ہزار درہم دیئے۔ اپنی افواج سے عملی مدد کرنے سے معذرت چاہی۔ یمنی شہزادہ جب دربار سے باہر آیا تو اُس نے درباری ملازمین میں ان دس ہزار درہم کو تقسیم کر دیا۔ جب یہ بات خسرو کے گوش گذار کی گئی تو اُس نے دوبارہ سیف کو اپنے دربار میں طلب کیا وضاحت چاہی کہ اس نے اپنے اس عمل سے دربار کی جو توہین کی ہے اس کا سبب اور جواز پیش کرے سیف نے جواب دیا کہ چاندی اور درہم میرے کس کام کے۔ میرے ملک میں جو چیزیں ہیں انمول ہیں ہمارے ہاں سونے اور چاندی کے پہاڑ ہیں۔ جس وقت ہم چاہیں سونے اور چاندی کو ان پہاڑوں میں سے نکال کر جتنا چاہیں اوروں کو دے سکتے ہیں۔ اس جواب سے شہنشاہ بہت متاثر ہوا۔ فیصلہ صادر ہوا کہ سیف کی مدد فوج کے ذریعہ کی جائے تاکہ سونے اور چاندی کے پہاڑوں والا ملک اُس کے قبضے میں آسکے۔

ایرانی فوجوں نے حبشی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ سیف کو یمن کا بادشاہ بنانے کا اعلان کیا۔ تقریباً ۲۰ سال تک یمن میں افراتفری رہی۔ عرب، ایران اور حبشی ایک دوسرے کے خلاف خوب لڑتے رہے۔ ان کی آپس کی جنگوں کا سلسلہ برسوں تک جاری رکھا۔ بالآخر ۵۹۷ء میں خسرو پرویز نے ایران سے ایک تازہ دم فوج یمن کو روانہ کی۔ اس فوج نے یمن پر پوری طرح سے قبضہ کر لیا۔ وہاں سے حبشیوں اور ان کے حامیوں کو مار بھگایا۔

جس وقت اب ہم باتیں کر رہے ہیں اس وقت جزیرہ نمائے عرب میں تین مذاہب تھے۔ عوام کی اکثریت بت پرست تھی۔ سیف خود یہودی تھا۔ اس کے اپنے علاقے میں رہنے والوں کی اکثریت بھی یہودی مذہب اختیار کئے ہوئے تھی۔ شاہی خاندان کے دیگر افراد بھی یہودی تھے۔

نجران میں تقریباً سب عیسائی تھے۔

پورا جزیرہ نما ایک عجیب بدنظمی کی حالت میں تھا۔ یہ کیفیت ۶۲۸ء تک رہی جبکہ یہ حصہ اسلامی

Marfat.com

مملکت کا ایک جزو بن گیا۔ حبشی حملے سے قبل یمن نے اپنی تہذیب و ثقافت میں جو عروج حاصل کیا تھا وہ تاریخ کا بس ایک حصہ بن کر رہ گیا۔

ہم نے جنوبی عرب کی تاریخ پوری تفصیل سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ اب آیئے آپ کو شمالی حصے کی تاریخ سنائیں۔

ادھر بنی غسان مشرقی شام پر حکومت کر رہے تھے۔ ان کے قبضے میں دمشق کے مغرب سے لے کر بحیرہ احمر کے سرے ایلہ تک پورا علاقہ تھا۔ ایلہ اب بندرگاہ عقبہ کے نام سے مشہور ہے۔ بازنطینی حکومتوں کی سرپرستی انہیں حاصل تھی۔ اپنے اندرونی معاملات میں یہ بالکل آزاد اور خود مختار تھے۔ امور خارجہ کی بھی نگرانی خود ہی کر لیا کرتے تھے۔

کی راجدھانی حیرا تھا۔ حیرا کی جگہ آج کل کوفہ آباد ہے۔ یہاں لخمد خاندان کی حکومت تھی۔ ان کو ایرانی دربار کی سرپرستی حاصل تھی۔ شہنشاہ ایران کی بالادستی تھی۔ رومیوں یا دیگر اقوام سے لڑائی اور جنگ ہونے کی صورت میں ایران ان کی عملی مدد کیا کرتا تھا۔

دریائے فرات کی ایک قدرتی سرحد کا کام دیتا تھا۔ اس دریا کے مشرقی جانب عراق کی وادی تھی جہاں ایرانی نسل کے لوگ کاشت کاری میں لگے ہوئے تھے۔ عرب پہلے تو دریا کے مغربی حصے کے ریگستان میں گھومتے پھرتے تھے پھر عنبر کے شمال میں پہنچے اور کسی نہ کسی طرح اس دریا کو پار کر کے جنوبی جزیرہ میں جا پہنچ گئے۔

بازنطینی حکومت کا سرکاری مذہب روایاتی اور قدیم عیسائیت تھا۔ پانچویں صدی عیسوی میں توحید کا ایک نیا عنصر عیسائیت میں داخل کیا گیا جس کو مصریوں نے اور مشرقی شام کے عربوں نے اپنایا۔
۵۸۱ء میں بنی غسان کا ایک شہزادہ حراست میں لیا گیا اور اسے استنبول پہنچایا گیا۔ اس کی حراست کا سبب اسی نئی بدعت کا اختیار کرنا تھا۔ مشرقی شام کے لوگوں نے اس کی حراست پر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا اور بغاوت بھی کی۔ ان کی بغاوت کو کچل دیا گیا۔ ۵۸۳ء میں بنی غسّان کے خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اس کے باوجود بھی اس خاندان کے لوگ عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ مختلف

Marfat.com

قبائل کی وفاداری ان کو حاصل رہی لیکن سیاسی حیثیت سے ان کا کوئی مقام نہ رہا۔

ریگستان کے مشرقی حصوں میں لخمد خاندان کے جو بچے کھچے لوگ رہ گئے تھے ان میں سے نعمان پنجم ابوقاموس تھا جس نے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ بیس سال تک اُس نے شان و شوکت سے حکومت کی۔ ۵۸۳ء سے ۶۰۲ء تک اُس نے عرب میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔ اُس کی تعریف میں بہت سے عرب شاعروں نے کئی ایک قصیدے لکھے۔

درباری سازش کی وجہ سے ایران کا بادشاہ خسرو پرویز نعمان ابوقاموس سے ناراض ہو گیا اپنے عتاب کا اعلان کیا۔ نعمان نے راہِ فرار اختیار کی۔ اپنے پیچھے عورتیں اور مال و دولت کا بیش بہا خزانہ چھوڑ گیا۔ آخر میں اپنے آپ کو خسرو پرویز کے حوالے کر دیا۔ خسرو نے اُسے قتل کروا ڈالا۔ لخمد خاندان کا یہ آخری فرمانروا تھا۔ اس خاندان نے حیرا میں ۳۲۰ سال تک حکومت کی۔ ایرانی دربار نے اس کے قتل کے بعد اس علاقے کے لیے اپنا ایک صوبہ دار مقرر کیا۔

خسرو پرویز کے دربار میں حاضر ہونے سے قبل نعمان نے اپنی دولت اور خزانے کو ایک مقامی قبیلے بنی بکر ابن وپل کے حوالے کیا تھا۔ نہ صرف مال و دولت بلکہ اپنے حرم کی عورتوں کو بھی وہیں چھوڑ گیا تھا۔ خسرو پرویز نے بنی بکر کو طلب کیا النعمان کے حرم کی عورتوں اور اُس کے چھوڑے ہوئے خزانے کا اُس سے مطالبہ کیا۔ اُس وقت تو اس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ۶۱۱ء کے موسم گرما میں جبکہ بنی بکر ذوقار میں اپنا پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا خسرو کو یہ موقع ملا کہ اس کے قبیلے پر فوج کشی کی جائے۔

ایرانی فوجوں نے دو طرف سے اس کے قبیلے کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور اپنے ایک نمائندہ کو بنی بکر کے سردار کی خدمت میں روانہ کیا۔ پیغام بھجوایا کہ نعمان کی عورتوں اور خزانے کو ایرانی فوجوں کے حوالے کر دیا جائے۔ چونکہ بنی بکر نے نعمان کی عورتوں کو پناہ دے رکھی تھی اس لیے اس نے اس مطالبہ کو پورا کرنے میں اپنی ذلت سمجھی اور مطالبہ کو رد کر دیا۔ حنظلہ ابن ثعلبہ بنی بکر کا سردار تھا۔ دوسرے دن اس نے اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ ایرانی فوجوں پر حملہ کر کے انہیں مار بھگائے۔ اس نے اپنے قبیلے کی عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اونٹوں پر سوار ہو کر دشمن پر حملہ بولنے والے لوگوں کے پیچھے پیچھے رہیں۔ جیسے ہی یہ لوگ اس مقام

Marfat.com

پر پہنچے جہاں دشمن نظروں کے سامنے تھا حنظلہ نے عورتوں سے کہا کہ وہ اونٹوں پر سے نیچے اتر آئیں اور میدان میں صف بستہ کھڑے ہو جائیں۔ جب ان عورتوں اور بچوں کو کھلے میدان میں دشمن کے آگے کھڑا کر دیا گیا تو بنی بکر کے سردار نے آواز لگائی کہ جس کو اب اپنی عزت و عصمت کی حفاظت کرنی ہے وہ سامنے آئے۔

غیرت دلانے کا یہ ایک ایسا نفسیاتی حربہ تھا کہ عربوں کی رگ حمیت پھڑک اٹھی اور وہ زوردار لڑائی ہوئی کہ ایرانی فوجوں کے دونوں کمانڈر مارے گئے۔ دشمن کی فوج میں انتشار پھیل گیا۔ بنی بکر کو فتح حاصل ہوئی۔ اس فتح نے عربوں میں ایک ایسا اعتماد پیدا کر دیا کہ ان کے دلوں میں ایرانیوں کی عظمت کی جو دھاک بیٹھی ہوئی تھی وہ خاک میں مل گئی۔ عربوں کا یہی حملہ اُن میں خود اعتمادی کا وہ جوہر پیدا کر گیا جو اس واقعے کے ۳۴ سال بعد مسلمانوں کی ایران پر چڑھائی کی صورت میں نمودار ہوا۔

لخمد خاندان کے خاتمے کے ساتھ ہی ایرانی اثر و رسوخ جو عربوں پر تھا آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا۔

یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ شروع ہونے سے ذرا پہلے ہی سے بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں نے اپنے عرب حلیفوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی جس کے نتیجے کے طور پر ان دونوں عظیم الشان سلطنتوں کے جاہ و جلال کے نقوش ان عرب علاقوں سے مٹتے جا رہے تھے۔

جب ذوقار کی جنگ لڑی گئی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف ۴۱ سال کی تھی۔ اسی واقعہ سے ایک سال پہلے یعنی ۶۱۰ء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہو چکی تھی۔ اس جنگ کے دو سال بعد حضور نے اپنی تبلیغ شروع فرمائی۔

مسلمانوں کے لیے ایک اور بات جو فائدہ مند ہوئی وہ یہ تھی کہ ۶۰۲ء میں ایران کے بادشاہ خسرو پرویز نے بازنطینی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ ۶۱۴ء میں شام کو اُس نے اپنے قبضے میں لے لیا ۶۱۶ء میں مصر اور ایشیا کوچک اُس کے زیرنگین آگئے ۲۶ سال تک یہ دونوں بڑی سلطنتیں ایک دوسرے سے اس طرح گتھم گتھا رہیں کہ ان دونوں کی سیاست کا اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر دیوالیہ نکل گیا۔ ایک عجیب افراتفری اور بدنظمی کا دور رہا۔ ۶۳۲ء میں جبکہ مسلمانوں نے وہاں اپنی سلطنت قائم

Marfat.com

کی امن و امان کا دور پھر لوٹ آیا۔

اسلام سے صدیوں قبل جزیرہ نمائے عرب کی جو سیاسی کیفیت رہی اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ وہاں کی سیاست اور حکمتِ عملی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ عرب قوم کا اونچا طبقہ نامور خاندانوں پر مشتمل تھا۔ اُن خاندانوں میں کئی لوگ ایسے گذرے ہیں جن پر عرب قوم بجا طور پر اپنے وقتوں میں ناز کیا کرتی تھی۔ ان خاندانوں کے سردار، شہزادے اور رہنما اپنی قوم کے سیاسی شعور کو ہمیشہ بیدار کرتے رہے۔ ان ہی خاندانوں میں الحریوں، سبائیین، لخمید اور بنی غسان شامل ہیں جزیرہ نمائے عرب کا مرکزی علاقہ قابل افراد سے ہمیشہ محروم رہا۔ عزت اپنے عروج پر رہی۔ کوئی بھی خاندان اپنے آپ کو مکمل طور پر حکمران کی حیثیت سے زیادہ دیر تک برقرار نہ رکھ سکا۔ اس کے برخلاف سرحدی مقامات جیسے یمن، مشرقی شام اور دریائے فرات کا نچلا حصہ تجارت میں کافی آگے تھے۔

اپنے وقت کی عظیم ترین سیاسی طاقتیں جزیرہ نمائے عرب کے اطراف پائی جاتی تھیں۔ ایک طرف ایران کی عظیم الشان سلطنت تھی تو دوسری طرف رومیوں کی پر عظمت اور مضبوط حکومت۔ اس پورے جزیرہ نمائے عرب کی غربت اور افلاس اور مفلوک الحالی نے بڑی طاقتوں کو عرب کے مرکزی علاقے پر قبضہ کرنے سے باز رکھا۔ اس کے باوجود جغرافیائی طور پر اس جزیرے کی اہمیت کا احساس ہر ایک کو تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف بحیرہ ہند واقع تھا تو اس جزیرے کی دوسری طرف بحیرہ روم۔ ان دونوں سمندروں کے ذریعہ بڑی ہی لمبی چوڑی تجارت ہوا کرتی تھی۔ جزیرے نمائے عرب کے ساحل بین الاقوامی تجارت کے لیے استعمال میں لائے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی طاقتوں نے عرب کے مرکزی علاقوں تک جانے کی زحمت گوارا نہ کی بلکہ صرف ساحلی علاقوں پر ہی اکتفا کیا۔ یہی وہ ساحلی علاقے تھے جن پر قبضہ کرنے سے یا جن پر نگرانی رکھنے سے یا ان علاقوں کے سربراہوں سے اپنے تعلقات بہتر رکھنے سے ان کا اپنا مقصد بہر حال پورا ہو جاتا تھا۔ آج بھی عدن اور یمن، پیٹرا اور مشرق اردن، پالمیرا اور خلیج فارس کی وہی اہمیت ہے جو آج سے دو ہزار سال پہلے تھی۔ اس وقت کی مہتم بالشان سلطنتوں میں سے ایک سلطنت روم کی تھی جو بازنطینی سلطنت بھی کہلاتی ہے۔ دوسری ایران کی۔ اس وقت ان کی وہی اہمیت تھی جیسے

آج امریکہ اور روس کی اہمیت ہے۔ حبشہ روم کی سلطنت کا حلیف اور یار وفادار تھا۔

دونوں بڑی طاقتیں یعنی روم اور ایران مختلف عرب قبائل اور ان کے علاقوں کی حفاظت کا ذمہ اپنے سر لیتی تھیں۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ بنی غسان کو رومیوں کی حمایت حاصل تھی تو لخمد کو ایرانیوں کی چھٹی صدی عیسوی کے ختم پر عرب قبائل بڑی طاقتوں کے لیے ایک بوجھ بن گئے۔ عربوں کے آپس کے جھگڑوں سے وہ ایسے تنگ آئے کہ ان کو اسی میں اپنی خیریت نظر آئی کہ وہ ان قبائل اور ان کے علاقوں سے دستبردار ہو جائیں اور ان کے آپس کے جھگڑوں میں حصہ نہ لیں۔ ان علاقوں اور قبائل کی حمایت بڑی طاقتوں کے لیے بہت ہی مہنگی پڑ رہی تھی۔ جب اس سرپرستی اور حمایت کو اٹھا لیا گیا تو یہ بات نہ صرف عرب قبائل کے لیے نقصان دہ ہوئی بلکہ ان کے سرپرستوں یعنی روم اور ایران کے لیے بھی۔ کئی صدیوں سے چلی آنے والی عرب کی بادشاہتیں ثقافتی اور سیاسی محوروں پر اپنا ایک مخصوص اثر چھوڑتی چلی آ رہی تھیں۔

سبائیں اور الحمری یہ دونوں قبائل کافی دولت مند اور شائستہ تھے۔ ذرائع آبپاشی اور فن تعمیر میں دنیا میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کی کپڑے کی صنعت اور زرکاری ساری دنیا میں مشہور تھی۔ حبشی اور ایرانی حملوں نے یمن کی صنعت اور معیشت کو ایسا تباہ کیا کہ پھر وہ ان میں آج تک لوٹ کر نہ آئی۔

جزیرہ نمائے عرب کے شمالی حصے جہاں نباتیں اور پالمیرس کی حکومت تھی رومی سلطنت کے حصے بنے ہوئے تھے۔ بنی غسان کے سربرآوردہ اکثر و بیشتر استنبول، شام اور ایشیائے کوچک آیا جایا کرتے کرتے تھے۔ شام تقریباً ایک ہزار سال تک روم کا ایک انتہائی دولت مند صوبہ اور ثقافت کا مرکز بنا رہا۔

اس کے برخلاف حیرا جو   میں واقع تھا اس وقت کی ایرانی سلطنت کے دارالخلافے سے صرف ستر میل دور تھا۔ ایران بھی اپنی ثقافت اور تہذیب میں اونچا مقام رکھتا تھا۔ لخمد نے جو ایران کے زیر اثر تھے ایرانی تہذیب کو کافی حد تک اپنا لیا تھا خود ان لوگوں کے اخلاق و عادات اتنے اعلیٰ تھے کہ شہنشاہ ایران نے اپنے ولی عہد کو تعلیم و تربیت اور اخلاق سیکھنے کے لیے حیرا روانہ کیا تھا۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا کہ اسلام سے قبل سارے عرب وحشیانہ صفات کے حامل تھے ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ جہاں تک عربوں کی سیاست، حکمت عملی، جنگ، بادشاہت، اندرونی

Marfat.com

اور بیرونی تعلقات کا تعلق ہے اوپر کے صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے۔ اب ذرا اور تفصیل سے دیکھنے اور ان کی زندگی کے مختلف رخوں پر جو نقاب پڑا ہوا ہے اُسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

عرب کی سماجی زندگی کی بنیاد خاندان اور قبیلے پر تھی۔ ہر فرد چاہے مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا بڑا، جوان ہو یا بوڑھا اپنے قبیلے کا وفادار ہوا کرتا تھا۔

اسلام سے قبل مرکزی عرب کے لوگوں کی وفاداری اپنے خاندان اور قبیلے کے ساتھ ویسے ہی وابستہ ہوتی تھی جیسے آج انگلستان، امریکہ، فرانس یا جرمنی کے لوگوں کی وفاداریاں اپنے ملک سے یا اپنی پارلیمنٹ سے یا اپنے منتخب کیے ہوئے نمائندوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ ایک امریکی کے لیے یہ بات ذلت اور شرم کا باعث ہوتی ہے کہ وہ روس کے لیے جاسوسی کرے۔ چونکہ سارے امریکی اپنے آپ کو ایک خاندان یا ایک معاشرے کا رکن تسلیم کرتے ہیں اس لئے وہ اپنے معاشرے سے بغاوت کرکے دوسروں کے معاشرے سے ناجائز یا نقصان دہ ربط قائم رکھنا اپنی سوسائٹی کے لیے تباہ کن تصوّر کرتے ہیں۔

یہی نفسیاتی کیفیت اُس وقت کے عربوں کی بھی تھی لیکن اس کے اطلاق کے پیمانے مختلف تھے۔

ہر خاندان یا قبیلے کا رکن اپنے خاندان اور قبیلے اور اس کے اپنے سردار کا مطیع فرماں بردار اور وفادار رہتا تھا۔ مختلف قبائل کے سرداروں کے درمیان رقابت کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ ان رقابتوں کی تہہ میں جو بات پوشیدہ رہتی تھی وہ یہ کہ اقتدار، دولت اور وفاداری میں کس طرح اضافہ کیا جائے۔ جیسے جیسے اُن کے اقتدار، دولت اور لوگوں کی ان سے وفاداریوں میں اضافہ ہوتا تھا ویسے ویسے اس قبیلے اور اُس کے سردار کی گرفت لوگوں پر مضبوط ہوتی جاتی تھی۔ قبیلے کی عظمت کا دارومدار ان ہی باتوں پر تھا۔ مختلف قبیلوں کے سردار ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ تبادلہ خیال کرتے تھے۔ آپس میں تحفوں کا لین دین ہوا کرتا تھا۔ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے مراتب کے پیش نظر آپس میں ضیافت اور خاطرداری کی جاتی تھی۔ مغربی مصنفین کے پاس بادشاہ کی حیثیت سلطنت کے ایک سربراہ کی ہوتی ہے۔ بادشاہ کو عوام کی وفاداری حاصل رہتی ہے عوام کی نظروں میں بادشاہ

Marfat.com

قابل احترام رہا کرتا ہے۔ اس کے برخلاف بدویوں کے ہاں قبیلے کی فرماں روائی رہا کرتی تھی اس کے سرداروں میں تبدیلی ہوا کرتی تھی۔ ملک یا ملاقے کی ترجمانی قبیلہ کرتا تھا۔ سردار قبیلے کی ترجمانی کرتا تھا اس بات کو جو ابھی بیان کی گئی ہے بہت ہی توجہ کے ساتھ پڑھا جائے۔ اس لیے کہ جب ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر نظر ڈالیں گے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ جب حضور نے پیغمبری کا اعلان فرمایا تو بدویوں کے لیے کسی مذہبی رہنما یا پیغمبر کا وجود میں آجانا اتنی پیچیدہ بات نہیں تھی جتنی یہ بات کہ انہوں نے ذات اقدس کو ایک سیاسی اور فوجی روپ میں دیکھا اور یہ سمجھ بیٹھے کہ حضور بھی اسی قسم کی بادشاہت کے خواہاں ہیں جیسے ماضی میں بنی غسان یا لخمد خاندان کے سربراہ جب مختلف قبائل کے سردار حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے تو حضور کی ضیافت کرتے یا حضور ان کی مہمان نوازی کرتے۔ تحفے تحائف دیتے بھی اور لیتے بھی۔ بحث و مباحثے میں بھی حضور حصہ لیا کرتے تھے اور اپنی تحریک کو ان سرداروں کے آگے رکھتے تھے۔

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ عرب کے سربراہوں کے درمیان جو کشمکش جاری رہتی اس میں اور قبائل کے درمیان جو رقابتوں کا سلسلہ چلتا رہتا دونوں میں کافی فرق ہے۔ جب سردار آپس میں لڑتے تو ان کا منشا مزید مال و دولت کا حصول ہوا کرتا تھا۔ ان کی سرداری قبول کرنے والوں میں اضافہ کرنا ہوتا تھا۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے سردار ہر جائز و ناجائز طریقہ کار اختیار کرتے تھے قبائل کی جنگوں کے مقاصد بالکل جداگانہ ہوا کرتے تھے۔ ان کا مقصد نہ حصول دولت ہوتا تھا اور نہ ہی حصول اقتدار وہ خود بھی زندہ رہنا چاہتے تھے اور دوسرے قبائل کو بھی زندہ دیکھنے کے آرزومند تھے۔ بعض اوقات قبائل اور ان کے سرداروں کی جنگیں ساتھ ساتھ چلتی رہتی تھیں۔ سردار کی لڑائی کا منشا کچھ اور ہوتا تھا۔ قبیلے کی لڑائی میں شرکت کا مقصد کچھ اور۔ سردار اپنے مقصد کے حصول کے لیے قبیلے کو استعمال کرتا تھا اور قبیلہ سردار کو۔

قبائلی جنگوں میں کسی قسم کی کوئی تنظیم نہیں ہوا کرتی تھی۔ ان جنگوں میں جس کے ہاتھ جو چیز آجاتی تھی وہ اس کی ہو جاتی تھی۔ جو بھی لوٹ مار ہوا کرتی تھی مال غنیمت کو سردار آپس میں تقسیم کر لیا کرتے تھے۔

Marfat.com

یادگار تاریخیں

یمن میں منائیں کی حکومت ۱۵۰۰ سے ۰۰، قبل مسیح تک

مشرق وسطیٰ پر ایرانیوں کا قبضہ ۵۳۸ قبل مسیح

یمن میں سبائین کی حکومت ۰۰، قبل مسیح سے ۵، قبل مسیح تک

سکندر اعظم کا مشرق وسطیٰ پر قبضہ ۳۲۰ قبل مسیح

نباتیں کی بادشاہت کا خاتمہ ۳۱۵ قبل مسیح سے ۱۰۶ عیسوی تک

یمن میں الحمریوں کی حکومت ۵، ء سے ۵۲۵ء تک

یمن میں مارب تالاب کے بند کا ٹوٹنا

اور اس کی وجہ سے عام تباہی اور لوگوں کی ہجرت ۱۲۰ء

اسد ابوقارب بادشاہ یمن کا یمن میں یہودیت پھیلانا ۲۰۰ء سے ۲۳۶ء

پالمیرا کا دورِ زریں ۱۵۰ء سے ۲۷۲ء

ایران کی بالادستی میں لخمد خاندان کی حکومت ۲۶۸ء سے ۶۰۵ء

رومنوں کی سرپرستی میں مشرقی شام میں بنی غسان کی حکومت ۲۹۲ء سے ۵۸۳ء

رومن شہنشاہیت کے مغربی آدھے حصے کا زوال ۵،لہء

یمن کے بادشاہ ذوالنواس کے ہاتھوں نجران کے عیسائیوں کا قتل عام ۵۲۲ء

یمن پر حبشیوں کا قبضہ ۵۲۵ء

حبشی والسرائے ابرہہ کا یمن پر اقتدار ۵۲۵ء سے ۵۷۰ء

سیف ذی یزن کا ایرانیوں کو حبشہ کے خلاف مدد کی دعوت دینا ۵۷۴ء

یمن میں خانہ جنگی ۵۷۴ء سے ۵۹۶ء

بنی غسان کی حکومت کا خاتمہ ۵۸۳ء

لخمی خاندان کے آخری فرماں روا النعمان پنجم کا خاتمہ ۶۰۵ء

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی ۶۱۰ء

ذوقار کا واقعہ ۶۱۱ء

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کی ابتدا ۶۱۲ء

بازنطینی اور ایرانی حکومتوں کی آپس میں جنگیں۔ ۶۰۲ء سے ۶۲۸ء

Marfat.com

مکہ اور قریش

مکہ بحر احمر کے قریب عرب کے ساحلوں سے کچھ ہی دور واقع ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں دو اسباب کی بناء پر یہ شہر اہمیت اختیار کر گیا تھا ایک سبب تو یہ تھا کہ مکہ بت پرستی کا مرکز تھا۔ عرب کے بدوی قبیلے یہاں زیارت کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس مذہبی تقدس کے علاوہ اس کی اہمیت کا دوسرا سبب اس کا ایک تجارتی مرکز ہونا تھا۔ بحر احمر کے مشرقی ساحلوں سے تجارتی سامان اونٹوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا تھا۔ اس تجارت میں چین، ہندوستان اور دوسرے مشرقی ممالک کے سامان شامل تھے۔ صدیوں سے اس اہم تجارت پر پہلے منائین قابض رہے اس کے بعد سبائین اور پھر تبائین اور ان کے بعد ان کی جگہ الحمریون نے لی ۵۲۵ء میں حبشیوں نے ان کے علاقوں کو فتح کر لیا اور آخر میں ۵۷۵ء میں ایرانیوں نے یمن پر حملہ کیا جس کے نتیجے کے طور پر یمن میں وہ تباہی مچی کہ یمن کے ہاتھوں میں برس ہا برس سے تجارت کی جو لگام تھی وہ ان کے ہاتھوں سے نکل گئی۔

چھٹی صدی عیسوی میں مکہ کے رہنے والوں نے یمن کی تباہی سے فائدہ اٹھایا۔ تجارت میں پیش پیش ہونے لگے۔ مکہ جغرافیائی طور پر عدن اور شام کے تقریباً بیچوں بیچ واقع ہے۔ یہاں اکثر و بیشتر تجارتی کاروانوں کا پڑاؤ ہوا کرتا تھا۔ اس جغرافیائی اہمیت کے باوجود مکہ کے رہنے والوں نے چھٹی صدی عیسوی سے قبل خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا اور ان میں سرمایہ داری نے جگہ نہیں لی۔

Marfat.com

مکہ کا چھوٹا سا شہر محل وقوع کے لحاظ سے اپنے میں چند خوبیاں بھی رکھتا تھا۔ پانی کی کمیابی کی وجہ سے باغات اور زراعت کا فقدان تھا۔ چاروں طرف پہاڑوں کے ڈھلاؤ پائے جاتے تھے۔ زراعت اور باغات کے لیے زمین بالکل موزوں نہیں تھی۔ جن لوگوں کے قبضے میں پانی کے چشمے تھے وہ معاشی اور سماجی اہمیت اس لیے اختیار کر گئے تھے کہ جو لوگ بت پرستی کے لیے مکہ آتے وہ ان چشموں کے مالکوں کے ہاں پانی کے لیے ضرور جاتے۔

قدیم روایات کے مطابق یہ پوری جگہ عرب کے ایک قدیم قبیلے جرہم کی ملکیت تھی۔ اس کا ذکر توریت میں بھی ہے۔ زمانے کی گردش کے باعث قبیلہ جرہم پر ایک اور قبیلے خزاعہ کی بالادستی ہو گی۔ قریش نامی قبیلہ جن کا اصلی تعلق مکہ کے جنوبی حصے سے تھا ایک بڑے قبیلے بنی کنانہ کی شاخ تھی۔ ۲۳۵ء کے لگ بھگ قریش خاندان کے ایک فرد نے جس کا نام قصیٰ تھا خزاعہ خاندان کی لڑکی سے شادی کی۔ قصیٰ اس وقت اپنے خاندان کا سردار تھا۔ قصی ایک ہونہار نوجوان تھا۔ اپنے خسر کا اس کو اتنا اعتماد حاصل تھا کہ وہ مختلف اوقات میں اور مختلف کاموں میں اپنے خسر کی نمائندگی کیا کرتا تھا۔ اس نمائندگی میں بت پرستی کرنے والوں کی رہنمائی اور ان کی سرپرستی بھی شامل تھی۔ جب خزاعہ کا انتقال ہوا تو اس کے داماد قصی نے بت خانے کی نگرانی کو اپنے ذمے لے لینے کی کوشش کی۔ خزاعہ کے خاندان نے اپنے اس موروثی حق کو دوسرے خاندان میں جاتے دیکھ کر قصی کی مخالفت کی۔ تلواریں نیام سے نکل آئیں۔

قصی جو بہت ہی ہوشیار اور عقلمند نوجوان تھا بڑی ہی عقلمندی اور دانشمندی سے اپنے خاندان والوں کو جمع کیا اور خزاعہ قبیلے سے مقابلہ کر کے اُن کو مار بھگایا۔ مکہ کا بت خانہ اب اس کا اپنا ہو گیا۔ اس لڑائی کے نتیجے کے طور پر مکہ کی وادی پر قریش کا قبضہ ہو گیا۔ خزاعہ خاندان قبیلہ قریش کی سرداری تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ لوگ مکہ کے جنوب مغربی حصے میں جا کر رہنے لگے۔

قبیلہ قصی کے لوگ مکہ کی وادی میں خیموں میں رہا کرتے تھے۔ ان کا مذہبی مرکز چار دیواروں پر مشتمل تھا۔ ان دیواروں کے اوپر نہ چھت تھی اور نہ ہی اس کے اوپر کوئی سائبان۔ مکے میں یوں بھی بارش بہت ہی کم ہوتی ہے۔ لیکن جب ہوا تیز چلتی تو ریت کے ذرے اور گرد و غبار کی بت خانے میں وہ بھرمار ہو جاتی تھی

Marfat.com

کر ان کے لیے اس کی صفائی ایک درد سر بن جاتی خیموں میں رہنے کے باوجود انہوں نے اپنے خیموں ہی کے اطراف ایک چھوٹی سی دیوار کا حصار بنالیا تاکہ گرد و غبار اور ریت کے ذروں کی زد سے محفوظ رہیں۔

قصی میں بہت ساری ذاتی خصوصیات بھی تھیں۔ اس نے اپنے قبیلے قریش کو اس بات پر رضا مند کیا کہ وہ اپنے بت خانے یعنی کعبہ کے ارد گرد گھر بنائیں۔

ان سارے لوگوں نے جو بنی قریش میں اہمیت کے مالک تھے کعبہ کے اطراف اپنے اپنے گھر بنائے ان اہم آدمیوں کی تعداد ۲۶ بتائی جاتی ہے۔ ان ۲۶ افراد کے بنائے ہوئے گھر صدیوں تک انکی آل و اولاد کے قبضے اور تصرف میں رہے۔ جو لوگ قصی کے قریب ترین رشتہ دار تھے انہوں نے کعبے کے اطراف اپنے اپنے گھر بنائے۔ باقی لوگ حسب عادت خیموں میں رہا کرتے تھے۔ بدوی گھرانے ریگستانوں میں اپنے پڑاؤ ڈالے ہوئے رہتے تھے۔

چند اچھے خاندانوں نے مکہ میں رہائش اختیار کر لی تھی اس کی وجہ سے یہ شہر اب دوسرے لوگوں کو بھی اپنی طرف راغب کرنے لگا۔ چھٹی صدی عیسوی میں ان جمے ہوئے خاندانوں نے تجارت میں دل کھول کر حصہ لینا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ ان میں امارت آتی گئی۔ دولت نے اپنے کھیل کھیلنے شروع کیے۔ غلاموں کی خرید و فروخت ہونے لگی۔ نوکر شاہی کا دور دورہ شروع ہوا۔ کاروانوں کی حفاظت کے لیے چوکیدار مقرر کیے جانے لگے۔ تیر و کمان اور ہتھیار بنانے والوں کو ملازم رکھا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ ان خاندانوں کی امارت اور ثروت نے مقامی لوگوں کو اور ریگستان علاقوں کے قبیلوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا۔ مختلف قبائل کے لوگ مکہ میں آکر رہنے لگے مقامی لوگوں سے شادی بیاہ کا آغاز ہوا۔ باہر سے آنے والوں نے اب مکہ کی زندگی کو اپنانا شروع کیا۔ اب مکہ صرف ایک ہی خاندان کی ملکیت نہ رہا بلکہ اس کے معاشی معاشرتی اور تمدنی ڈھانچے میں دوسرے لوگوں نے بھی اپنے آپ کو سمونا شروع کیا۔

قصی نے کعبہ کی زیارت کے فن کو نکھارا۔ اس کی تنظیم نئے سرے سے کی۔ کعبہ کی مختلف مذہبی رسومات کی ادائیگی کی ذمہ داری اپنے خاندان کے افراد کے سپرد کی۔ کعبہ کی تولیت اس نے اپنے سب سے بڑے لڑکے اور اس کی آل و اولاد کے حوالے کی۔ جس شخص کو کعبہ کی تولیت عطا کی گئی تھی اس کا نام عبد الدار

Marfat.com

تھا۔

قدیم زمانے سے کعبہ بت خانہ بنا ہوا تھا۔ ہر سال تین دن کے لیے یہ بت پرستوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔ سرزمین عرب کے ہر حصے سے لوگ مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لیے مکہ آنا عبادت سمجھتے تھے۔ کعبہ کی زیارت کے لیے امیر و غریب سب ہی آیا کرتے تھے۔ اُن کی خاطر مدارات اور ان کی بھوک پیاس رفع کرنے کے لیے قصی نے لوگوں سے ایک ٹیکس وصول کرنا شروع کیا جس کا نام رفادہ تھا۔

اگرچہ کعبہ کی زیارت اور عبادت تین دن پر مشتمل ہوا کرتی تھی لیکن عربوں کا دستور تھا کہ اُس سے ایک ہفتہ قبل مکہ کے اطراف تجارتی میلے لگائیں اور اس میں خرید و فروخت کریں۔ رفتہ رفتہ قریش کے لوگ جانوروں کی دیکھ بھال، نگہداشت اور خرید و فروخت سے جو ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھا تجارت کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرنے لگے۔ مکے کے قرب و جوار کے میلے ان کے لیے یہ مواقع فراہم کرنے لگے کہ وہ تجارت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

اس ہوشیار آدمی یعنی قصی نے یہ جدت بھی کی کہ قمری سال کو اپنایا۔ قمری سال عرب کے بدوی قبیلوں کے لیے آسان ترین ان معنوں میں تھا کہ چاند کے دکھائی دینے پر ان کے مہینے شروع ہوتے تھے اور عرب ایک ایسا مقام ہے جہاں کی شامیں اکثر و بیشتر ایسی ہوتی ہیں جہاں چاند ہر ایک کو آسانی سے دکھائی دیتا ہے چونکہ عرب لوگوں کی اکثریت پڑھی لکھی نہیں ہوتی ہے اس لیے چاند پر مشتمل سال، مہینے اور دن ان کو آسان معلوم ہونے لگے۔ قمری سال شمسی سال سے ۱۱ دن چھوٹا ہوتا ہے۔

قمری سال کے بارہویں مہینے میں حج ہوا کرتا ہے اور اس لحاظ سے شمسی سالوں کے پیش نظر ہر ۳۳ سال کے بعد حج پورا ایک سال پیچھے ہو جاتا ہے۔ اس شمسی اور قمری سالوں کے تفاوت کو اور اس کے اثرات کو پیش نظر رکھ کر قصی نے اس بات کی کوشش کی کہ حج کا زمانہ موسم بہار میں رکھا جائے تاکہ ہر تیسرے سال شمسی اور قمری مہینوں کا اتصال ہو جائے۔ گو یہ طریقہ اطمینان بخش نہیں تھا لیکن اس دور میں جبکہ لوگ بدوی زندگی کے عادی تھے اس کی جدت کی داد دینی پڑتی ہے۔

قصی نے دوسری جدت جو اختیار کی وہ یہ تھی کہ جب کوئی قبیلہ یا جماعت جنگ کے لیے جائے اس کے

Marfat.com

سردار کو وہ اپنے ہاتھوں سے ایک علم یا جھنڈا عطا کرے اور علم کا کپڑا سفید ہو یہ عطا یہ ایک نیک شگون سمجھا جاتا تھا۔ مسلم ممالک میں آج تک بھی یہ روایت عملاً دیکھنے میں آتی ہے۔

بدوی قبائل میں یہ دستور تھا کہ قبیلہ کا سردار کبھی کوئی فیصلہ اپنی مرضی سے صادر نہیں کرتا تھا بلکہ جو بات بھی اہم ہوتی وہ قبیلے کے افراد کے سامنے لائی جاتی تھی۔ سردار قبیلہ کے خیمے میں سارے لوگ جمع ہوتے تھے۔ بحث و مباحثہ ہوتے تھے اور سب کی مرضی سے کسی بھی بات کو قطعیت دی جاتی تھی۔ قصی نے اسی پرانی روایت کے پیش نظر کعبہ کے بالکل سامنے ایک عمارت تعمیر کروائی جسے دار الندوہ کہا جاتا تھا۔ اس مقام پر ہر سال حج کو آنے والے جمع ہوتے اور آپس میں صلح مشورہ کرتے تھے۔

دار الندوہ جیسے شوکت لفظی رکھنے والے نام سے اس غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہیے کہ وہ کوئی عظیم الشان عمارت تھی۔ دار الندوہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جو پتھر، ریت اور کیچڑ و مٹی سے بنایا گیا تھا۔ اس کی چھت لکڑیوں کی تھی۔

قصی کا انتقال ۴۸۰ اور ۴۰۰ عیسوی کے لگ بھگ ہوا۔ اس نے اپنا جانشین اپنے بڑے لڑکے کو بنایا جس کا نام عبدالدار تھا۔ عبدالدار کی دوسری نسل میں یہ صلاحیت نہ رہی کہ وہ کعبہ کی تولیت کو سنبھال سکیں۔ ان کی تنظیمی قابلیت کے فقدان نے عبد المناف کی اولاد کو قیادت کیلئے ابھارا اور انہوں نے عبدالدار کے جانشینوں کو چیلنج کیا۔ دونوں خاندانوں میں مصالحت ہوئی۔ عبدالدار کے جانشینوں نے کعبہ کی تولیت اور دار الندوہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا اور اس کے ساتھ ساتھ جنگ پر جانے والوں کو علم دینے کا مجاز بھی اپنے آپ کو قرار دیا۔ عبد المناف کے جانشینوں نے رفادہ وصول کرنے کا ذمہ لیا اور کعبہ کی زیارت کرنے والوں کو غذا اور پانی فراہم کرنے کی بھی ذمہ داری لی۔ خاندان کے مختلف افراد میں مختلف فرائض تقسیم کیے گئے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہبل نامی بت کے سامنے جو تیر پھینکے جاتے تھے اُن کو جمع کیا جائے اور ان کے گرنے کے انداز سے نیک شگونی یا بدشگونی کو ظاہر کیا جائے اور تیر مارنے والے کو اس کے فال کی تعبیر دی جائے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ مکہ کے لوگوں کی امارت یمن کی تباہی کا نتیجہ رہی۔ اس دور میں عبدالمناف اور بنی مخزوم کے لوگ اچھے خاصے امیر ہو گئے دوسرے قبیلے دولت کی دوڑ میں ان سے پیچھے رہے۔ مکہ کے لوگوں میں تجارتی ذہنیت جگہ پانے لگی۔ مکہ کے اکثر و بیشتر لوگوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جس طریقے سے بھی ہو اپنی

Marfat.com

بچت کو کسی نہ کسی طریقے سے کسی نہ کسی تجارت میں لگا دیں۔ کچھ لوگ اپنی بچت کو یکجا کر کے کسی تجارتی کاروان کو ملک سے باہر روانہ کرتے اور اس سے جو بھی منافع ہوتا آپس میں تقسیم کر لیتے۔

عرب کے سربرآوردہ صرف اونٹوں کے کاروانوں پر ہی گزر بسر نہیں کرتے تھے بلکہ ان میں سے بہت سے حقیقی معنوں میں کافی مالدار تھے۔ ان میں سے بعض عدن جایا کرتے تھے جہاں سے وہ ہندوستان سے آنے والے جہازوں کے سامان کو خود خریدتے اور وہاں سے مکہ لے آتے تھے۔ مکہ سے پھر یہ سامان شام، غزہ اور مصر کے لیے روانہ کیا جاتا تھا۔ جو لوگ ہندوستان کا سامان لے کر مصر، شام اور غزہ وغیرہ جاتے اس سامان کو فروخت کر دیتے اور وہاں سے مقامی سامان لے کر مکہ آتے اور یہ سامان مکہ سے پھر ہندوستان وغیرہ فروخت کے لیے روانہ کر دیتے تھے۔ مکہ کے مقامی میلوں میں بھی مصر، شام اور ہندوستان کا سامان خوب بکتا تھا۔ اس سامان کو مقامی قبیلوں کے لوگ خریدا کرتے تھے۔

جو لوگ ہندوستان اور چین کا سامان خرید کر بازنطینی اور ایران کی سلطنتوں میں بیچا کرتے تھے یقیناً ان میں وہ ساری خصوصیات رہی ہوں گی جو بڑے تجار میں ہوا کرتی ہیں۔ ان کی تنظیمی قابلیت، ان کا علم ان کی دور اندیشی اور ان کا تدبر اور دنیا کے اہم ممالک سے تجارتی روابط رکھنے کی صلاحیت اور تجارتی نکتوں کو سمجھ کر ان کو کام میں لانے کی سعی ان کو دن بہ دن ترقی کی طرف لیتی گئی۔

عبدالمناف کا بڑا لڑکا عبدالشمس تجارت میں بڑا ہی کامیاب رہا۔ اس کی جد و جہد اور تجارتی کوششوں میں اس کی قسمت اس کا بڑا ساتھ دیتی رہی۔ اپنی تجارت میں وہ اتنا منہمک رہنے لگا کہ اس کی مکہ سے لمبے عرصے کے لیے غیر حاضری اس کے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں مانع ہونے لگی۔ تجارت کے سلسلے میں اس کو لمبے لمبے سفر کرنے پڑتے تھے۔ اس کی وجہ سے مقامی اور خاندانی ذمہ داریاں عبدالمناف کے دوسرے لڑکے ہاشم نے سنبھال لیں۔ ہاشم حج پر آنے والوں کی جو خاطر داری کرتا تھا اس کے پیش نظر اس کی مقبولیت دن بہ دن عربوں میں پھیلتی گئی۔ اس کی نیک نامی میں اضافہ ہوتا گیا اور اس نیک نامی نے اس کی دولت میں کافی اضافہ کیا۔

اپنے ایک تجارتی سفر کے دوران مکہ کے جنوب میں تقریباً ۱۵۰ میل دور یثرب کے مقام پر ہاشم نے یثرب کے ایک ممتاز قبیلے بنی النجار کی ایک لڑکی سے شادی کی۔ ہاشم کی بیوی کا نام سلمیٰ تھا جو اپنے وقت کی

ایک ممتاز خاتون تھیں۔ سلمیٰ کے بطن سے ۴۹۷ء میں عبدالمطلب پیدا ہوئے۔

عبدالمناف کے اسی لڑکے ہاشم نے سالانہ دو منظم کاروانوں کی مکہ سے روانگی کی ابتدا کی۔ ایک یمن کی طرف روانہ کیا جاتا تھا جو ہندوستان سے آنے والے سامان کو خرید کر مکہ لے آتا۔ دوسرا کاروان مکہ سے شام کی طرف روانہ کیا جاتا تھا۔ ہاشم کا انتقال غزہ میں ہوا جبکہ وہ ایک تجارتی کارواں کے ہمراہ وہاں گئے ہوئے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائی المطلب نے حاجیوں کو پانی پلانے اور ان کی حاجت روائی کی ذمہ داری اپنے سر لی۔

ہاشم کے انتقال کے بعد ہاشم کی بیوہ سلمیٰ اپنے چھوٹے لڑکے کو لے کر اپنے میکے یثرب چلی گئیں۔ جب سلمیٰ کا لڑکا سن شعور کو پہنچا تو لڑکے کے چچا المطلب اسے یثرب سے مکہ لے آئے۔ جب مکہ کے لوگوں نے دیکھا کہ المطلب کے اونٹ پر ایک نوجوان لڑکا بیٹھا ہوا ہے تو انہوں نے خیال کیا کہ شاید المطلب کوئی نیا غلام خرید کر لایا ہے اور اس لڑکے کو انہوں نے عبدالمطلب پکارنا شروع کر دیا یعنی مطلب کا غلام۔ اس نوجوان کا نام شیبہ تھا لیکن وہ مشہور عبدالمطلب کے نام سے ہوئے۔ المطلب کا انتقال یمن میں ہوا۔ یثرب، غزہ، یمن میں قریش کے سربرآوردہ لوگوں کے انتقال ہونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح وہ لوگ تجارت میں منہمک رہا کرتے تھے اور اکثر و بیشتر تجارت کے سلسلے میں اپنے مستقر سے دور رہتے تھے۔ عبدالمناف کے تمام بیٹوں میں صرف عبدالشمس ہی ایسے رہے جن کا انتقال مکہ میں ہوا۔ عبدالمناف کے سب سے چھوٹے بیٹے نوفل کا انتقال سلمان میں ہوا جو اپنے کاروان کو EUPHRATES کے علاقے حیرہ لے گئے تھے۔ عبدالمطلب اپنے چچا المطلب کے جانشین ہوئے۔ حاجیوں کو پانی پلانے اور ان کے خورد و نوش کے انتظام کی ذمہ داری سنبھالی۔ اسلامی مورخین کا کہنا ہے کہ عبدالمطلب ہی نے خانہ کعبہ کے حدود میں ایک کنواں کھدوایا تھا جس کو زم زم کہا جاتا ہے۔ اس کنویں کی وجہ سے حج پر جانے والے لوگوں کو پانی کی سہولت ہو گئی۔ اگرچہ کہ مکہ کی وادی میں اور بھی کنویں ہیں لیکن زم زم اپنی نوعیت میں اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ وہ حدود کعبہ میں واقع ہے۔

عبدالمطلب نے تاریخ میں ایک ممتاز مقام اس لیے بھی حاصل کیا کہ ان ہی کی زندگی میں اور ان ہی کی سرداری کے دوران ۵۷۰ء میں حبشی گورنر ابرہہ نے فوج کشی کی تھی۔ یہ سال عام الفیل کہلاتا ہے۔ مکہ

Marfat.com

کے لوگوں نے اس حملہ کی کوئی مزاحمت نہیں کی اور مکہ چھوڑ کر اپنے مال و اسباب کے ساتھ اطراف کے علاقوں میں پناہ گزیں ہوئے۔ روایات کے مطابق عبد المطلب نے اپنے خدا سے دعا کی کہ وہ کعبہ کی حفاظت فرمائے۔ ان کی دعا مقبول ہوئی۔ پرندوں نے اپنی چونچوں میں کنکر اٹھائے ہوئے ابرہہ کی فوجوں پر اس طرح یلغار کی اور سنگریزے برسائے کہ ابرہہ کا لشکرِ جرار تباہ و برباد ہو گیا۔ چونکہ عبد المطلب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا ہوتے ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ مسلم مورخین نے عبد المطلب کو موحد کا لقب دے کر دعا اور لشکر کی تباہی کو ان سے موسوم کر دیا ہو تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کی عظمت اس طرح سے بھی ظاہر کی جائے یہ بات قابل ذکر ہے کہ عرب کے بت پرستوں کے ہاں بھی ایک عظیم اور واحد خدا کا تصور تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے مقامی چھوٹے چھوٹے خداؤں کی بھی پرستش کیا کرتے تھے۔ اپنا اپنا بت اپنے ساتھ لیے پھرتے تھے کہ جب چاہیں اپنے بت کی پرستش کر کے اپنی عبادتی تشنگی کو سیراب کر سکیں۔ اس کے علاوہ اس وقت عیسائیت اور یہودیت کے ماننے والے بھی عرب کے ہر حصے میں مل جاتے تھے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے ایک قریبی رشتہ دار ورقہ ابن نوفل توحید پرست تھے۔ ان کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے انجیل یا توریت کے کچھ حصوں کا عربی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ ورقہ کی حقیقی بہن کے متعلق بھی یہ کہا جاتا ہے کہ وہ توریت کا ہر وقت مطالعہ کرتی رہتی تھیں عبد المطلب ۴۹۷ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ خدا نے ان کو دس بیٹے عطا فرمائے۔ عبد المطلب نے اپنی جوانی میں کعبے کے خداؤں سے منت مانگی تھی کہ اگر اُن کو دس بیٹے ہوں تو ان میں سے وہ ایک کو خدا کی راہ میں قربان کریں گے جب واقعی ان کو دس بیٹے ہو گئے تو ان کو اپنے کیے ہوئے عہد کا خیال آیا۔ وہ سوچنے لگے کہ عہد کو کس طریقے سے پورا کیا جائے۔ انہوں نے قرعہ اندازی کی اور پورے دس بیٹوں کے نام اس میں شامل کیے۔ قرعہ اندازی میں عبد اللہ کا نام نکل آیا جو ان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ عبد اللہ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ عبد المطلب ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار نہ ہوتے تھے کہ عبد اللہ کو خدا کی راہ میں قربان کیا جائے۔ اپنی ذہنی کش مکش کو دور کرنے کے لیے انہوں نے اور لوگوں کی رائے لی۔ ان میں ایک مقامی کاہنہ بھی شامل تھی۔ اس نے عبد المطلب کو مشورہ دیا کہ جان کا بدلہ مال کی صورت میں بھی دیا جا سکتا ہے اور بہتر یہ ہو گا کہ

Marfat.com

عبداللہ کی جان کے عوض بہت سے اونٹوں کی قربانی کی جائے۔ اگر خداؤں نے اونٹوں کی تعداد پر اعتراض کیا تو اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اونٹوں کی تعداد میں مسلسل اتنا اضافہ کیا جانا چاہیے جو خداؤں کے لیے قابل قبول ہو اور ان کی خوشنودی کا باعث ہو۔

عبدالمطلب نے دس اونٹوں کی قربانی کی پیشکش کی۔ جب تیر پھینکا گیا تو قیافہ شناسوں کے سردار نے اعلان کیا کہ ہبل بت کے لیے یہ پیشکش ناقابل قبول ہے۔ اونٹوں کے پیشکش میں ہر تیر کے ساتھ دس اونٹوں کا اضافہ کیا جاتا رہا اور دسویں تیر پر قیافہ شناس نے اعلان کیا کہ ہبل کے لیے سو اونٹ قابل قبول ہیں اور یہ اونٹ عبداللہ کی جان کے عوض قربان کیے جائیں۔

عجیب اتفاق کی بات ہے کہ یہ پورا واقعہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسحٰق کے واقعے سے ملتا جلتا ہے۔ مسلم مورخین نے حضرت اسحٰق کی جگہ حضرت اسماعیل کا ذکر کیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسماعیل کو ذبح کرنے کے لیے ابراہیم نے وہی مقام چنا تھا جس کو صدیوں بعد عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کی قربانی کے لیے انتخاب کیا تھا۔ حضرت اسماعیل کی جان بخشی خدا کے حکم سے ہوئی تھی خدا نے اسماعیل کی جگہ ایک دنبے کو حضرت ابراہیم کے آگے ذبح کے لیے رکھ دیا۔ بعض مسلم مورخین نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسحٰق کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا تھا نہ کہ اسماعیل کو۔

قریش کے قبیلے سے تعلق رکھنے والے ایک خاندان بنی زہرہ کی ایک خاتون آمنہ سے عبداللہ نے شادی کی۔ شادی کے کچھ مہینوں بعد عبداللہ کا انتقال یثرب میں ہوا جبکہ وہ تجارت کی غرض سے وہاں گئے ہوئے تھے۔ ۵۷۰ء میں حضرت آمنہ کے بطن سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ کی پیدائش ہوئی۔ محمد نامی یہی بچہ آگے چل کر دنیا کا ایک عظیم ترین قائد اور پیغمبر بنا۔ قریش کا یہ معاشرتی دستور تھا کہ بچے پیدا ہونے کے بعد ان کو خانہ بدوش قبیلوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا کہ وہ اپنی شیر خواری کا زمانہ مکہ کے باہر گزاریں۔ مکہ کے باہر کی تازہ آب و ہوا کو وہ لوگ بچوں کے لیے بہتر اور صحت مند سمجھتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے چند دن بعد بنی سعد کی عورتوں کی ایک جماعت جن کا تعلق ہوازن قبیلے سے تھا بچوں کو حاصل کرنے کے لیے مکہ آئی۔ نوجوان بیوہ آمنہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے محمد کو حسب دستور ان عورتوں کے حوالے کرنا چاہا لیکن آمنہ کی بیوگی اور غربت

Marfat.com

کے پیش نظران عورتوں نے اس بچے کو لینے سے انکار کر دیا۔ بچوں کو دودھ پلانے اور صحرا میں ان کی پرورش اور نگہداشت کرنے والی عورتوں کو بچوں کے باپ خاص طور پر بڑی بڑی رقمیں بطور معاوضہ دیا کرتے تھے۔ مائیں اس سلسلے میں ذرا کنجوس ہوتی تھیں۔ یہی بات حضرت آمنہ کے ساتھ بھی ہوئی۔ جتنی عورتیں جماعت کی صورت میں بچوں کے لیے وہاں آئی تھیں ان سب سے سوائے ایک عورت کے باقی تمام کو پرورش کے لیے ایک ایک بچہ مل گیا۔ جس عورت کو کوئی بچہ نہ مل سکا اس کا نام حلیمہ تھا۔

بچوں کو لے کر جماعت کی ساری عورتیں اپنے اپنے مقام پر روانہ ہو رہی تھیں لیکن حلیمہ خالی ہاتھ واپس ہونا پسند نہیں کرتی تھیں۔ مجبوراً حلیمہ نے اس یتیم بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔ یہی وہ بچہ تھا جس کو لینے سے جماعت کی ساری عورتوں نے انکار کیا اور اسی بچے کو حلیمہ نے بادل ناخواستہ اپنی گود میں لے لیا۔

جب تک بنی سعد کے درمیان حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقیم رہے کئی معجزے ظہور پذیر ہوتے رہے۔ ان میں سے ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار دو سفید پوش نمودار ہوئے۔ بچے کو فرش پر لٹایا۔ اس کا سینہ چاک کیا۔ دل نکالا۔ دل کو دھو کر پھر سینے میں رکھ کر روپوش ہو گئے۔

جہاں تک معجزوں کا تعلق ہے ان پر بحث کرنا بے سود ہے اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی معجزوں کو اہمیت نہیں دی۔ آپ نے یہاں تک فرمایا کہ آپ معجزہ دکھانے سے قاصر ہیں۔ حضور کی اس صاف گوئی نے دشمنوں کو یہ موقع دیا کہ وہ حضور پر طعنہ کسیں کہ حضورؐ پیغمبر ہونے کے باوجود معجزے دکھانے سے قاصر ہیں۔

اگر حضورؐ اپنی تبلیغ کے زمانے میں صرف اُن معجزوں کا ذکر فرما دیتے جو آپ کے بچپن سے لے کر تبلیغ کے زمانے تک آپ سے منسوب کیے گئے ہیں تو صرف یہی معجزے مخالفین کی زبان بند کرنے کے لیے کافی تھے لیکن حضورؐ نے کبھی بھی معجزوں کی آڑ نہیں لی اور نہ ہی معجزوں کو اہمیت دی۔

حضورؐ نے بچپن کے چھ سال اپنا دودھ پلانے والی ماں حلیمہ اور اُن کے شوہر کے ساتھ بسر کیے۔ حلیمہ کے دوسرے بچوں کے ساتھ بکریاں چرانے کے لیے حضورؐ بھی جایا کرتے تھے۔ حضورؐ نے اپنے عروج اور بلند اقبالی کے زمانے میں اپنی زبان مبارک سے فخریہ یہ فرمایا تھا کہ میں تو ایک ایسا پیغمبر ہوں جو اپنے بچپن میں بکریاں چرایا کرتا

Marfat.com

تھا اور لوگوں کی نگہبانی کیا کرتا تھا۔ چھ سال کی عمر میں یعنی ۵۷۶ء میں حضورؐ اپنی والدۂ ماجدہ حضرت آمنہ کے ہاں مکہ آ گئے۔ حضورؐ کو اپنی ماں کے پاس آ کر ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ حضورؐ کی والدہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یتیم تو تھے ہی اب یسیر بھی ہو گئے۔ ایک مختصر عرصے کے لیے حضرت آمنہ کی ایک لونڈی آپ کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ پھر آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کو اپنے ہاں بلا لیا اور اپنے پوتے کا ہر طرح سے خیال رکھنا شروع کیا۔ دادا کی چاہت اپنے پوتے سے اتنی زیادہ تھی کہ وہ پوتے پر اپنی جان نچھاور کرتے تھے۔ دل بہلانے کی خاطر وہ معصوم پوتے سے کھیلا کرتے تھے۔

دو سال بعد شفقت و محبت کا یہ دنیاوی سہارا بھی اٹھ گیا۔ ۵۷۸ء میں عبدالمطلب کا انتقال ہو گیا۔ ماں کی رحلت پھر چہیتے دادا کی مفارقت نے حضورؐ کی کم عمری میں زندگی کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ عبدالمطلب نے اپنی وفات سے قبل اپنے ایک بیٹے ابوطالب سے کہا کہ حضورؐ کی کفالت کا ذمہ لیں۔ ابوطالب حضور کے والد حضرت عبداللہ کے حقیقی بھائی تھے۔ عبدالمطلب کے دوسرے بیٹے ابوطالب کے سوتیلے بھائی ہوتے تھے۔

ایک روایت کے مطابق جبکہ حضورؐ کی عمر ۱۲ سال تھی، اور دوسری روایت کے مطابق ۹ سال حضرت ابوطالب تجارتی قافلے کے ساتھ شام گئے۔ جاتے ہوئے اپنے اس سفر میں حضورؐ کو بھی ساتھ لیتے گئے مسلم مورخین اس سفر کو فخریہ انداز میں اس لیے بھی بیان کرتے ہیں کہ اسی سفر کے دوران شام کے ایک عیسائی پادری نے حضورؐ کو دیکھ کر یہ پیش گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر پیغمبر بنے گا۔

یہ ملاقات یقیناً ہوئی ہو گی اس لیے کہ اس زمانے میں شام میں بہت سے عیسائی راہب رہا کرتے تھے۔

حضورؐ بچپن ہی سے سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے۔ حضورؐ کے بچپن کا ابتدائی زمانہ جس مصیبت اور ذہنی کرب میں گزرا اس کے پیش نظر سنجیدگی کا غالب آنا ایک فطری بات تھی۔ شاید یہی وہ سنجیدگی تھی جس کو دیکھ کر عیسائی پادری نے ایک ۹ یا ۱۲ سالہ لڑکے کو یہ کہہ دیا ہو کہ اس ہونہار کا مستقبل یقیناً تابناک معلوم ہوتا ہے۔ ۵۸۶ء اور ۵۹۰ء کے لگ بھگ جبکہ حضورؐ کی عمر ۱۵ یا ۲۰ سال کی ہو گی بنی قریش اور ان کے حلیف بنی کنانہ اور قبیلہ ہوازن کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ جنگ کا جو سبب تھا وہ چھٹی صدی عیسوی کے عرب

Marfat.com

لوگوں کے طرز فکر اور طرز معاشرت کی اچھی خاصی ترجمانی کرتا ہے۔

نعمان پنجم ابو قابوس لخمد خاندان کا بادشاہ تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ مکہ کے قرب و جوار میں ہونے والے میلوں میں اپنے ملک کا سامان فروخت کے لئے روانہ کرے۔ ان میلوں میں ایک بڑا میلہ عکاظ کے مقام پر لگا کرتا تھا۔ یہ میلہ حج کے موقع پر ہوا کرتا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ جو کاروان مختلف علاقوں سے گزرتے تھے اُن کاروانوں کے امیر گزرنے والے علاقوں کے سرداروں سے اپنی اور اپنے سامان کی حفاظت کی ضمانت لیتے تھے۔ جو قبائل اس ذمہ داری کو قبول کر لیتے تھے اپنے فرض کو پوری عمدگی سے انجام دیتے تھے۔ نعمان پنجم نے اپنے کاروان کی حفاظت کے لیے ہوازن کے ایک رہبر کا تعاون حاصل کیا۔ بنی کنانہ کے ایک فرد نے جو اپنی چوری اور ڈکیتی میں ممتاز تھا، نعمان کو اپنی خدمات کی پیشکش کی لیکن اس کی مجرمانہ عادات کے پیش نظر نعمان نے اس کی پیش کش کو رد کر دیا۔ اس کے باوجود بھی وہ اس کے تجارتی کاروان کے ساتھ ہو گیا جو حیرہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوا تھا۔ دوپہر کی دھوپ میں جبکہ اہل کاروان سستا رہے تھے بنی کنانہ کے ایک فرد نے قبیلہ ہوازن کے ایک نگران کار کو قتل کر دیا کاروان کا کچھ سامان لے کر چلتا بنا قاتل کا تعلق نہ صرف بنی کنانہ سے تھا بلکہ وہ قریش کے حرب ابن امیہ کے طرف داروں میں بھی تھا۔ جرم کی شدت اس وجہ سے بھی محسوس کی گئی کہ وہ حج کے مہینے سے ایک ماہ قبل یعنی ذی قعدہ کے مہینے میں عمل میں آیا تھا یہ مہینہ عربوں کے لیے ایک مقدس مہینہ تھا۔ اس مہینے میں کسی بھی قسم کی بے ہودگی اور بدتمیزی قومی طور پر بہت بری سمجھی جاتی تھی اس واقعہ کے نتیجے کے طور پر قریش اور ہوازن کے درمیان جنگ بھڑک گئی۔ تقریباً پانچ سال تک ان دونوں قبیلوں کے درمیان جھڑپیں چلتی رہیں۔ پانچ سال تک ہر سال ایک بڑی لڑائی ہوا کرتی تھی۔ اس واقعہ کے وقت حضورؐ کی عمر شاید ۲۰ سال ہوگی۔ اس لڑائی میں حضورؐ نے بھی حصہ لیا تھا۔ اپنے چچا کی مدد عملی طور پر اس طرح کی تھی کہ جو بھی تیر دشمن کی طرف سے آ کر اُن کے قبیلے کے قریب گرتے حضورؐ ان تیروں کو جمع کر کے اپنے چچا کے حوالے کرتے تاکہ وہ ان تیروں کو دوبارہ استعمال میں لائیں۔

حضورؐ کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے بہت ہی کم واقعات کا ہم کو علم ہے۔ گو حضورؐ کے دادا عبدالمطلب مکہ کے ایک بہت ہی بڑے آدمی تھے لیکن ان کے صاحبزادے حضرت ابوطالب کو غربت کی زندگی گزارنی پڑی۔

Marfat.com

اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عبد المطلب کی جائداد اور دولت اُن کے کئی فرزندوں میں تقسیم ہوئی اور ہر ایک کے حصے میں تھوڑی بہت جائداد آئی۔

اپنے چچا کی کفالت اور سرپرستی میں آنے کے بعد حضورؐ کو پھر چند دن تک چرواہنے کا کام کرنا پڑا حضورؐ جب سن بلوغ کو پہنچے تو آپ نے اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح تجارت میں حصہ لینا شروع کیا۔ اس وقت کے دستور کے مطابق آپ اپنے چچا کے ساتھ تجارتی قافلے کے ہمراہ یمن بھی گئے۔ قافلے کے لوگوں میں آپ امین سے مخاطب کئے جاتے تھے۔ قافلے والے آپ کی سنجیدگی اور متانت سے بہت متاثر ہوا کرتے تھے۔ آپ نے بعد میں ایک دفعہ یہ فرمایا کہ سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد اپنے عنفوان شباب میں آپ نے کبھی کوئی بے راہ روی اختیار نہیں فرمائی خدیجہ بنت خویلد قریش کی ایک مالدار خاتون تھیں۔ ان کی دو بار شادی ہو چکی تھی۔ وہ تجارت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ اپنے کاروان عرب کے دوسرے حصوں میں روانہ کرتی تھیں۔ اپنی تجارت کا حساب و کتاب خود کر لیتی تھیں۔ ۵۹۵ء میں جبکہ حضور کا سن مبارک ۲۵ سال کا تھا ابو طالب نے خدیجہ سے حضورؐ کی سفارش کی اور اس سفارش کے نتیجے کے طور پر خدیجہ نے حضورؐ سے خواہش کی کہ آپ ان کا کاروانِ تجارت اپنی نگرانی میں شام لے جائیں۔

خدیجہ نے حضورؐ سے کہا کہ جو سامان آپ شام لے جا رہے ہیں وہاں فروخت کر دیں اور اس فروخت سے جو رقم وصول ہو اس سے شام کا سامان خریدیں جس کی مکے کے بازاروں اور میلوں میں کھپت ہو سکے گو ابو طالب کی سفارش بظاہر کام کر گئی لیکن حضورؐ نے اپنے تجارتی تجربے، سنجیدگی، متانت اور دیانتداری میں سارے قریش میں وہ شہرت حاصل کر لی تھی کہ خدیجہ کو اپنا فائدہ اسی میں نظر آیا کہ قریش کے ایماندار ترین آدمی کے ذریعہ اپنی تجارت کو فروغ دیں اس لیے انہوں نے کاروانِ تجارت حضورؐ کے حوالے کیا۔

روایات میں ہے کہ جب کاروانِ شمال کی طرف جا رہا تھا دوپہر میں دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے کسی جگہ قیام ہوا۔ حضور ایک درخت کے سائے میں آرام کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ ایک عیسائی پادری حضور کے قریب آیا جب اس نے دیکھا کہ حضور ایک خاص درخت کے نیچے لیٹے ہوئے ہیں تو اس نے کہا کہ اس درخت کے نیچے تو صرف پیغمبر ہی کو جگہ مل سکتی ہے۔ اس روایت کو صحیح ماننے میں ذرا

Marfat.com

تکلف اس لیے مانع ہے کہ جس مقام پر اس واقعہ کا ہونا بیان کیا جاتا ہے وہاں کئی ایک درخت ہیں اور گرما کی دھوپ میں ہر درخت سایہ کا کام دیتا ہے اور ہر درخت کے نیچے اب تک شاید ہزاروں لاکھوں آدمی بیٹھتے اور سوتے آئے ہوں گے لیکن آج تک وہ درخت اردن میں موجود ہے آج بھی لوگوں کو وہ درخت اُس واقعہ سے منسوب کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

حضورؐ کے ذریعہ حضرت خدیجہؓ نے جو کاروانِ تجارت شام روانہ کیا تھا اس کے مالی نتائج بہت بہتر صورت میں نکلے حضورؐ کی انتظامی اور کاروباری صلاحیت سے حضرت خدیجہؓ بہت متاثر ہوئیں۔ اس کاروان سے جو خاطر خواہ فائدہ ہوا وہ بی بی خدیجہؓ کی دلی خوشی کا باعث ہوا۔ ابن اسحٰق لکھتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ بہت ہی سمجھدار، شریف النفس اور اپنے اصولوں کی بڑی ہی پابند خاتون تھیں۔ خدیجہؓ کی سمجھ دار طبیعت نے ان کو اس بات پر مائل کیا کہ وہ حضورؐ کی خدمت میں ان الفاظ میں شادی کا پیغام روانہ کریں کہ اے میرے چچا کے فرزند میں آپ کو بہت پسند کرتی ہوں۔ آپ اور میں ایک ہی خاندان سے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ عوام میں کافی مقبول ہیں۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔

حضرت خدیجہؓ کا یہ پیغام روانہ کرنا چند باتوں کی وجہ سے بہت ہی دلچسپ بن جاتا ہے۔ ایک طرف تو یہ شادی حضورؐ کی زندگی کو ایک اہم موڑ پر لے آتی ہے اور دوسری طرف اسلام سے قبل عورتوں کی جو اہمیت تھی اس کا بھی اظہار ہو جاتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ ایک خود مختار خاتون تھیں۔ اپنے معاملات کو آپ چلایا کرتی تھیں۔ اپنی مرضی سے انہوں نے اپنے ہونے والے شوہر کا انتخاب کیا تھا۔ یہ پیغام حضورؐ کی طرف سے نہیں گیا تھا بلکہ حضرت خدیجہؓ نے اس میں پہل کی تھی حضورؐ نے اپنے چچا ابوطالب سے مشورہ کیا۔ چچا نے اپنے بھتیجے کو اس پیغام کو قبول کر لینے کا مشورہ دیا۔

حضرت خدیجہؓ کے والد ایک قبیلہ وارانہ جنگ میں مارے گئے تھے۔ خدیجہؓ کے چچا عمر ابن اسد خاندان کے سرپرست تھے اور سرپرست کی حیثیت سے شادی کے لیے اُن کی منظوری ضروری تھی اس منظوری کو حاصل کرنے کے لئے ابوطالب، حضورؐ کے ایک اور چچا حمزہ اور خود حضورؐ حضرت خدیجہؓ کے مکان گئے۔ بی بی خدیجہؓ نے اس بات کو ابھی راز ہی میں رکھا تھا ابھی تک اپنے چچا سے اپنی اس

خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ عمرا بن اسد حضرت خدیجہؓ کی مرضی اور منشاء سے قطعی لاعلم تھے۔

اس وقت کے رسم اور رواج کے مطابق حضرت خدیجہؓ نے اپنے چچا کی تواضع مشروبات سے کی۔ اسد نے اتنی پی لی کہ اُن پر نشہ کا عالم طاری ہوگیا۔ جب عمرا بن اسد مستی کے عالم میں تھے ابوطالب نے ایک تمہیدی تقریر کی اور عمرا بن اسد سے شادی کی منظوری کے لیے درخواست کی۔ ورقہ ابن نوفل نے ابوطالب کی درخواست کی حمایت کی۔ عمرا بن اسد نے خاموشی اختیار کی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اُن کی خاموشی کو رضامندی سے تعبیر کیا گیا اور شادی ہوگئی۔ چند گھنٹے بعد جب اس ابن اسد کا نشہ کافور ہوا اور ہوش میں آیا تو اس نے سوال کیا کہ یہ سب کچھ کیا ہورہا ہے۔ حاضرین نے جواب دیا کہ وہ شادی کی محفل میں لطف اندوز ہورہے تھے۔ دلہا محمدؐ ابن عبداللہ ہیں اور دلہن خدیجہؓ۔ حضرت خدیجہؓ کے چچا عمرا بن اسد نے کہا کہ یہ سب کچھ میری اجازت کے بغیر ہورہا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ وہ آپ ہی تو ہیں جنہوں نے میری شادی کرڈالی اور اپنے چچا کی نارضامندی پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا۔ عمر کو اس بات کا پتہ ہی نہیں چلا کہ دو تین گھنٹے پہلے اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا اس لیے اس نے اسی میں اپنی خیریت سمجھی کہ اب اس شادی پر اپنی رضامندی کا اظہار کرے۔ حضرت خدیجہؓ نے اپنے چچا کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اس لیے بحث طلب نہیں ہے کہ وہ آپ کا اپنا انفرادی فعل تھا بعثت سے قبل حضورؐ کی شادی ہوئی تھی۔ نشہ آور مشروبات پر اس وقت کوئی پابندی نہیں تھی حضرت خدیجہؓ عاقل و بالغ تھیں۔ یہ شادی ان کی اپنی مرضی سے ہوئی تھی حضرت خدیجہؓ نے خود یہ پیغام روانہ کیا تھا۔ رسمی طور پر چچا کی مرضی اور ان کی منظوری مانگی جارہی تھی۔ حضرت خدیجہؓ نے منظوری حاصل کرنے کے لیے جو بھی بہتر طریقہ ہوسکتا تھا خود ہی منتخب کیا ہوگا۔ پروفیسر سید نواب علی نے اپنی کتاب سیرت رسول اللہ کے ایک حاشیے میں لکھا ہے کہ

"روض الالف صفحہ ۱۲۲ میں ایک عجیب روایت منقول ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے اپنے والد کو شراب پلا کر نشہ کی حالت میں نکاح پڑھوالیا۔ جب باپ کو ہوش آیا تو بیٹی کی اس کارروائی پر بہت ناراض ہوئے اس روایت سے اموی دربار کی سیہ مستی کی بُو آتی ہے۔ عروہ بن زبیرؓ نے حضرت عائشہ سے اور عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ نکاح حضرت خدیجہؓ کے چچا عمرا بن اسد نے پڑھایا

زاد المعاد جلد اوّل صفحہ ۱۰۴۔

حضورؐ کا دامن اس واقعہ سے اس لیے ملوث نہیں کیا جاسکتا کہ بقول ابن اسحٰق "پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جوان ہوئے اور اللہ ہر ایک شر و فساد سے آپ کی حفاظت کرتا تھا اور جاہلیت کی ہر ایک ناپاکی سے آپ کو پاک رکھتا تھا کیوں کہ وہ آپ کو کرامت اور رسالت عطا کرنے والا تھا۔ چنانچہ جب آپ بالغ ہوئے تو اپنی قوم میں سب سے بڑھ کر بامروّت صاحب اخلاق، شریف، ملنسار بڑے حلیم، راست گو، امانت دار تھے۔ فحش و اخلاق ذمیمہ سے جو شرافت انسانی کے لیے مضرت رساں ہیں، بہت دور تھے یہاں تک کہ قوم نے آپ کو الامین کے لقب سے یاد کیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے امور صالحہ آپ میں جمع فرما دیے تھے (ابن ہشام جلد اوّل صفحہ ۱۰۲)

(حضورؐ کے اخلاق عالیہ سے یہ بات میل نہیں کھاتی کہ حضورؐ کو خدیجہؓ اور اسد کے درمیان جو ذہنی فصل تھا اُس کا علم ہوا اور حضور کو اُن کے طریقہ کار سے اتفاق بھی ہوا ہو۔ چونکہ مسلم مورخین نے اس روایت کو بیان کیا ہے اس لیے گلب پاشا نے بھی اس واقعہ کو اپنی کتاب میں جگہ دے دی واللہ اعلم۔ حبیب)

روایات کے مطابق حضرت خدیجہؓ کی عمر شادی کے وقت ۴۰ سال تھی۔ ایک مورخ کے بیان کے مطابق ان کی عمر ۲۸ سال تھی۔ شادی کے بعد حضرت خدیجہؓ کے چھ بچے ہوئے جن میں دو لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔ یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ شادی کے وقت خدیجہ کی عمر ۴۰ سال ہوگی۔ خدیجہؓ کے بطن سے ہونے والی اولاد سب کی سب ۴۰ سال سے کم عمر میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اُن کے بچوں میں سے کسی نے بھی ۴۰ سال سے زیادہ کی عمر نہ پائی۔ اکثر تو بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ دونوں لڑکوں کا انتقال ایام طفولیت ہی میں ہوا۔ اس سے قطع نظر یہ شادی باقی تمام پہلوؤں سے کامیاب رہی۔ شادی کے وقت حضورؐ کی عمر ۲۵ سال تھی۔ حضورؐ خاموش اور تنہائی پسند تھے۔ اس کے باوجود ذات اقدس کو اپنے بچوں سے بڑا ہی پیار تھا۔ جب بھی وقت ملتا اپنے بچوں کے ساتھ گزارتے ازدواجی زندگی بہت ہی خوشگوار اور کامیاب ترین رہی۔ اپنی بیوی بچوں کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ ان سے ہمیشہ خوش مزاجی سے پیش آتے تھے۔

Marfat.com

یادگار تاریخیں

خزاعہ قبیلہ کے سردار کی لڑکی سے قصی کی شادی	۴۲۰ء
مکہ پر قصی کا اثر و نفوذ	۴۴۰ء
حضورؐ کے دادا عبدالمطلب کی پیدائش	۴۹۷ء
سال فیل	۵۷۰ء
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش	۵۷۰ء
عبدالمطلب کا انتقال	۵۷۸ء
حضورؐ کا ابوطالب کی سرپرستی میں آنا	۵۷۸ء
حضورؐ کا خدیجہؓ سے نکاح	۵۹۵ء

Marfat.com

پیغمبرانہ دعوت

شادی کے کچھ عرصہ بعد تک حضورؐ تجارت ہی میں مصروف رہے۔ تواریخ میں پوری طریقے سے اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ آیا حضورؐ شادی کے بعد بھی حضرت خدیجہؓ ہی کے مال کی تجارت کیا کرتے تھے یا آپ نے خود اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ چونکہ آپ کے تمام رشتہ دار تجارت ہی میں لگے ہوئے تھے۔ اس لیے آپ کو بھی تجارت ہی میں حصہ لینا پڑا۔ قرآن پاک میں کئی جگہ تجارتی زبان استعمال ہوتی ہے۔ جس میں اخلاقی پہلوؤں کا ذکر ہے۔

۶۰۵ء میں حضورؐ کی عمر ۳۵ سال تھی۔ قریش نے فیصلہ کیا کہ کعبہ پر چھت ڈالی جائے۔ اس وقت تک کعبہ صرف چار دیواروں پر مشتمل تھا اس پر کوئی چھت نہیں تھی چھت ڈالنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کی دیواریں مضبوط ہوں۔ چونکہ دیواریں بوسیدہ ہو گئی تھیں اس لیے کعبہ کی دیواروں کو گرا کر انہی کی جگہ نئی دیواریں کھڑی کرنی تھیں۔ ان لوگوں کو دیواریں ڈھانے اور نئی دیواریں کھڑی کرتے ہیں یہ خطرہ تھا کہ جو بت کعبہ میں نصب ہیں کہیں عذاب نازل نہ کردیں۔ غصے میں نہ آجائیں۔ ان میں سے ایک آدمی جو زیادہ جرأت مند تھا آگے بڑھا اور اپنے ہاتھ میں کدال لیے ہوئے ایک دیوار کے قریب کھڑا ہو کر زور سے چلانے لگا کہ اے بتو! ہم یہ کام تمہاری بھلائی کے لیے کر رہے ہیں گھبرانا نہیں۔ مکہ کے لوگ تمام رات اسی گھبراہٹ سے نہ سو سکے کہ کہیں ان لوگوں پر کعبہ کی دیواریں گرانے سے کوئی آفت نہ آجائے۔ کہیں ان لوگوں کے بت ان سے ناراض ہو کر ان کا نقصان نہ کردیں۔

جب صبح ہوئی تو مکہ کے تمام لوگ کعبے کے اطراف جمع ہو گئے۔ خوشی کا اظہار کرنے لگے کہ ان کے بت ان کے اس کام سے راضی ہیں جب ہی تو رات میں ان پر کوئی بلا نازل نہیں ہوئی۔

جدہ کے ساحل پر ایک یونانی جہاز تباہ کن حالت میں ملا تھا۔ جہاز کی لکڑی مکہ لائی گئی۔ اس لکڑی سے کعبہ کی چھت بنائی گئی۔ ایک مصری نجار کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اسی نے چھت کے کام کو پورا کیا۔ لکڑی کی کمی اور نجاروں اور فن کاروں کے فقدان نے ہی شاید اس وقت تک کعبے کو بغیر چھت کے رکھا ہو۔ کعبے کے اطراف رہنے والے بھی اکثر و بیشتر ڈیروں اور قناتوں کا استعمال کیا کرتے تھے۔ یونانی جہاز کی تباہی، لکڑی کی فراہمی اور مصری نجار کی موجودگی چھت کی تعمیر کا وسیلہ بن گئی۔

کعبہ کی عمارت پر چھت کا نہ ہونا اس وقت کوئی ایسی بات نہ تھی جسکی وجہ سے اسکی حرمت میں کوئی فرق آتا۔ پہلے تو یہ کہ مکہ میں بہت ہی کم بارش ہوتی ہے۔ دوسرے ڈیرے اور قناتیں گرمی اور لو کو روکے رکھتے ہیں۔ مکہ میں ایسے کوئی بڑے درخت نہیں اگتے تھے جن کو کاٹ کر لوگ اپنے گھروں کے چھت بنائیں۔ اونٹوں کے ذریعہ شام یا یمن سے لکڑی لانا مشکل تھا۔ جب لکڑی ہی نہ ہو تو لکڑی کے کام کرنے والے کہاں ہوں گے۔ اس معاملہ میں مکہ جزیرہ نمائے عرب کے دوسرے حصوں سے مختلف تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس وقت سے ہزار سال پہلے یمن میں لوگ پتھروں کی بنی ہوئی کئی منزلہ بہترین عمارتوں میں رہا کرتے تھے ان کی عمارتیں فن تعمیر میں اپنی مثال آپ ہوا کرتی تھیں۔ بعض علاقوں میں تو سنگ مرمر کا بیشتر استعمال ہوتا تھا۔ کعبہ کی قدیم عمارت میں ایک کالا پتھر نصب تھا۔ اس پتھر کو حجرِ اسود کہا جاتا ہے۔ عرب اسکو بہت ہی مقدس مانتے تھے۔ جب دیواروں کی تعمیر کے دوران وہ حصہ آگیا جہاں حجرِ اسود نصب ہونا تھا تو ہر قبیلہ کے سردار کی یہ خواہش تھی کہ یہ سعادت وہ اپنے ذمے لے۔ بات نے بہت طول کھینچا اور بحث و مباحثہ اتنا بڑھا کہ ہاتھا پائی تک کی نوبت آگئی۔

عبد الدار کے قبیلے کے لوگ جن کے ذمہ کعبہ کی تولیت تھی اپنے اس حق پر مصر تھے انہوں نے ایک بڑے کٹورے میں خون بھرا۔ اپنے خاندان کے افراد سے کہا کہ وہ خون میں ہاتھ ڈال کر قسم کھائیں کہ حجرِ اسود کو ان ہی کے قبیلے کا سردار نصب کرے گا۔

Marfat.com

بنی مخزوم کی شاخ کا ایک آدمی ابو امیہ بہت ہی عمر رسیدہ اور تجربہ کار تھا اس نے تجویز پیش کی کہ تمام حاضرین اس بات پر متفق ہوں کہ اس ملے کے بعد جو آدمی بھی باہر سے حدود کعبہ میں پہلے آئے اس کو تمام فریق اپنا پنچ مقرر کریں۔

اس تجویز کو حاضرین نے منظور کر لیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ چند ہی منٹ بعد حضورؐ وہاں اچانک تشریف لائے۔ لوگوں نے اس قضیہ کی ساری روداد حضورؐ کے آگے رکھی۔ آپ نے فرمایا کہ ایک چادر لائی جائے۔ جب چادر لائی گئی تو آپ نے اس چادر پر حجر اسود رکھا اور تمام خاندانوں کے سربراہوں سے کہا کہ چادر کے کونے تھامے رکھیں۔ لوگوں نے چاروں طرف سے اس چادر کو پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ جب وہ چادر اتنی اونچی ہو گئی جہاں پر حجر اسود نصب ہوتا تھا تو حضورؐ نے اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اس کی مقرر کردہ جگہ پر نصب فرما دیا۔

اس وقت کعبہ میں حاضری دینے کے چند شرائط تھے۔

جب مکہ سے باہر کے لوگ کعبہ میں حاضری دینے کے لیے آتے تو اپنے ساتھ حرم کعبہ میں حرام یا ناجائز غذا قسم کی کوئی چیز نہیں لا سکتے تھے۔ حرم میں حاضری دینے والوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ سات دفعہ کعبہ کی عمارت کا طواف کریں۔ حرم کعبہ میں لباس کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اس وقت کے جائز قسم کے لباس کا پہننا ضروری تھا۔ لباس کی پابندی کی وجہ سے مکہ کے کپڑا بیچنے والے تاجروں کو یہ فائدہ ہوتا تھا کہ سال میں ایک دفعہ ان کے کپڑے کی اچھی خاصی تجارت ہو جاتی تھی۔ خوب کپڑا بکتا تھا۔ جو لوگ اس خاص قسم کے لباس کو اپنی غربت کی وجہ سے نہیں پہن سکتے تھے ان کے لیے اس بات کی اجازت تھی کہ وہ برہنہ کعبہ کا طواف کریں۔

حضورؐ کی شادی کے بعد اور نبوت کا اعلان کرنے سے پہلے تاریخ یہ کہتی ہے کہ چار آدمی مکہ میں ایسے موجود تھے جنہوں نے کعبہ میں بتوں کی پوجا سے توبہ کر لی تھی۔ ان میں سے ایک ورقہ بن نوفل تھے جو حضرت خدیجہؓ کے رشتہ کے بھائی تھے۔ ورقہ بن نوفل نے الہامی کتب کا مطالعہ کیا تھا دوسرا آدمی حبشہ چلا گیا وہاں عیسائیت اختیار کر لی۔ تیسرے نے استنبول کو ہجرت کی اور اس نے بھی

Marfat.com

عیسائیت کو قبول کر لیا۔ چوتھے توحید پرست تھے جن کا نام زید ابن عمر ابن طفیل بتایا جاتا ہے۔ انہوں نے بت پرستی سے توبہ تو کی لیکن نہ یہودیت کو اختیار کیا اور نہ عیسائیت کو۔ زید کے انتقال کے کئی سال بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ کی صاحبزادی اسماءؓ لوگوں سے کہا کرتی ہیں کہ زید اپنے بڑھاپے کے زمانے میں خانہ کعبہ کے ایک کونے میں بیٹھے کہا کرتے تھے کہ اے اللہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیری پرستش اور عبادت کس طرح سے کی جاتی تو میں اسی طریقے کو اختیار کرتا لیکن افسوس میں اس علم سے محروم ہوں۔ ان کے خاندان کے لوگ ان کی باتوں کا مذاق اڑاتے اور وہ ان لوگوں کے مذاق سے تنگ آ کر ایک بار عراق اور شام کی طرف بھی نکل گئے۔ عیسائی اور یہودی علماء سے اپنی ذہنی کشمکش کا اظہار کرنے لگے۔ ان علماء کے جوابات سے ان کو تشفی نہ ہوئی۔ جب وہ اپنے سفر سے مکہ واپس ہو رہے تھے راستے میں چند لٹیروں نے ان کو قتل کر دیا۔

اوپر کی مثال سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کس طرح مکہ میں لوگوں کے ذہن آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہے تھے اور کس طرح ان کے اندازِ فکر میں تبدیلی آ رہی تھی۔ مذہبی تعصب نام کو بھی نہیں تھا۔

عیسائی اور یہودی تاجر تجارت کی غرض سے مکہ کے میلوں اور بازاروں میں جایا کرتے تھے۔ بلا کسی خوف و خطر اپنے اپنے مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ جب مکے کے لوگ اور خصوصاً قریش ایران، شام اور مصر جاتے اور وہاں کے عیسائیوں یا یہودیوں کو دیکھتے تو دل ہی دل میں اپنی بت پرستی پر لعن طعن کرتے اور دوسرے مذاہب کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی خامیوں کا جائزہ لیتے تھے۔ مکہ کے رہنے والوں کی مذہبی نگران کے تجارتی مفاد سے وابستہ رہتی تھی۔

مکہ میں بھی ایسے سخی اور نیک بخت لوگ تھے۔ جو غریبوں کی عملی مدد کرتے تھے۔ جن نومولود بچوں کو ان کے ماں باپ اپنی غربت کے باعث اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتے تھے ان بچوں کو وہ ان کے ماں باپ سے لے کر ان کی پرورش کرتے تھے۔ قیدیوں کو رہا کروایا کرتے تھے۔ غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے ان کے مالکوں کو کثیر رقم دیا کرتے تھے۔ ان سب خوبیوں کے باوجود بھی وہ لوگ کسی خاص مذہب سے وابستہ نہیں تھے۔

Marfat.com

عربوں کے تعلق سے یہ بات جو مشہور کی گئی ہے کہ وہ اپنی بچیوں کو پیدا ہونے کے بعد ہی زندہ دفن کر دیا کرتے تھے محض قصہ گوئی ہے۔ بعض قبیلے تو ایسے بھی تھے جو لڑکیوں کی پیدائش کو اپنی بلند اقبالی کی نشانی سمجھتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ چند جنونی ایسے بھی ہوں جو اس ڈر سے کہ ان کی بچیاں بڑی ہو کر کہیں آوارہ اور بدکار نہ نکلیں ان کو پیدا ہونے کے بعد ہی مار ڈالتے ہوں۔ بچیوں کی شادیاں ۸ یا ۹ سال میں کر دینے کا جواز بھی ان کی اسی ذہنیت میں ملتا ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کی عزت و عصمت کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔

اس معاملے میں اسلامی مورخین نے قبل اسلام کے عربوں کے ساتھ بہت ہی زیادتی کی ہے۔ اس رنگ آمیزی کا منشا و شاید یہ ہو کہ لوگوں کے دلوں میں قبل اسلام کی گھناونی تصویر پہلے پیش کی جائے اور پھر اسلام کی خوبیوں کا ذکر کیا جائے۔

دوسری طرف تاریخ جس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ یہ کہ عورتیں بہادر ہوتی تھیں۔ خانہ بدوش قبیلوں کی عورتوں میں محبت کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا گیا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے حضرت خدیجہؓ اپنی تجارت کی آپ نگہبان تھیں۔ عرب کی عورتیں شاعری اور علم نجوم میں بہت ممتاز تھیں۔

مکہ کے سالانہ میلوں اور بازاروں میں شاعری کے مقابلے ہوتے تھے ان مقابلوں میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش حصہ لیا کرتی تھیں۔ عربوں کی وضعداری اور خوش اخلاقی بھی تاریخ میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے دو باتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے اوپر کی بیان کردہ خصوصیات و صفات ان کا قومی سرمایہ بن گئیں۔ ایک تو آپس میں قبیلہ واری رقابت اور دوسرے پولیس کا نہ ہونا۔

پولیس کی عدم موجودگی اور قبیلہ واری رقابت ان لوگوں کو مجبور کرتی تھی کہ وہ لوگوں کو اپنانے کے لیے خوش اخلاقی سے پیش آئیں اور قبیلے کی وضعداری کے اظہار کا خاص اہتمام کریں۔ اپنے ناموس کی حفاظت اور کسی کے قتل کا بدلہ ان کو دوسروں کے قتل کے لیے مجبور کیا کرتا تھا۔ عربوں کی قومی خصوصیات میں زمین و آسمان کا تضاد پایا جاتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ ان کی اکثریت کی جہالت تھی۔ مختلف حصوں میں مختلف قسم کے لوگ پائے جاتے تھے۔ ان مختلف قسم کے لوگوں میں مختلف قسم کی خصوصیات کے حامل لوگ تھے ایک طرف تو سخاوت کے دریا بہتے تھے۔ مہمان نوازی اپنا جواب نہیں رکھتی تھی بہادری اور شجاعت ہر لمحہ

Marfat.com

ایک نئی شان دکھاتی تھی اور دوسری طرف وحشیانہ پن اتنا کہ بات بات پر تلوار نیام سے باہر نکل آئی تھی۔ نسل در نسل خاندانی دشمنی کا چکر چلتا رہتا تھا۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی باتیں کی جاتی تھیں۔ عشق و محبت کی داستانوں کو دہرایا جاتا تھا۔

یہی وہ تضاد تھا جس نے زید ابن عمر ابن طفیل جیسے لوگوں کو وحدانیت کی طرف مائل کر دیا تھا

اس وقت کے معاشرہ کا مادی یا ذہنی تضاد آج کی بیسویں صدی میں پوری طریقے سے ہماری سمجھ میں اس لیے نہیں آتا کہ ہمارے ہاں اخبارات ہیں، ریڈیو ہیں، ٹیلویژن ہیں اور بہت سے ایسے وسائل ہیں جن کی بدولت ہمیں دنیا اتنی چھوٹی نظر آتی ہے کہ ہم ساری دنیا کے مسائل کو بہ یک وقت دیکھ سکتے ہیں۔ ان کا تقابل کر سکتے ہیں۔ اس عالمی نظر یا عالمی فکر کی عمر بہ مشکل پچاس سال ہوگی۔ اس سے پہلے کے مسائل اور لوگوں کے حالات میں جو تضاد نظر آتا ہے۔ وہ صرف اسلام سے قبل ہی کے لیے مخصوص نہیں رہا ہے۔ وہ تضاد لاعلمی اور بے بصری سے ہر جگہ نمایاں ہوتا رہا ہے

حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد حضورؐ کی زندگی کے ۱۵ سال یعنی ۵۹۵ء سے ۶۱۰ء تک عام حالات میں گزرے۔ کچھ وقت تو تجارت میں صرف ہو جاتا تھا۔ شادی کے بعد آپ نے کوئی بڑا تجارتی سفر نہیں فرمایا۔ فکر روزگار کو حضرت خدیجہؓ کی دولت نے کچھ کم کر دیا تھا۔ آپ اللہ کی اس دی ہوئی نعمت سے خوب واقف تھے۔ قرآن کریم کی ابتدائی مکی آیتوں میں اس نعمت کا ذکر ہے۔ سورۃ ضحیٰ کی آیات ہیں جس کا مفہوم ہے۔

"آپ کا خدا نہ ہی آپ کو بھولا ہے اور نہ ہی آپ سے ناراض ہوا ہے۔ کیا آپ کو اس وقت سہارا نہیں دیا گیا جبکہ آپ یتیم تھے؟ کیا آپ کی اس وقت رہنمائی نہیں کی گئی جبکہ آپ بھٹک رہے تھے؟ آپ احتیاجات کی تکمیل کے لیے کوشاں تھے اور اللہ نے آپ کو غنی کر دیا۔"

اس زمانے کے دو واقعات کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہوگا۔ حضورؐ ایک ایسے یتیم تھے جس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا اور اپنے چچا ابو طالب کے زیر سایہ پروان چڑھ رہے تھے۔ اس کے بعد غربت کا ساتھ رہا۔ شادی کے بعد حضورؐ نے اپنے چچا کا احسان اس طرح چکایا کہ ان کے صاحبزادہ علیؓ ابن ابی طالب کو اپنے زیر پرورش لے لیا۔ گو حضرت علیؓ حضورؐ کے چچا زاد بھائی تھے لیکن حضورؐ

حضورؐ نے ان کو اپنا بیٹا بیسا بنا لیا تھا۔

زید بن حارثہ ایک عیسائی لڑکا تھا۔ جنوبی شام میں اسکی پیدائش ہوئی تھی۔ جب وہ بچہ تھا تو ڈاکوؤں نے اسے لوٹ لیا تھا۔ اغوا کرکے اسے غلام کی حیثیت سے بیچ دیا۔ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے جبکہ وہ تجارت کے لیے شام گئے ہوئے تھے اس غلام زید کو خرید کر مکہ لے آئے اور اپنی چچی حضرت خدیجہؓ کے حوالے کر دیا شادی کے بعد جب حضورؐ نے حضرت خدیجہؓ کے گھر میں اس غلام کو دیکھا تو اس طرح سے شفقت مہربانی سے پیش آئے کہ بی بی خدیجہؓ نے اس غلام کو حضورؐ کی نذر کر دیا۔

کچھ دنوں بعد زید کے باپ جو اپنے اغوا شدہ بیٹے کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے مکہ پہنچے زید کو مکہ میں پایا تو حضورؐ کی خدمت میں ایک بڑی رقم کی پیش کش کی اور کہا کہ زید کو آزاد کر دیں۔

حضورؐ نے زید کو طلب فرمایا اور زید کے سامنے دو صورتیں رکھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ واپس چلا جائے۔ دوسری یہ کہ اگر وہ چاہے تو حضورؐ کے ساتھ مکہ ہی میں رہے۔

زید نے دوسری صورت کا انتخاب کیا۔ اپنے باپ کے ساتھ واپس جانے سے انکار کر دیا۔ زید کے اس اپنائیت کے جذبے نے حضورؐ کو اتنا متاثر کیا کہ فوراً زید کو حدود کعبہ میں لے گئے اور اعلان فرمایا کہ اب زید غلام نہیں ہیں بلکہ بیٹے ہیں۔

حضورؐ کے دو صاحبزادے جو حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ہوئے تھے ایام طفولیت ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ اب حضورؐ کے گھرانے میں دو لڑکوں کا اضافہ ہو گیا۔ ایک تو تھے علیؓ ابن ابی طالب اور دوسرے زیدؓ بن حارثہ۔

حضورؐ ان دونوں لڑکوں کو اپنے حقیقی بیٹوں کی طرح سے عزیز رکھتے تھے اور شفقت پدرانہ کا اظہار روز و شب ہوا کرتا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا رہا حضورؐ کی عبادت و ریاضت میں اضافہ ہوتا رہا۔ مکہ کی مصروف تجارتی زندگی سے بیزار ہو کر آپ اکثر و بیشتر پہاڑوں کا رخ کرتے تھے جہاں سے تنہائی میں اپنے مولیٰ سے راز و نیاز میں اپنے آپ کو مصروف رکھتے۔ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر آپ کو تنہائی میں عبادت کرنے

میں خوب لطف آتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ آپ نے شام کے سفر میں عیسائی راہبوں کو ایسا کرتے دیکھا تھا ان کا یہ طرز عبادت شاید حضورؐ کو پسند آیا ہو۔

اس قسم کی عبادت کا طریقہ اس وقت کے بت پرستوں میں بھی رائج تھا جب لوگ دنیا کی گہما گہمی سے بیزار ہو جاتے تو پہاڑوں کا رخ کرتے اور تنہائی میں اپنے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔

حضورؐ کے دادا عبدالمطلب کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ رمضان کا پورا مہینا غار میں بسر کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اسلام سے پیشتر مکہ کے بعض اور بھی افراد رمضان میں روزے رکھتے تھے۔ شراب سے پرہیز کرتے تھے اور دوسری لغویات سے احتراز کرتے تھے۔

حضورؐ کے خیالات، مشاہدے اور فکر و نظر پر عیسائیوں اور نصرانیوں سے ملنے ملانے سے شعوری یا لاشعوری طور پر ان کے عقیدے کی گہری چھاپ پڑی تھی۔

مکہ کا قدرتی محل وقوع، پہاڑوں کا سلسلہ، ترکاریوں، پھولوں اور پھلوں کا فقدان اور دن کی جلتی دھوپ نے حضورؐ کے ذہن میں دوزخ کا اچھا خاصا نقشہ پیدا کر دیا تھا۔ حضورؐ پہاڑوں پر چڑھتے اترتے اور اور دشوار گزار راستوں سے آنے جانے اور زندگی کا گہرا تعلق عقبیٰ سے جوڑا کرتے تھے اور حضورؐ کی ہمنوائی کے لیے حضورؐ کی غمگسار اور وفادار رفیقہ حیات حضرت خدیجہؓ حضورؐ کے ساتھ تھیں۔

حضرت عائشہؓ جو حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئیں فرماتی تھیں کہ حضورؐ کو تنہائی بہت پسند آنے لگی تھی آپ اکثر غار حرا تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں کئی کئی راتیں غور و فکر میں بسر ہوا کرتی تھیں۔ غار حرا کی عبادت سے فارغ ہوتے تو اپنے گھر کا رخ فرماتے جہاں گھر کی ساری ضروریات کی تکمیل کا انتظام فرماتے تاکہ پھر غار حرا جا کر سکون سے عبادت کر سکیں۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رمضان ۶۱۰ء کی ایک رات تھی جبکہ حق کا انکشاف حضورؐ پر ہوا اور کہنے والے نے کہا کہ اے محمدؐ آپ خدا کے پیغمبر ہیں۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ جس وقت یہ آواز آ رہی تھی میں کھڑا ہوا تھا۔ اس آواز کو سن کر سر بسجود ہو گیا۔ وحی لانے والے نے کہا ”پڑھ“ حضورؐ نے فرمایا ”میں پڑھ نہیں سکتا “یا” میں پڑھنا نہیں جانتا“ وحی لانے والے نے حضورؐ کو اپنے سینہ سے اتنی سختی سے چمٹا لیا کہ حضورؐ کو سانس

Marfat.com

لینا مشکل معلوم ہونے لگا۔ یہ عمل تین بار دہرایا گیا۔

عربی الفاظ کی ذو معنویت نے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ حضورؐ کا جواب تھا "ما اقراء" اس کے معنی ایک تو یہ ہوتے ہیں کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس کے دوسرے معنی ہوتے ہیں "میں کیا پڑھوں؟" میں پڑھ نہیں سکتا یا پڑھنا نہیں جانتا۔ یہی معنی اکثر مسلم مفسرین نے اختیار کیے ہیں۔ اس آیت سے مسلم علماء یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضور امی تھے یعنی حضورؐ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ یہاں مسلم علماء کا یہ کہنا کہ حضورؐ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس وقت مکہ کے اکثر تاجر اور خصوصاً وہ تاجر جو شام وغیرہ کا سفر کیا کرتے تھے پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ چونکہ حضورؐ کی سرپرستی ابو طالب کر رہے تھے اس لیے ممکن ہو کہ آپ کی تعلیم اوسط سے کچھ کم درجے کی رہی ہو۔ حضورؐ کو امی قرار دینے وقت شاید قرآن کے معجزہ کو ظاہر کرنا مسلم علماء کا منشاء رہا ہو۔ عربی کے طالب علم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ حضورؐ کے زمانے میں شام کے عیسائی قراء کے معنی قرارت کے لیتے تھے نہ کہ پڑھنے کے۔

جو کچھ بھی ما اقراء کے معنی بیان کیے جائیں یا اس کی تاویل کی جائے وہ بذات خود نزول وحی کے واقعہ پر کسی طریقے سے بھی اثر انداز نہیں ہوتا۔ صرف اس بات میں فرق پیدا کر دیتا ہے کہ حضورؐ پڑھنا لکھنا جانتے تھے یا نہیں۔

وحی لانے والے نے تین دفعہ حضورؐ سے پڑھنے کیلئے کہا اور حضورؐ نے ما اقراء کا جواب دیا۔ قاصد وحی نے حضورؐ کو تین دفعہ اپنے سینے سے چمٹایا اور چھوڑا اور اس کے بعد سورہ اقراء تلاوت کرنے کے لیے حضورؐ سے کہا۔ جیسے ہی وحی لانے والا غائب ہوا حضورؐ پر ایک اضطراری کیفیت طاری ہوی۔ آپ ایک عجیب و غریب ذہنی کرب میں اپنے آپ کو پانے لگے۔ ذہنی انتشار میں آپ نے فرمایا کہ میں ایک پہاڑی کی اونچی چوٹی پر جاؤں گا اور وہاں سے اپنے آپ کو نیچے گرا کر ہلاک کر لوں گا تاکہ مجھے ذہنی سکون ملے۔

آپ فرماتے ہیں کہ جب میں اس ارادہ کو عملی جامہ پہناتے کے لیے پہاڑ کی بلندی کی طرف جا رہا تھا مجھے غیب سے آواز آئی "اے محمدؐ آپ تو خدا کے پیغمبرؐ اور رسول ہیں"۔ میں اس آواز کو غور سے سنتا رہا۔ آسمان کی طرف میری نظریں اٹھنے لگیں۔ وحی لانے والا ایک آدمی کی شکل اختیار کر گیا۔

افق کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس آدمی کا وجود مجھے نظر آرہا تھا۔ میں اس وقت تک کھڑا رہا جب تک وہ شکل مجھے نظر آتی رہی۔ جب وہ شکل غائب ہوگئی تو میں اپنے گھر واپس چلا آیا۔ سیدھے خدیجہؓ کے برابر بیٹھ گیا اور خدیجہؓ کو اپنے قریب سے قریب تر آنے کے لیے کہا۔

چونکہ غارِ حرا مکہ سے صرف دو یا تین ہی میل کے فاصلے پر ہے اس لیے ہوسکتا ہے کہ حضورؐ اس واقعہ کے ایک گھنٹے کے اندر ہی اپنے گھر پہنچ گئے ہوں۔

وحی کی آمد دو طریقے سے ہوتی تھی۔ ایک تو یہ ہے کہ وحی لانے والا نظر آتا تھا۔ دوسری یہ کہ صرف آواز سنائی دیتی تھی۔ بعض اوقات کچھ دیکھنے میں آجاتا تھا اور کچھ سن لیا جاتا تھا۔ حضورؐ کی پہلی وحی اور بیت المقدس میں تشریف آوری کا تعلق وحی کی پہلی قسم سے تھا۔ جہاں حضورؐ سب کچھ دیکھ رہے تھے حضورؐ کی ذات گرامی پر قرآن کا نزول وحی کی دوسری قسم میں ہے۔ جہاں حضورؐ وحی کو سن کر قرآن پاک کو اکٹھا فرما رہے تھے۔ وحی کا یہ سلسلہ حضورؐ کی ساری زندگی تک جاری رہا۔

جب آپ گھر تشریف لائے تو سارا واقعہ حضرت خدیجہؓ کو سنایا جو کچھ بھی آپ نے دیکھا، جو کچھ بھی آپ نے سنا اور جو کچھ بھی آپ پر گزری اس کا اظہار جوں توں کر کے اپنی رفیقۂ حیات کے سامنے کیا۔ آپ ہراساں اور پریشان تھے کہ کہیں مشاہدہ اور تجربہ آپ کو غلط راہ پر نہ بھٹکا دے۔ اس لیے کہ اس وقت کے زمانے میں خلافِ معمول باتیں بعض بعض لوگوں سے سرزد ہو جایا کرتی تھیں۔

جب حضرت خدیجہؓ نے ساری روداد سنی تو بڑے ہی جوش و خروش سے حضورؐ سے فرمایا کہ آپ کو مبارک ہو۔ جس کے ہاتھ میں خدیجہؓ کی جان ہے اسکی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ خدا نے آپ کو رسالت اور پیغمبری عطا فرمائی ہے آپ ہم سب لوگوں کے لیے پیغمبر اور رسول ہیں۔ خدا آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا وہ آپ کے خلوص اور آپ کی سچائی سے اچھی طرح سے واقف ہے۔

جب آپ کو کچھ سکون ہوا تو خدیجہؓ اپنے رشتہ دار ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ واضح رہے کہ ورقہ بن نوفل ایک مذہبی آدمی تھے۔ خدا کے متلاشی اور اسی شوق نے ان کو عیسائیت کی طرف بھی راغب کر دیا تھا۔ انہوں نے عیسائی مذہبی کتابوں کا عربی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ پر

Marfat.com

گزری ہوئی ساری باتوں کا ذکر ورقہ بن نوفل سے کیا اس سلسلے میں ان کی رائے دریافت کی ۔
ورقہ نے کہا کہ اگر یہ ساری باتیں سچ ہیں جو تم نے مجھ سے بیان کی ہیں ۔ تو یہ وحی اسی انداز کی ہے جیسی حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی ۔ محمدؐ سے جاکر کہو کہ مبارک ہو۔ خدا نے ان کو رسالت اور پیغمبری سے سرفراز فرمایا ہے ۔

حضرت خدیجہؓ نیسات اپنے مکان واپس ہوئیں۔ ورقہ نے جو کچھ بیان کیا بے کم وکاست حضورؐ کے آگے بیان کر دیا ۔ ورقہ اور حضرت خدیجہؓ کی ہمت افزائی نے حضورؐ کے حوصلے بہت بلند کر دیے

ابن اسحٰق اور طبری کے بیان کے مطابق حضورؐ نے یہ فرمایا کہ پہلی وحی لانے والے جبرائیل تھے ۔ بہت سے علماء کا بیان ہے کہ مکہ کے ابتدائی دور میں نزول قرآن کے دوران کسی جگہ بھی جبرائیلؑ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے حضرت عائشہؓ کے بیان کے مطابق وحی میں صرف حق کا نزول ہوا تھا ۔ یہی وہ حق تھا جس نے سورۂ اقراء کی تلاوت حضورؐ سے کروائی اور حضورؐ کو رسالت عطا فرمائی ۔ اسی لیے ہم نے بھی ابتدائی سطروں میں جہاں حضورؐ کی بعثت کا ذکر ہے جبرائیلؑ کے نام سے احتراز کیا ہے اور صرف حق یا وحی لانے والے کے الفاظ استعمال کیے ہیں ۔

مغربی دنیا میں حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو ہر زمانے نے اپنے اپنے طریقوں سے پیش کیا ۔ عجیب وغریب تاویلات کی جاتی رہیں ۔ قرون وسطیٰ میں حضورؐ کو نعوذ باللہ ایک گنہگار کی شکل میں پیش کیا جاتا رہا ۔ اٹھارویں صدی میں جبکہ حقیقت شناسی عام ہو رہی تھی ۔ حضورؐ کو ایک عقلمند، قانون داں اور اپنی ہر بات کو منوانے والے کی صورت میں پیش کیا گیا ۔ اب ہمارے اپنے عہد میں اور خصوصاً روس میں اسلام کی ابتداء اور اس کی نشو ونما کا باعث محض اس بات کو سمجھا گیا کہ مکہ کے عام آدمی یعنی مزدور طبقہ وہاں کا سرمایہ دار بورژوا طبقے کے خلاف کھڑا ہو گیا تھا اور مزدور طبقے کو اکٹھا کر کے سرمایہ داروں سے لڑانے کے فرائض ذاتِ رسالتؐ نے اپنے ذمے لیے اور اس میں حضورؐ کو کامیابی ہوئی ۔ سرمایہ داروں کا استحصال ہوا ۔ مزدور طبقہ خوشحال ہوا ۔ جیسے کارل مارکس یا لینن ایک انقلاب کا باعث ہوئے اسی طریقے سے محمدؐ بھی ایک کامیاب انقلابی تھے ۔ ہر وقت مصنفین اور دیگر لکھنے والوں

Marfat.com

نے اپنے وقت کے انداز سے فکر و نظر کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں کرنے کی کوشش کی۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قاری جو چاہے نتیجہ اخذ کرے لیکن اس حقیقت سے انکار کرنا محال ہے کہ حضورؐ کی ذات گرامی میں وہی مشابہت ہے جس کا ذکر توریت اور انجیل میں انبیاء کے تعلق سے ہے۔ سارے انبیاء کی صفات حضورؐ میں جمع ہو گئی تھیں ایسی ہی چند خصوصیات ہم عیسائی اولیا اور ہندو مذہب کے اوتاروں میں دیکھتے ہیں۔

حضورؐ پر غیب کے جو اسرار ظاہر ہوا کرتے تھے اسی قسم کے اظہار کا ذکر توریت اور انجیل میں بھی آچکا ہے جو نبیوں سے تعلق رکھتا ہے ان ہی اسرار کا افشاء انبیاء اور رسولوں کی پیغمبرانہ زندگی کا ابتدائیہ ہوتا ہے۔

علم غیب سے آشنائی اور الہام و وحی کا سلسلہ پرانا رہا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ الہام وحی سے آشنا لوگوں میں باوجودیکہ ان کے درمیان ہزاروں سال کا فصل ہے اور ایک دوسرے کی جائے پیدائش میں بھی ہزاروں میلوں کا فاصلہ ہے الہام و وحی کی یکسانیت ضرور پائی جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے الہام و وحی سے قطعی ناواقف ہوتے تھے بلکہ ایک دوسرے کے وجود تک سے بھی لاعلم رہتے تھے لیکن ان کی واردات قلبی مشترک ہوا کرتی تھی۔ ایک بات کی طرف قاری کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ حضورؐ کے انتقال کے بعد اسلام اور عیسائیت میں ایک ہزار سال تک جنگ ہوتی رہی ان جنگوں کی حیثیت سیاسی رہی ہے۔ ان کی وجہ اصل میں عربوں اور بازنطینی سلطنتوں کی آپس میں رقابت رہی ہے۔ مذہبی یا اخلاقی اصولوں کی خاطر یہ جنگیں نہیں لڑی گئیں۔

ان سیاسی جنگوں نے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان اتنے اختلافات اور ایک دوسرے سے اتنی نفرت پیدا کر دی کہ یورپ میں حضورؐ کے خلاف بغض و عناد کا ایک بھرپور جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس کا ایک بیّن ثبوت یہ بھی ہے کہ سارے ایک ہزار سالہ دور میں عیسائی برابر مسلم ممالک میں رہتے چلے آئے ہیں۔ اس کے برخلاف مسلم ممالک میں رہنے والے عیسائیوں کو بھی عیسائی حکومتیں دشمنوں کی نظر سے دیکھتی رہیں۔ اگر یہ جنگیں مذہبی نوعیت کی ہوتیں تو عیسائیوں کا مسلم ممالک میں رہنا ناممکن ہوتا۔ چونکہ

Marfat.com

جنگوں کی نوعیت مذہبی نہیں تھی بلکہ سیاسی تھیں اسی لیے عیسائی بڑے آرام کے ساتھ مسلم ممالک میں اپنی زندگی گزارتے آرہے ہیں ۔

اسی بغض و عناد کا نتیجہ تھا کہ یورپ میں صدیوں تک حضورؐ کی شخصیت کو عجیب و غریب روپ میں پیش کیا جاتا رہا۔ کچھ عرصے سے مغربی مصنفین کوشش کر رہے ہیں کہ تاریخ پر جو گرد و غبار ہے اسے صاف کریں اور حقیقت شناسی کے ساتھ اسلامی تاریخ کو پیش کریں ۔

عیسائیت اور یہودیت کی اشاعت جن طریقوں سے عمل میں آئی تھی انہی راستوں سے اسلام نے بھی اپنے آپ کو دنیا کے آگے پیش کیا۔

اسلام کے تعلق سے تو بعض مغربی مصنفین کا کہنا ہے کہ یہ عیسائیت کا چربہ ہے جو کلیسا کے بعض اصولوں پر خاص طور پر زور دیتا ہے ۔ جہاں تک اسلام کے بنیادی اصولوں کا تعلق ہے اور خصوصاً وہ اصول جو اسلام کے ابتدائی دور میں پیش کیے گئے تھے عیسائی اصولوں سے بہت ہی مشابہ ہیں مثلاً انسان کو جو نعمتیں بارگاہِ خداوندی سے عطا ہوئی ہیں ان نعمتوں میں کائنات کا ذرہ ذرہ شامل ہے ۔ خود انسان کی پیدائش اللہ کی مہربانی ہے ۔ بارش، پھول، پھل، ترکاریاں، غذاؤں کی فراہمی، موسم کا انسانی فطرت سے تطابق یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ کی انسان پر مہربانی ہے ۔ خدا کی بارگاہ میں سجدۂ عبودیت انسانی فرائض میں شامل ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ عبدیت کا احساس اپنی جگہ باقی رہے ۔ سزا اور جزا پر ایمان اور ان کے بنیادی اصولوں میں اسلام اور عیسائیت میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا ۔

اس کتاب کا مقصد صرف یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کو من و عن بیان کر دیا جائے ۔ اس کے لیے رواداری ضروری ہے ۔ تعصب کا گزر کسی بھی گوشے سے نہ ہو سکے میں پڑھنے والوں سے التماس کروں گا کہ جہاں پر حضورؐ کی ذات گرامی پر وحی یا الہام کا ذکر ہے اسے پڑھ کر اپنے دل میں وسوسے پیدا نہ کریں ۔ تعصب اور تنگ نظری کی عینک لگا کر وحی و الہام کو جانچنے کی کوشش نہ کریں ۔ وحی نبوت کا خاصہ رہی ہے اور ہر زمانہ کے اور ہر مذہب کے پیغمبر کو وحی اور الہام سے سابقہ پڑا ہے ۔

Marfat.com

یادگار تاریخیں

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش	۵۷۰ء
حضور کی حضرت خدیجہؓ سے شادی	۵۹۵ء
بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں کے درمیان عظیم معرکے	۶۰۲ء سے ۶۲۸ء
نبوت سے سرفرازی	۶۱۰ء

Marfat.com

آزمائش کا زمانہ

حضورؐ کی نبوت پر سب سے پہلے ایمان لانے والی حضرت کی بیوی خدیجہؓ ہیں۔ دستِ مبارک پر ایمان لانے کے بعد سے اپنی وفات تک جو نو سال کا زمانہ رہا ہے حضرت خدیجہؓ کے ایمان میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا رہا۔ حضرت خدیجہؓ کے قدم کبھی بھی ڈگمگائے نہیں۔ جب کبھی دن میں حضورؐ کو لوگوں کی بدتمیزیوں سے سابقہ پڑتا اور شام میں جب آپ گھر واپس آتے تو آپ پر ایمان لانے والی کو اپنے گھر میں پاتے جو آپ کو دلاسا اور تسلی دیتیں اور حضورؐ کی ہمت بڑھاتیں۔

نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک حضورؐ پر وحی والہام کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ اس کی وجہ سے بعض اوقات آپ پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی، دل مکدر رہنے لگتا تھا۔ آپ متفکر ہو جاتے تھے۔ وحی کے التواء کے زمانے کا تعین کرنا مشکل ہے۔ راویوں کا بیان ہے کہ یہ سلسلہ دو سے تین سال رہا۔ قرآن پاک کی ایک آیت اس موقوفی وحی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سورۂ ضحیٰ کی تیسری آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "تمہارے پروردگار نے نہ تم کو چھوڑا اور نہ ہی تم سے ناراض ہوا۔"

یہاں پر قرآن کے تعلق سے کچھ لکھ دینا ضروری ہے۔ حضورؐ کی ذات گرامی پر وحی والہام کا جو سلسلہ جاری رہا ان سب کو ایک کتابی صورت دی گئی۔ یہی کتاب قرآن کے نام سے موسوم ہے انجیل کے برخلاف قرآن ایک ایسا تسلسل ہے جس میں اللہ نے اپنے الفاظ اپنے پیغمبر محمدؐ کی زبان سے

Marfat.com

چوبیس سال کی مدت میں ادا کروائے۔ ان سب الفاظ کو قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

قرآن کی ابتدائی آیتیں اس وقت نازل ہوئیں جب کہ آپؐ کی ذات گرامی کو ایک پیغمبر اور رسول کی حیثیت سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ آیتیں یا تو حضورؐ کو یاد تھیں یا پھر آپ کی زوجہ کرمہ حضرت خدیجہؓ کو یا پھر علیؑ ابن ابی طالب یا زیدؓ بن حارثہ ان آیات سے واقف تھے۔

بعد میں جب آپؐ کا عروج ہوا تو آپ پر نزول شدہ وحی کو آیتوں کی صورتوں میں لوگوں نے جمع کرنا اور حافظہ میں محفوظ کرنا شروع کر دیا جو لوگ لکھنا جانتے تھے کتابی صورت میں محفوظ کرنے لگے تمام آیات ایک کتاب کی صورت میں نہیں تھیں۔ چیدہ چیدہ سورتوں اور آیتوں کو مختلف لوگ اپنے اپنے پاس رکھ کر رکھ لیا کرتے تھے۔ ان تمام چیدہ چیدہ سورتوں اور آیتوں کو ایک جگہ اور ایک کتاب کی صورت میں حضورؐ کی وفات کے کئی ایک سال بعد کیا گیا۔

جب ان سورتوں اور آیتوں کو جمع کیا جا رہا تھا لوگوں کے لیے یہ ناممکن ہو گیا کہ تمام سورتوں کو واقعاتی ترتیب میں اکٹھا کیا جائے۔ نتیجہ کے طور پر ایک درمیانی صورت نکالی گئی۔ جو آیتیں اور سورتیں طویل تھیں ان کو قرآن کی ابتداء میں رکھ گیا اور جو سورتیں مختصر تھیں ان کو آخری حصے میں جگہ دی گئی حالانکہ واقعاتی نقطہء نظر سے قرآن کی یہ ترتیب الٹی تھی۔ حضورؐ کی نبوت کے ابتدائی دور میں مکہ میں نازل شدہ آیتیں مختصر سی تھیں۔ شاعرانہ حسن تھا۔ جذبات سے اپیل کرتی تھیں۔

حضورؐ کے آخری زمانہ میں جب کہ آپ مذہبی رہنما کے علاوہ ایک سیاسی اور فوجی رہبر کی جگہ بھی حاصل کر چکے تھے آپ پر طویل سے طویل سورتوں کا نزول ہوا کرتا تھا جس میں مسلم معاشرہ سے تعلق رکھنے والی ہر بات کھُل کر بیان کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس بات کا ثبوت بھی فراہم کرنا مشکل ہے کہ آیا ایک سورۃ کا نزول ایک ہی وقت میں ہوا تھا یا مختلف اوقات میں ایک سے زیادہ بار۔

ایک ہی سورۃ میں مختلف موضوعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۃ کا عنوان رکھنے میں بھی ایک پیچیدگی یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس سورۃ میں اُسی عنوان سے ہٹ کر بھی بہت سی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔

Marfat.com

بعض اوقات ایسی آیتیں نازل ہوتی ہیں جو پہلے کی آیتوں کی تنسیخ کر دیتی تھیں۔ قرآن کے دوسرے سورۃ یعنی سورۃ البقرہ کی ۱۰۶ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے: "ہم جب آیت کو منسوخ کر دیتے یا اُسے فراموش کروا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ہر بات پر قادر ہے۔" جیسا جیسا وقت گزرتا جاتا ہے حضورؐ پہلے کی نازل شدہ آیتوں کو بعض اوقات بھول جاتے تھے لیکن وہ آیات حضورؐ کے حلقہ بگوشوں کو یاد رہتی تھیں اس لیے کہ وہ اُن آیات کو لکھ لیا کرتے تھے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ساری زندگی کبھی بھی کوشش نہیں کی کہ خدا کو فلسفیانہ طریقے سے عوام کے سامنے پیش کریں جیسا کہ موجودہ زمانہ کے اکثر صاحبان علم کا دستور رہا ہے کہ خدا کی ہستی کو منطقی طور پر ثابت کرنے کی کوشش کریں۔

پیغمبر کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ خدا کی ذات کی اس طرح سے جستجو کرے کہ اس کی ذات کو سائنٹیفک طریقے سے باثبت اور منفی بنیادوں پر پیش کرے۔ پیغمبر اپنے خدا کو بہرحال جانتا ہے۔ خدا اور پیغمبر کے آپس کے تعلق کی نوعیت بالکل ہی جداگانہ ہے۔

پیغمبر اپنے خدا کو حاکمِ کل جانتا ہے۔ اس کو اس بات پر پورا یقین رہتا ہے کہ اللہ جب چاہے اپنے حکم میں ردوبدل کر سکتا ہے

حضورؐ کی وفات کے بعد جب مسلم مفکرین کا ربط دوسرے ملکوں کے فلسفیوں اور صاحبانِ علم سے بڑھنے لگا تو ان مسلم مفکرین نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ وہ یہ کہنے لگے کہ قرآن لوحِ محفوظ کی صورت میں ازل سے جنت میں محفوظ ہے اور ابد تک رہے گا۔

اس قسم کا خیال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی نہ آیا ہوگا۔ اس لیے کہ حضرت کا ذہن فلسفیانہ نہیں تھا۔ سیدھی سادی بات کے حضورؐ قائل تھے۔ اپنی ہر بات کو ذاتِ رسالت نے سیدھے سادے الفاظ میں پیش کیا۔

جبر و اختیار کے مسئلہ کو بھی مسلم فلسفیوں نے ایسا دقیق سے دقیق تر بنایا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

Marfat.com

حضورؐ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ خدا نیک و بد دونوں کا خالق ہے۔ خدا کے علم میں نیکوں کی نیکی اور بدوں کی بدی ہمیشہ رہتی ہے۔

دوسری جگہ حضورؐ نے فرمایا کہ انسان کی نجات انسان کے اپنے عمل پر موقوف ہے۔

پیغمبر سیدھے سادھے ہوتے ہیں۔ اللہ کے اس پیغمبر نے جبر و اختیار کے پورے مسئلہ کو سیدھے طریقے سے اپنی امت کے آگے رکھ دیا۔ اس مسئلہ کے حل کرنے کو مسلم فلسفیوں اور مفکرین نے اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا۔

یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ قرآن کوئی ایسی نصابی کتاب نہیں ہے جس میں صرف عقلیات اور اخلاقیات پر جزوی یا کلی طور پر بحث کی گئی ہو۔

۶۱۰ء سے ۶۳۲ء کا زمانہ جو حضورؐ کی نبوت کے ۲۳ سال پر مشتمل ہے بہت ہی بڑے بڑے اور اہم مسائل کو حل کرنے میں گزرا ہے جب کبھی حضورؐ کو کوئی دقت پیش آتی تھی تو آپ خدا سے رجوع کرتے تھے۔ اس مسئلہ کا حل خدا کی طرف سے ہوتا تھا۔ وہ سورت یا آیت جو حضورؐ کے ایک خاص مسئلہ کے حل کا باعث ہوتی تھی قرآن کا حصہ بن جاتی تھی۔ یہی قرآن بعد میں چل کر اسلامی قانون کی صورت اختیار کر گیا۔

ایک مرتبہ ایک عورت حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ شکایت کی کہ اس کو وراثت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس شکایت کے پیش نظر حضورؐ پر وحی نازل ہوئی جس میں اس عورت کی شکایت کا حل پیش کیا گیا۔ بعد میں یہی شکایت اور شکایت کا ازالہ مسلم قانون کا جزو بن گیا جو اب تک ہر مسلمان کے لیے قابل تعمیل ہے۔

قرآن کو سمجھنے کے لیے حضورؐ کی زندگی کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ حضورؐ کی زندگی کے واقعات کو پیش نظر رکھنا لازم ہے۔

ایک طالب علم جو قرآن کو پڑھنا چاہے اور وہ حضورؐ کی زندگی سے ناواقف ہو اور حضورؐ کے زمانے کے واقعات سے لاعلم ہو تو وہ قرآن کو کچھ بھی سمجھ نہیں سکے گا۔

قرآن کے پڑھنے کو قرادت کہتے ہیں۔ قرادت ہو سکتا ہے کہ آج کے مغربی یا مغرب زدہ طالب علم کو اپنی طرف راغب نہ کرے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن نے اشاعتِ اسلام اور تبلیغ میں بہت ہی اہم حصّہ ادا کیا ہے۔ جب قرآن کو بہ آواز بلند پڑھا جاتا تھا تو لوگوں پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ قرآن کی عظمت اُن کے دلوں میں اس طرح رچی ہوئی تھی کہ قرادت کے وقت لوگ ہیبت سے کانپنے لگتے تھے۔ جنگجو اور بہادر سپاہیوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے، ان پر غشی طاری ہو جاتی تھی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی اور ہی عالم میں گم ہو جاتے تھے۔ بہت سے ایسے واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن میں مسلمانوں کا قرآن کی آیتوں سے اتنا متاثر ہونا بیان کیا گیا ہے جن سے ان کی دفعتاً موت واقع ہوئی خصوصاً ان آیتوں پر جن میں دوزخ وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان واقعات میں چاہے کتنی ہی مبالغہ آرائی کی گئی ہو، قرآن کی اثر پذیری سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

میرا اپنا مشاہدہ رہا ہے کہ ہنگامی صورتِ حال میں عرب کے بدوی انتہائی سکون اور اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے برخلاف انہی حالات میں یورپین اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ ہنگامی صورتِ حال کا خندہ پیشانی سے استقبال عربوں کی ایک خصوصیت رہی ہے اس وضعداری اور خندہ پیشانی کی تہہ میں اضطراب اور جذباتی طوفان چھپا رہتا ہے۔ ان خصوصیات کا فقدان ہم کو یورپین لوگوں میں نظر آئے گا۔

قرآن لوگوں کے جذبات میں نہ صرف ایک تلاطم پیدا کرتا ہے بلکہ سننے والوں کے دلوں میں اپنی ہیبت بھی بٹھاتا ہے۔ ساتویں صدی کے عرب سیدھی سادی ذہنیت کے مالک تھے۔ ان کے یقین کے مطابق وہ قرآن کو خدا کا کلام اس طرح سمجھتے تھے جو ان میں ہیبت اور ڈر پیدا کرتا تھا دوزخ کے بیان سے وہ اتنے ہیبت زدہ ہو جاتے تھے کہ بعض اوقات وہ صرف اُسی کے تصور اور خیال سے بے ہوش ہو جاتے تھے۔ بعض کی دل کی حرکت بند ہو جاتی تھی اور انتقال کر جاتے تھے۔

حضورؐ بذاتِ خود دوزخ کے خیال سے بہت گھبراتے تھے۔ خصوصاً نبوت کے ابتدائی زمانے میں جب کہ دوزخ کا ذکر اکثر قرآن میں آیا ہے اس موضوع نے حضورؐ کو کافی متاثر کیا۔ بعض مواقع پر آپ نے زمین کی تباہی، زلزلہ آسمان سے آگ کے برسنے کا بھی ضمنی طور پر بطور عذاب ذکر فرمایا ہے۔

گزشتہ کچھ عرصے سے مغرب کے عیسائیوں کے نزدیک دوزخ کی وہ اہمیت نہیں رہی جیسی ان کے پیش روؤں میں تھی۔

جہاں تک خوف اور ڈر کا تعلق ہے عیسائیت کی بنیادوں میں سے یہ ایک اہم بنیاد ہے ایک بڑے پادری TOR ANDRAE کے بیان کے مطابق چھٹی صدی عیسوی میں کلیسا میں دوزخ کا جو تصور تھا وہ وہی تھا جو حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے بیان کے مطابق لوگوں کے آگے رکھا۔ کلیسا کے دوزخ اور اسلام کے بیان کردہ دوزخ دونوں کے خاکوں میں ہو بہو مشابہت ہے۔

خوف اور ڈر حضورؐ کی تعلیمات کی بنیاد رہی ہے۔ آپ کا یقین تھا کہ گنہگار کو ہمیشہ ڈرنا چاہیئے۔ خوف اور ڈر کے تعلق سے آپ نے جو بیان فرمایا ہے، اسی قسم کا بیان شام کی عیسائیت کی تعلیم رہی ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ پہلی وحی کے بعد دو تین سال تک آپ پر پھر کوئی وحی نہیں آئی۔ اس وقفے کے بعد وحی کا سلسلہ جو آپ پر شروع ہوا وہ آپ کی وفات تک برقرار رہا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ وحی خدا کی طرف سے آتی ہے اور قرآن خدا کا کلام ہے۔

قرآن پڑھتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رہے کہ ناطق خدائے عز و جل ہے مختلف لکھنے والوں نے اس بات کی کوشش کی کہ قرآن کے نزول کو مختلف عنوانات کے تحت پیش کیا جا سکتا۔

Marfat.com

روایات کے مطابق جب حضورؐ سے دریافت کیا جاتا کہ وحی کا نزول کس طرح سے ہوتا تھا تو آپ جواب میں فرماتے کہ ایک گھنٹی کی سی آواز آتی ہے جب گھنٹی کی آواز ختم ہو جاتی تو آپ خدا کے کلام سے واقف ہو جاتے یا واقف کروا دیئے جاتے۔ یہ جواب اس بات کی ترجمانی نہیں کرتا کہ واقعی آپ خدا کا کلام الفاظ کی صورت میں سنتے تھے بلکہ اس گھنٹی کی آواز کے دوران آپ کے ذہن پر مختلف موضوع نقش ہو جاتے تھے بعد میں آپ ان کی صراحت فرما دیتے تھے یا اپنے الفاظ میں مضمون کو ادا فرما دیتے تھے۔

بعض روایات کے مطابق خدا اپنے پیغمبر سے پس پردہ ہم کلام ہوتا تھا ان موقعوں پر آپ لفظ بہ لفظ ہر بات کو سنتے تھے۔ ان خدائی الفاظ کو اپنے حافظہ میں محفوظ رکھتے تھے۔ پھر لوگوں کے سامنے بیان فرماتے تھے۔

تیسری صورت وحی کے نزول کی یہ تھی کہ خدا اپنے فرشتہ جبرئیلؑ کو انسان کے بھیس میں حضورؐ کی خدمت میں روانہ کرتا تھا اور اپنے پیغمبر سے ہم کلام ہوتا تھا۔

ان تینوں صورتوں میں پیغمبر کو وحی کے نزول کا فوری علم ہو جاتا تھا۔ عام طور سے حضورؐ کملی یا دوشالے کو اپنے اوپر ڈالے رکھتے تھے جس وقت وحی کا نزول ہوتا تھا انتہائی سردیوں کے زمانے میں بھی آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے۔ وحی کے نزول کے فوری بعد آپ بیٹھ جاتے اور اللہ کی طرف سے آئے ہوئے الفاظ کا اعادہ فرماتے تھے۔

بعض اوقات وحی کا نزول اس وقت بھی ہوتا تھا جب کہ آپ سفر میں ہوتے تھے اونٹ پر سفر کرتے ہوئے یا کسی بڑے مجمع سے خطاب کے وقت بھی حضورؐ پر وحی نازل ہوتی۔ بعض اوقات لوگ جب سوال کرتے تھے تو جواب تک بھی وحی کے نزول کے مطابق دیا جاتا تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ حضورؐ پر جو وحی نازل ہوتی تھی اس کی مشابہت حضرت موسیٰؑ پر نازل کردہ وحی سے بہت زیادہ ہے۔ مثلاً توریت میں ہے" خدا نے موسیٰ سے کہا کہ کہہ دو ان اسرائیلی بچوں سے کہ جب خدا زمین پر آئے گا"! یا پھر دوسری جگہ ذکر ہے" وہ تم سے پوچھتے

Marfat.com

ہیں کہ ان کے لیے کون کون سی چیزیں جائز ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ ساری اچھی اور پاک چیزیں ان کے لیے جائز ہیں۔"

تیسری جگہ اللہ فرماتا ہے کہ "ان اسرائیلیوں سے پوچھو کہ ہم نے تم کو کیسی کیسی نشانیاں دی ہیں"

توریت میں جہاں خدا موسیٰ سے ہمکلام ہے صریحاً موجود ہے کہ خدا نے موسیٰ سے کہا لیکن قرآن میں ہر آیت کے آگے خدا نے محمدؐ سے کہا کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ سارا قرآن خدا کا کلام ہے اور ہر آیت خدا کی کہی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود توریت اور قرآن کا انداز بیان بہت ملتا جلتا ہے۔ دونوں جگہ خدا براہِ راست اپنے بندوں سے مخاطب ہے۔ اس کے حکم براہِ راست اس کے بندوں تک پہنچ رہے ہیں۔

قرآن میں موسیٰ کا جتنی بار ذکر آیا ہے کسی اور فرد کا نہیں۔ حضورؐ خود اپنے آپ کو زمرہ پیغمبران میں شامل کرتے تھے اور موسیٰ اُسی زمرہ کے ایک فرد تھے۔

اس بات کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو اپنے گھر والوں میں شامل کر لیا تھا تاکہ اس طرح سے اپنے چچا ابی طالب کی مدد کر سکیں۔ حضورؐ کو جب نبوت سے سرفراز کیا گیا تو حضرت علیؓ کی عمر دس سال کی تھی اور اس دس سالہ بچے کو یہ فخر حاصل رہا کہ مردوں میں مسلمان ہونے والوں میں سب سے پہلا نمبر اُسی کا رہا۔ وحی کے اترنے کے چند دن بعد حضورؐ نے نماز کی ابتداء کی۔ حضرت عائشہؓ کے قول کے مطابق خدا نے حضورؐ کو حکم دیا تھا کہ نماز دو رکعت پر مشتمل ہو بعد میں اس میں اضافہ کیا گیا۔ تین اور چار رکعتوں پر مشتمل نمازیں پڑھی جانے لگیں۔

روایات کے مطابق حضورؐ اپنے کمسن بھتیجے حضرت علیؓ کو ساتھ لے کر مکہ کے باہر پہاڑیوں سے گھری ہوئی وادیوں کا رخ کرتے تھے جہاں پر آپ تنہائی میں عبادت فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ ہی کے قول کے مطابق ایک دن جب کہ حضورؐ نماز ادا فرما رہے تھے اچانک ابو طالب وہاں پہنچ گئے اور تعجب سے حضورؐ سے دریافت کیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ خدا نے آپ کو پیغمبر بنا کر اس دنیا میں روانہ کیا تاکہ آپ انسانوں کو انسانیت کی تعلیم دیں اور اپنے مذہب کو اس تعلیم

Marfat.com

کا ذریعہ بنائیں۔ آپ نے اپنے چچا سے اسی موقع پر درخواست کی کہ وہ آپ کے مذہب کو قبول کر لیں تاکہ ان کی رہنمائی، سرپرستی اور مدد سے حضورؐ کے کام میں آسانی ہو۔ ان بڑے حضرت نے جواب دیا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے پائے ہوئے مذہب کو ترک کر کے ایک نئے مذہب کو قبول کرنے سے قاصر ہیں اور نہ ہی وہ اس بات کے لیے تیار ہیں کہ عبادت کا کوئی اور طریقہ اختیار کریں جیسا کہ نماز۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ابو طالب نے حضورؐ کو یقین دلایا کہ وہ حضورؐ کی کسی بھی طریقے سے مخالفت نہیں کریں گے۔

حضرت عائشہؓ کی بیان کردہ یہ روایت ابو طالب کی شخصیت کو ابھار رہی ہے کہ کس طرح وہ اپنے پرانے عقیدے پر جمے ہوئے تھے اور اس کا اظہار کتنی بے باکی سے کر دیتے تھے اس کے باوجود وہ حضورؐ کی ذات کے لیے ایک بڑا سہارا بنے رہے۔ اپنے بھتیجے کے کاموں میں ہر طرح سے دلچسپی لیتے تھے اور ان کے مشن کی ہمت افزائی کرتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ اور حضرت علیؓ کے بعد اسلام لانے والوں میں زیدؓ ابن حارثہ ہیں۔ ان کے تعلق سے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ ایک غلام لڑکا تھا جس کو حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ کی نذر کر دیا تھا۔ اور حضورؐ نے اس غلام کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔

اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کرنے والوں میں چوتھا نمبر ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کا تھا جس کا تعلق قبیلہ قریش کی ایک جماعت بنی تیم سے تھا۔ اس آدمی کا نام عتیق تھا، لیکن بعد میں یہی عتیق سارے عالم میں ابو بکرؓ کے نام سے مشہور ہوا، ان کے والد کا نام ابو قحافہ تھا۔

حضرت ابو بکرؓ ایک مالدار تاجر تھے اگرچہ کہ ان کا شمار عرب کے امیر ترین لوگوں میں نہیں ہوتا تھا وہ عوام میں کافی مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ نسب ناموں اور شجرہ نویسی سے انہیں کافی دلچسپی تھی۔ اس فن کے وہ امام مانے جاتے تھے۔

بہت سی باتیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ حضورؐ طبعاً خلوت پسند تھے، شہرت اور نام و نمود کو ناپسند کرتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ کے مشورے سے

Marfat.com

آپ اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ اپنے مذہب کی خفیہ طریقے سے پیروی کی جائے۔ جیسے ہی حضرت ابو بکرؓ اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے راز داری کی مخالفت کی۔ وہ خود علانیہ پرچار کے شائق تھے۔

۶۱۰ء میں حضرت ابو بکرؓ کی عمر ۳۷ سال تھی جب کہ حضورؐ کا سن مبارک ۴۰ سال حضورؐ حضرت ابو بکرؓ سے عمر میں تین سال بڑے تھے۔

جن چار لوگوں نے اب تک اسلام قبول کیا تھا اُن میں نسبتاً سب سے زیادہ تجربہ کار اور پختگیٔ عقل کے مالک حضرت ابو بکرؓ تھے۔ ان چاروں کے بعد اسلام لانے والوں میں حضورؐ کے ایک رشتہ کے بھائی زبیرؓ ابن العوام ہیں۔ یہ ابھی بیس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے۔ ان کے بعد سعدؓ ابن ابی وقاص مسلمان ہوئے۔ ان کی عمر صرف ۱۷ سال تھی۔ یہ تیر بنانے کی مشق کیا کرتے تھے۔ آگے چل کر ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلام کس طرح نوجوانوں کی تحریک اور ان کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔

بہت سے تاریخ دانوں نے اس بات کو اس زمانے کے معاشی بحران کا نتیجہ قرار دیا ہے قریش اصل میں ایک خانہ بدوش قبیلہ تھا۔ اس قبیلے کی اکثر جماعتیں معاشی ابتری کا شکار تھیں یہ معاشی ابتری نہ صرف اس وقت کی خانہ بدوش زندگی کا خاصہ تھی بلکہ چودہ سو سال بعد بھی یعنی ہمارے اپنے زمانے میں خانہ بدوش قبیلوں کی زندگی اور معاشی بدحالی لازم و ملزوم نظر آتی ہے۔

بعضوں نے مکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان میں قصی کا ذکر اوپر آچکا ہے جو حضورؐ کی بعثت سے تقریباً دو سو سال بعد مکہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ ابتدا میں لوگوں کو صرف حج کروانے کی ذمہ داری اس قبیلے نے اپنے سر لی تھی۔

۵۲۵ء میں جب حبشہ کی فوجوں نے حمیریوں کی بلند اقبالی کا خاتمہ کر دیا تو قریش نے تجارت میں ان کی جگہ سنبھالنی شروع کر دی۔ نتیجتاً چند مخصوص خاندانوں میں خوشحالی آئی۔ ان خوشحال گھرانوں میں بنی مخزوم، بنی عبد مناف قابلِ ذکر ہیں۔ باقی لوگ اسی پرانی مفلسی کا شکار رہے۔

امارت اور غربت کی آپس میں رقابت نے نوجوانوں کو اس بات کی رغبت دلائی کہ کسی نئی تحریک کی ابتدا کریں۔

چونکہ یورپ میں گزشتہ کچھ عرصے سے دنیا کی ہر بات کو معاشیات کی ترازو میں تولا جاتا ہے اس لیے اسلام کی تاریخ بھی اسی نظریہ کی زد میں آگئی۔

جہاں تک میرے مشاہدہ کا تعلق ہے میں نے غریب سے غریب اور امیر سے امیر عربوں کے درمیان زندگی گزاری ہے اور میرے طویل ترین قیام کے دوران مجھے کبھی کوئی ایسا اتفاق نہیں ہوا جس کی بناء پر کہا جا سکے کہ کسی غریب نے کسی امیر کو دیکھ کر حسد کیا ہو۔

مغربی ممالک کے لوگوں کے ذہن میں یہ بات مشکل ہی سے آئے گی کہ بغیر دولت کے بھی لوگ زندہ رہتے ہیں۔ دولت کی اُن لوگوں کو نہ تو خواہش رہتی ہے اور نہ ہی دولت کے نہ رہنے کا غم آج کے مادی اور معاشی نظریات کا اطلاق ۱۳۰۰ سو سال پہلے کے زمانے پر کرنا تاریخ پر اگر ظلم کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

عربوں میں رقابت کا مادہ ہمیشہ سے رہا ہے لیکن دولت رقابت کی بنیاد کبھی نہیں رہی۔

اس بات سے ہم بھی متفق ہو سکتے ہیں کہ قریش نے جب خانہ بدوش زندگی کو خیرباد کہہ کر مکہ میں سکونت اختیار کر لی تو ہو سکتا ہے کہ ان کے طرز رہائش کی تبدیلی نے اس وقت کے اور لوگوں کو ان کے خلاف اس بات پر اکسایا ہو کہ قریش نے اپنے اپنے آبائی طرز رہائش کو خیرباد کہہ کر نئی طرز رہائش کیوں اختیار کر لی۔ نئی طرز رہائش کی وجہ سے ان کے رسم و روایات میں بھی تبدیلی آئی ہو گی۔ یہ تبدیلی ہو سکتا ہے کہ اس وقت کے نوجوانوں کو بھی بری لگی ہو۔

موجودہ زمانے میں معاشیات ہماری ہر بات پر چھائی ہوئی ہے۔ جب بھی ہم تاریخی واقعات کو دہرانے ہیں یا بیان کرتے ہیں تو اس بیان پر بھی موجودہ معاشی نظریات کی چھاپ پڑنے لگتی ہے۔ مشرق نے کبھی بھی مادی دولت کی پرستش نہیں کی۔ مغرب ہمیشہ سے دولت کا پجاری رہا۔ مشرق نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ خوشی کی بنیاد دولت کبھی نہیں رہی۔ دولت مند کی خوشی اور مفلس کی خوشی کے پیمانے مختلف ضرور ہیں لیکن خوشی دولت مند اور مفلس دونوں کو حاصل ہو سکتی ہے۔ مشرق میں غربت اور افلاس کا پہلا سبب قدرت

Marfat.com

رہی ہے۔ مشرق میں رہنے والوں کو بڑی بڑی زمینیں میسر ہیں۔ جانور ان کے مونس و مددگار ہیں کھلی فضاء میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ کاشت کاری پر گزارہ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف مغرب میں انسانوں کے بنائے ہوئے ایوان کھنڈروں میں تبدیل ہوتے رہے اور پھر کھنڈر ایوانوں میں کچھ کھنڈروں میں رہنے کے عادی ہوگئے اور کچھ نے ایوانوں ہی کو حاصل زندگی سمجھ لیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ابتدائی اسلام لانے والوں میں قریش کے نوجوانوں کے علاوہ باقی کی اکثریت یا تو غلاموں پر مشتمل تھی یا پھر غریب لوگوں پر۔ اسی حقیقت کا اطلاق تقریباً سب ہی مذہبی تحریکوں پر ہوتا ہے۔ با اقتدار، دولت مند اور اونچے طبقہ کے لوگ اپنے اثر و اقتدار، دولت، ثروت، شان و شوکت اور دنیاوی نعمتوں پر نازاں ہوا کرتے ہیں۔ مذہبی تحریکات ان لوگوں کو ابتداء میں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتیں۔

سینٹ پال نے کہا ہے کہ عیسائیت ابتداء میں اپنے وقت کے عقل مندوں، دولت مندوں، حکمرانوں اور امیروں کو اپنی طرف راغب کرنے میں ناکام رہی لیکن خدا نے اپنے وقت کے غریب ترین اور کمزور سے کمزور تر کو اس بات کے لیے چنا کہ وہ اس عظیم امانت کو اٹھائیں اور اپنے ساتھ لے چلیں

ہاں جب کوئی تحریک کامیاب ہو جاتی ہے اور عوام میں مقبولیت حاصل کر لیتی ہے تو پھر نام نہاد شرفاء اور وقت کے بچاری اپنی حیثیت کو اونچا کرنے کے لیے تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہی بات حضورؐ کے ساتھ بھی ہوئی۔

اسلام کی ابتداء حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضورؐ کے چند قریبی نوجوان رشتہ داروں کے اسلام لانے سے ہوئی۔ اس کے بعد چند غلاموں اور غریب طبقے کے لوگوں نے اسلام کو قبول کیا۔ ان سب نے اپنے لیے دین کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی۔ جب کبھی حضورؐ تلاوت کرنا چاہتے کسی خاموش جگہ چلے جاتے جہاں لوگ نہ ہوں۔ ابوبکرؓ نے اس خفیہ طریقہ کار کو علانیہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اپنے ملنے والوں سے اسلام کا ذکر کرنا شروع کیا۔ چونکہ اسلام کی اس نئی چھوٹی سی جماعت نے کسی کا کچھ بگاڑا نہیں تھا اور کسی کے خلاف بھی نہیں تھی اس لیے دوسروں نے بھی اس جماعت کے مذہب پر کوئی تعرض نہیں کیا اسی طرح تین

سال گزر گئے۔ علانیہ تبلیغ کرنے کا حکم حضورؐ کو ان تین برس کے اختتام پر ہوا۔

حضرت علیؓ سے یہ روایت منسوب ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے علیؓ سے فرمایا کہ خدا نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ اپنے خاندان والوں اور رشتہ داروں کو تنبہ کریں۔ حضورؐ یہ سمجھے تھے کہ یہ کام حضورؐ کے بس کا نہیں۔ آپ کو ڈر تھا کہ اگر خدا کا پیغام اپنے رشتہ داروں تک پہنچائیں تو وہ برا مان جائیں گے۔ اسی خیال کے تحت حضورؐ نے خاموشی اختیار کی حتیٰ کہ جبرئیلؑ حاضر ہوئے۔ اور کہا کہ اگر حضورؐ اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے تو آپ سے خدا ناراض ہو جائے گا۔ پھر حضورؐ نے علیؓ سے فرمایا کہ تھوڑا سا گوشت تیار کر لو اور ایک کٹورا بھر دودھ اپنے ساتھ رکھ لو اور چلو۔ گوشت اور دودھ صرف ایک آدمی کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔ جن لوگوں میں وہ تبلیغ کے لیے پہنچے ان کی تعداد چالیس تھی۔ حضورؐ نے ان کی تواضع گوشت اور دودھ سے کرنی چاہی اور سب کے آگے پیش کیا۔ ہر ایک نے پیٹ بھر کے گوشت کھایا اور جی بھر کے دودھ پیا۔ راوی نے اس روایت سے حضورؐ کا ایک معجزہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک آدمی کا کھانا چالیس آدمیوں کے کھانے کے برابر ہو گیا تھا۔

حضورؐ نے ہمیشہ معجزے کے اظہار سے تامل فرمایا۔ اس بات کا کئی دفعہ آپ نے اعتراف بھی کیا کہ آپ معجزہ کی ادائیگی سے قاصر ہیں اس کے باوجود راویوں نے عجیب و غریب قصوں کو گھڑ کر حضورؐ سے منسوب کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔

جیسے ہی سب لوگوں نے سیر شکم ہو کر کھانا کھایا ابولہب نے جو حضورؐ کا چچا تھا اس محفل کو برخواست کر دیا حضورؐ کو موقع ہی نہیں دیا کہ آپ حاضرین سے مخاطب ہو سکیں۔ حضور نے پھر ان لوگوں کو مدعو کیا اور فرمایا کہ اے عبدالمطلب کی اولاد۔ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو تبلیغ کے لیے چنوں۔ تم میں کون ہے جو میری اور میرے بعد میرے جانشینوں کی مدد کے لیے تیار ہے۔ یہ مختصر سی تقریر یہ حاضرین کے لیے ایک سکتہ کا باعث بن گئی۔ یہ سکتہ اس وقت ٹوٹا جبکہ تیرہ سالہ لڑکے علیؓ ابن ابی طالب نے بھری محفل میں اٹھ کر کہا کہ اے اللہ کے رسول میں آپ کی مدد کے

Marfat.com

لیے تیار ہوں۔ اس لڑکے علیؓ کے جواب نے ساری محفل کو کشتِ زعفران بنا دیا۔ فطرتاً ایک خاموش پسند اور سنجیدہ نوجوان محمدؐ پر اس محفل کی ناکامی کا جو اثر ہوا ہوگا اس کا اندازہ آپ ہم سب ہی کر سکتے ہیں

جو پہلا تاثر مکہ کے لوگوں پر حضورؐ کے پیغام کا ہوا وہ یہ کہ انہوں نے سمجھا کہ محمدؐ پر دیوانگی کا دورہ پڑا ہے اور نعوذ باللہ حضورؐ کے دماغ میں فتور ہے۔ بعضوں نے سمجھا کہ جن دیو یا بھوت یا پری کا سایہ پڑ گیا ہے۔ جب دماغ کی خرابی یا جن بھوت پری کے سائے حضورؐ سے منسوب ہونے لگے تو لوگوں میں یا تو ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے یا پھر آپ کی ذات ان لوگوں کے لیے دل لگی اور مذاق کا موضوع بن گئی۔ عداوت اور مخالفت کی ابتدا ابھی نہیں ہوئی تھی۔

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کی ترتیب واقعات کے تسلسل کے لحاظ سے نہیں ہوئی اگر اس ترتیب کی کوشش کی جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ حضورؐ کی ابتدائی تبلیغ اور تعلیم نے ابھی لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں کیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن حضورؐ کی رسالت و نبوت کی ڈائری کا بھی کام انجام دیتا ہے۔ جب بھرے مجمع میں حضورؐ پر آوازے کسے جانے لگے تو حضورؐ کو ذریعہ وحی ردِ عمل کا طریقہ بھی بتلا دیا جاتا تھا۔ قرآن نے ان باتوں کو بھی محفوظ کر رکھا ہے۔ اگر اسی منطق کو قبول کر لیا جائے تو قرآن کی ابتدائی سورتوں میں حضورؐ کی مخالفت کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ قرآن کی ابتدائی آیتوں میں ساری باتوں کا مثبت طریقے سے ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی عظمت، انسان کی پیدائش، پیدائش کا مقصد، خالق کائنات کا مقام، مخلوق کی عاجزی اور بے چارگی، عبدیت کے لوازم اور اسی قسم کے موضوعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان ہی ابتدائی آیتوں میں جزا اور سزا کا بھی ذکر ہے۔ قریش کو بھی خاص طور سے مخاطب کیا گیا ہے اور اس وقت حضورؐ خاص طور پر اہل قریش کے لیے اپنی سرگرمیاں مختص کیے ہوئے تھے۔

یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیتوں ہی میں اپنی عظمت اور اس کے خالق ہونے کا ذکر اس کیا ہے جیسے وہاں کے لوگ اللہ کی عظمت اور اسکے خالق ہونے کا تصور اپنے ذہنوں میں پہلے ہی سے رکھتے ہوں جہاں جہاں اللہ کی عظمت اور اسکے خالق ہونے کا ذکر آیا ہے وہاں ان الفاظ کی مزید تشریح نہیں کی گئی۔ تشریح کسی بات کی اس

وقت نہیں ہوتی ہے جبکہ الفاظ کے مفہوم سے مخاطب پوری طرح واقف رہیں۔

اپنے اپنے دین سے ہٹے ہوئے لوگوں کے ذہن میں بھی ایک خدائے بزرگ و برتر کا تصور تھا۔ حضورؐ کے والد کا نام عبداللہ تھا۔ عبداللہ کے معنی اللہ کا بندہ یا اللہ کے غلام کے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے بتوں کو مادی صورت میں خدا کا مظہر مانتے تھے خدا کی خوشنودی کی خاطر بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

قرآن کی ابتدائی آیتوں نے عربوں کو حضورؐ کے خلاف اس لئے نہیں کیا تھا کہ اُن آیتوں میں اُن ہی باتوں کا ذکر تھا جن سے مقامی عرب آشنا تھے۔ تمسخر اور مضحکہ اس بات کا تھا کہ حضورؐ نے اپنے آپ کو اللہ کا رسول بتلانا شروع کر دیا تھا۔ پیغمبروں اور رسولوں کی تاریخ میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اُن کی عزت کبھی بھی اُن کے اپنے ملک میں نہیں ہوئی۔

ابن اسحٰق کا کہنا ہے کہ قریش نے رسول اللہ کی اُس وقت تک مخالفت نہیں کی جب تک آپ اللہ کی عظمت اور اس کی قدرت بیان کرتے رہے۔ مخالفت کی ابتدا اس وقت ہوئی جبکہ آپ نے اُن کے بتوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ مکہ والوں نے جب دیکھا کہ اُن کے خداؤں کی اب توہین ہونے لگی ہے تو انہوں نے بھی حضورؐ کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔ طبری نے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جو عبدالملک ابن مروان کے نام لکھا گیا تھا۔ عبدالملک بن مروان ۸۵ ھ سے ۶۸۵ء تک مسند خلافت پر متمکن رہا۔ اس خط میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کا پیغمبر لوگوں کو اپنے قریب بلا کر جب ان لوگوں کو اپنی سیادت تسلیم کرنے کے لیے کہتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ لوگ پیغمبر پر نازل ہونے والی وحی کو دل سے قبول کریں تو لوگ اطمینان سے پیغمبر کی باتوں کو سن لیا کرتے تھے اور حاضرین اپنی جگہ موجود رہتے تھے لیکن جب مجمع کے سامنے بتوں کو بُرا بھلا کہنا شروع ہوتا تھا تو لوگ پیغمبر کو تنہا چھوڑ کر اپنی اپنی راہ لیتے تھے۔

اس خط کا مضمون اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ابتداء میں لوگ حضورؐ کی باتوں کو ہمدردی سے سن لیتے تھے۔

Marfat.com

آہستہ آہستہ جب حضور کی مخالفت میں اضافہ ہونے لگا تو قریش کے با اثر اور سربر آوردہ لوگوں پر مشتمل ایک وفد حضورؐ کے چچا ابو طالب کے ہاں گیا۔ اس وقت ابو طالب ہاشمی خاندان کے رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس وفد میں دو قابل ذکر لوگ عتبہ اور شیبہ تھے جو آپس میں حقیقی بھائی تھے۔ ان کے باپ کا نام ربیعہ تھا۔ اس وفد میں ابو جہل بھی تھا جو خاندانِ مخزوم کا سرپرست اعلیٰ تھا عبد الشمس خاندان کا سربراہ ابو سفیان ابن حرب بھی وفد میں شامل تھا۔ اس وفد کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کے سارے ارکان مکہ کے اُن دولت مند خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے جو کاروانی تجارت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔

ابن اسحٰقؒ سے روایت ہے کہ وفد نے ابو طالب سے کہا کہ تمہارا بھتیجہ ہمارے خداؤں کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ ہمارے آبائی مذہب کی توہین کرتا ہے۔ یا تو آپ آگے بڑھ کر اُسے روکیں یا پھر اس معاملہ کو ہم پر چھوڑ دیں۔ ہم جیسے مناسب سمجھیں گے اس سے نپٹ لیں گے۔

ابو طالب نے ان کا جواب بہت ہی مصالحت آمیز انداز میں دیا۔ حضورؐ اپنے مقصد کی تکمیل میں لگے رہے اور تبلیغ کا کام جاری رہا۔

اہل قریش کی کوشش پہلی دفعہ جب ناکام رہی اور حضورؐ حسبِ معمول اپنے کام میں لگے رہے تو انہی لوگوں پر مشتمل ایک اور وفد دوسری بار پھر ابو طالب کے ہاں گیا اور نہایت ہی سختی کے ساتھ اپنے مطالبات کو دہرایا۔ اُن لوگوں کی دکھتی رگ اس بات سے اور بھڑک اٹھی جب حضورؐ نے فرمایا کہ قریش کے آباؤ اجداد بت پرستی کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوئے اور سب کے سب جہنم کی آگ میں جل رہے ہیں۔

اس وفد نے ابو طالب سے کہا کہ ہم اس بات کے لیے قطعی تیار نہیں ہیں کہ اس طرح ہمارے آباؤ اجداد کی توہین کی جائے اور ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہا جائے۔ وفد نے کہا کہ ابو طالب ہم آپ کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ آپ ایک ذی عزت منصب پر فائز ہیں۔ اگر آپ اپنے بھتیجے کو نہ روکیں تو ہم سب نہ صرف آپ کے بھتیجے کو مزہ چکھائیں گے بلکہ آپ کی مخالفت پر بھی

اتر آئیں گے اور دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لیں گے۔

وفد کے اس رویہ کو دیکھ کر ابو طالب کا دل بہت ہی اداس ہوا اور ساتھ ہی ساتھ وہ کچھ اور بھی سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ وفد میں جو لوگ شریک تھے وہ سب کے سب وقت کے بدمعاش ترین یا شر و فساد کے مظہر نہیں تھے۔ دو ایک کے سوا باقی تمام نمائندے اپنے وقت کے ممتاز ترین، قابل عزت اور کامیاب ترین تاجر تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مکہ میں امن و امان رہے۔ حضورؐ کی تعلیمات کی وجہ سے جو نقص امن کا اندیشہ ہو گیا تھا اُسے رفع کرنا چاہتے تھے۔ خود ابو طالب بھی اسی انداز فکر کے حامل تھے۔ یہ ایسی ہی بات ہوئی کہ اس زمانہ میں کوئی شخص بینک منیجر ہو اور اس کا بھتیجہ پکا کمیونسٹ ہو۔ نہ صرف خود ہو بلکہ دوسروں کو بھی کیمونزم کی تعلیم دیتا ہو۔ چونکہ ابو طالب اپنے بھتیجے کو دل سے عزیز رکھتے تھے اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو عجیب و غریب موقف میں پایا۔ ابو طالب نے اپنے بھتیجے کو بلوایا اور وہ سب کچھ کہا جو سردارانِ قریش نے ابو طالب سے کہا تھا۔ اپنے آپ کو اور مجھے بچاؤ کے الفاظ ابو طالب کی زبان سے نکلے۔ ساتھ ہی ساتھ کہا کہ مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔

حضورؐ نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ ابو طالب بھی سردارانِ قریش کے ہم خیال ہو چکے ہیں ابو طالب سے کہا کہ چچا خدا کی قسم اگر وہ لوگ میرے سیدھے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ کر کہیں کہ میں اپنے مقصد سے دستبردار ہو جاؤں میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یا تو میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر رہوں گا یا اس کی خاطر اپنی جان دے دوں گا۔ یہ کہتے ہوئے حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپ واپس جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

بھتیجے کی اس ادا کو دیکھ کر بوڑھے چچا نے کہا کہ بھتیجے میرے قریب آؤ۔ جب حضورؐ قریب آئے تو ابو طالب نے محبت سے کہا کہ میرے بھائی کے بچے جاؤ اور جو کچھ تم کہنا

Marfat.com

چاہتے ہو کہو۔ اب میں تم کو کبھی نہیں روکوں گا۔ جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔

دو باتوں نے مکہ والوں کو حضور کے خلاف برانگیختہ کر دیا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کے مقامی خداؤں کی توہین کی تھی۔ دوسری بات بت پرستوں کے لیے آپ نے فرمایا تھا کہ وہ دوسری دنیا میں دوزخ کی آگ میں ہمیشہ جلتے رہیں گے۔ یہی دو باتیں تھیں جنہوں نے مکہ والوں کے دلوں میں غم اور غصہ کے جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ وہ اکثر حضور سے سوال کرتے تھے کہ ان کے بت پرست آباؤ اجداد کا کیا حشر ہو گا۔ حضورؐ فوراً جواب دیتے تھے کہ وہ تو آگ میں جل رہے ہیں اپنے آباؤ اجداد کی عزت نہ صرف ان کی زندگی میں بلکہ مرنے کے بعد بھی کرنا شروع ہی سے عربوں کا قومی وطیرہ رہا ہے۔ آج بھی بدوی عربوں کے خیموں میں بیٹھ کر آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جب کسی عرب کا غصہ ٹھنڈا کرنا ہوتا ہے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ خدا تمہارے باپ کو جنت نصیب کرے۔ مشرق وسطیٰ میں کئی لڑکوں کا باپ ہونا بہت ہی اچھی بات سمجھی جاتی ہے تاکہ بڑھاپے میں نوجوان بیٹوں کا سہارا رہے۔

ابن اسحٰقؒ سے ایک اور دلچسپ روایت منقول ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ تیسری مرتبہ جب وفد آیا تو اپنے ساتھ ایک خوبرو نوجوان کو بھی لے آیا۔ وفد نے ابوطالب سے کہا کہ سارے قریش میں یہ نوجوان، مضبوط، مخلص اور خوش رُو ہے۔ اس نوجوان کو آپ اپنا بیٹا بنا لیں۔ اپنے بھتیجے محمد کو ہمارے حوالہ کر دیں۔ جو ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے اور ہمارے طرز زندگی کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ ابوطالب نے وفد کی اس تجویز کو رد کر دیا۔

وفد کا تین مرتبہ ابوطالب کے ہاں آنا اور ناکام و نامراد واپس جانا مکہ کے لوگوں کے دلوں میں لگی ہوئی آگ کو مزید مشتعل کرنے کا سبب بنا۔ اب مکہ کے رئیسوں اور سرداروں نے کھلم کھلا مخالفت شروع کر دی اور ساتھ ہی نئے نئے اسلام قبول کرنے والوں کو بھی اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ آج کل مغرب کے لوگوں میں جیسے قومی وفاداری کا جذبہ پایا جاتا ہے اسی طرح اُس زمانے میں قبیلہ کی حمایت اور اُس سے وفاداری کا عربوں میں رواج تھا۔ جس طرح آج حکومت سے اختلاف کے باوجود عوام بیرونی دشمن کا مقابلہ حکومت کے ساتھ مل کر اور ڈٹ

کر کرتے ہیں اسی طرح زمانہ قدیم میں مختلف قبیلوں کے افراد اپنے سرداران قبیلہ سے اختلاف کے باوجود پورے قبیلے کی خاطر اپنے جان و مال کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے۔

ابوطالب چونکہ خاندان ہاشمی کے سربراہ تھے اس لیے اُن کے خاندان کے افراد ہر بات میں اُن کی حمایت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اگرچہ کہ اُن میں سے اکثر بت پرست تھے۔ سردار قبیلہ کا یہ فرض سمجھا جاتا تھا کہ اپنے قبیلے کے ہر فرد کی جان و مال کی حفاظت کرے۔ سردار قبیلہ اپنے اس فرض میں اتنا پورا اترتا تھا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ غلطی اس کے اپنے قبیلہ کے فرد کی ہے پھر بھی اُسی کی حمایت کرتا تھا۔ وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتا تھا کہ اُس کے خاندان یا قبیلے کے چند افراد اُس کے کسی فیصلے سے متفق ہیں یا نہیں۔ یہی سبب تھا کہ ابتداء میں لوگوں نے حضورؐ کے ساتھ تشدد روا نہیں رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کا نتیجہ برا ہوگا۔ بنی ہاشم کے لوگ اس کا پورا پورا بدلہ لیں گے۔

کئی شاعروں نے بنی ہاشم کی عزت و ناموس کی حفاظت اپنی شاعری کے ذریعہ کی۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ابتداء میں اسلام لانے والوں میں یا تو بچے تھے یا غلام یا پھر ایسے افراد جن کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ نہ اُن کا تعلق کسی قبیلے سے تھا نہ کوئی قبیلہ اُن لوگوں کی حمایت کرتا تھا۔ حضورؐ کے دشمنوں نے ان بچاروں پر دنیا تنگ کر دی تھی۔ اُن کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچایا کرتے تھے جس میں مار پیٹ بھی شامل تھی۔

عرب نسل پرست بھی واقع ہوئے تھے۔ نہ صرف وہ حسب و نسب پر زور دیتے تھے بلکہ نسلی غرور کو بجا بھی سمجھتے تھے۔ نہ صرف اپنے تعلق سے وہ نسل پرست تھے بلکہ اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کی بھی نسل کی حفاظت کیا کرتے تھے۔

اسی نسلی غرور کا نتیجہ تھا کہ جو لوگ شجیع، بہادر اور خاندان میں نام آور تھے اپنی اولاد کو بھی انہی صفات سے متصف دیکھنا چاہتے تھے۔ اکثر ہوتا بھی ایسا ہی تھا کہ جب کوئی اپنے آباؤ اجداد کی کسی صفت کی تعریف کرتا تھا تو دوسرے معنوں میں وہ خود اپنی ہی تعریف کیا کرتا تھا اس

Marfat.com

یے کہ اپنے آباؤ اجداد کی خاص صفت کا عکس اُس کو اپنے آپ میں نظر آتا تھا۔ اگر وہ اپنے باپ دادا کی بہادری کی تعریف کرتا تو اُسے وہی صفات و جذبات خود اپنے میں نظر آتی تھیں یعنی تعریف صفت کی ہوتی تھی اور وہ صفت باپ دادا اور تعریف کرنے والے میں مشترک ہوتی تھی۔ جب حضور مکہ والوں کے آباؤ اجداد کے مذہب کی مذمت کرتے تھے تو اس ندامت میں وہ اپنے آپ کو بھی شریک کر لیتے تھے۔

ہمارے اپنے زمانہ میں جبکہ انسان انسان برابر ہے کا نعرہ لگایا جاتا ہے نسلی امتیاز ایک بے کار سی چیز سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی گئی ہے کہ سارے بچے جو اس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں وہ سب برابر ہیں اس لیے ان تمام کا پیدائشی حق ہے کہ وہ یکساں تعلیم حاصل کریں اور یکساں تعلیم کے نتیجے کے طور پر جب وہ بڑے ہوں گے تو آپس میں برادرانہ سلوک اور یکسانیت کا اظہار کرتے رہیں گے۔

عملی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔

ایک موسیقار کی اولاد میں بہت ممکن ہے کہ موسیقی کا شغف زیادہ پایا جائے ہو سکتا ہے کہ ایک فوجی کا لڑکا فوج میں جانے کی زیادہ صلاحیت رکھے۔ فطری استعداد بہرحال کوئی چیز ہوتی ہے۔ اولاد کی نشوونما میں بہت سے عوامل و عناصر کام کرتے ہیں۔ اگر عرب نسلی امتیاز میں حد سے زیادہ تجاوز کرتے تھے تو ہم نسل اور خون کو حد سے زیادہ حقیر کر دیتے ہیں۔

عربوں کو اس بات کا علم تھا کہ ان کے بڑوں کی بڑی صفات اُن کے اپنے لیے اور اُن کی آنے والی نسلوں کے لیے ایک قیمتی اثاثہ کا کام دیتی ہیں۔ اولاد کے لیے اپنے باپ دادا کی اچھی صفات مشعل راہ کا کام دیتی ہیں۔ وہ خود بھی اپنے بڑوں کی اعلیٰ صفات کو اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ سال میں ایک دفعہ سارے جزیرہ نمائے عرب سے قافلے در قافلے مکہ کو کعبہ کی زیارت کے لیے آیا کرتے تھے۔ ان کے حج کا زمانہ مقدس مہینوں میں

Marfat.com

شمار ہوتا تھا۔ حج سے پہلے اور حج کے بعد وہ مختلف سماجی اور معاشی سرگرمیوں میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اب حج کا زمانہ قریب آرہا تھا۔ عیسوی سنہ ۶۱۳ تھا۔ حضورؐ کا سن مبارک ۴۳ سال تھا۔ سرداران قریش کو اب یہ فکر لاحق ہوئی کہ مکہ کو آنے والے قبیلے کہیں حضورؐ کے خیالات سے واقف نہ ہو جائیں۔ کہیں حضورؐ ان باہر سے آنے والوں کے سامنے کعبہ کے بتوں کی توہین نہ کرنے لگیں۔

مکہ کے لوگ زیادہ سے زیادہ قبیلوں کو حج کے موقع پر مکہ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ کیونکہ قریش کی ساری آمدنی کا دارومدار ہی اُن کی آمد پر تھا۔ کعبہ اور کعبہ کے بتوں کی توہین سے مکہ والوں کو ڈر تھا کہ کہیں ان کے ذریعہ آمدنی پر ضرب نہ پڑ جائے۔ قریش کی خوشحالی کا خاتمہ اُن کی نظروں کے سامنے تھا۔ اُن کی معیشت کا نظام ہی جس بات پر قائم تھا اب اُن کو اُس کی بنیادیں لرزتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

حج کا زمانہ شروع ہونے سے کچھ پہلے رؤسائے قریش کی ایک کانفرنس میں غور کیا گیا کہ حضورؐ کو کس طرح سے باہر سے آنے والے قبیلوں سے نہ ملنے دیا جائے۔ اُن کو یقین تھا کہ حضورؐ ضرور اُن قافلوں سے کہیں گے کہ بتوں کی پوجا کرنا اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ بت نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ اس طرح سے بتوں اور کعبہ کی عظمت قافلے والوں کے دلوں سے نکل جانے کا اندیشہ تھا۔ اگر وہ آنا بند کر دیں تو اس کے نتائج سارے قریش کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔

ان سب لوگوں نے طے کیا کہ جو طریقہ کار حضورؐ استعمال کرنا چاہتے ہیں وہی حربہ حضورؐ کے خلاف استعمال کیا جائے۔ جب لوگ آنے لگیں تو اُن سے کہا جائے کہ مکہ میں ایک جادوگر ہے جو اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے باپ بیٹے میں، بھائی بھائی میں، شوہر بیوی میں آپس میں اختلاف کروا دیتا ہے۔ لڑوا دیتا ہے اور اس فتنہ گری میں وہ طاق ہے۔

Marfat.com

اس وقت تک بدقسمتی یا خوش قسمتی سے صرف وہی لوگ مسلمان ہوئے تھے جن کا یا تو کسی قبیلے سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا یا اُن کے رشتہ داروں نے خفا ہو کر اُن سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اسی قسم کی مثالیں ایسی تھیں کہ سردارانِ قریش بطور ثبوت مکہ میں آنے والے قبیلوں کے سامنے پیش کر سکتے تھے۔

ساتویں صدی عیسوی میں یہی الزام حضورؐ کے تعلق سے ساری دنیا میں دہرایا گیا اس الزام کو سب سے پہلے حضورؐ کی ذات گرامی سے منسوب کرنے والا ولید ابن مغیرہ تھا۔ یہ قریش کے مالدار تاجروں میں سے ایک تھا۔

قرآن میں سورۂ مدثر کی ۲۴ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے "پھر کہنے لگا یہ تو بس جادو ہے جو اگلوں سے منتقل ہوتا آیا ہے۔ (پھر بولا) یہ (خدا کا کلام نہیں بلکہ) بشر کا کلام ہے۔ اس کے جواب میں خدائے تعالیٰ نے اسی سورۃ کی ۲۶ ویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے" ہم عنقریب اس کو سقر میں داخل کریں گے"۔ یہیں سے قرآن پاک میں جوابات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جب لوگ حضورؐ پر اعتراض کرتے یا سوال کرتے تو جواب خدا کی طرف سے آتا تھا۔ حضورؐ ان اعتراضات اور سوالات کے جواب بر بنائے وحی دیتے تھے۔

اس کانفرنس میں جو فیصلے کئے گئے ان کے مطابق جب مکہ میں لوگ آنے لگے تو مخالف اُن سے حضورؐ کے تعلق سے جو کہنا طے ہوا تھا کہتے رہے۔ اس کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ نہ جاننے والے بھی حضورؐ کو جاننے لگے۔ آپ کے نام سے واقف ہونے لگے۔ اُن کے کان آپ کے پیغام سے آشنا ہوئے۔ جیسا کہ آج کے زمانے میں شہرت کو کامیابی کا پہلا زینہ سمجھا جاتا ہے قطع نظر اُس کے کہ شہرت پانے والا اچھا ہے یا بُرا اسی طرح اس زمانہ میں بھی شہرت اپنا پورا پورا کام کرتی تھی۔ اس سال جتنے قبیلے مکہ کو آئے سب کے سب حضورؐ کے نام اور کام سے واقف ہوئے جب وہ اپنے مقام پر واپس ہوئے تو دوسروں سے آپ کے نام اور کام کا ذکر کرنے لگے۔

Marfat.com

یادگار تاریخیں

حضورؐ نبی کریم صلی اللہ وسلم کی پیدائش	۵۷۰ عیسوی
〃 〃 〃 کا خدیجہؓ سے نکاح	۵۹۵ ء
〃 〃 〃 کی بعثت	۶۱۰ ء
〃 〃 〃 کی خاموش تبلیغ	۶۱۰ سے ۶۱۳ء

Marfat.com

حبشہ کو ہجرت

حضور کا سب سے زیادہ جانی دشمن ابوجہل تھا۔ یہ بنی مخزوم کا سردار تھا۔ ابوجہل کے بعد دوسرا دشمن خود آپ کا چچا ابولہب تھا۔ اس کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا۔

ابوجہل کا شمار مکہ کے معززین میں ہوتا تھا۔ سرداروں کے گروہ میں اسے خاص مقام حاصل تھا۔ ابولہب دوسرے نمبر پر آتا تھا۔

خاندانوں میں اختلاف پیدا کرنے کا الزام ان کی نظروں میں اہمیت اختیار کر گیا ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کو پہلے پہل قبول کرنے والوں میں اکثر نوجوان تھے جن کی سرگرمیاں اپنے ماں باپ یا خاندان والوں کے خلاف ہوا کرتی تھیں۔ قریش کے ایک نوجوان خالد ابن سعید نے مسلمان ہونے کے بعد اپنے گھر سے فرار ہو کر حضورؐ کے گھر میں آکر پناہ لی۔

اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے کہ ابتدا میں مسلمان ہونے والوں پر کیا کچھ بیتی۔

عام طور پر عرب مہربان اور ہر حیہ باد اباد کے قایل رہے ہیں۔ ساتویں صدی کے عرب بھی ایسے ہی تھے۔ بلاشبہ حضورؐ کو تضحیک اور توہین سے گزرنا پڑا لیکن یہ بدلہ ایسا نہیں تھا جیسے یورپ اور ایشیا میں لوگ اپنے مخالفین سے لیتے رہے ہیں، یورپ اور ایشیا کی تاریخیں اپنے مخالفین کے ساتھ وحشیانہ سلوک سے بھری پڑی ہیں۔ رومیوں نے اپنے مخالفین کو سولیوں پر چڑھایا۔

نیرو کے عہدِ حکومت میں عیسائیوں کو زندہ جلایا گیا یا بھوکے شیروں کے سامنے پھینکا

Marfat.com

گیا: تاتاریوں نے اپنے مخالفین کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں تہہ تیغ کیا۔ عہد وسطیٰ کے یورپ میں ہیرو کو جلتے کوئلوں پر رکھ کر کباب بنایا گیا۔ پابند سلاسل کر کے ظلم و ستم کی شمع جلائی۔

اس قسم کے طریقے ابتدا میں اسلام قبول کرنے والوں کے خلاف نہ تو استعمال کئے گئے اور نہ ہی اُن کے جواب ذخیال میں اوپر بیان کردہ وحشیانہ بدلے آئے۔

حضورؐ کے خلاف سرگرمیاں جاری رہیں۔ ابن اسحٰق نے بڑے ہی دلچسپ طریقے سے قریش اور حضورؐ کی آپس میں رسہ کشی کو بیان کیا ہے۔ یہ روایت عمر بن العاصؓ سے بیان کی جاتی ہے جو اس وقت بُت پرست تھے لیکن بعد میں چل کر فاتح مصر بنے۔ اُن سے پوچھا گیا کہ قریش نے حضورؐ کے ساتھ سب سے زیادہ بدتمیزی کی کون سی حرکت کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ ایک بار میں قریش کے ایک گروہ کے ساتھ کعبہ کے حدود کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ کسی نے حضورؐ کا ذکر چھیڑا۔ اُس گروہ کے چند لوگوں نے فوری کہا کہ ہم نے اپنی زندگی بھر میں اس قسم کی فتنہ گری کبھی نہیں دیکھی تھی جیسی محمدؐ نے بپا کر رکھی ہے۔ اس شخص نے پوری برادری، پورے قبیلے اور پوری قوم کو آپس میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ لوگ آپس ہی میں سر بہ گریباں ہیں۔ ہم لوگ ابھی یہ باتیں کر رہے تھے کہ حضورؐ تشریف لائے حجر اسود کو بوسہ دیا۔ کعبہ کا طواف کرنے لگے۔ جب حضورؐ اس گروہ کے سامنے سے گزرے تو ان لوگوں نے حضورؐ کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہے میں حضور کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جو متغیر تھا۔ حضورؐ نے ایک طواف پورا کیا اور دوسرے طواف کے لیے پھر حضورؐ کا گزر ہمارے سامنے سے ہوا، ہم لوگوں نے پھر سے گستاخی کی اور حضورؐ خاموشی سے طواف کے پورا کرنے میں مصروف رہے۔ جب حضورؐ تیسرا طواف کرنے کی غرض سے پھر ہمارے سامنے سے گزرے ہم نے پھر گستاخانہ جملے کہنے شروع کیے۔ اس پر حضورؐ رک گئے اور ہماری طرف مخاطب ہو کر فرمایا

Marfat.com

"اے قریش کے لوگو، سنو میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اُس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں ابھی تمہارا خاتمہ کرسکتا ہوں اور تم کو یہیں ڈھیر کر سکتا ہوں"۔ یہ الفاظ ایسے اثر پذیر تھے کہ ہم سب کی زبانوں پر تالے پڑ گئے اور سب خاموشی کی تصویر بن گئے۔ یہاں تک کہ ہم میں جو سب سے زیادہ غنڈہ اور بدمعاش تھا اس پر بھی اتنی ہیبت طاری ہوئی کہ اس نے دھیمی آواز میں بڑی ہی لجاجت سے کہا کہ اے ابوالقاسم آپ تشریف لے جائیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ لڑائی جھگڑا پسند نہیں کرتے۔ آپ اُن آدمیوں میں سے نہیں جو لوگوں سے مار پیٹ کرتے ہیں۔

یہی روایت اور آگے بڑھتی ہے۔ اس واقعے کے بالکل دوسرے دن جبکہ چند لوگ آپس میں بحث و مباحثہ کر رہے تھے حضورؐ تشریف لے آئے۔ سارے کے سارے حضورؐ کے اطراف جمع ہو گئے۔ انہوں نے حضورؐ کو گھیرے میں لے کر حضورؐ سے سوال کیا کہ کیا آپ وہی ہیں جو ہمارے خداؤں کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ حضورؐ نے جواب دیا "ہاں"۔ اس جواب پر مجمع میں سے کسی نے حضورؐ کی ردائے مبارک پر ہاتھ ڈالا۔ ابوبکرؓ نے مداخلت کی اور اپنے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا کیا تم اُس آدمی کو مارنا چاہتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میں ایک خدا کا ماننے والا ہوں۔ ابوبکرؓ کے اتنا کہنے پر اُس آدمی نے ردا کو چھوڑ دیا اور پھر سب اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔

عمر بن العاصؓ کہتے ہیں کہ یہی وہ بدترین اور گستاخانہ حرکت تھی جو میری آنکھوں نے قریش کو حضورؐ کے ساتھ کرتے دیکھا۔

ایک دن بنی مخزوم کے سردار ابوجہل کا حضورؐ سے راستے میں سامنا ہو گیا۔ ابوجہل نے حضورؐ کے ساتھ انتہائی بدتمیزی سے بات چیت کی اور اسلام کے خلاف اول فول بکنے لگا۔ حضورؐ نے سکوت اختیار کیا۔ آگے بڑھ گئے۔ کعبہ کے باہر حضورؐ کو قریش کے چند اوباش بدذات مل گئے۔ اسی اثناء میں حضورؐ کے ایک اور چچا حمزہ ابن عبدالمطلبؓ وہاں پہنچ گئے

Marfat.com

اپنے شانے پر وہ تیر کمان لیے ہوئے تھے۔ حمزہ شجیع، توانا، مضبوط اور شکار کے بڑے شوقین تھے۔ ایک عورت نے جو ابوجہل کی بدتمیزی اور اُس کے اول فول کو راستہ میں سُن چکی تھی اس کا اظہار فوری حمزہ بن عبدالمطلبؓ سے کر دیا۔ حمزہ یہ سُن کر غصے سے آگ بگولہ ہو گئے کعبہ کا رُخ کیا جہاں ابوجہل اور لوگوں کے ساتھ بیٹھا گپ شپ ہانک رہا تھا۔ اپنی تیر کا رُخ ابوجہل کے سر کی طرف کرتے ہوئے حمزہ نے کہا کہ آئندہ کبھی تو محمدؐ کی توہین کرے گا تو میں محمدؐ کا مذہب قبول کر لوں گا اور دیکھوں گا کہ تو میرا کیا بگاڑ لیتا ہے۔ حمزہ کے یہ جوشیلے الفاظ سن کر بنی مخزوم کے چند لوگ ابوجہل کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ابوجہل نے خاموشی سے اپنے حمائیتوں سے کہا کہ چپ رہو۔ میں نے حمزہ کے بھتیجے کے ساتھ تھوڑی دیر پہلے واقعی زیادتی کی تھی۔

یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ حمزہ پہلے ہی سے آیا یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ حضورؐ پر ایمان لائیں گے یا اس واقعہ نے حمزہ کو یہ ضد دلادی کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ بہرحال حمزہ فوری مسلمان ہو گئے حضرت حمزہؓ کا مسلمان ہو جانا مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت کے لیے تقویت کا باعث بنا۔ حضرت حمزہؓ چونکہ ایک فوجی آدمی تھے اور اپنی شجاعت اور بہادری میں اپنی مثال آپ تھے اس لیے لوگوں پر ان کا کافی رعب تھا۔

ایک اور واقعہ مشہور ہے جس کی صداقت میں تھوڑا بہت شبہ ہے۔ ایک بار سربراہان قریش حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک بہت بڑی رقم کی پیش کش کی اس کے علاوہ حضورؐ سے یہ بھی کہا کہ اگر حضورؐ چاہیں تو مکہ کی بادشاہت مل سکتی ہے۔ رقم اور بادشاہت کے عوض حضورؐ اپنی تبلیغ اور تعلیم سے باز آجائیں اور مکہ والوں کے خداؤں کو بُرا بھلا کہنا چھوڑ دیں۔ اس حکایت کی صداقت میں اس لیے شبہ ہے کہ جس زمانے میں اس واقعہ کا ہونا بیان کیا گیا ہے اس وقت حضورؐ اس موقف میں نہیں تھے کہ لوگ حضورؐ سے ڈریں۔ لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ حضورؐ ایک انقلابی اور موقع پرست ہیں

Marfat.com

اور وقت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

شہر مکہ کے رہنے والے لگ بھگ دس ہزار آدمیوں میں سے اس وقت تک سو سے بھی کم لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ اس چھوٹی سی اقلیت سے اتنی بڑی اکثریت کا ڈرنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ حضورؐ کو رقم کا لالچ دیا گیا ہو گا۔ اگر ایسا ہے تو اُن لوگوں نے حضورؐ کو سمجھنے میں سخت غلطی کی۔ اپنا حکمراں تسلیم کرنے کی بات لغو معلوم ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ بت پرستوں نے یہ الزام لگایا ہو کہ حضورؐ نے دولت کے حصول یا اقتدار کی خواہش میں اسلام کا شوشہ چھوڑا ہو۔

اب مخالفین نے ایک نیا حربہ اختیار کیا۔ وہ یہ کہ حضورؐ سے رسالت اور نبوت کی نشانیاں مانگنے لگے۔ وہ کہنے لگے کہ وہ ایمان لانے کو تیار ہیں اگر کسی جیتے جاگتے فرشتے سے اس بات کی تصدیق کروا دیں کہ جس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں وہ صحیح ہے یا پھر اپنے خدا سے مانگ کر ان لوگوں کو باغات، سونا چاندی، ہیرے جواہرات، زر و دولت سے نوازیں جنت کو اگر آپ زمین پر لے آئیں تو ہم ابھی آپ پر ایمان لانے کو تیار ہیں۔ اسی قسم کے مہمل مطالبات ہونے لگے۔

چند لوگوں نے کہا کہ آپ انہی باتوں کو دہرایا کرتے ہیں جسے نجد کا رہنے والا یمامہ نامی ایک شخص سکھا دیا کرتا تھا۔ ابن اسحٰق کا کہنا ہے کہ لوگوں کی اس قسم کی باتوں سے آپ بہت دل برداشتہ ہو جایا کرتے تھے۔

قریش کا ایک فرد جس کا نام نضر تھا جو حیرا کے لخمند بادشاہوں کے دربار میں جایا کرتا تھا اپنے دورانِ قیام میں اُس نے ایرانی عشق و محبت کی داستانیں بھی سنی تھیں۔ رستم و سہراب جیسے سورماؤں کے کارنامے بھی اُسے یاد تھے۔ ایک بار جبکہ حضورؐ لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے قدیم انبیا کا ذکر کر رہے تھے کہ کس طرح آپ سے پہلے آنے والے رسولوں نے اپنے وقت کے لوگوں کو خدا سے خوف و ڈر سے واقف کروایا تھا۔ نضر ایک

Marfat.com

کونے میں بیٹھا ہوا حضورؐ کی یہ گفت گو سن رہا تھا مداخلت کرتے ہوئے اس کم بخت نے کہا کہ "آیئے میں آپ کو ان واقعات سے دلچسپ باتیں سناؤں۔ قدیم انبیا اور رسولوں کے قصوں سے زیادہ رنگین ایرانی عشق و محبت کی داستانیں ہوتی ہیں۔ اجازت ہو تو انہی رنگینیوں کو دہراؤں۔

قرآن کے سورۂ القلم میں غالباً اسی آدمی کی طرف اشارہ ہے۔ اس سورہ کی پندرھویں آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

"جب اس کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ اگلے لوگوں کے افسانے ہیں"۔

توریت کی تعلیم کے عین مطابق حضورؐ برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے لوگوں کو اس بات سے ڈراتے تھے کہ ہر برائی کی سزا یا تو اسی دنیا میں ملے گی اور اگر یہاں نہ ملے تو مرنے کے بعد دوسری دنیا میں مل کر ہی رہے گی۔ اپنے اس نکتے کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کے لیے آپؐ اکثر و بیشتر توریت میں بیان کردہ واقعات کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے تھے۔

مثلاً حضرت موسیٰ کا فرعون کو سمجھانا اور ڈرانا اور فرعون کی غرقابی اور اسی قسم کے کئی واقعات حضورؐ کی زبان مبارک سے لوگوں تک پہنچے۔

کہا جاتا ہے کہ توریت میں بیان کردہ واقعات جو حضورؐ نے ارشاد فرمائے ہیں ان کی صحت میں سقم واقع ہوا ہے۔ قرآن کے سورۂ مریم میں حضرت زکریا کا ذکر آیا ہے۔ زکریا کے عبادت خانے میں JOHN THE BAPTIST کی پیدائش۔ مریم کے پیٹ سے بغیر شوہر کے عیسیٰ کا پیدا ہونا۔ یہاں پر مریم کو ہارون کی بہن بتایا گیا ہے۔ MARY کو عربی میں مریم کہا جاتا ہے۔ اور دوشیزہ MARY کو عربی میں دوشیزہ مریم کا نام دیا گیا ہے۔ اس بات پر کافی بحث ہوئی ہے کہ حضورؐ نے بی بی مریم کو ہارون کی بہن بتایا ہے۔ مغربی مصنفین کا خیال ہے کہ دو عورتوں کو جن کے نام مریم تھے اور جن کا زمانہ ایک دوسرے سے تیرہ سو سال اِدھر اُدھر ہے خلط ملط کر دیا ہے۔ مولانا محمد علی نے اس اعتراض کا جواب یوں دیا ہے کہ جو لوگ عربی سے پوری طریقہ سے واقف نہیں ہیں وہی لوگ اس قسم کا اعتراض کر سکتے ہیں اور

دو ناموں کے خلط ملط کرنے کا الزام لگا سکتے ہیں۔ جس طرح یہودی اپنے آپ کو موسیٰ کے بچوں سے مخاطب کرتے ہیں اسی مفہوم میں ہارون کی بہن یہاں استعمال کیا گیا ہے۔ جس طرح یہودی موسیٰ کے حقیقی بچے نہیں ہیں بلکہ معنوی ہیں اسی طرح مریم بھی ہارون کی حقیقی بہن نہیں۔

بات یہ ہے کہ حضورؐ جب توریت کے واقعات بیان فرماتے ہیں تو اس کی اصلیت کا پتہ چلانے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ ایک غیر مسلم کی رائے اس سلسلے میں یہی ہو سکتی ہے کہ حضورؐ نے ان واقعات کو یہودیوں اور عیسائیوں سے سنا تو ضرور لیکن پوری طریقے سے ان واقعات کو یاد نہ رکھ سکے اس کی شہادت مسلمانوں کے اس دعویٰ سے بھی ہو سکتی ہے کہ حضورؐ کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا اسی لیے سنی سنائی باتیں پوری طریقے سے ذہن میں نہ رہ سکیں۔

موجودہ زمانے کے علماء حقائق اور واقعات کے تسلسل کو بڑی اہمیت دیتے ہیں تسلسل کی اہمیت بعض اوقات حقائق کی اہمیت کو اس وقت گھٹا دیتی ہے جبکہ اس کے اطلاق سے کوئی اخلاقی ضابطہ پیش کرنا مقصود ہو مثلاً ایک جگہ حضرت عیسیٰ کے تعلق سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے ایک بندہ نے یروشلم یا بیت المقدس سے JERICHO کا رخ کیا۔ اس واقعہ میں دوسری جگہ بجائے JERICHO کے دمشق کی طرف جانا بیان کیا گیا ہے حضرت عیسیٰ کا JERICHO یا دمشق جانا یا کسی اور مقام کی طرف رخ کرنا اتنی اہمیت نہیں رکھتا ہے یہاں دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کا منشاء اور مقصد کیا تھا اور اس منشا اور مقصد کے پیش نظر کسی بھی مقام پر جانا مقام کی اہمیت کو گھٹا کر مقصد کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اسی منطق کے پیشِ نظر اگر حافظے نے واقعات کے بیان کرنے میں کچھ کوتاہی کی ہو تو واقعاتی اعتبار سے ان کا تسلسل ٹوٹتا نظر آتا ہے لیکن جس منشاء اور مقصد کو آپ بیان کرنا چاہتے تھے اس میں آپ صد فی صد کامیاب رہتے تھے۔

ایک اور مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق قرآن خدا کے الفاظ

Marfat.com

کا مجموعہ ہے۔ کئی باب اور سورتیں شروع ہی اس لفظ سے ہوتے ہیں "قل" یعنی کہہ "کہہ کر میں بھی تمھارے ہی جیسا ایک فانی انسان ہوں"۔ خدا خود اپنے الفاظ اپنے پیغمبر کو دہرانے کے لیے دے رہا ہے۔ اس عقیدہ اور یقین میں ذرا سا بھی تزلزل ان کے ہاں گناہ ہے۔ اس مشکل کے پیش نظر ہم کو بھی مسلمانوں کا اپنایا ہوا فقرہ دہرانا چاہیے۔ "واللہ اعلم"

ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ اسی دوران مکہ کے لوگوں نے اپنے دو آدمی یہودیوں کے شہر یثرب بھیجے۔ یثرب مکہ سے تقریباً ڈھائی سو میل دور ہے اور مکہ کے شمال میں ہے۔ انہوں نے یثرب والوں سے حضورؐ کے تعلق سے ان کی رائے دریافت کی۔ یہودیوں نے ان سے کہا کہ توریت میں بیان کردہ دو ایک واقعات کی تفصیل پہلے آپؐ سے دریافت کی جائے۔ دونوں نمائندے مکہ واپس آئے۔ ایک مجلس میں یہودیوں کے دریافت کیے ہوئے سوالات آپ کے آگے رکھے گئے۔ حضورؐ نے سوال کرنے والوں سے کہا کہ آپ دوسرے دن ان کا جواب دیں گے۔ دن گزرتے گئے۔ پندرہ دن بعد حضورؐ اپنا جواب لیے ہوئے اسی مجلس میں گئے اور قرآن کے سورۂ کہف کی تلاوت فرمائی۔ ایک سوال کے جواب میں اصحاب کہف اور ان کے کتے کا واقعہ تھا اور دوسرے کا جواب آپ نے دیا کہ وہ آدمی جس کے تعلق سے یہودیوں نے دریافت کیا ہے وہ وہی آدمی ہے جس کے سر پر دو سینگ تھے یعنی ذوالقرنین۔

یہودیوں کے سوال کرنے کا مقصد یہی تھا کہ قرآن کے ذریعے اپنے سوالات کا جواب حاصل کریں۔ یہاں پر یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ یہودیوں نے اس قسم کے سوالات آپ کے ہاں روانہ کیے ہوں اس لیے کہ ان دونوں سوالات اور جوابات کے پیچھے یونانی انداز چھپا ہوا ہے۔

ایک بار حضورؐ کے تمام ساتھی جمع تھے۔ ان ہی میں سے کسی نے کہا کہ قریش کے سامنے اب تک ہم لوگوں میں سے کسی نے بھی قرآن کو بہ آواز بلند نہیں پڑھا۔ یہ سن کر عبداللہ ابن مسعودؓ جو ایک غلام تھے اور نئے نئے مسلمان ہوئے تھے قرآن سنانے پر رضامند ہوگئے۔ کسی نے کہا

Marfat.com

کہ بہتر ہوگا اگر غلام کی بجائے کوئی باعزت گھرانے کا فرد قریش کو قرآن سنائے تاکہ گھرانے کی وجہ سے قرآن سنانے والے کی جان محفوظ رہ سکے۔ اپنے ساتھیوں کی اس بات کو سن کر عبداللہ ابن مسعود بضد ہو گئے کہ قرآن وہی سنائیں گے اور لوگوں سے کہا کہ اللہ میری حفاظت کرے گا۔

دوسرے دن صبح سویرے کعبہ سے باہر عبداللہ ابن مسعود نے کھڑے ہو کر بہ آواز بلند قرآن کی تلاوت شروع کر دی۔ پہلے تو لوگوں کو تعجب ہوا اور بڑے غور سے لوگ عبداللہ ابنِ مسعودؓ کو دیکھنے لگے۔ اُن میں سے کسی نے کہا کہ غلام عورت کا یہ لڑکا کیا بک رہا ہے پھر سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ جب دشمنوں کو اس کا علم ہوا کہ عبداللہ ابنِ مسعودؓ قرآن کی اُن آیات کی تلاوت کر رہے ہیں جو حضورؐ پر نازل ہوئی تھیں تو سب کے سب عبداللہ ابنِ مسعودؓ کے قریب آکر اُن کو مارنے لگے۔ عبداللہ ابن مسعودؓ مار کھاتے جاتے تھے اور تلاوت کرتے جاتے تھے۔ اُن کے ساتھی جب انھیں اپنے ساتھ واپس لائے تو عبداللہ ابن مسعودؓ کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔

ساتھیوں میں سے کسی نے کہا کہ ہم کو پہلے ہی سے اس بات کا ڈر تھا کہ تمھارا یہ حشر ہوگا۔ عبداللہ ابن مسعود نے فوراً کہا کہ میں کل صبح بھی ایسا ہی کروں گا۔ اس پر اُن کے ساتھیوں نے کہا کہ نہیں۔ تم نے اپنا فرض ادا کیا۔ تم نے قریش کو وہ چیز سنا دی جس کو سننے کے لئے وہ قطعی تیار نہیں تھے۔

قریش برابر آپ کے خلاف سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ قریش کے قبیلے کے وہ لوگ جو اسلام لا چکے تھے اپنی ہی برادری کے لوگوں سے مار کھا رہے تھے۔ ان ہی کے بھائی بند اُن پر زندگی کے دروازے بند کئے ہوئے تھے ان کو غذا تک سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ باپ کا اپنے بیٹے کے ساتھ یہی سلوک تھا۔ بھائی کا اپنے سگے بھائی کے ساتھ یہی سلوک تھا۔ جو بیچارے بے سہارا تھے اور جن کی حفاظت کی ذمہ داری کوئی اور قبیلہ

Marfat.com

نہ لیتا تھا اُن پر تو تشدد حد سے زیادہ بڑھتا جاتا تھا۔

افریقہ کا ایک غلام جس کا نام بلال ابن رباحؓ تھا بلا ناغہ اپنے آقا امیہ ابن خلف کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتا تھا۔ اس غلام کا صرف یہی قصور تھا کہ اُس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ آقا اسے تپتی ہوئی ریت پر لٹا دیتا اور جلتی ہوئی سلاخیں اس کے سینے پر رکھتا اور کہتا کہ یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ تم محمدؐ کے خلاف نہ ہو جاؤ۔ پھر سے ہمارے معبود لات اور عزیٰ کی پرستش نہ کرنے لگو۔ بلالؓ بھی اپنے عقیدے میں پکے نکلے۔ ہر دن ابتلا و آزمائش کے دوران وہ اپنے اللہ کو پکارا کرتے تھے اور بار بار کہتے تھے: "اللہ ایک ہے" "اللہ ایک ہے"۔

ایک دفعہ جبکہ بلالؓ اسی ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے ابوبکرؓ کا گزر ہوا اور انہوں نے بلالؓ کے آقا امیہ سے سوال کیا کہ کب تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ کب تک اس غریب کی جان آفت میں رہے گی۔

بلال کے آقا امیہ نے ابوبکرؓ کو درشتگی کے ساتھ جواب دیا کہ بلال کو اس مصیبت میں مبتلا کرنے والے تم ہو۔ ابوبکرؓ نے کہا کہ میرے ہاں بھی ایک افریقی غلام ہے تندرست و توانا ہے۔ محنتی اور صحت مند ہے اور ساتھ ہی ساتھ بتوں کی پوجا بھی کرتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میرے غلام کو تم لے لو اور مجھے اپنا یہ غلام دے دو۔ امیہ غلاموں کے لین دین پر راضی ہو گیا۔ بلال ابوبکرؓ کے حوالے کر دیئے گئے۔ ابوبکرؓ نے اپنے حاصل کردہ نئے غلام بلال کو اسی وقت آزاد کر دیا۔

حضورؐ جو فطرتاً رحم و کرم کے خوگر تھے اور سراپا شفقت و مہربانی کا مجسمہ اس بات سے سخت پریشان رہتے تھے کہ آپؐ کے ماننے والوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ خصوصاً ان لوگوں پر زیادہ آفت آ رہی تھی جو بالکل بے سہارا تھے۔ بظاہر جن کا پرسانِ حال کوئی نہیں تھا۔

Marfat.com

حضورؐ نے بڑھتے ہوئے تشدد کو دیکھ کر اپنے ماننے والوں میں چند سے کہا کہ بہتر ہوگا کہ وہ حبشہ چلے جائیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ حبشہ کے لوگ مہربان ہیں۔ وہاں عدل وانصاف کا دور دورہ ہے۔ وہاں کا بادشاہ عیسائی ہے۔ تم لوگ وہاں اُس وقت تک ٹھہرے رہو جبتک کہ خدا ہم کو اس قابل نہ کر دے کہ ہم ظلم وستم سے نجات پا جائیں۔

یہاں پر یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اس وقت تک حضورؐ مکہ کے بت پرستوں کو اپنا اور اسلام کا دشمن سمجھتے تھے اور عیسائیوں اور یہودیوں پر اتنا اعتماد تھا کہ نازک موقع پر آپ کی نظر بس ان ہی پر ہوتی تھیں۔

ابن اسحٰق کے بیان کے مطابق ۸۳ آدمیوں نے آپ کے اس مشورہ کو مان لیا۔ ابنِ اسحٰق نے ان ۸۳ آدمیوں کے نام بھی دیئے ہیں جنہوں نے مشورہ قبول کرتے ہوئے حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ ان میں سے بعض لوگ اپنے ساتھ اپنے اہل وعیال کو بھی لیتے گئے۔ اُن ہجرت کرنے والوں میں قابلِ ذکر عثمانؓ ابن عفانؓ ہیں جن کا تعلق بنی امیہ سے تھا اور ابوسفیان اُن کا چچازاد بھائی ہوتا تھا۔

حضرت عثمانؓ کا نکاح حضورؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ سے ہوا تھا۔ بی بی رقیہؓ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ ابن اسحٰق کے بیان کردہ ناموں میں تقریباً ان سب ہی لوگوں کے نام آجاتے ہیں جو اس وقت تک مسلمان ہوئے تھے۔ سارے مسلمانوں کو حبشہ روانہ کر کے ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ آپ مکہ میں رہنے لگے۔ مکہ دشمنوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس مخالف فضا میں قیام حضورؐ کی بہادری، شجاعت، اخلاقی بلندی اور اعلیٰ کردار کو نمایاں کرتا ہے۔

علیؓ ابن ابی طالب اور زیدؓ آپ کے ساتھ ہی ٹھہرے رہے۔ وفادار اور جانثار ساتھی ابوبکرؓ بھی مکہ ہی میں رہے۔ حبشہ جانے والے مہاجرین سب کے سب ایک ساتھ نہیں گئے بلکہ آٹھ آٹھ دس دس لوگوں پر مشتمل چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی صورت میں مکہ سے روانہ ہوئے۔

مکہ کے عربوں کے لئے حبشہ کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ وہ تجارت کے سلسلے میں حبشہ سے

Marfat.com

خوب واقف تھے۔ اس کے علاوہ حبشہ نے یمن پر تقریباً پچاس سال حکومت بھی کی تھی یہ زمانہ ۵۲۴ء سے ۵۷۴ء تک کا تھا۔

بہت ممکن ہے کہ حبشہ جانے والے مہاجرین سے مقامی لوگوں نے دلچسپی کا اظہار کیا ہو۔ اس وقت حبشہ کا دارالخلافہ اکسم تھا۔ حبشہ میں پوری طرح مذہبی آزادی تھی مسلمان بھی کھلے بندوں عبادت اپنے طور پر کیا کرتے تھے۔ ان کے طریقہ عبادت پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی ان لوگوں کا حبشہ میں ذریعہ معاش کیا تھا اس کے متعلق کوئی معلومات ہمیں نہیں ملتی۔ ان میں سے بعض لوگوں نے اس وقت بھی حبشہ ہی میں قیام کرنے کو ترجیح دی جبکہ وہ عرب میں محفوظ طریقے سے واپس جاکر پھر سے وہاں اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکتے تھے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اُن کی روزی کا ذریعہ ٹھیک ہی ہو گا۔

حال ہی میں ایک مغربی مصنف منٹگمری واٹ نے یہ انکشاف کیا ہے کہ مسلمانوں میں آپس میں اختلاف ہو گیا تھا اس لئے اُن میں سے چند تنگ آ کر مجبور ہو کر حبشہ کی طرف چلے گئے جس کو مسلم مورخین نے چھپائے رکھا۔ ہمارے لیے یہ قطعی ناممکن ہے کہ ہم اوپر کے انکشاف کی کسی بھی طرح سے تصدیق یا حمایت کر سکیں۔ ہجرت کی وجوہ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہو سکتیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

ابن اسحق کے دیئے ہوئے ۸۳ ناموں کا جب ہم غور سے مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں اکثریت یا تو بنی مخزوم کے لوگوں کی تھی یا پھر اُن کا تعلق عبدالشمس کے خاندان سے تھا۔ یہ دونوں قبیلے قریش کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھا۔ یہی وہ مالدار طبقہ تھا جو حضورؐ کی مخالفت میں پیش پیش رہا کرتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان مالدار اور تجارت پیشہ قبیلوں کے چیدہ چیدہ افراد اسلام قبول کرنے کی وجہ سے خاندانی جھگڑوں کا شکار ہو گئے تھے اس کے برخلاف وہ خاندان جو زیادہ امیر نہیں تھے مثلاً بنی ہاشم، بنی مطلب، بنی زہرہ یا بنی تیم ان کے بہت ہی کم لوگوں نے حبشہ کا رخ کیا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اُن خاندان والوں

Marfat.com

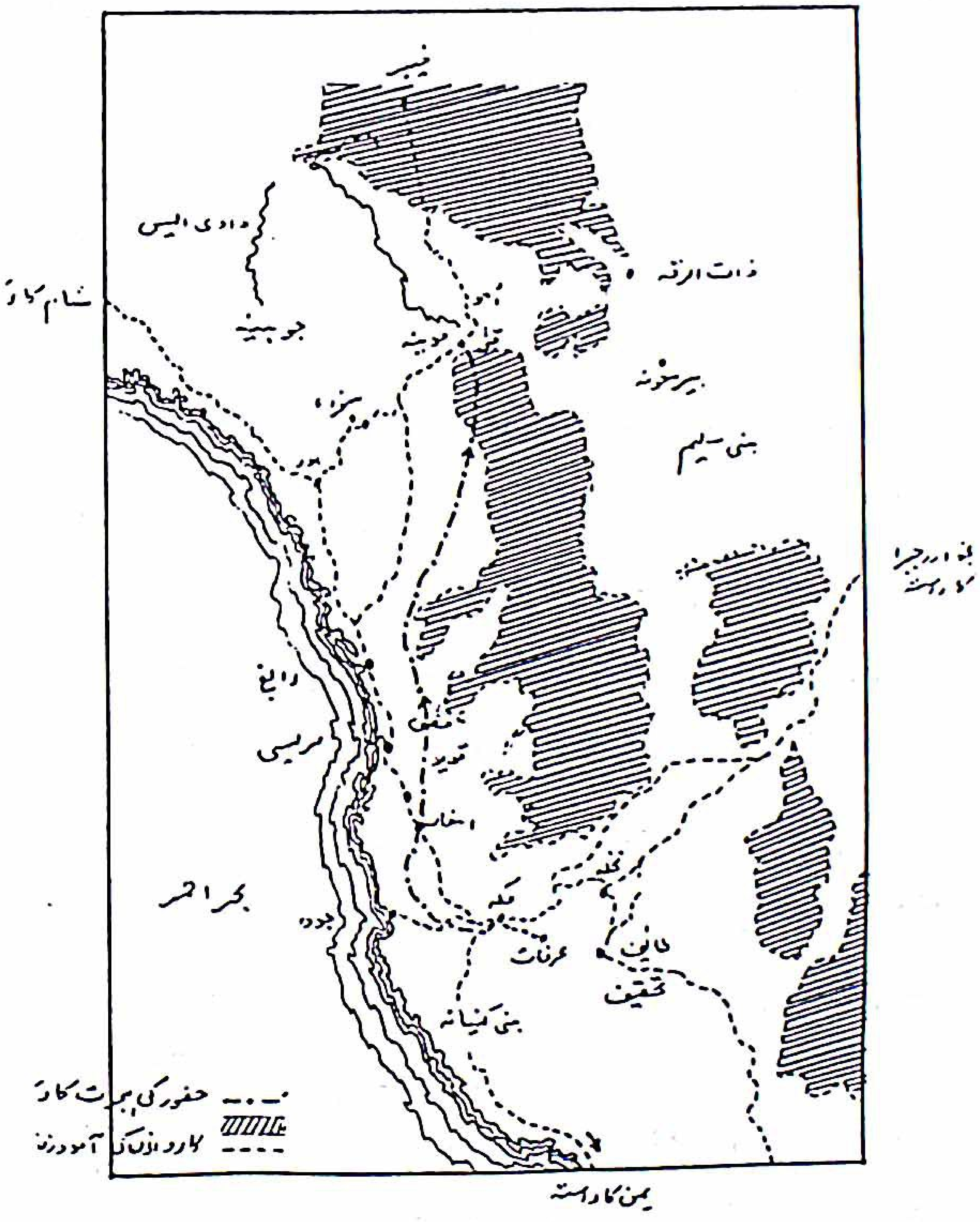
خیبر
وادی الیس
ذات الرقہ
بیر معونہ
بنی سلیم
رابغ
قدید
بحر احمر
جدہ
مکہ
عرفات
طائف
حنین
بنی کنانہ
یمن کا راستہ

نے اپنے مسلم افراد خاندان کو اتنا تنگ نہیں کیا ہوگا جتنا بنی مخزوم یا عبد الشمس کے قبیلوں نے اپنے افراد کو تنگ کیا۔

مکہ کے لوگ اکثر و بیشتر حبشہ کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے واقف بھی تھے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ خود حضورؐ بھی بہ نفس نفیس حبشہ جا چکے تھے اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ اس کی تصدیق کرنا بھی ہمارے لیے مشکل ہے۔

جب قریش کے لوگوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ہجرت کر کے حبشہ پہنچ گئی ہے تو انھوں نے اپنا ایک وفد حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی خدمت میں روانہ کیا۔ بادشاہ سے درخواست کی کہ مہاجرین کو اپنے ملک سے نکال دے۔

قریش کا وفد دو نمائندوں پر مشتمل تھا۔ یہ نمائندے مکہ کے با اثر اور صاحب الرائے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام عبداللہ ابن ربیعہ تھا اور دوسرے کا نام عمر ابن العاص۔ یہ دوسرے صاحب تو آگے چل کر مسلمانوں کے بہت ہی بڑے فاتح بنے۔ فاتح مصر یہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر مکہ والوں نے حبشہ کے مہاجرین کو واپس کرنے کے لیے کیوں بادشاہ سے درخواست کی۔ اگر واقعی ہجرت کیے ہوئے مسلمان فتنہ اور فساد کا باعث تھے تو ان کا مکہ سے ہجرت کرنا اور حبشہ میں جا کر قیام کرنا مکہ والوں کی اپنی فتح تھی اس کی تشریح دو طرح سے کی جا سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ مکہ کے مالدار تاجر حبشہ کے بادشاہ سے اپنے تعلقات استوار رکھنا چاہتے تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان مہاجرین کی وجہ سے ان لوگوں کے تعلقات شاہ حبشہ سے بگڑ جائیں۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو جو ان کی قومی دولت میں اضافہ کر رہے تھے غیر ملک میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ چمڑے کی مصنوعات مکہ کی خصوصیت تھی۔ قریش کے نمائندے حبشہ جاتے وقت اپنے ساتھ کافی تعداد میں چمڑے کی مصنوعات لیتے گئے۔ چلنے سے پہلے مکہ کے تجربہ کاروں نے اپنے نمائندوں سے کہہ دیا تھا کہ حبشہ کے درباریوں کا خاص خیال

Marfat.com

رکھنا۔ جیسے ہی حبشہ میں داخل ہوں خاص خاص درباریوں اور شاہی خدام کے جیب گرم کردینا تاکہ وہ لوگ دربار شاہی میں تمھاری اور تمہارے سامان کی خریداری کے لیے بادشاہ سے سفارش کریں۔

عبداللہ اور عمر بن العاص جیسے ہی حبشہ پہنچے دربار شاہی میں حاضر ہونے کے لیے بادشاہ سے درخواست کی۔ جب دربار میں پہنچے تو ان دونوں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ ہمارے ملک کے چند لوگ اپنے آبائی دین سے برگشتہ ہو کر آپ کے ملک میں پہنچ گئے ہیں اور یہاں پناہ گزین ہیں۔ وہ نہ تو اپنے باپ دادا کے دین پر قائم ہیں اور نہ ہی اس ملک میں آکر انہوں نے آپ کا مذہب اختیار کیا ہے بلکہ انہوں نے دونوں مذاہب سے الگ اپنا ایک نیا دین اختیار کیا ہے۔ دونوں نمایندوں نے بادشاہ سے التجا کی کہ آئے ہوئے پناہ گزینوں کو حبشہ سے نکال کر پھر واپس مکّہ روانہ کر دیا جائے۔

درباریوں اور امرا نے جو پہلے ہی سے ان نمایندوں سے رشوت حاصل کر چکے تھے ان نمائندوں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ بادشاہ سے سفارش کی کہ نمائندوں کے کہے پر عمل ہو تو بہتر رہے گا۔

بادشاہ نے نمائندوں کی درخواست کو رد کر دیا۔ اُن سے کہا کہ وہ اس وقت تک مسلمانوں کو اپنے ملک سے باہر نہیں نکالے گا جب تک کہ اُن کو بھی صفائی کا موقع نہ ملے۔ دربار میں مسلمانوں کی طلبی ہوئی۔ مسلمانوں نے اپنا نمائندہ حضرت جعفرؑ ابن ابی طالبؑ کو بنایا اور دربار میں اپنی نمائندگی کے لئے روانہ کیا۔

جعفر ابن ابی طالب نے حبشہ کے بادشاہ سے کہا کہ ہم پہلے بتوں کی پوجا کرتے تھے اخلاقی تنزل میں تھے۔ ہر قسم کی برائی میں ملوث تھے۔ خدا نے ہماری یہ حالت دیکھ کر ہمارے لیے ایک رسول بھیجا اُس رسول نے ہمیں سکھایا کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ اپنی زندگی میں سچائی پیدا کرو۔ بتوں کو بھول جاؤ۔

Marfat.com

بادشاہ نے جعفر سے سوال کیا کہ تمھارے ہاں کوئی ایسا کلام ہے جسے خدا نے تمھارے پیغمبر کو دیا۔ حضرت جعفرؓ نے قرآن کے سورۂ مریم کی تلاوت کی اور ایک سے شروع کر کے چالیسویں آیت پر اپنی قرأت ختم کی۔ ان آیات میں حضرت زکریا اور JOHN THE BAPTIST کی پیدائش کا ذکر ہے اور پھر حضرت عیسیٰ کا بغیر باپ کے بی بی مریم کے بطن سے پیدا ہونا بیان کیا گیا ہے۔ ایک عیسائی بادشاہ کے سامنے تلاوت ہو رہی تھی۔ یہ عین ممکن ہے کہ حضرت جعفرؓ نے ۳۴ ویں آیت پر پہنچ کر اپنی قرأت ختم کر دی ہو اس لیے کہ ۳۵ ویں آیت میں جس بات کی طرف اشارہ ہے وہ عیسائی عقیدہ سے میل نہیں کھاتا۔ ۳۵ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

"خدا کو سزاوار نہیں کہ کسی کو بیٹا بنائے۔ وہ پاک ہے۔ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اُس کو یہی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔"

پروفیسر مارگولیتھ کا کہنا ہے کہ اس آیت کو سورہ میں اس وقت جگہ ملی جب بعد میں مل کر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مناقشہ پیدا ہونے لگا۔

حضرت جعفرؓ کی قرأت کو سن کر نجاشی کو یہ گمان گزرا کہ اسلام بھی عیسائیت ہی کا کوئی نیا فرقہ ہے۔ بادشاہ نے مسلمانوں کی حبشہ سے واپسی کے مطالبے کو سختی سے رد کر دیا۔

عمر بن العاص نے ابھی ہمت نہیں ہاری۔ دوسرے دن پھر بادشاہ کے ہاں حاضر ہونے کی درخواست کی۔ ان کو دربار میں دوبارہ بلوایا گیا۔ انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ مسلمانوں کو پھر سے دربار میں طلب کیا جائے اور اُن سے سوال کیا جائے کہ عیسیٰ اللہ کی مخلوق ہیں یا نہیں۔ جعفر دربار میں طلب کیے گئے۔ اُن سے وہی سوال پوچھا گیا۔ جواب میں جعفر نے کہا کہ ہم عیسیٰ کے تعلق سے وہی کہیں گے جس کو ہمارے پیغمبر نے ہم سے کہا ہے۔ عیسیٰ خدا کا بندہ ہے اس کے پیغمبر ہیں۔ اس کی روح ہیں۔ اس کے الفاظ ہیں۔ عیسیٰ وہی ہیں جن کو خدا نے بی بی مریم کے شکم سے اپنی طرف سے روانہ کیا۔

یہاں یہ عین ممکن ہے کہ جعفر کا دوسری بار دربار میں بلوائے جانے کا واقعہ مورخین کی اپنی

اختراع ہو۔ ساتھ ہی ساتھ یہ واقعہ اس بات کی بھی نشان دہی کرتا ہے کہ مکّہ کے لوگ چاہے وہ مشرک تھے یا بت پرست، کافر تھے یا مسلمان، سب کے سب عیسائیت کی تعلیم اور اس کے عقیدوں سے واقف ضرور تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضورؐ کے ایک قریبی رشتہ دار ورقہ ابن نوفل نے انجیل کا کچھ ترجمہ عربی میں بھی کیا تھا۔

جعفر کے جواب سے حبشہ کے بادشاہ کو اطمینان ہوگیا۔ عبداللہ اور عمر بن العاص خالی ہاتھ مکّہ واپس لوٹے۔

ارقم نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اس نوجوان کا تعلق بنی مخزوم سے تھا۔ ارقم نے اپنے گھر کو مسلمانوں کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ جگہ اب مسلمانوں کے آپس میں مل بیٹھنے کی جگہ بن گئی۔ ارقم کا مکان مکہ کے شہر کی گلیوں سے کچھ آگے پُرسکون جگہ واقع ہوا تھا۔ بغیر کسی شور و شغب کے مسلمان سکون کے ساتھ اس گھر میں مل بیٹھتے تھے۔ جس مقام پر گھر تھا اس کا نام الصفا تھا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سخت ترین دشمن عمر بن خطاب بھی تھے۔ ان کا تعلق عدی بن کعب کے قبیلہ سے تھا۔ ان کی تند طبیعت اور جذباتی فطرت سے مکہ کا ہر شخص خائف تھا۔ ایک دن عمر کو جوش آیا اور غصّہ میں اپنے گھر سے اس ارادہ سے نکلے کہ ارقم کے گھر جا کر مسلمانوں کی محفل کو تہہ و بالا کر دیں۔ اس وقت اُس مکان میں بشمول خواتین ۴۰ افراد تھے۔ راستے میں کسی شخص سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس شخص نے سوال کیا کہ عمر کہاں کے ارادے ہیں۔ عمر نے جواب دیا کہ میں ارقم کے گھر منعقد ہونے والی مجلس کو برخواست اور ساتھ ہی محمدؐ کو ختم کرنے جا رہا ہوں۔ عمر کا غصّہ سے بھرا ہوا جواب سُن کر اُس شخص نے کہا کہ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ پہلے اپنے گھر والوں کا جائزہ لو۔ عمر نے چیخ کر کہا "کیوں"؟ میرے خاندان والوں میں تمہیں کیا برائی نظر آتی ہے۔ اُس شخص نے جواب دیا۔ حضرت۔ آپ کے بہنوئی سعید اور آپ کی ہمشیرہ فاطمہ دونوں نومسلمان ہو چکے ہیں۔ پہلے گھر جا کر اُن کی تو خبر لو۔

عمر آپے سے باہر ہو گئے۔ غصّے سے کانپتے ہوئے اپنے بہنوئی اور بہن کے گھر کا رُخ کیا۔

Marfat.com

جو کچھ عمر نے سنا تھا سچ پایا۔ بہن اور بہنوئی کو مسلمان پایا۔ جب عمر دروازہ پر پہنچے اس وقت خباب بن ارتؓ نامی ایک مسلمان اُن میاں بیوی کو سورہ طٰہٰ کی آیات پڑھ کر سنا رہے تھے۔ یہ آیات تحریری صورت میں بھی خباب کے پاس تھیں۔ جیسے ہی عمر کے آنے کی آہٹ ہوئی خباب جو بے چارے غلام تھے اپنی جان کی سلامتی کے لیے پڑھنا پڑھانا بند کر کے گھر کے پچھلے حصے میں جا کر چھپ گئے۔ عمر دروازہ کے باہر ہی سے قرأت کی آواز سن چکے تھے۔ چیختے چلاتے گھر میں گھس آئے اور کہنے لگے کہ یہ سب کیا بکواس تھی۔ میاں بیوی نے بہ یک آواز خاموشی سے کہا کہ کچھ بھی نہیں۔ عمر خاموش رہنے والے کہاں تھے۔ فوراً کہا کہ میں سب کچھ سن چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم دونوں نے محمدؐ کا دین قبول کر لیا ہے۔ عمر اپنے بہنوئی سعید سے دست و گریباں ہو گئے اور مار پیٹ شروع کرنے والے ہی تھے کہ عمر کی بہن فاطمہ اپنے شوہر کو بچانے کے لیے درمیان میں آگئیں۔ عمر آپے سے باہر تھے اپنی بہن کو پیٹنے لگے۔

میاں بیوی دونوں نے پُرعزم لہجے میں کہا کہ ہاں ہم مسلمان ہو گئے ہیں ہم خدا پر ایمان لائے ہیں۔ اُس کے پیغمبر کو برحق مانتے ہیں تمہیں جو کرنا ہے کر لو۔

جب عمر نے دیکھا کہ بہن کے چہرے سے خون ٹپک رہا ہے اُن کا غصّہ کم ہوا۔ کہنے لگے جو چیز تم ابھی پڑھ رہے تھے مجھے دو۔ میں بھی تو دیکھوں کہ محمدؐ کیا کہتے ہیں۔ اُن کی بہن قرآنی تحریر کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئی تھیں۔ جرأت مندی سے اپنے بھائی عمر کو جواب دیا۔ میرے بھائی تم گندے ہو تم ناپاک ہو۔ اس تحریر کو تو صرف پاک لوگ ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں۔ بہن کی یہ بات سن کر عمر باہر گئے۔ اپنے ہاتھوں کو دھویا اور پھر اپنی بہن سے قرآنی تحریر مانگی اور قسم کھائی کہ وہ پڑھ کر اسے واپس کر دیں گے۔

عمر کافی پڑھے لکھے تھے اور ہر تحریر کو آسانی سے پڑھ لیتے تھے۔ جس سورہ کو عمر پڑھ رہے تھے اُس میں خدائے پاک اپنے پیغمبر سے یوں مخاطب ہے۔

Marfat.com

"اے محمدؐ! ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں بلکہ اس شخص کو نصیحت دینے کے لیے (نازل ہوا) جو خوف رکھتا ہے۔ یہ اس کا اتارا ہوا ہے جس نے زمین اور اونچے اونچے آسمان بنائے"۔

ان آیات کو پڑھ کر بے اختیار عمر کی زبان سے نکلا سبحان اللہ کتنے پیارے الفاظ ہیں۔ خباب جو ایک کونے میں چھپے ہوئے تھے قرآن کی یہ تعریف سن کر باہر نکل آئے اور وجد میں آ کر کہنے لگے۔ عمر خدا کی طرف آؤ۔ عمر خدا کی طرف آؤ۔

عمر نے پھر سے تلوار سنبھال لی۔ سیدھے ارقم کے گھر کا رخ کیا۔ ارقم کے ہاں پہلے تو اس خیال سے جانا چاہتے تھے کہ محفل کو درہم برہم کر دیں لیکن اب دل کی دنیا بدل چکی تھی۔ جب وہاں پہنچے تو دروازہ پر دستک دی۔ مسلمانوں میں سے کسی نے دروازے سے پہلے جھانکا۔ فوراً پلٹ کر حضورؐ سے کہا کہ یہ تو عمر ہے جو تلوار لیے دروازہ پر کھڑا ہے۔ خوش قسمتی سے وہاں حمزہؓ بھی موجود تھے۔ حمزہؓ نے کہا کہ عمر کو اندر آنے دو۔ اگر وہ برے ارادے سے آئے ہیں تو ہم اُن سے نپٹ لیں گے۔

حضورؐ بہ نفس نفیس دروازہ پر تشریف لے گئے تاکہ عمر کو خوش آمدید کہیں۔ عمر کی چادر اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے حضورؐ نے سوال کیا کہ اپنی عصبیت کب ختم کرو گے۔ عمر نے جواب دیا کہ اللہ کے رسول اسی جہالت کو ختم کرنے ہی کے لیے تو میں یہاں حاضر ہوا ہوں۔ یہاں اس لیے آیا ہوں کہ اللہ پر اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤں۔ عمر کے اسلام لانے کا یہ واقعہ کافی مشہور ہے۔

حضرت عمرؓ نے جب خود اپنی زبان سے اپنے اسلام لانے کا ذکر کیا ہے تو اس میں کسی جگہ اپنی بہن کو مارنے کا ذکر نہیں کیا۔ حضرت عمرؓ کا حلقہ بگوشِ اسلام ہونا اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اب مسلمانوں کے ہاں دو عظیم شخصیتیں تھیں۔ ایک حمزہؓ اور دوسرے عمرؓ۔

حضرت عمرؓ کا جو رعب و دبدبہ تھا اُس کے متعلق خود حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اگر شیطان

Marfat.com

بھی دیکھتے کہ عمرؓ آرہے ہیں تو وہ راستے سے ہٹ جائے گا۔

حضرت عمرؓ حضورؐ سے عمر میں دس سال چھوٹے تھے۔ اپنی نوجوانی میں اُن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ پکے شرابی تھے۔ یہی وہ عمرؓ ہیں جن کے زمانہ خلافت میں مکّہ کی چھوٹی سی بستی دنیا کی ایک عظیم سلطنت میں تبدیل ہوگئی۔

باوجود اپنی اُجڈ اور تشدّد پسند طبیعت کے حضرت عمرؓ اسلام کے سچے عاشقوں میں شمار کئے جانے لگے۔ خلوص نیت کے ساتھ دل و جان سے رسول اللہ کے چاہنے والوں میں سے تھے۔

طبیعت کے لحاظ سے حضرت عمرؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ضد تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نرم خو تھے۔ مسائل کو ہمیشہ نرمی سے حل کرتے تھے۔ اُن کے برخلاف حضرت عمرؓ تُند خو تھے طاقت اور قوت کی زبان استعمال کرتے تھے۔ خود اپنے گھر میں اپنی بیوی کو بھی زدوکوب کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے۔

حضورؐ کے مخالفین کے لیے حضرت عمرؓ کا اسلام لانا ایک تکلیف دہ بات تھی۔ مسلمانوں کی اکثریت کے حبشہ ہجرت کرنے کے باوجود اسلام آہستہ آہستہ جڑیں پکڑ رہا تھا۔ لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو رہے تھے۔ حبشہ کے بادشاہ کا مہاجرین کو مکّہ واپس کرنے سے انکار مکّہ کے مالدار اور با اثر تاجروں کے منہ پر ایک طمانچہ تھا۔

مخالفین پھر ایک بار جمع ہوئے۔ آپس میں گفت و شنید کرنے لگے۔ طے پایا کہ حضورؐ اور آپ کے قریبی رشتہ داروں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ قریش کی تمام جماعتوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ خاندان بنی ہاشم اور خاندان المطلب کا ہر طریقے سے مقاطعہ کیا جائے۔ ان دونوں خاندانوں کو نہ لڑکیاں دی جائیں اور نہ ہی اُن خاندانوں کی لڑکیوں سے اپنے لڑکوں کا بیاہ کیا جائے۔ نہ ان کو کوئی چیز فروخت کی جائے اور نہ ہی اُن سے کوئی چیز خریدی جائے۔

اس مقاطعہ کے فیصلے پر سنجیدگی سے عمل کرنے کی ہر ایک نے قسم کھائی۔ مقاطعہ کی تفصیلات کو ایک دستاویز کی شکل دے کر خانۂ کعبہ میں لٹکا دیا گیا۔

جیسے ہی مقاطعہ کا آغاز ہوا بنی ہاشم اور بنی مطلب کے افراد شہر مکہ سے ذرا باہر ایک چھوٹی سی وادی میں جہاں ابوطالب رہا کرتے تھے منتقل ہو گئے۔ اس وادی کے اطراف پہاڑ تھے۔ ایک روایت کے مطابق تقریباً ۴ ہزار افراد ایسے تھے جو مقاطعہ کی زد میں تھے۔ یہ تعداد مبالغے پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس وقت مکہ کی کل آبادی تقریباً دس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ ہو سکتا ہے کہ چار سو کو لوگوں نے چار ہزار بنا دیا ہو۔ ان چار سو میں بھی مرد، عورتیں، بچے، آزاد اور غلام، صحت مند اور بیمار سب ہی شامل رہے ہونگے۔

قریش کے سرداروں کے ارد گرد سارے افراد خاندان کا جمع رہنا اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ قریش کے لوگ خیموں میں رہا کرتے تھے۔ اُن میں ابھی بدویت باقی تھی۔

بنی ہاشم میں صرف ابولہب ہی ایسا تھا جو حضورؐ کا چچا ہونے کے باوجود اپنے قبیلے کو چھوڑ کر دشمنوں سے مل گیا اور دشمنوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور رہنے لگا۔

اس وادی میں دونوں خاندانوں کے افراد ابوطالب کی سرپرستی میں اپنی زندگی کے دن کاٹنے لگے۔ ان افراد میں بہت کم ایسے تھے جو مسلمان تھے۔

ابولہب کی بیوی نے اپنا مشغلہ بنا لیا تھا کہ کانٹوں کے ڈھیر کے ڈھیر لا کر حضور کے گھر کے سامنے ڈال دے۔ راستے میں کانٹوں کو اس طرح سے بچھا دیتی تھی کہ حضورؐ جیسے ہی اپنے گھر سے قدم نکالیں کانٹے آپ کی پابوسی کریں۔

قرآن پاک کے سورہ لہب میں ابولہب اور اس کی بیوی کا ذکر کیا گیا ہے

"ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو۔ نہ تو اس کا مال ہی اس کے کچھ کام آیا اور نہ وہ جو اس نے کمایا۔ وہ جلد بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا اور اس کی بیوی بھی جو ایندھن سر پر اٹھائے پھرتی ہے اس کے گلے میں مونج کی رسی ہوگی۔

گو ہاشمی اور مطلبی خاندانوں کے افراد کے ساتھ شادی بیاہ اور خرید و فروخت میں

Marfat.com

بائیکاٹ ضرور رہا لیکن ان کو شہر میں آنے جانے کی آزادی تھی۔ حضورؐ کے ساتھ جو بدزبانی اور یاوہ گوئی کی جاتی تھی۔ ان ساری بدتمیزیوں اور بےہودگیوں کے باوجود حضورؐ برابر شہر تشریف لے جاتے، راستوں میں بےخطر گھوما کرتے، لوگوں سے بحث ومباحثے کرتے لیکن کبھی بھی کسی تشدد کا آپ نے مظاہرہ کیا اور نہ ہی کسی نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کی۔

اس دوران مکہ میں بحث ومباحثہ کا بازار گرم تھا۔ جب لوگ حضورؐ کی ذرا سی بھی موافقت کرتے مخالفین ان کے پیچھے پڑ جاتے اور کبھی ختم نہ ہونے والی بحث شروع ہو جاتی۔ آپس میں مار دھاڑ، قتل وغارت، قید وبند، ظلم وستم یا شہادت کی ابتدا ابھی نہیں ہوئی تھی۔

ہمارے ہاں کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ اس وقت کے بت پرستوں کا عقیدہ آخر کیا تھا۔ وہ ایک خدائے واحد کو ماننے کے لیے تیار تھے بشرطیکہ ان کے اپنے بنائے ہوئے معبودوں کو انسان اور خدا کے درمیان ایک وسیلہ یا رابطہ مان لیا جائے۔ ان کے بتوں کو پوجنے کو ان معنی میں نہ لیا جائے کہ وہ پتھر یا لکڑی یا درختوں کو ان کی خاطر پوجا کرتے تھے۔ یہ ایسی ہی بات ہوئی جیسے چرچ میں پلاسٹر کی مورتیاں ہوتی ہیں۔ ان میں عیسٰی کی بھی مورتی ہوتی ہے اور مریم کی بھی۔ اس کے باوجود چرچ میں عیسائی ان مورتیوں کی پوجا کے لیے نہیں جاتے بلکہ اپنے خدا کی عبادت کے لیے جاتے ہیں۔

ان میں سے اکثر لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ان کے بت خدائے واحد کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کے ذریعے خدا تک آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے۔ چونکہ حضورؐ خود بھی فرشتوں اور جن کے قائل تھے اس لئے مکہ کے بعض لوگوں نے بت پرستی، فرشتے اور جن کے تصور کے درمیان مماثلت اور مصالحت پیدا کرنی چاہی۔

چند بے دین اس بات کے تو قائل تھے کہ مرنے کے بعد پھر سے زندگی ملے گی مگر اس بات کے قائل نہیں ہوتے تھے کہ انسان من وعن وہی جسم دوسری دنیا میں لے گا جیسے وہ اس دنیا میں لئے ہوئے ہے۔ اس دنیا میں ہمارے جسم اور خدوخال جیسے ہیں ان کا دوسری دنیا میں اعادہ ہوگا۔

Marfat.com

ایک بار ایک شخص نے پرانی ہڈی حضورؐ کی خدمت میں پیش کی اور کہا اے پیغمبرؐ آپ تو کہتے ہیں کہ خدا اس ہڈی کو پھر سے زندگی دے گا۔ یہاں تو یہ فنا درجے میں ہے حضورؐ نے فرمایا ہاں میں سچ کہتا ہوں خدا اس ہڈی کو اور مرنے کے بعد تم کو دوسری دنیا میں نئی زندگی دے گا اور تم کو اس تمسخر کے نتیجے میں دوزخ میں بھیجے گا۔ یہ سن کر سوال کرنے والے کو غصہ آیا اور ہڈی کو ہاتھوں سے ملتے ہوئے اُس کی گو دکو آپ کی طرف پھونکا۔

حضورؐ کی خصوصیات میں آپ کی خاموش پسند طبیعت، امن پسندی ہر دلعزیزی اور محبت آمیز سلوک کا ہر ایک قائل تھا۔ آپ مکّہ کے لوگوں کو دل سے چاہتے تھے۔ طبری کا کہنا ہے کہ آپ کسی ایسے سمجھوتے کی تلاش میں تھے جس سے آپ کا اور مکّہ والوں کا کسی نہ کسی نکتہ پر اتفاق ہو جائے۔

طبری اور واقدی کے بیان کے مطابق حضورؐ مجمع عام میں قرآن پاک کے سورۂ النجم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ آپ اس سورہ کی اٹھارویں آیت پر پہنچے جس میں خدائے پاک اپنے رسول کی اِن الفاظ میں شہادت دے رہا ہے۔

" انھوں نے اپنے پروردگار (کی قدرت) کی کتنی ہی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ بھلا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا اور تیسرے منات کو۔"

اس مقام پر شیطان حضور کی زبان سے یہ الفاظ بھی ساتھ ہی نکلوا تا ہے۔

"یہ بلند مرتبہ بت ہیں اور شفاعت کرنے والے ہیں۔"

جب قرأت ختم ہوئی حضورؐ سجدہ میں گر پڑے۔ آپ کو دیکھ کر مسلمانوں نے بھی سجدہ کیا۔ جب بت پرستوں نے عزیٰ اور لات ومنات کا ذکر باعزت طریقے سے حضورؐ سے سنا اور یہ بھی سنا کہ اُن کی شفاعت کی توقع ہے تو یہ لوگ بھی حضورؐ کے ساتھ سجدہ میں شامل ہو گئے۔ خانۂ کعبہ میں جتنے لوگ موجود تھے مسلمان اور مشرک سب ہی سر بہ سجود تھے اور ایک ساتھ عبادت کر رہے تھے۔ جب لوگ منتشر ہوئے تو قریش آپس میں ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے کہ چلو مصلحت کی اور مفاہمت کی کوئی صورت تو نکل آئی۔

Marfat.com

جدید مسلم علمائے کرام نے عیسائی مصنفین کو ہدف ملامت بنایا ہے کہ ان شر پسندوں نے اس واقعہ کو رنگین بنایا۔ یہ ان کی اپنی اختراع ہے تاکہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر کوئی تو دھبہ لگے۔

طبری اور واقدی دونوں نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔

بہت سے مسلم مفسرین بشمول ابنِ اسحٰق نے اس واقعہ کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ میرے نزدیک اس واقعہ کو سرے سے نظر انداز کر دینا دیانت کے خلاف ہے۔ حضورؐ نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں فرمایا کہ آپ گناہوں اور غلطیوں سے مبرا ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کا یہ عمل دشمنوں کے تالیفِ قلوب کے لیے ہوا ہو۔

اس واقعہ کی صداقت کے لیے ایک اور ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔ حبشہ کے مہاجرین کو جب اس کا علم ہوا کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت ہو گئی ہے اور ان کے تعلقات آپس میں پھر سے سنورنے لگے تو کئی ایک ہجرت کیے ہوئے لوگ مکہ واپس آ گئے۔

ابنِ اسحٰق نے ان تمام آدمیوں کے نام بھی گنوائے ہیں جو اس مصالحت کی خبر سن کر حبشہ سے مکہ واپس ہوئے اگرچہ کہ انہوں نے شیطانی الفاظ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ اگر واقعی یہ صحیح ہے کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت ہو گئی تو اس مفاہمت کی میعاد یقیناً کئی دن بلکہ کئی ہفتے ہونا چاہیے۔ جب ہی تو حبشہ کے لوگ اس بات کو سن کر مکہ واپس آئے۔

طبری جنہوں نے شیطانی وسوسہ اور الفاظ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ حضورؐ نے اپنی غلطی محسوس کر کے اسی دن اپنی مفاہمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا کہنا ہے کہ حضورؐ نے کبھی بھی شیطانی الفاظ اپنی زبان سے ادا نہیں فرمائے تھے بلکہ بت پرستوں نے حضورؐ کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنی مطلب براری کی۔

(سیرت رسول اللہ میں پروفیسر نواب علی رضوی لکھتے ہیں کہ قاضی عیاض نے شفا میں اور بیضاوی امام رازی نے اپنی اپنی تفاسیر میں اس روایت کی قلعی کھولی ہے اور ثابت کیا ہے کہ

Marfat.com

عقلاً اور نقلاً یہ روایت مردود ہے جنہوں نے اس روایت کو بیان کیا ہے ان کو یہ نہ سوجھا کہ اسی سورۂ نجم میں اس جھوٹی روایت کی قلعی کھولی گئی ہے شروع میں صاف صاف فرمادیا گیا۔

"وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ"

نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکلتے ہیں۔ اس کے بعد کی آیت ہے یہ تو حکم خدا ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔

پھر شیطان کیونکر تصرف کرتا اور زبانِ مبارک سے وہ نجس جملہ نکلواتا۔ حبیب)

انسانی کمزوری کا ایک اور واقعہ حضورؐ سے منسوب ہے۔ اس کا وقوع بھی غالباً عین اسی زمانے میں ہوا جبکہ اوپر بیان کیا گیا ہوا واقعہ پیش آیا۔ آپ ایک مرتبہ مکہ کے ایک بہت ہی بااثر آدمی سے مصروفِ گفتگو تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ کسی طرح اُس آدمی کو داخل سلام کریں اسی دوران ایک بوڑھا جو اندھا بھی تھا آموجود ہوا اور حضورؐ سے فرمائش کی کہ آپ اس کو قرآن سنائیں۔ حضورؐ اس بن بلائے مہمان کی آمد اور مداخلت سے اور بے وقت کی فرمائش سے ناراض ہو گئے۔ بغیر اُسے کچھ جواب دیئے غصّے میں وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ خدا اپنے پیغمبر کی اس حرکت سے خوش نہیں ہوا۔ قرآن کے سورۂ عبس میں ارشاد ہوتا ہے۔

"(محمدؐ) ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے کہ اُن کے پاس ایک نابینا آیا۔ اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا یا سوچتا تو سمجھانا اُسے فائدہ دیتا۔ جو پرواہ نہیں کرتے اس کی طرف تو آپ توجہ کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ نہ سنورے تو آپ پر کچھ الزام نہیں (اور جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آیا اور (خدا سے) ڈرتا ہے اُس سے آپ بے رُخی برتتے ہیں دیکھئے یہ نصیحت ہے۔ جو چاہیں اُسے یاد رکھیں"

قرآن کی یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آپ اپنی انسانی کمزوریوں کو تسلیم کرتے تھے۔ آپ نے لات، منات اور عزیٰ تین نسوانی خداؤں کا ذکر تو اپنی زبان سے کر دیا۔ لیکن بعد میں پچھتاتے رہے کہ یہ کیا غلطی ہو گئی اس بات کو آپ کا دل نہیں مانتا تھا۔ اس

معاملے میں جب آپ کی تشویش بڑھ گئی تو جبرئیل حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ خدا کے الفاظ نہیں تھے شیطان نے آپ کے دماغ میں کچھ ایسی بات ڈال دی تھی جس سے مجبور ہو کر آپ نے شیطان کے الفاظ اپنی زبان سے ادا کر دیئے۔ شیطان نے یہ حرکت صرف آپ ہی کے ساتھ نہیں کی ہے۔ آپ سے پہلے آئے ہوئے انبیاء اور رسول بھی شیطان کی ان حرکتوں کی زد میں آ چکے ہیں۔

شیطان سے ادا کروائے گئے ہوئے الفاظ سورہ سے نکال دیئے گئے۔ قریش کے ساتھ مفاہمت ختم ہو گئی اور مخالفین نے پھر سے اپنی مخاصمت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

(اس سارے واقعے کی بنیاد ہی طبری اور واقدی کی روایات پر ہے۔ واقدی کے تعلق سے ابتداء میں ہم نے پروفیسر نواب علی رضوی کی سیرت رسول اللہ سے کچھ بیان کر دیا تھا۔ پھر ایک بار اس کا اعادہ ضروری ہے۔ واقدی سیرت رسول میں بے احتیاطی کیا کرتے تھے۔ روایات کو مخلوط کر دیتے تھے۔ امام احمد حنبل نے ان کو کذاب کہا ہے۔ امام بخاری متروک الحدیث کہتے ہیں۔ نسائی نے کہا ہے کہ واقدی رسول اللہ پر جھوٹ بولنے والوں میں سے تھے۔

طبری نے آنحضرتؐ کے واقعات ابن اسحٰق سے نقل کیے اور جا بجا واقدی کے اختلافات اور مختلف طریقوں سے جو روایات خود ان کو پہنچی تھیں وہ بھی درج کر دیں مگر بغیر کسی تحقیق کے۔

اسلام کی تاریخ لکھنے والے کے لیے ابن اسحٰق، زہری، واقدی، طبری اور بخاری کے رشحات قلم سے گریز کرنا ممکن نہیں اس لیے عقیدت اور ارادت کے قطع نظر ان قدیم ماخذوں میں حضورؐ کی ذات کے تعلق سے جو بات بھی کام کی مل جاتی ہے تاریخ داں اس سے استفادہ کرتے ہیں بد قسمتی سے سیرت کا ایک بڑا حصہ انہی ماخذوں کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے جن میں واقعات اور حقائق بھی ہیں اور رنگینیاں بھی۔ اُن ہی حضرات کو جن کے نام اوپر دیئے گئے ہیں۔ امام المغازی، نقل روایات کے دریائے ذخار، امیر المومنین فی الحدیث، ائمہ مجتہدین سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور انہی کو "دجالوں میں سے ایک دجال"

Marfat.com

کذاب، متروک الحدیث، لغو بیانوں کا سردار اور رطب و یابس کا ماہر کہا جاتا ہے۔

جب ایک ہی مورخ کو سارے اچھے القاب سے نواز دیتے ہیں اور جب اُسی مورخ نے کوئی ایک بات ایسی لکھ دی ہو جو واقعاتی نقطہ نظر سے اس کی نظر میں صحیح ہے تو ہم اس سے نہ صرف لڑنا شروع کر دیتے ہیں بلکہ فتنہ و فساد پر اُتر کر اسے گالیوں سے نوازتے ہیں محض اس لیے کہ اس کی کہی ہوئی بات ہمارے اپنے عقیدے اور ہماری اپنی محبت بلا اپنے انداز فکر سے میل نہیں کھاتی۔ اگر کسی مورخ کو کذاب ہی ٹھہرا دیا گیا تو پھر اُس کی ہر بات کذب پر مبنی ہو گی۔ اس کی معلومات یا اس کی کتاب سے استفادہ کرنا ہی غلطی ہے۔

سیرت اور اسلامی تاریخ کی ہر کتاب میں مسلم مورخین کے حوالے دیے جاتے ہیں جن میں ابن اسحٰق بھی ہیں۔ واقدی بھی ہیں۔ طبری بھی ہیں۔ زہری بھی ہیں بہت سے اسلامی واقعات کا ماخذ ہی ان لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ ایک طرف تو قدم قدم پر اُن کی کتابوں سے استفادہ کیا جائے اور واقعات کی بنیاد ہی ان کی روایات پر رکھی جائے اور ساتھ ہی ساتھ اُن کو کذاب یا دجال سے مخاطب کیا جائے کچھ عجیب سی بات لگتی ہے۔

دوسرے مورخین کی طرح گلب پاشا نے بھی قدیم اسلامی مفسرین اور مورخین کے رشحات قلم کو پیش نظر رکھا ہے۔ جو بات انہوں نے بیان کی ہے وہ بلا حوالہ نہیں ہے بلکہ اس کی سند ہے۔ اگر ہم میں سے کسی کو گلب پاشا کے حوالے اور سند سے اختلاف ہو تو غلطی گلب پاشا کی نہیں بلکہ اُن قدیم اسلامی مورخین کی ہے جن کے قلم سے نکلی ہوئی تحریریں آج سینکڑوں سال بعد بھی بعض اوقات ہمارے عقیدے اور جذبات کو مجروح کرتی ہیں۔

(حبیب)

اس دوران مقاطعہ کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس مقاطعہ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا اور اس کا اثر دونوں قبیلوں پر نہ ہونے کے برابر ہوا۔ بعض لوگ ان دونوں قبیلوں سے بالکل تعلقات نہیں رکھنا چاہتے تھے اور بعضوں نے بنی ہاشم کے ساتھ شادی بیاہ کا سلسلہ پھر سے بحال کر دیا۔ راتوں کو اکثر و بیشتر کھانے پینے کے سامان سے لدے ہوئے اونٹ مکہ کے شہر سے نکلتے اور ابو طالب کی وادی کا راستہ لیتے۔

جن مسلمانوں کا تعلق بنی ہاشم سے نہیں تھا اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی مقاطعہ نہیں کیا گیا۔ ہاں ان لوگوں کے ساتھ بے عزتی اور توہین کا سلوک نہ صرف جاری رہا بلکہ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ مجبور ہو کر چند مسلمانوں نے اپنے آپ کو با اثر بت پرستوں کی سرپرستی میں دے دیا تاکہ اُن کی سرپرستی کی وجہ سے وہ لوگ شر و فساد سے محفوظ رہیں۔ ابوبکرؓ کے قرابت داروں نے اُن کو اپنی قرابت سے نکال دیا تھا۔ ابوبکرؓ نے ہجرت کا ارادہ کیا اور حضورؐ سے ہجرت کی اجازت مانگی۔ جب آپ اپنی منزلِ مقصود کی طرف جا رہے تھے راستے میں ابن دغنہ سے ملاقات ہوئی جو اپنے قبیلہ کا سردار تھا۔

ابن دغنہ قریش کے حمایتوں میں تھا۔ قریش کے اونٹوں کو اپنی نگرانی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا کرتے تھا۔ ابن دغنہ نے ابوبکرؓ سے ہجرت کا سبب دریافت کیا۔ وہ ابوبکرؓ سے اچھی طرح سے واقف تھا۔ ابوبکرؓ کا شمار مکّہ کے معززین میں ہوتا تھا۔ وہ اپنی داد و دہش اور احسان و سلوک میں بھی ممتاز تھے۔ یہاں یہ بات دلچسپ ہے کہ خود اس وقت مکہ کی صورت حال سے اتنا بے خبر تھا کہ اس غریب کو پتہ ہی نہیں تھا کہ وہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔

قریش کے ہمدردوں نے مطالبہ شروع کیا کہ اس مقاطعہ کو ختم ہو جانا چاہیئے اس لیے کہ مقاطعہ اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہا۔ صرف ابوجہل ہی وہ واحد شخص تھا جو اس مطالبہ کا شد و مد سے مخالف تھا۔

مقاطعے کی جس دستاویز کو کعبے میں لٹکایا گیا تھا دیکھنے پر پتہ چلا کہ اسے دیمک چاٹ گئی

Marfat.com

ہے۔ جو الفاظ دکھائی دے رہے تھے وہ صرف یہ تھے "اے خدا تیرے نام پر" اس کا مفہوم وہی تھا جو بسم اللہ کا ہے اور اسی نقرہ سے دستاویز کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ واقعہ مقاطعہ کو ختم کرنے کا ایک بڑا سبب بنا۔ یہ مقاطعہ تین سال تک جاری رہا اس کی مدت ۶۱۶ء سے ۶۱۹ء تک تھی۔

پروفیسر مارگولیتھ کا کہنا ہے کہ مقاطعہ تو اسی وقت اٹھا دیا گیا تھا جبکہ قریش سے مسلمانوں کی مفاہمت ہو چکی تھی۔ چونکہ خود شیطانی الفاظ ادا کیے جانے کا واقعہ ہی پردوں میں ہے اس لیے پھر مسلمانوں ہی کے الفاظ دہرانا چاہیے۔ واللہ اعلم

Marfat.com

یادگار تاریخیں

حضورؐ کی پیدائش	۵۷۰ء
حضرت خدیجہؓ سے نکاح	۵۹۵ء
بعثت	۶۱۰ء
فترۃ الوحی (وحی کا تین سال تک بند رہنا)	۶۱۰ء سے ۶۱۳ء
تبلیغ کی ابتدا	۶۱۳ء
مصر، شام اور ایشیائے کوچک پر ایرانیوں کا قبضہ	۶۱۲ء سے ۶۲۸ء
مسلمانوں کی حبشہ کو ہجرت	۶۱۵ء
بنی ہاشم سے مقاطعہ	۶۱۶ء سے ۶۱۹ء

Marfat.com

بیعتِ عقبہ

نماز کی ابتدا حضور نے کروا دی تھی۔ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کس تاریخ اور کس سنہ سے نماز کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ایک اہم بات یاد رکھنی چاہیئے کہ نماز میں اللہ تعالیٰ کی صرف حمد و ثنا کی جاتی ہے۔ نماز کے بعد ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ نماز عیسائیوں کے طریقہ عبادت سے ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ چرچ میں مذہبی بھجن بھی گایا جاتا ہے۔ نماز میں گانا نہیں ہوتا۔ حضورؐ نے موسیقی کو ناپسند فرمایا تھا اور اپنے چاہنے والوں کو بھی اس سے دور رکھنا چاہا۔

نماز پڑھنے والے کا رُخ کعبہ کی طرف ہوتا ہے۔ نماز کی نیت باندھی جاتی ہے۔ دونوں ہاتھوں کو کانوں تک لے جا کر اللہ اکبر کہا جاتا ہے۔ پھر دونوں ہاتھوں کو سینے پر یا ناف کے اوپر باندھ لیا جاتا ہے۔ سورۂ فاتحہ کے بعد پھر کوئی اور سورہ یا چند آیات پڑھی جاتی ہیں۔ رکوع کیا جاتا ہے اور پھر سجدہ میں جانا پڑتا ہے۔ ہر رکعت میں ایک رکوع اور دو سجدے ہوتے ہیں۔ فجر میں دو فرض رکعتیں ہوتی ہیں۔ ظہر میں چار رکعت فرض ہیں۔ عصر میں چار رکعت فرض اور مغرب میں تین رکعت اور پھر عشاء میں ۴ رکعت فرض ہیں ۲۴ گھنٹوں میں پانچ وقت فرض نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ فرض کے ساتھ سنت نمازیں بھی

Marfat.com

پڑھی جاتی ہیں۔ نماز کے بعد دعا مانگی جاتی ہے۔

نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس میں صرف اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہوتی ہے۔ انگریزی دانوں کے لیے جب لفظ عبادت نماز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو اس لفظ سے نماز کا مفہوم پورے طریقے سے ادا نہیں ہوتا۔ نماز میں سورۂ فاتحہ کی اس آیت کے سوا کہ اے خدا ہم کو سیدھے راستہ پر چلا کسی مقام پر بھی حرص و ہوا کے حصول کے لیے کچھ نہیں کہا جاتا۔

حضورؐ نے انفرادی اور اجتماعی طریقہ پر دعا کے طریقوں کے کوئی خاص اصول وضع نہیں فرمائے لیکن احادیث میں دعاؤں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ قرآن پاک میں سورۂ مومن کی ۶۰ ویں آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔"

حضورؐ نے اس بات کو اہمیت دی کہ انسان اپنے خدا کو ہر حال میں یاد رکھے۔ ہر وقت اُسے پکارے۔ دنیوی دھندوں اور فکر معاش کی پریشانیوں میں بھی اس کی یاد بہر حال آتی رہنی چاہیئے۔

عیسائیت نے بھی ایسی ہی تعلیم دی ہے۔

مشہور محدث مسلم کے حوالہ سے ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ لوگ جب اللہ کو یاد کرنے بیٹھتے ہیں تو فرشتے اور ملائکہ ان کے اطراف جمع ہو جاتے ہیں۔ اللہ کا لطف و کرم ان کو اپنے دامن میں سمیٹے رہتا ہے۔ ذہنی آسودگی اور سکون قلب کی نعمت سے وہ نوازے جاتے ہیں۔ اللہ جل جلالہٗ اپنے مقربین سے اپنی عبادت کرنیوالوں کا ذکر کرتا رہتا ہے۔

ایک اور حدیث ہے جس میں حضورؐ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ

Marfat.com

جب بھی مجھے یاد کرتا ہے مجھے اپنے قریب پاتا ہے۔

حضورؐ بذاتِ خود اپنے اللہ سے اکثر و بیشتر دعائیں مانگا کرتے تھے۔ آپ کی پیروی میں دعاؤں کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک مسلمان صبح سویرے اپنے کام پر جانے لگتا ہے تو جاتے وقت کہتا ہے" میرے اللہ تجھ پر میرا بھروسہ ہے" سفر پر روانہ ہونے سے قبل کہتا ہے" میرے اللہ تیری ذات پر مجھے اعتماد ہے۔ تو میرا مختار کل ہے۔"

یہ اور اسی قسم کے جملے بار بار مسلمانوں کی زبان سے ادا ہوتے رہتے ہیں اور اس کثرت سے ادا ہوتے ہیں کہ اب یہ بات چیت کا جزو بن چکے ہیں۔ اظہار بیان کا ایک طریقہ ہو گئے ہیں اور ان کی مذہبی اہمیت ضمنی ہو کر رہ گئی ہے۔

حضورؐ نے اوراد اور وظیفوں کی اہمیت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص سو بار سبحان اللہ پڑھے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی ہزار بخششیں ہوتی ہیں اور اس کے ہزار گناہ معاف کیے جاتے ہیں۔

اپنے گناہوں اور غلطیوں سے معافی مانگنا بھی دعاؤں کا ایک بڑا جزو ہے۔ اکثر مذہبی لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا جاتا ہے کہ اے اللہ میرے گناہوں کو معاف کر دے میری خطاؤں کو درگزر فرما اسی قسم کے جملے بار بار دہرائے جاتے ہیں۔

مکہ کے قیام کے دوران حضورؐ کے مخالفین کو نماز نے جس بری طریقے سے مخالفت پر آمادہ کیا کسی اور چیز نے نہیں کیا۔ حضورؐ کی تعلیمات میں سے کسی اور بات نے لوگوں کو اتنا دشمن نہیں بنایا جتنا نماز کی تعلیم نے۔ خصوصاً بدوی قبیلوں کی طرف سے بڑی مخالفت ہوئی۔ نماز کی پابندی ان کی آزادانہ زندگی اور لامحدودیت کو نظم و ضبط کا جامہ پہنا رہی تھی۔ ان کی زندگی میں ایک تنظیم پیدا کر رہی تھی۔ ایک مخصوص وقت پر ایک مخصوص طریقے سے نماز ادا کرنا ان کے لیے بارِ خاطر ہو رہا تھا۔ نماز میں رکوع اور سجدہ میں جانا اُن

Marfat.com

عربوں کے لیے ان کے اپنے نقطۂ نظر سے انسانی عظمت کے منافی تھا۔

رکوع اور سجدہ عبدیت کے اظہار کا طریقہ تھا جس میں انکسار، عجز اور خاکساری کے عناصر شامل تھے۔ بندہ کا اپنے آپ کو حقیر سمجھنا اُن عربوں کو بھا نہیں رہا تھا۔

گو بدوی نماز کی مخالفت کرتے تھے لیکن دعائیہ جملے اُن کی زبان سے بھی نکلا کرتے تھے اپنے خدا کو بہت ہی پیار سے وہ پکارا کرتے تھے "اے میرے پیارے اور ننھے منے خدا" سے مخاطبت ہوتی تھی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے حضورؐ پر ایک زمانہ ایسا بھی آچکا تھا کہ آپ قریش کے بُت پرستوں کو اپنا دشمن سمجھ رہے تھے اور یہودیوں اور نصرانیوں کو اپنا دوست۔

قرآن کی آیات میں اور حضورؐ کے مواعظ میں توریت کی کئی کہانیوں کا ذکر ہے جس میں اخلاقی سدھار کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ نے مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنے کا مشورہ دیا تھا اور اس وقت حبشہ ایک نصرانی ملک تھا۔

جب سے آپ نے نماز کی باقاعدہ ابتدا کی اپنا قبلہ بیت المقدس یروشلم کو بنائے رکھا اس وقت یروشلم ایک مقدس شہر مانا جاتا تھا۔ آپ کے ملنے والوں اور دوستوں (جن میں یہودی اور نصرانی بھی شامل تھے) ان سب کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔ ان ہی دنوں ایک دن آپ نے اعلان فرمایا کہ آپ گزشتہ رات بیت المقدس ہو آئے ہیں۔ شب معراج کا ذکر بھی اسی واقعہ سے متعلق ہے۔

ایک روایت کے مطابق جبرئیل نے آپ کو ایک رات نیند سے جگایا، ایک جانور جس کا نام براق تھا اُس پر بٹھایا۔ براق کی تیز رفتاری حدِ نگاہ کے برابر بیان کی جاتی ہے۔ جبرئیل کی معیت میں آپ بیت المقدس تشریف لے گئے، یہاں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے آپ کی ملاقات ہوئی جو آپ کا وہاں انتظار کر رہے تھے۔ ان تمام انبیاء نے ایک ساتھ وہاں عبادت کی۔

روایات میں ہے کہ آپ بیت المقدس سے ساتویں آسمان پر لے جائے گئے جہاں پر

Marfat.com

آپؐ نے حضرت آدم، نوح، موسیٰ، ابراہیم اور عیسیٰ علیہم السلام سے ملاقات کی۔ ان تمام انبیاءؑ سے ملتے ملاتے اب آپ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں جبرئیل کی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ اور آگے بڑھ سکیں آپؐ تنہا اس مقام پر پہنچے جہاں اللہ جل سبحانہ جلوہ فرما ہے۔ یہیں سے آپ کو جنت اور دوزخ کا نظارہ کروایا گیا۔ اسی موقع پر آپ کو پانچ وقت کی نماز کی باقاعدگی کا حکم ملا۔ واپسی براق ہی کے ذریعہ ساتویں آسمان سے سیدھے مکہ چند منٹوں میں ہو گئی۔

دوسرے دن علی الصبح صحنِ کعبہ میں حضورؐ نے اعلان فرمایا کہ حضورؐ گزشتہ رات یروشلم تشریف لے گئے تھے اور اسی رات واپس بھی ہوتے۔

ابنِ اسحاق کے بیان کے مطابق بہت سے لوگوں نے کہا کہ خدا کی قسم یہ تو بالکل لغویات ہے۔ کاروان اگر اور دن اور شام جائے تو جانے آنے میں پورا ایک مہینہ لگ جاتا ہے۔ اتنا لمبا سفر محمدؐ ایک رات میں کیسے کر سکتے ہیں۔ کئی ایک مسلمانوں نے اس واقعہ کو سن کر اپنے ایمان اور اعتقاد کو خیرباد کر دیا یہیں سے مسلمانوں نے اس واقعہ کے ظہور اور اسکی تفصیلات میں بحث و مباحثہ کا آغاز کر دیا۔

ابن اسحٰق نے حضرت عائشہؓ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ معراج کی رات حضورؐ کا جسم مبارک بستر پر ہی تھا۔ صرف آپ کی روح کو عالم بالا کی سیر کروائی گئی۔ اس رازِ سربستہ سے صرف حضورؐ ہی واقف ہیں کہ آپ نے عالم بالا کو کس طرح دیکھا اور وہاں کیا دیکھا۔

ابن اسحٰق کا اپنا کہنا ہے کہ چاہے حضورؐ عالم بیداری میں ہوں یا میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہوں اس واقعہ کا ظہور یقیناً ہوا تھا۔

۶۱۹ء یہ سال حضورؐ کیلئے انتہائی منحوس ثابت ہوا۔ اسی سال آپ کی چہیتی بیوی حضرت خدیجہؓ اس دنیا سے عالم جاودانی کی طرف روانہ ہوئیں۔ نبوت کی سرفرازی کے بعد نو سال تک حضرت خدیجہؓ حضورؐ کیلئے ایک بڑا سہارا تھیں۔ آپ کا دست و بازو تھیں۔ آپ کی معتمد علیہ تھیں۔ آپ کے ہاتھ پر سب سے پہلے ایمان لائی تھیں۔

حضورؐ اپنے شکوک و شبہات، تفکرات اور تکالیف کا ذکر اگر کسی سے کرتے تو بیب

Marfat.com

سے پہلے اپنی اس نیک بخت بیوی سے کرتے۔ جب آپ پر نا امیدیوں اور مایوسیوں کے بادل چھا جاتے تو آپ کی دلجوئی اور ہمت بڑھانے والی خدیجہؓ کو اپنے نزدیک پاتے۔

حضورؐ اور بی بی خدیجہ کی ازدواجی زندگی کے ۲۴ سال انتہائی رفاقت اور محبت کے ساتھ گزرے۔ آپ اپنی عمر سے بڑی بیوی کے نہ صرف ہمیشہ بہی خواہ اور وفادار رہے بلکہ ہمیشہ اپنی محبت کی مالا اپنی بیوی کے گلے میں پہنائے رکھی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضورؐ کا نکاح سودہؓ بنت زمعہ سے ہوا۔ یہ نکاح سوائے اسکے اور کچھ نہ تھا کہ امور خانہ داری میں سہولت ہو حضورؐ کا سن مبارک اسوقت ۴۹ سال تھا۔ حضرت سودہؓ ادھیڑ عمر سے زیادہ تھیں۔ فربہ بدن تھیں۔ حضورؐ سے نکاح ہونے سے قبل یہ بیوہ ہو گئی تھیں۔

حضورؐ کی صاحبزادیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ حضورؐ دو بچوں یعنی علیؓ اور زید کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ بی بی سودہؓ سے نکاح ہو جانے کے بعد گھر کی تمام ذمہ داریاں ان کے سپرد کر دی گئیں۔ حضور کی زندگی تک بی بی سودہؓ حضورؐ کے پاس ہی رہیں

سیرت نگاروں نے حضورؐ کی سوانح مبارک میں بی بی سودہؓ کا بہت ہی کم ذکر کیا ہے۔

حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد حضورؐ کے چچا ابو طالب بیمار ہو گئے۔ مکہ کے معززین جن میں عتبہ، شیبہ، ابوجہل وغیرہ شامل ہیں ابو طالب کی مزاج پرسی کے لیے بستر مرگ پر آئے۔ ابن اسحٰق کے بیان کے مطابق مکہ کے معززین ابو طالب سے یوں مخاطب ہوئے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے اور آپ کے بھتیجے کے درمیان کن کن باتوں کی وجہ سے خلیج حائل ہے۔ ہماری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنے بھتیجے کو یہاں طلب کریں تاکہ وہ اور ہم کسی مصالحت پر پہنچیں۔ وہ ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دے تاکہ ہم بھی ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔"

ابو طالب نے حضورؐ کو طلب کیا۔ معززین مکہ نے جو کچھ کہا تھا

Marfat.com

ابوطالب نے حضورؐ کے آگے دہرا دیا۔ فرمایا ان معززین سے میں صرف ایک ہی بات کی درخواست کرتا ہوں یہ سب مل کر کہہ دیں کہ لا الہ الا اللہ۔ محمد رسول اللہ۔ مزاج پرسی کو آئے ہوئے معززین حضورؐ کے اس جواب کو سن کر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ آپس میں کہنے لگے کہ یہ شخص تو کسی بات سے بھی دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔ ہم اُس سے جو حاصل کرنا چاہتے ہیں ذرہ برابر بھی حاصل نہیں کر سکتے یہ کہتے ہوئے جھنجلا کر واپس چلے گئے۔

حضورؐ کی بڑی خواہش تھی کہ ابوطالب اپنے آخری لمحات میں کلمہ شہادت پڑھ لیں گے ابوطالب نے خاموشی اختیار کی اور اسی خاموشی میں اُن کا انتقال ہوا۔

ابوطالب بڑی ہی دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ حاضر جواب، حق پسند، حضورؐ کے وفادار خیر خواہ اور انتہائی ہمدرد۔ اپنے بھتیجے کی رضا کی خاطر انہوں نے ذہنی اذیتوں کو برداشت کیا۔ مخالفین کی الزام تراشیوں اور بہتان بازیوں کا شکار رہے نقصان پر نقصان اٹھاتے رہے۔ ان سب باتوں کے باوجود انہوں نے اپنا عقیدہ نہیں بدلا اور حضورؐ کے دین کو قبول نہیں کیا۔ مسلمانوں کے نزدیک ان کی کوئی خاص اہمیت اس لیے نہیں ہے کہ اسلام قبول کیے بغیر ہی اس دنیا سے انہوں نے آخرت کا سفر اختیار کیا۔ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر ابوطالب اپنے بھتیجے کی ہمت نہ بڑھاتے اور اسلام کی حمایت میں ہر وقت کمربستہ نہ رہتے تو شاید اسلام اپنے ابتدائی دنوں ہی میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتا۔

حضرت خدیجہؓ اور حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد مکّہ میں حضورؐ کی مخالفت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ ان مخالفتوں کے پیش نظر حضورؐ نے مکّہ چھوڑ دینے ہی میں اپنی بھلائی سمجھی اور طائف کو ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔

طائف مکّہ کے مشرق میں تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ اپنی ٹھنڈی

Marfat.com

آب وہوا اور میوے کے باغات کی وجہ سے وہ اس زمانے میں کافی مشہور تھا طائف میں رہنے والے اکثر لوگ قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ مکہ کے مالدار لوگوں نے بھی وہاں باغات اور جائیدادیں خرید رکھی تھیں۔

بعض روایات میں ہے کہ آپ طائف اکیلے تشریف لے گئے۔ بعض روایات کے مطابق حضورؐ کے منہ بولے بیٹے زید بھی آپ کے ساتھ گئے۔ آپ طائف پہنچے۔ وہاں کے تین مقامی اکابرین سے ملاقات کی۔ یہ تینوں آپس میں حقیقی بھائی تھے۔ بہت ہی خندہ پیشانی سے ان تینوں بھائیوں نے حضورؐ کا استقبال کیا۔ جب حضورؐ نے گفتگو شروع فرمائی تو یہ تینوں مسخرے قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اگر خدا کو کسی پیغمبر ہی کو بھجوانا تھا تو کیا اُسے آپ سے زیادہ کوئی اور موزوں آدمی نہیں ملا۔ دوسرے نے طنزاً کہا کہ واقعی اگر آپ خدا کے رسول ہیں تو آپ کا مجھ سے بات کرنا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ اس موقع پر حضورؐ نے اپنے آپ کو بہت ہی بے بس محسوس کیا۔ اُن تینوں سے کہا کہ اگر تم کو میری باتوں پر یقین نہیں آتا ہے نہ آئے۔ کم از کم اتنا تو کرو کہ میری بیان کی ہوئی باتوں کو کسی اور سے نہ کہو۔

تینوں اکابرینِ طائف خاموش رہنے والے کہاں تھے۔ ان بدذاتوں نے پورے شہر میں اپنی اور حضورؐ کی گفتگو کا ڈھنڈورا پٹوا دیا۔ آپ کے اطراف مجمع لگنا شروع ہوا۔ پتھر پھینکے جانے لگے۔ آپ اس پتھراؤ کے دوران پناہ کی تلاش کرتے ہوئے انگور کے ایک باغ میں چلے گئے۔ روایات کے مطابق انگور کا یہ باغ قبیلہ قریش کے دو افراد عتبہ اور شیبہ کی ملکیت تھا۔ یہ وہی عتبہ اور شیبہ ہیں جو چند دن پہلے ابو طالب کی علالت کے دوران جب وہ بستر مرگ پر تھے تو ان کی مزاج پرسی کے لیے گئے تھے عجیب اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت عتبہ اور شیبہ دونوں اپنے باغ میں کام کر رہے تھے۔ ان دونوں کو حضورؐ کی اس حالت پر بہت ترس آیا۔ انہوں نے اپنے نصرانی غلام سے

کہا کہ انگور سے بھری ہوئی پلیٹ لاکر آپ کے آگے پیش کی جائے۔

کہتے ہیں کہ خدا کے رسول نے طائف میں یہ دعا فرمائی۔

"اے میرے خدا۔ تو نے جسمانی طور پر مجھے اتنا طاقتور نہیں بنایا کہ میں ان لوگوں کا ڈٹ کر مقابلہ کروں۔ اے رحمن۔ اے رحیم تو کمزوروں کا والی ہے اور مجھ جیسے کمزور کا تو ہی واحد سہارا ہے۔"

ابوطالب کی پشت پناہی سے محروم ہو جانے کی وجہ سے اب آپ مکہ واپس جانے سے گھبرا رہے تھے۔ آپ نے اپنا ایک نمائندہ مکہ کی ممتاز شخصیتوں کی خدمت میں روانہ کیا۔ اُن سے آپ نے درخواست کی کہ وہ آپ کی حفاظت کا ذمہ لیں۔ دو سرداروں نے تو آپ کی درخواست کو مسترد کر دیا البتہ قبیلہ قریش کی ایک شاخ نوفل کے سردار مطعم ابن عدی نے حفاظت کا ذمہ لیا۔ دوسرے دن علی الصبح مطعم ابن عدی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کے ہمراہ خانہ کعبہ گیا اور اعلان کیا کہ آپ ان کے قبیلے کی حفاظت میں ہیں۔

مطعم ابن عدی کی اس پیش کش پر حضورؐ مکہ واپس گئے لیکن اب آپ کی تبلیغ میں وہ گرمی نہیں رہی، ہو سکتا ہے کہ مطعم ابن عدی جو خود بھی بت پرست تھا حفاظت کی ذمہ داری لیتے وقت حضورؐ پر تبلیغ نہ کرنے کی شرط عائد کر دی ہو۔

ایک مختصر سے عرصہ کے لیے حضورؐ نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ جو قافلے وقتاً فوقتاً مکہ آیا کرتے تھے صرف اُن ہی کی حد تک تبلیغ کو محدود رکھا جاتے۔

مکہ کے سالانہ اجتماع کے وقت سینکڑوں قافلے مکہ کے اطراف اپنے خیمے ڈالتے حضورؐ گھوم پھر کر اُن کے سامنے اسلامی تعلیمات کو پیش فرماتے۔

میلوں کا انعقاد حج کی تاریخوں سے چھ ہفتے پہلے ہوا کرتا تھا۔ ذی قعدہ کے فوری بعد کا مہینہ ذی الحجہ ایک مقدس مہینہ سمجھا جاتا تھا۔ پہلے ۲۱، دن میں عکاظ

Marfat.com

کے مقام پر ایک بڑا میلہ لگتا تھا۔ نامی گرامی شعراء کے درمیان شاعری کا مقابلہ بھی اسی زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد کے دس دن مجنہ میں میلہ بھرتا تھا پھر اس کے بعد ۸ دن تک کے لیے ذوالمجاز میں لوگوں کا اجتماع ہوتا تھا۔

ان سالانہ میلوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضورؐ خانہ بدوشوں کے درمیان اپنی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ آپ کے پیچھے پیچھے ابوجہل ہوتا اور کہتا پھرتا تھا کہ ان کی باتوں کو نظرانداز کردو۔ ان کا دماغی توازن بگڑا ہوا ہے۔ غالباً انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک شخص طفیل ابن عمرو جو قبیلہ دوس سے تعلق رکھتا تھا حضورؐ کے ہاتھ پر ایمان لے آیا۔ اور درخواست کی کہ آپ اس کے قبیلے والوں کی امان میں آجائیں۔ طفیل کی یہ درخواست حضورؐ نے منظور نہیں کی۔ اس کے کیا اسباب تھے۔ اُس کا کوئی علم نہیں ہے۔

اس سال حضورؐ کو اپنی تبلیغ میں خاطرخواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ مکہ والوں نے بھی یہ خیال کرنا شروع کر دیا کہ اب یہ تحریک دم توڑ رہی ہے۔ شاید اسی خیال کے تحت اُن لوگوں میں رواداری کا جذبہ اُبھر آیا۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہی وہ زمانہ تھا جس میں اکابرین قریش نے آپ کو دولت وثروت اور اقتدار کا لالچ دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ہر مادی چیز دینے کو تیار ہیں بشرطیکہ آپ اپنی تبلیغ سے دستبردار ہوجائیں۔ اپنے آپ کو خدا کا رسول کہنا چھوڑ دیں۔ یہ روایت اس لیے ضعیف معلوم ہوتی ہیں کہ آپ اس زمانہ میں اپنے رفیقوں اور ہمدردوں یعنی بی بی خدیجہ اور ابوطالب کی وفات کی وجہ سے اتنے مایوس اور پست ہمت ہوگئے تھے کہ آپ کا مشن دشمنوں کی نظر میں ناکام ہوتا نظر آرہا تھا۔ اگر دولت، ثروت اور اقتدار کی پیش کش واقعی کی ہی گئی ہو تو یہ وہ زمانہ ہوسکتا ہے جب کہ ابوطالب زندہ تھے۔

ایک دوسری دلخراش بات یہ ہوئی کہ آپ کے چچا ابوطالب کی وفات پر بنی ہاشم کی جانشینی حضورؐ کے سخت ترین دشمن ابولہب کے حصے میں آئی۔

ابو طالب کی وفات کے فوری بعد ابولہب کے روّیہ میں کچھ تبدیلی آئی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے بھتیجے کی حفاظت کا ذمہ لے گا۔ کچھ ہی عرصہ بعد ابولہب اپنی پرانی روش پر لوٹ آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا خاندان بنی ہاشم حضوؐر کا دشمن ہوگیا۔ یہی وہ بنی ہاشم تھے جو ابوطالب کی زندگی میں حضوؐر کی جان ومال کی حفاظت کو اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے۔

بدوی قبیلے رضا و رغبت سے تو حضوؐر کے وعظ کو کیا سنتے البتہ تجسس کے پیش نظر اس پیغام کو سن لیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ تقریباً صفر کے برابر نکلتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک قبیلہ کے شیخ نے حضوؐر کو اس شرط پر آمادہ کرنا چاہا کہ اگر اس کو اپنا نائب اور فرائض منصبی کا حصّہ دار بنا لیں تو وہ آپ کا ساتھ دے گا۔ حضوؐر نے جواب دیا کہ نبوت کے فرائض ایسی چیز نہیں جس کے حصّے بخرے انسانوں کی طرف سے کیے جائیں۔ یہ خدا کی طرف سے تفویض کیے جاتے ہیں، نبوّت خدا کی دین ہوتی ہے۔

حضوؐر کے اس جواب نے شیخ اور اس کے قبیلہ کو مایوس کر دیا۔

یثرب کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ مکّہ سے شمال کی جانب تقریباً ڈھائی سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حضوؐر کے زمانہ سے تقریباً چار سو سال قبل یمن کا بادشاہ اسدابوقارب یثرب پر قبضہ کرکے یہاں سے دو یہودی علماء کو اپنے ساتھ یمن لے گیا تھا۔ یہ دونوں یہودی علماء جنوبی عرب میں یہودیت کی تبلیغ کرنے لگے۔

یثرب میں جاکر لوگوں کے بسنے کی داستاں مکّہ والوں سے بالکل مختلف ہے۔ مکّہ میں پینے کا پانی تک مشکل سے ملتا۔ پھل اور ترکاریاں عنقا۔ زراعت کا فقدان۔ چلچلاتی دھوپ، پہاڑوں کی وادیوں میں خیمے پڑے ہوتے۔ مکّہ میں رہنا اور بسنا صرف اس لیے تھا کہ بدوی قبیلوں کے لیے کوئی تو ایسا مقام ہو جہاں سے وہ اپنا سفر شروع کرسکیں۔ جہاں وہ واپس آکر اپنا سفر ختم کرسکیں۔ مکّہ میں رہنے والے یمن، مصر، شام اور ایران آیا جایا کرتے تھے۔

Marfat.com

یثرب کی معیشت اور معاشرت بالکل مختلف تھی۔ پانی کی افراط۔ زراعت کے وافر وسائل۔ زرخیز زمین، کھجوروں کے باغات یثرب کا خاصہ تھے۔

بسنے والوں کا ذریعہ معاش یا تو زراعت تھا یا پھر گھریلو قسم کے جانوروں کی پرورش۔ قبیلہ واریت یہاں بھی تھی۔ ہر قبیلہ کی اپنی زمین ہوتی تھی۔ اس زمین کے بیچوں بیچ وہ اپنی بستی بسایا کرتے تھے۔

سارے یثرب کی ہری بھری اور زرخیز زمین پر بکھری بکھری بستیاں، چھوٹے چھوٹے گاؤں اور پھیلی پھیلی آبادی ایک پُرسکون فضا مہیا کئے ہوتے تھی۔

۶۲۰ء میں یثرب میں صرف پانچ چھوٹے سے قبیلے رہا کرتے تھے۔ ان پانچ قبیلوں میں سے تین قبیلے یثرب کی سب سے زیادہ زمین پر اپنا تصرف رکھتے تھے۔ یہ تینوں زمیندار قبیلے یہودی تھے۔

ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے لوگوں میں ایک دوسرے کے مذہب کے تعلق سے نہ تجسس تھا نہ ہی ان کو اس بات کی پرواہ تھی کہ دوسرے کا مذہب کیا ہے۔ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ جو یہودی اس وقت یثرب میں آباد تھے ان کے آباؤ اجداد کا سلسلہ یروشلم کے قبیلہ یہودہ سے ملتا تھا یا نہیں یا یہ وہ مقامی عرب تھے جو یہودیت کو اپنا مذہب بنا چکے تھے جیسا کہ یمن کے عرب اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر یہودیت کو قبول کر چکے تھے۔

یثرب کے یہودی بظاہر عرب تھے۔ مادری زبان عربی تھی۔ رہن سہن اور طرزِ زندگی پر عربیت کی چھاپ تھی۔ ان کے نام عربوں جیسے نام تھے۔

جہاں کہیں بھی یہودی جاتے ہیں اپنے ساتھ اپنے نام ضرور لے جاتے ہیں، جیسے ابراہیم، ہارون، موسیٰ، داؤد، یوسف وغیرہ۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی یہودی ملیں گے یہ نام ضرور ان میں ملیں گے لیکن یثرب میں اُس زمانے میں رہنے والے کسی بھی یہودی کا نام ان ناموں میں سے نہیں تھا۔ وہ لوگ عربیت کو اس حد تک اپنا چکے تھے کہ اپنے قومی

Marfat.com

ناموس تک کو خیرباد کر دیا تھا۔

آج ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہم اُن تین یہودی قبیلوں کی اصل کے تعلق سے کچھ بیان کر سکیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ سیکڑوں سال قبل یہودی علما تبلیغ کے سلسلے میں یثرب گئے ہوں اور وہاں انہوں نے مقامی عربوں کو اُن کے اپنے آبائی مذہب سے ہٹا کر یہودی بنا لیا ہو۔

حضرت عیسیٰؑ کے عہد میں اور ان کے بعد یہودی علماء نے تبلیغ کا سلسلہ بڑے ہی زور و شور سے شروع کر رکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اسی زمانے میں یثرب کے عربوں نے یہودیت اختیار کر لی ہو۔

دو اور قبیلے یثرب میں رہا کرتے تھے جو اپنے آبائی دین کو اختیار کیے ہوئے تھے یہ لوگ ہر سال کعبہ کے بتوں کی پوجا کے لیے مکہ جایا کرتے تھے۔ ان دو قبیلوں کے نام اوس اور خزرج تھے۔ یہ وہ یمنی تھے جو مارب کا بند ٹوٹنے کے بعد تباہی کے سبب ہجرت کر کے یثرب پہنچے تھے۔

جب یہ دونوں قبیلے ہجرت کر کے یثرب کی وادی میں پہنچے تو تین یہودی قبیلوں کو ساری زمین کا قابض اور مالک پایا۔ کسی طریقے سے لڑ لڑا کر کچھ زمینوں پر انہوں نے بھی اپنا قبضہ جما لیا۔ کچھ باغات کو بھی انہوں نے اپنے تصرف میں لے لیا۔

۶۲۰ء تک ان دونوں قبیلوں نے اپنی دولت و ثروت، امارت اور اقتدار میں اتنا اضافہ کر لیا تھا کہ اب یہودی قبیلے ان دو بت پرست قبیلوں کے سامنے ہیچ تھے۔

یہودی قبیلے چونکہ نسبتاً ایک ارفع و اعلیٰ مذہب کے ماننے والے تھے اس لیے بت پرستوں کے مقابلے میں زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج افریقہ میں عیسائی پڑھے لکھے ہیں اور مقامی باشندے اَن پڑھ۔

چونکہ یہودی اُس وقت کے ایک روشن مذہب کے ماننے والے تھے اس لیے صنعت و

Marfat.com

ترقّی کے مختلف شعبوں میں بھی آگے تھے ۔ مالی اعتبار سے یہ بت پرست قبیلوں سے بہتر تھے ۔ یہ ساہوکاری بھی کرتے تھے ۔ لوگوں کو سودی قرض دینا ان کا پیشہ تھا ۔

فوجی اعتبار سے بُت پرست قبیلوں کا تسلط ان یہودی قبیلوں پر تھا بنی خزرج کی ایک شاخ بنی کینقو کو یہودی قبیلے ہر سال ایک رقم خراج کے طور پر پیش کرتے تھے ۔ اس رقم کے عوض بُت پرست قبیلے یہودی قبیلوں کی جان و مال کی حفاظت اپنے ذمے لئے ہوتے تھے ۔

یہودی قبیلوں کی دو شاخیں بنو نضیر اور بنی قریظہ سالانہ خراج نہیں دیتی تھیں ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق بُت پرست قبیلوں سے تھا ۔

یہودی قبیلوں کے اپنے مدرسے تھے ۔ بچوں کو اُن مدرسوں میں توریت پڑھائی جاتی تھی ۔ ان یہودی قبیلوں کے تقریباً تمام افراد خصوصاً مرد پڑھنا لکھنا جانتے تھے ۔ سالانہ میلوں کے موقع پر یہودی شعراء شاعری کے مقابلوں میں حصّہ لیا کرتے تھے ۔

یثرب کے بت پرستوں کی اکثریت زراعت پیشہ تھی ۔ یہ لوگ بہت ہی کم سفر کیا کرتے تھے ۔ باہر کی دنیا میں جو ہوتا رہتا تھا اس سے وہ لاعلم تھے ۔ اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کی مالی حالت ابتر تھی ۔

ہجرت کے ۱۲ سال بعد جب حضورؐ کا انتقال ہوا تو کہا جاتا ہے کہ آپ کے ہتھیار یا ذرہ بکتر ایک یہودی کے ہاں رہن رکھے ہوتے تھے پوری وادیٔ یثرب میں شادی کا جوڑا اور شادی میں پہنائے جانے والے زیورات کا صرف ایک سٹ تھا ۔ جب بھی کسی بُت پرست قبیلہ کی کسی لڑکی کی شادی ہوتی تھی تو یہ شادی کا جوڑا اور شادی کے زیورات یہودیوں کے پاس سے کرایہ پر لیے جاتے تھے ۔

تقریباً ۶۱۶ء میں اوس اور خزرج کے درمیان تنازعہ ہو گیا ۔ جھگڑوں کی ابتداء اکثر و بیشتر جن باتوں پر ہوتی تھی ان میں سب سے بڑا سبب کسی کی حفاظت کا ذمہ

لینا ہوتا تھا۔ اپنے اس فرض کو نبھانے کی خاطر وہ بڑی سے بڑی مصیبت اپنے سر لے لیتے تھے۔

قبیلہ اوس کے ایک آدمی نے ذوالبیان سے آنے والے ایک بدوی کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ یہ آدمی یثرب آرہا تھا۔ قبیلہ خزرج کے ایک تاجر نے ایک مقامی یہودی کو کچھ رشوت دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ آنے والے بدوی کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مارے۔ طمانچہ اس وقت مارے جب کہ بدوی یہودیوں سے اپنا معاملہ طے کر رہا ہو۔

جب اوس کے آدمی کو معلوم ہوا کہ اس کی حفاظت میں آئے ہوئے آدمی کو طمانچہ مارا گیا ہے تو وہ فوراً مقام واردات پر پہنچ گیا جس یہودی نے اس کے بدوی کو طمانچہ مارا تھا اسے قتل کر دیا۔

خزرج بدلہ لینے کے لیے اوس کا پیچھا کرنے لگے۔ قاتل فرار ہو چکا تھا۔ قبیلہ خزرج نے اوس کے کسی اور آدمی کو پکڑ کر اس کو قتل کر دیا۔ اب دونوں قبیلوں میں قتل و غارت کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ آخر کار اوس فتح یاب ہوتے۔

ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہودی قبیلوں کی دونوں جماعتوں نے اس جنگ میں حصہ لیا۔ ایک نے اوس کی طرف داری کی اور دوسرے یہودی قبیلے نے خزرج کا ساتھ دیا۔

یثرب میں سارے قبیلے اور خاندان ایک دوسرے کے قریب رہا کرتے تھے وہ ایک دوسرے کے ہمسایہ اور پڑوسی تھے۔ اسی باعث خزرج کے ایک سردار نے ان لڑائی جھگڑوں میں حصہ لینے سے نہ صرف احتراز کیا بلکہ ہر ممکنہ کوشش کی کہ اوس اور خزرج کے درمیان مفاہمت ہو جائے۔ ان کے آپس کے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ اس سردار کا نام عبداللہ ابن ابی تھا۔

Marfat.com

یہ اس زمانے میں جب کہ اوس اور خزرج کے قبیلے آپس میں سر بگریباں تھے حضورؐ نے اپنی تبلیغ کو مکہ آنے والے قبائل کی حد تک محدود کر رکھا تھا۔

۶۲۰ء میں یثرب سے کچھ لوگ مکہ آئے۔ حضورؐ کو یہ موقع ملا کہ ان تک اپنا پیغام پہنچائیں سات آٹھ آدمیوں پر مشتمل ایک جماعت تبلیغ سے متاثر ہوئی۔ وہ جانتے تھے کہ یہودیوں کی روایات کے مطابق اہل یہود ایک مسیحا کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کو یقین ہو گیا کہ وہ مسیحا جن کی آمد کا یہودیوں کو انتظار ہے، آپ ہی کی ذات مبارک ہے۔ دوسری بات جو اُن کے ذہن میں آئی وہ یہ کہ خزرج اور اوس کے قضیوں میں حضورؐ کو ثالث بنا دیا جائے۔

حج کے اختتام پر ان ہی تاثرات کے ساتھ یہ جماعت یثرب واپس ہوئی۔ اس جماعت کے افراد میں صرف ایک شخص ایسا تھا جو اپنی جماعت کا ہم خیال نہیں تھا۔

۶۲۰ء سے ۶۲۱ء کا زمانہ حضورؐ کے لیے بہت ہی مایوس کن اور حوصلہ شکن رہا اس دوران بظاہر ایک فرد بھی اسلام میں داخل نہیں ہوا۔ آپ نے مکہ میں اپنے تبلیغی سلسلے کو بھی تقریباً بند کر دیا تھا۔

حج کا موسم پھر سے آیا۔ وہ سات آدمی جو گزشتہ سال حج کے لیے مکہ آئے تھے، اور جنہوں نے آپ سے ملاقات کی تھی پھر اس سال حج کے لیے آئے اور آتے وقت مزید پانچ آدمیوں کو اپنے ساتھ لائے مکہ سے باہر ایک چھوٹی سی وادی میں ان بارہ آدمیوں نے حضورؐ سے ملاقات کی۔ بات چیت کرنے کے بعد حضورؐ نے قرآن کی چند سورتوں کی تلاوت فرمائی۔

یہ بارہ آدمی آپ کی باتوں اور قرآن کی آیات سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے فوری اعلان کیا کہ آئندہ سے وہ بتوں کی پرستش گناہ سمجھیں گے۔ چوری سے اجتناب کریں گے۔ نومولود بچیوں کو زمین میں زندہ دفن نہیں کریں گے۔ اپنے ہمسایوں کو تکلیف

Marfat.com

نہیں دیں گے۔ حضورؐ کی اطاعت کریں گے۔ اُن لوگوں کے اس عہد و پیمان کے عوض حضورؐ نے اُن کو جنت کی بشارت دی۔

ان بارہ آدمیوں کے عہد و پیمان اپنی نوعیت میں ممتاز اس لیے ہیں کہ اس سے پہلے کسی سے بھی اس طرح کا عہد نہیں لیا تھا۔ اُن کے عہد "نہیں کریں گے" پر ختم ہوتے تھے بتوں کی پوجا نہیں کریں گے۔ بچیوں کو زندہ دفن نہیں کریں گے، ہمسایوں کو تکلیف نہیں دیں گے وغیرہ۔ یہاں پر صرف اعمال کو اہمیت دی گئی ہے۔ عقیدہ پر اتنا زور نہیں دیا گیا۔ یہ اُسی طریقے کی تعلیم اور تبلیغ تھی جو وادیٔ سینا میں عصائے ربانی کے ذریعہ ہوئی تھی۔ اس موقع پر خیالات اور جذبات کو نظرانداز کر دیا گیا۔ محبت اور نفرت، عقیدہ اور یقین کا کسی جگہ ذکر نہیں۔

اس عہد کو بیعت عقبہ کہا جاتا ہے اس میں صرف وفاداری کا وعدہ تھا۔ ساتھ ہی ان کی یہ وفاداری اُن کو حضورؐ یا اسلام کے لیے کسی سے لڑنے پر مجبور نہیں کر رہی تھی۔ اُن کو اس بات پر مجبور نہیں کیا گیا کہ وہ حضورؐ کی خاطر کسی سے لڑیں۔

جب یہ بارہ آدمی یثرب واپس ہو رہے تھے تو حضورؐ نے ان لوگوں کے ساتھ مصعب ابن عمیر کو یثرب روانہ کیا۔ یہ عبد الدار ابن قصیٰ کی اولاد میں تھے۔ ان کو روانہ کرنے کا منشاء یہ تھا کہ وہ یثرب کے لوگوں کو قرآن سنائیں۔ نماز پڑھنا سکھائیں لوگوں کے ایمان و ایقان اور عقیدے کو پختہ کریں۔

حضورؐ اس کے بعد آنے والے سال کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے ۶۲۲ء میں یثرب کے بت پرستوں کی ایک بڑی جماعت حج کے لیے مکہ آئی۔ ان بت پرستوں کے ساتھ وہ چند مسلمان بھی آئے جو گزشتہ سال اسلام قبول کر چکے تھے۔ بت پرستوں نے اپنے عقیدے اور رواج کے مطابق جب حج کی تکمیل کر لی تو اُسی رات ان کے ساتھ آئے ہوئے مسلمان چپکے سے ان کا ساتھ چھوڑ کر مکّہ کی اسی وادی میں جمع ہو گئے

Marfat.com

جہاں وہ گزشتہ سال جمع ہو کر حضورؐ کے ہاتھ پر ایمان لے آئے تھے۔ یہ مسلمان اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لیتے گئے۔ اس طرح جمع ہونے والوں کی کل تعداد ۷۳ مردوں اور ۲ عورتوں پر مشتمل تھی۔

ستاروں کی جگ مگ اور رات کے سناٹے میں ریگستان میں بیٹھے ہوئے یہ لوگ حضورؐ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ کے ساتھ آپ کے چچا عباس بھی تھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ شاید یہ آپ کی حفاظت کرتے ہوئے ساتھ آئے تھے۔

ابن اسحاق کے بیان کے مطابق پہلے عباس نے یثرب کے لوگوں کو مخاطب کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ کے لوگ حفاظت کا ذمہ لینے کو تیار رہوں تو حضورؐ یثرب والوں کے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہیں۔ عباس کے بعد حضورؐ نے اُن لوگوں سے خطاب کیا پہلے قرآن کی چند سورتوں کی تلاوت کی اس کے بعد فرمایا کہ میں تم لوگوں سے اس بات کا اطمینان چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھتے ہوئے میری حفاظت کرو گے۔

یثرب سے آئی ہوئی جماعت کے سردار البراء ابن معرور نے حضورؐ سے اس بات کا وعدہ کیا کہ وہ اور ان کی جماعت کے لوگ آپؐ کے وفادار رہیں گے اپنے ہتھیاروں کے ساتھ آپ کی حفاظت اُسی طریقے سے کریں گے جیسے وہ اپنے گھر والوں کی حفاظت کیا کرتے ہیں۔ اُن میں سے ایک بااثر آدمی نے کہا کہ اگر حضورؐ کے ساتھ ہم لڑیں اور فتح یاب ہو جائیں تو حضورؐ یثرب چھوڑ کر مکہ واپس تو نہیں چلے آئیں گے۔

جب یثرب والوں نے اپنی محبت اور خلوص کا برملا اعلان کر دیا تو حضورؐ نے اُن کی اطاعت کے جذبہ کی قدر کرتے ہوئے اور اپنی حفاظت کا فرض ان کو سپرد کرتے ہوئے یہ اعلان فرمایا کہ اب میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔ میں ان سب لوگوں

Marfat.com

کے ساتھ لڑنے کو تیار ہوں جن سے تم لڑنا چاہتے ہو۔ جن سے تم امن قائم رکھنے کے خواہش مند ہو، میں بھی اس خواہش کا احترام کروں گا۔

یثرب کی جماعت نے اپنے میں سے ۱۲ لیڈروں کو چُنا جن میں سے ۹ قبیلے خزرج سے اور ۳ قبیلہ اوس سے تھے۔

مجلس کے اختتام پر یثرب والوں نے سوال کیا کہ ان کی اظہار کردہ وفاداری کے صلہ میں انہیں کیا انعام ملے گا۔ حضورؐ نے سیدھا سادہ جواب صرف ایک لفظ میں دیا۔ وہ یہ تھا ''جنت''

یثرب کی جماعت کے سارے افراد نے فرداً فرداً آپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اپنی وفاداری اور اسلام کو قبول کرنے کا اظہار کیا۔ ان لوگوں کی بیعت عقبہ کی دوسری بیعت کہلاتی ہے۔ بیعت کے بعد یہ سارے لوگ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی صورت میں جا کر اپنے بقیہ لوگوں کے ساتھ مل گئے جو رات کی تاریکی میں گہری نیند کے مزے لے رہے تھے۔

رات کا یہ خفیہ اجلاس باوجود انتہائی کوششوں کے راز میں نہ رہ سکا۔ دوسرے دن صبح سارے مکہ میں اس بات کی تشہیر ہو گئی۔ مکہ کے بُت پرست اس بات سے پریشان ہو کر اپنا وفد یثرب کے لوگوں کے پاس لے گئے۔ ان کے سردار پر یہ الزام دھرا گیا کہ اس نے باقاعدہ سازش کر کے حضورؐ کے ساتھ ربط قائم کیا۔ یثرب کی جماعت کے سرداروں نے قسم کھا کر کہا کہ جو افواہیں مکہ میں پھیلی ہوئی ہیں ان میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ چونکہ ان لوگوں کو خود بھی اس بات کا علم نہیں تھا اس لیے ان کو بیعت کی حقیقت معلوم نہ ہو سکی۔ وہ اپنے آپ کو گزشتہ رات کے سارے واقعے سے لاعلم قرار دے رہے تھے۔

کارواں یثرب کی طرف روانہ ہوا۔ اس اثناء میں قریش کے اکابرین واقعہ

Marfat.com

کی مزید تحقیقات کر رہے ہیں۔ جب ان کو علم ہوا تو انہوں نے کارروان کا تعاقب کرنے کے لیے چند لوگوں کو روانہ کیا۔ اس جماعت نے پیچھا کیا مگر ان کو کارروان نہ مل سکا۔ البتہ انہوں نے سعدؓ ابن عبادہ کو پکڑ لیا۔ سعد نے خود تو بیعت نہیں کی تھی مگر ان بارہ آدمیوں میں سے ایک تھے جن کو بیعت کرنے والی جماعت نے اپنا لیڈر چنا تھا۔ سعد ابن عبادہ کو پکڑ کر وہ لوگ مکہ لے آئے۔ راستے میں ان کی خوب پٹائی بھی ہوئی۔ وہ ایک باعزت آدمی تھے۔ قبیلہ خزرج کے سرداروں میں سے ایک سردار تھے۔ سعد کے تجارتی تعلقات مطعم ابن عدی کے بیٹے جبیر سے تھے۔ جبیر مکہ کے ایک ممتاز تاجر تھے۔ مطعم ابن عدی حضورؐ کی حفاظت کا ذمہ بھی لیے ہوئے تھے۔ جب ایک قیدی کی طرح سعد مکہ لائے گئے تو سعد نے چلا کر کہا کہ میں جبیر ابن مطعم کی حفاظت میں ہوں۔ سننے والوں میں سے ایک شخص فوراً بھاگا بھاگا جبیر کے ہاں گیا اور ان کو اس واقعہ کی اطلاع کر دی جبیر موقع واردات پر پہنچے۔ سعدؓ ابن عبادہ کو انکے دشمنوں سے چھڑوا کر اپنے گھر لے آئے۔

اس بات کا امکان ہے کہ عقبہ کی دوسری بیعت سے کچھ قبل حضورؐ پر وحی نازل ہوئی ہو جس میں مسلمانوں کو اسلام کی خاطر لڑنے کی اجازت دے دی گئی ہو۔ اس سے قبل آپ کو صرف یہ ہدایت تھی کہ لوگوں کو جمع کریں۔ ان کی خامیوں کی نشاندہی کریں۔ ہدایت کے باوجود جہالت پر قائم رہنے والوں کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ اب حضورؐ کو اس بات کی اجازت مل گئی کہ اپنے دشمنوں کے خلاف باقاعدہ لڑیں۔

ابن اسحاق کے بیان کے مطابق خدا نے اپنے پیغمبر کو پہلی بار لڑنے کی ہدایت قرآن کے سورۂ حج کی ۳۹ سے ۴۲ ویں آیات میں دیں۔

"جب مسلمانوں سے لڑائی کی جاتی ہے تو اُن کو اجازت ہے کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا یقیناً اُن پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے

ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے جُدا نہ کرتا رہتا تو صومعہ اور عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں اللہ کا بہت ذکر کیا جاتا ہے ویران ہو چکی ہوتیں اور جو شخص اللہ کی مدد کرتا ہے، اللہ اس کی ضرور مدد کرتا ہے بے شک اللہ توانا اور غالب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو توفیق دیں تو نماز پڑھیں اور زکواۃ دیں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں۔ سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ اگر یہ لوگ تم کو جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد و ثمود کو بھی جھٹلا چکے ہیں۔"

یہاں لڑنے کی اجازت مدافعت کے لیے تھی۔ یثرب کے لوگوں نے مدافعت کا یہ پہلو قبول کر لیا تھا۔ اسی بناء پر حضورؐ نے مکّہ کے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ مکّہ سے ہجرت کر کے یثرب جائیں اور یثرب کے مسلمانوں سے اپنے تعلقات مستحکم کریں۔

مکّہ کے بعض مشرکوں نے اب اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی ہجرت کو روکا جائے چند مسلمانوں کو ان کے رشتہ داروں نے زبردستی روکے رکھا۔ اجتماعی طور پر جو مسلمان ہجرت کرنا چاہتے تھے اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

یہیں سے مکّہ کے لوگ جس بات میں بھی حضورؐ کی مخالفت کرنا چاہتے تھے کھل کر نہیں کرتے تھے۔ اب ان کے تشدد میں وہ زور باقی نہیں رہا تھا۔

جس بات کی بھی ابتدا ہوتی تھی وہ اب مسلمانوں کی طرف سے ہوتی تھی۔ مکّہ کے مشرکین اور مخالفین مسلمانوں کے لیے اقدامات کو صرف روکنے کی کوشش کرتے تھے مکّہ کے مشرکین کی مدافعت اب غیر مؤثر ہو رہی تھی۔ جس شدت سے مدافعت ہونی چاہیئے تھی، نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکابرین قریش تاجر تھے ان کو اپنی روزی کی خاطر اور بہت سے کام کرنے پڑتے تھے۔ وہ اپنا سارا وقت تو اس مخالفت میں صرف نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے ہاتھ مدافعت کی خاطر

Marfat.com

جنگ کا ہدایت نامہ بھی آ گیا تھا۔

بت پرستوں نے منفی طریقہ کار اختیار کیا تھا۔ یعنی مسلمانوں کی جو باتیں انہیں ناگوار گزرتی تھیں اس کی روک تھام اور بس۔ یہ منفی طریقہ کار کسی طریقے سے بھی ان کے لیے سودمند نہ ہوا۔ ایک اور بات جو مسلمانوں کے حق میں مفید رہی وہ یہ کہ مسلمانوں میں اب اکثریت جوانوں اور نوجوانوں کی تھی۔ ان کے برخلاف مشرکین کی اکثریت بوڑھے اور عمر رسیدہ لوگوں پر مشتمل تھی۔

حضورؐ اس لحاظ سے خوش قسمت رہے کہ آپ کے مذہب کی مخالفت اس شدو مد سے نہیں ہوئی جیسے یہودیوں کی مخالفت خود عیسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے یا رومن کیتھولک چرچ کی مخالفت ریفارمیشن کے دوران ہوئی تھی۔

عرب بت پرست چیدہ چیدہ، پھیلے پھیلے اور منتشر نہ صرف مادی اعتبار سے تھے بلکہ ذہنی طور پر بھی۔ ان کی کوئی ایسی موثر جماعت یا تنظیم نہیں تھی جس نے یہ کوشش کی ہو کہ اس مشن کی مخالفت باقاعدگی سے کرے۔

مسلمانوں کی اکثریت جو مکہ سے یثرب ہجرت کر گئی تھی۔ یثرب کے مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگی تھی۔ ان لوگوں کی وہاں کافی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ یثرب کے مسلمانوں نے ایثار اور ہمدردی، میزبانی اور لطف و کرم کا عملی مظاہرہ کیا تھا۔ مسلمانوں نے اپنی عبادت کے لیے قباء میں ایک جگہ چنی۔ یثرب کے جنوب میں قباء واقع ہے مکہ سے گئے ہوئے لوگوں نے قباء ہی میں اپنی رہائش اختیار کی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ سے درخواست کی کہ آپ بھی یثرب ہجرت کر جائیں لیکن آپ مکہ ہی میں ٹھہرے رہے۔ شجاعت و مردانگی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ مخالفین کے ہجوم میں آپ صرف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کے ساتھ مکہ میں تھے اور مکہ ہی کے قیام کو ترجیح دے رہے تھے۔

Marfat.com

اوپر کے واقعات نے اب قریش کی آنکھیں کھول دیں۔ اُن لوگوں کی اپنی زندگی کی بنیاد ہی اپنے اپنے قبیلے کے افراد کی وفاداری پر قائم تھی۔ ایسی جگہ جہاں نہ فوج ہو اور نہ پولیس اور نہ کوئی باقاعدہ حکومت، افراد کی وفاداری ہی قبیلے کی بقاء کی ضامن تھی۔ آپ کی تعلیم ان کے لیے بالکل نئی تھی۔

حضورؐ نے وفاداری کا سبق تو دیا لیکن یہ وفاداری کی تلقین ان کے لیے اس لیے نئی تھی کہ اہل قبیلہ کی قبیلے سے وفاداری کی بجائے مسلمانوں کو اسلام سے وفاداری کی تلقین کی۔ ایک مسلم کا دوسرے مسلم سے ذہنی اشتراک اور انہی بنیادوں پر مسلمانوں کو آپس میں متحد رہنے کی تعلیم دی۔

حضورؐ کے پیش کردہ اسلام نے خاندانوں میں بڑا اختلاف پیدا کر دیا تھا۔ قبیلوں کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ وہ نوجوان جو آپ کے ہاتھ پر ایمان لا چکے تھے اپنے والدین سے باغی ہونے لگے۔ یہ بات قریش کے لیے ایک بہت بڑے حادثے سے کم نہ تھی۔ آپؐ کی تعلیمات کی وجہ سے اُن کی صدیوں پرانی روایات اور ان کی اپنی سماجی زندگی کی بنیادیں ہلتی اور مسمار ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ مسلم نوجوان جو یثرب جا چکے تھے، وہاں کے لوگوں کو اس بات پر تیار کر رہے تھے کہ مکّہ والوں سے جنگ کریں اور مکّہ والے بھی کون؟ اُن نوجوانوں کے باپ، بھائی، چچا، ماموں، خالو اور دوسرے رشتہ دار جو پال پوس کر ان کو طفولیت سے جوانی کی منزل تک لے آئے تھے۔ اب یہ جوان ہو کر اسلام قبول کر کے اپنے ہی پالنے پوسنے والوں سے لڑائی کی باتیں کر رہے تھے۔

یہ ایسی ہی بات ہوئی جیسے آکسفورڈ یونیورسٹی کے طلبا جن میں سے کئی ایک کے باپ یا چچا یا ماموں برٹش گورنمنٹ میں وزیر ہیں یا اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہیں، روس چلے جائیں اور وہاں جا کر ساری دنیا کے خلاف بشمول انگلستان اعلانِ جنگ کر دیں۔ اس صورتِ حال سے جو عام تاثر سارے انگلینڈ میں ہو گا وہی تاثر اس وقت مکّہ

Marfat.com

میں ہوا ہو گا۔

قبل اس کے کہ ہم اس باب کو ختم کریں جس میں آپؐ کے مکہ میں قیام کا ذکر ہے، ان باتوں کا ذکر ضروری ہے جو حضورؐ کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوئیں۔

یہ اپنی جگہ صحیح بات ہے کہ اس سارے طویل عرصے میں نہ کسی نے آپؐ کو صلیب پر چڑھایا اور نہ ہی کسی اور اسلام قبول کرنے والے کو۔ نہ کسی کو زندہ جلایا گیا اور نہ ہی پہاڑوں پرسے جا کر کسی کے ساتھ دہشت انگیزی کی گئی۔ اس کے باوجود نفسیاتی طور پر یہ زمانہ آپ کے لیے بہت ہی ہمت شکن اور مایوس کن ثابت ہوا۔ دس سال تک زندگی کا ہر لمحہ مکہ میں اسلام کی تبلیغ میں گزرا۔ تبلیغ ہی آپ کی زندگی کا واحد مقصد رہی اسلام کی تبلیغ کے لیے آپ نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ ان ساری باتوں کے باوجود نتیجہ بظاہر بہت ہی مایوس کن نکلا۔ جو لوگ آپ کے ہاتھ پر ایمان لا چکے تھے وہ بڑی منتشر حالت میں تھے۔ اپنے ہی رشتہ داروں کے ہاتھوں آپ کی ہتک ہوتی رہی مضحکہ خیزی اور ہنسی مذاق کا مرکز آپ کی ذات کو بنانے کی کوشش کی گئی۔ بعض اوقات عوام کو صورت دکھانے میں آپ شرم محسوس کرتے تھے۔

کیا دنیا میں کوئی مثال اور بھی ایسی مل سکتی ہے جس میں مقصد کے حصول کے لیے اٹھنے والے کی اتنی زیادہ مخالفت کی گئی ہو؟ ایسے وقت جب کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام ہوتا ہوا بھی نظر آ رہا ہو؟ اس کے باوجود جس صبر کی مثال آپ نے پیش کی وہ اپنی آپ نظیر ہے ان سارے حوصلہ شکن واقعات کے باوجود صبر کا دامن آپ کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ اس خیال سے لاشعوری طور پر شاید آپ کو کچھ اطمینان ہوتا ہو کہ اسلام کے مخالفین دوزخ کی آگ میں جلائے جائیں گے اس کے باوجود آپ نے اپنی اس وقتی ناکامی کو ذہنی طور پر قبول بھی کیا۔ یہ بات حضورؐ کے مخالفین خصوصاً مغربی مصنفین کے لیے ایک تازیانہ ہے جو یہ کہتے ہیں کہ آپؐ ایک غیر محتاط

Marfat.com

قسمت آزما تھے۔

آنے والے دور کی کامیابیوں کو دیکھ کر آپ کو غیر محتاط قسمت آزما کے لقب سے یاد کرنا بہت آسان ہے لیکن بعثت کے بعد کے بارہ سال جیسے اور جس طرح سے بھی گزرے وہ آپ کے لیے گراں ترین سال تھے۔ اس عرصے میں بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ نہ صرف اپنے مقصد سے بلکہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

Marfat.com

یادگار تاریخیں

حضورؐ کی پیدائش	۵۷۰ء
بعثت	۶۱۰ء
تبلیغ کی ابتداء	۶۱۳ء
ہجرت حبشہ	۶۱۵ء
بنی ہاشم کا مقاطعہ	۶۱۶ سے ۶۱۹ء
معراج	۶۱۹ء
خدیجہؓ کی وفات	۶۱۹ء
ابو طالب کی وفات	۶۱۹ء
طائف کا سفر	۶۱۹ء
یثرب کے پہلے مسلمان	۶۲۰ء
بیعت عقبہ اوّل	۶۲۱ء
بیعت عقبہ دوم	۶۲۲ء
مدافعت کیلئے جنگ کے احکام	۶۲۲ء

انصار اور مہاجرین

اکابرین قریش نے خاص طور پر ایک جلسہ کا انعقاد کیا۔ اس میں مکہ سے مسلمانوں کے فرار پر بحث و مباحثہ ہوا۔ حسبِ معمول اس دفعہ بھی مکہ کے مشرکین نے تاخیر سے کام لیا۔ یہ اس وقت بحث و مباحثہ کر رہے تھے جب کہ مسلمان مکہ سے یثرب جا چکے تھے۔

ایک پرانی کہاوت ہے، قدیم اقوام ہمیشہ ایک حکومت یا ایک بادشاہ کی اطاعت کرتی آئی ہیں۔ عربوں کے پاس نہ تو حکومت تھی اور نہ ہی بادشاہت۔ اس لیے ہر عرب اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا رہا ہے وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی بھی اس کے کہے یا کیے پر کسی قسم کا اعتراض کرے۔

ہمارے اپنے تجربہ کے مطابق جمہوریت کے زیرِ سایہ زندگی خوشگوار تو گزرتی ہے لیکن جب ناگہانی صورتحال کا سامنا کرنا پڑے تو اس سے نمٹنے کے لیے جمہوریت سے زیادہ وہ اصولِ سیاست کامیاب نظر آتا ہے جس میں اقتدار سمٹ کر ایک ذات میں مرکوز ہو جاتا ہے اگر مکہ میں کسی ایک آدمی کا اقتدار ہوتا تو اسلام کو بہت زمانہ پہلے ہی دبا دیا جاتا۔ اکابرین قریش کی لمبی لمبی نشستوں، طویل طویل مباحثوں، لچھے دار تقریروں نے ان کو صرف نشستند و گفتند و برخاستند تک ہی محدود رکھا۔ عملی طور پر وہ کچھ نہ کر سکے۔ ان کے برخلاف مسلمان اگرچہ تعداد میں بہت ہی کم تھے مگر

Marfat.com

ایک رہبر کی رہبری انہیں حاصل تھی۔

ابنِ اسحاق کے بیان کے مطابق اکابرین قریش کے ہاں اس مسئلہ کا صرف ایک ہی حل رہ گیا تھا اور وہ تھا حضورؐ کا قتل۔

ابوجہل نے تجویز پیش کی کہ ذاتِ رسالتؐ کا اب خاتمہ کر دیا جائے قبیلہ داری خونی رقابت کے پیش نظر یہ طے پایا کہ قریش کے ہر قبیلہ یا جماعت کا ایک ایک فرد اپنے آپ کو اس کام کے لیے پیش کر دے۔ اس فرض کو اس طرح سے پورا کیا جائے کہ ہر شخص کی تلوار محمدؐ کے جسمِ مبارک پر پڑے تاکہ قتل کی ذمہ داری سب ہی قبیلوں میں بٹ جائے اگر ایک آدمی کا راج ہوتا تو وہ خاموشی سے کسی کو کہہ دیتا کہ محمدؐ کو قتل کر دے۔ مغربی جمہوریت میں ہر آدمی یہ توقع رکھتا ہے کہ پالیسی وضع کرنے میں اس سے صلاح و مشورہ کیا جائے اور اس صلح و مشورہ کے درمیان بعض اوقات خاص خاص مواقع ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں اسی طرح اس وقت کی جمہوریت بھی کچھ ایسی ہی ثابت ہوئی۔

اکابرین قریش کی کونسل کی نہ تو رکنیت محدود تھی اور نہ ہی رکنیت کی کوئی خاص شرائط تھیں۔ کوئی بھی بالغ آدمی ان کی محفل میں شریک ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی اکابرین قریش نے قتل کا فیصلہ کیا، آپ کو یہ اطلاع پہنچ گئی۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادہ عبداللہ قریش کی اس محفل میں شریک تھے۔ عبداللہ نے حضور کو یہ خبر سنا دی۔ ایک اور روایت کے مطابق حضورؐ کی چچی یا پھوپھی رقیقہ کے ذریعے یہ اطلاع حضورؐ تک پہنچی۔ رقیقہ بنی زہرا کے ایک سردار سے بیاہی گئی تھیں۔

حضورؐ اس خبر کو سننے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے گھر تشریف لے گئے حضرت ابوبکرؓ کے گھر جانے سے پہلے آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ وہ حضورؐ کے بستر پر لیٹ جائیں آپ نے حضرت علیؓ کو یہ تسلی بھی دی کہ انشاءاللہ ان پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔ حضرت علیؓ حضورؐ کے بستر پر لیٹ گئے۔ حضورؐ کی چادر اپنے پر ڈال لی۔

Marfat.com

عام روایات کے مطابق قتل کے ارادہ سے آنے والے حضورؐ کے گھر کے سامنے جمع ہو گئے۔ خدا کی قدرت سے وہ اپنی بصارت کھو بیٹھے جس کے نتیجے کے طور پر رات تمام وہ آپؐ کے گھر کے سامنے ہی بھٹکتے پھرے۔ صبح جب اُن کی بصارت لوٹ آئی تو اُن کو معلوم ہوا کہ آپ گھر چھوڑ کر جا چکے ہیں اور بستر پر حضرت علیؓ دراز ہیں۔

حضورؐ کے معتقدین نے جہاں اور قسم کی باتوں سے آپ کی زندگی کو آراستہ کرنے کی کوشش کی اس واقعہ میں بھی معجزانہ باتوں کو لا کر اس واقعہ کو رنگین بنانے کی کوشش کی۔

آسانی سے یہ بات تصور میں آسکتی ہے کہ ایک جماعت جو مختلف جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو اور جس کے ذمہ یہ کام ہو کہ ایک وقت مقررہ پر قتل کے لیے ایک مقررہ مقام پر جمع ہوں ایک رات میں تو اُن سب کو اس اقدام کے لیے آمادہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ بات قدرتی ہے کہ اپنا فیصلہ کرنے کے بعد انہوں نے چند جاسوسوں کو آپ کے گھر کے اطراف متعین کر دیا ہو تا کہ نقل و حرکت پر نگرانی رکھی جا سکے۔ جب ان جاسوسوں نے دیکھا کہ بستر پر کوئی چادر اوڑھے ہوئے لیٹے ہیں تو وہ اپنے یقین میں اپنی حد تک صحیح تھے کہ بستر پر حضورؐ ہی دراز ہیں۔

یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبداللہ اکابرین کی محفل سے اُٹھ کر سیدھے آپ کے مکان گئے ہوں تا کہ دشمنوں کے منصوبہ سے واقف کریں اور اس انکشاف کے فوری بعد آپ حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹا کر اپنی چادر اوڑھا کر سیدھے ابوبکرؓ کے مکان چلے گئے ہوں۔

حضورؐ کا حضرت علیؓ سے یہ فرمانا کہ تم پر کوئی آفت نہیں آئے گی اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ خود یہ محسوس فرما رہے تھے کہ اس رات صرف جاسوسوں کو چھوڑا گیا ہے۔ قاتلوں کو نہیں۔ وہ رات صرف جاسوسی کی رات تھی۔ قتل کی رات نہیں تھی۔

Marfat.com

یہ بات ہمارے لیے تعجب کا باعث ہے کہ مورخین اس واقعہ کی ڈرامائی صورت کو پیش کرنے کی بجائے اس میں معجزیت کا عنصر داخل کر دیتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں یہ رات ایک عجیب وغریب رات ہے۔ گرم ہواؤں سے بھرپور اور چھوٹی سی وادی مکہ سے حضورؐ جگمگاتے اور جھلملاتے تاروں کی روشنی میں اب رخت سفر باندھتے ہیں۔

دنیا آج کتنی مختلف ہوتی اگر اکابرین قریش اپنے مضحکہ خیز پلان کی بجائے سیدھے سادھے فارمولے کو اختیار کرتے بجائے اس کے کہ منتخب کردہ نمائندوں کو قتل کے لیے تیار کرتے کسی ایک جری اور بہادر کی خدمات مستعار لے کر حضورؐ کا قتل کروا دیتے اگر ایک آدمی اس خدمت پر مامور کر دیا جاتا تو وہ سیدھے حضورؐ کے گھر کا راستہ لیتا اور حضورؐ کا کام تمام کر دیا ہوتا۔

قریش کے جاسوس جب کہ اپنی جاسوسی کے فرائض انجام دے رہے تھے، آپ ابوبکرؓ کو ساتھ لیے گھر کے پیچھے کے دروازہ سے خاموشی سے باہر نکل جاتے ہیں اور شہر سے تین میل دور جنوب کی طرف ایک غار میں جو غارِ ثور کہلاتا ہے چھپ جاتے ہیں۔ یہ غار یثرب کے راستے میں واقع ہے۔ آپ کا پیچھا کرنے والے اس خیال میں رہتے ہیں کہ آپ یثرب چلے گئے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ جو تجربہ کار تاجر تھے جاتے ہوئے ایک تھیلی میں اپنے ساتھ پانچ ہزار درہم رکھ لیتے ہیں۔ لے دے کے یہی وہ رقم تھی جو حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہ گئی تھی۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے آپ کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے اپنا سارا اثاثہ اسلام پر نچھاور کر دیا تھا۔ غریب مسلمانوں کی مدد کرتے تھے۔ غلاموں کو ان کے مالکوں سے خرید کر آزاد کر دیا کرتے تھے۔

حضورؐ کے پاس اس موقع پر کوئی رقم نہیں تھی۔

Marfat.com

حضرت ابو بکرؓ کے بیٹے عبداللہ اپنے باپ کی خواہش پر مکہ ہی میں مقیم رہے، تمام دن کی خبریں رات میں غار میں جا کر آپؐ سے اور حضرت ابو بکرؓ سے بیان کرتے تھے۔

حضرت علیؓ مکہ ہی میں قیام پذیر تھے آپ کی زوجہ مطہرہ بی بی سودہؓ بھی مکہ ہی میں تھیں۔

عامر ابنِ فہیرہؓ ایک غلام تھے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا حضرت ابو بکرؓ نے ان کو ان کے مالک سے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ عامر ابن فہیرہؓ اپنے محسن کی حفاظت کی خاطر روزانہ صبح سویرے بکریوں کا گلہ لے کر غار کے دہانے تک چلے جاتے تاکہ رات میں غار میں آنے والوں کے پاؤں کے نشانات جو ریت پر پڑ جاتے تھے بکریوں کے گزرنے کی وجہ سے مٹ جائیں۔

حضورؐ کی شجاعت اور ہمت و مردانگی کا اعتراف ہم اوپر کر چکے ہیں کہ سارے مسلمان یثرب چلے جانے کے باوجود آپ اکیلے مکہ میں ٹھہرے رہے صرف حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ آپ کے ساتھ تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے کئی دفعہ ہجرت کی درخواست کی لیکن آپؐ اس میں تامل فرماتے رہے۔ جس شام حضرت ابو بکرؓ کے مکان گئے آپ نے حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا کہ اللہ نے اب مجھے ہجرت کی اجازت دے دی ہے۔ یہاں پر فوراً ہمارا ذہن اس بات کی طرف جاتا ہے کہ اللہ آپ کی ہجرت کو گوارا نہیں کرتا تھا لیکن جب مشرکین نے آپ کے قتل کا فیصلہ کر لیا تو اللہ نے آپ کو ہجرت کی اجازت دے دی۔

مشرکین کو جیسے ہی آپ کے روپوش ہونے کی اطلاع ملی انہوں نے گرفتاری کے لیے سو اونٹوں کا اعلان کیا۔ گرفتاری کے لیے انعام کا تو اعلان کر دیا لیکن گرفتاری کی کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی۔

قریش کے چند سربراہوں نے اندر ہی اندر اطمینان کا سانس لیا۔ اس صورتِ حال کو انہوں نے خوش آمدید اس لیے کہا کہ بغیر مزید خون بہائے انہوں نے آپ سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ ان کی نظر میں آپ کی ذات فتنہ و فساد کی جڑ تھی۔ اب جڑ اپنی جگہ چھوڑ

پکی تھی۔

ہمیشہ کی طرح اکابرین قریش کی رائیں اس معاملہ میں بھی ایک دوسرے سے مختلف رہیں۔ ان میں کوئی آدمی بھی کسی دوسرے کو کسی بھی ذمہ دارانہ کام کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ آپس کی یہ عدم اعتمادی اور نااتفاقی نے ان کو حضورؐ کے خلاف بہت ہی کم اکسایا۔

حضرت ابوبکرؓ کے ذہن میں چونکہ پہلے ہی سے ہجرت کا ایک خاکہ موجود تھا، اس لیے انہوں نے احتیاطاً بہت پہلے ہی سے سواری کے دو اونٹ خرید کر رکھے تھے ان اونٹوں کو عبداللہ ابن اُریقط کی حفاظت میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس وقت تک عبداللہ بت پرست ہی تھا ان کا تعلق بنی کنعانہ سے تھا۔

تیسری رات حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہ غارِ ثور گئے۔ حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ دشمن اپنی سرگرمیوں میں اب اتنے تیز نہیں ہیں۔ بیٹے نے اپنے باپ کو مشورہ دیا کہ جتنی جلد ہو سکے۔ غار چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں۔

تین دن تک غار میں چھپے رہنا اللہ کے ان دونوں بندوں کے لیے گھبراہٹ اور پریشانی کا باعث بنا رہا۔ حضرت ابوبکرؓ نے تو اپنی پریشانی کا اظہار کر دیا۔ حضورؐ نے انہیں دلاسہ دیا کہ اللہ اُن دونوں کی حفاظت فرمائے گا۔

قرآن نے بھی حضرت ابوبکرؓ کی اس پریشانی اور حضورؐ کے دلاسہ کا ذکر کیا ہے سورہ توبہ کی ۴۹ ، ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

" اگر تم پیغمبر کی مدد نہ کرو گے تو اللہ ان کا مددگار ہے۔ وہ وقت تم کو یاد ہو گا کہ جب ان کو کافروں نے گھر سے نکال دیا۔ اس وقت دو ہی شخص تھے جن میں (ایک ابوبکرؓ تھے) دوسرے (خود رسول اللہ) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اللہ نے ان پر تسکین نازل فرمائی اور ان کو ایسے لشکروں سے مدد دی جو تم کو نظر نہیں آتے تھے اور

کافروں کو پست کر دیا۔ بات تو اللہ ہی کی طرف بلند تھے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔"

اسی اثنا عبداللہ ابن اریقط حضرت ابوبکرؓ کے دو اونٹ لے کر غارِ ثور پہنچ گیا، اپنا اونٹ بھی ساتھ لیتا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی اسماؓ جو عبداللہ کی بہن تھیں، کھانا وغیرہ پکا کر اپنے والد ماجد کے پاس گئیں۔ سفر کا توشہ حضرت ابوبکرؓ کے حوالے کر دیا۔ وہ آتے وقت اپنے ساتھ ڈوری یا رسّی لانا بھول گئیں جس سے وہ توشہ دان اور کھانے پکانے کا سامان اونٹ سے باندھ سکیں۔ حضرت اسماؓ نے کمر سے اپنا کمربند نکالا اور سامان کو اپنے کمر بند سے باندھ کر ناقہ پر لٹکا دیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے عبداللہ ابن اریقط کو اپنا رہبر مقرر کیا تھا۔

ہم لوگوں کی عادت یہ رہی ہے کہ عربوں سے ہماری مراد وہ سارے عرب ہوتے ہیں جو تمام عرب ممالک میں رہتے ہیں۔ اس میں فرق نہیں کرتے کہ عرب مختلف حصّوں اور مختلف ممالک میں رہتے ہیں۔

شہری اور دیہاتی عرب میں کافی فرق ہوتا ہے۔ ایک مقام کا عرب دوسرے مقام کے عرب سے بہت سی باتوں میں مختلف ہوتا ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی شخص لفظ یوروپین استعمال کرے اور اس بات کو ملحوظ نہ رکھے کہ یوروپین میں فرنچ بھی ہیں، جرمن بھی ہیں، انگریز بھی ہیں، اطالوی بھی ہیں۔

آج بھی عربی بولنے والے ملکوں کے لوگ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ حتیٰ کہ جزیرہ نمائے عرب کے شہری بدیوں سے مختلف ہیں۔

ایک مشہور مستشرق پروفیسر مارگولیتھ اپنی کتاب "محمدؐ اور اسلام کے عروج" میں لکھتے ہیں کہ محمدؐ نے کاروانوں کی آمدورفت کے دوران جاسوسی کا جو فن سیکھ لیا تھا یہی فن اس بات کے لیے کافی رہا کہ آپ آگے چل کر سرپھروں کی سرکردگی کریں۔ میرے نزدیک اس مستشرق کا یہ بیان انتہائی گمراہ کن اور غلطی پر مبنی ہے۔ عرب کے تاجر ریگستانوں میں نہیں

Marfat.com

رہا کرتے تھے۔ اپنے کاروانوں کے ساتھ وہ ریگستانوں سے ایک مسافر کی حیثیت سے گزرتے تھے۔ اُن کی رہنمائی اور راستوں کی نشاندہی بدو کیا کرتے تھے۔ اُن بدویوں کے فرائض اس زمانے میں ایسے ہی تھے جیسے آج ایک طیارہ چلانے والے کے۔ جس طریقے سے آج کا تاجر ایک ہوائی جہاز چلانے والے پر بھروسہ کرکے اطمینان سے ہوائی جہاز میں بیٹھ جاتا ہے، اسی طرح اس زمانے کے تاجر اپنے کاروانوں کی رہنمائی کے لیے بدویوں کو مقرر کرتے تھے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے اُن بدویوں پر لوگوں کو اسی طرح اعتماد ہوتا تھا جیسے آپ اور ہم ہوائی جہاز کے سفر کے دوران پائیلٹ پر کیا کرتے ہیں۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ ایک بُت پرست بدوی کو اپنا رہبر بنانے پر اس لئے مجبور تھے کہ وہ مکہ سے یثرب جانے والے راستے پر اُن کی رہنمائی کرے یہ صحیح ہے کہ اگر آپ عام راستے سے سفر کرتے تو وہ بغیر اس بدوی کی مدد کے بھی مکہ سے مدینہ پہنچ جاتے چونکہ آپ دونوں کا پیچھا ہو رہا تھا اور معلوم راستے سے گزرنا آپ دونوں کے لیے خطرے کا باعث تھا اس لیے آپ نے بدوی کو اس بات کے لیے مقرر کیا کہ وہ حجاز کے پہاڑوں اور چھوٹے چھوٹے راستوں سے آپ دونوں کو مکہ سے یثرب لے جائے۔ حضرت ابوبکرؓ ہجرت کرتے ہوئے اپنے ساتھ اپنے آزاد کردہ غلام عامر ابن فہیرہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے وہ آگے آگے تھا اور حضورؐ اور ابوبکر اس کے پیچھے پیچھے۔

یہ واقعہ ۱۸ یا ۱۹ جون ۶۲۲ء کا ہے۔

دوسرے دن صبح صبح بنی کنعانہ کا ایک گھوڑے سوار ان تھکے ماندے مسافروں کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ اس غرض سے راستوں کی تلاش کر رہا تھا کہ اُسے حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ مل جائیں تاکہ قریش کا اعلان کردہ انعام جو سو اونٹوں پر مشتمل تھا اُسے مل جائے۔

حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ نے اس گھوڑے سوار کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ان کا پیچھا کرنا چھوڑ دے اور مسافروں کو اپنے حال پر چھوڑ دے اور کسی سے اس مقام اور ملاقات کا ذکر

Marfat.com

نہ کرے۔

دو دن کے مسلسل سفر کے بعد یہ چھوٹی سی جماعت عسفان پہنچی۔ یہ مقام مکہ سے تقریباً ۵۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ سواری میں استعمال ہونے والے اونٹ ۲۴ گھنٹوں میں اسی سے سو میل کا فاصلہ آسانی سے طے کر لیتے ہیں۔ اس جماعت نے فاصلے کے طے کرنے میں جو دیر لگائی اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ آپ لوگ دن میں پہاڑیوں میں چھپ جاتے ہوں اور صرف رات میں اپنا سفر جاری رکھتے ہوں۔ ذرا آگے بڑھنے پر امج کے مقام پر آپ حضرات کو اسلم کا کیمپ ملا۔ یہ جماعت بنی خزاعہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اتفاق سے حضرت ابو بکرؓ کی ایک چھوٹی لڑکی اپنی دایہ کے ساتھ اس کیمپ میں پائی جاتی ہے اس قبیلے کے لوگ حضرت ابو بکرؓ کا استقبال کرتے ہیں۔ حضورؐ کی خدمت میں سواری کا اونٹ پیش کرتے ہیں۔ آپ کا اپنا اونٹ سفر کی وجہ سے شاید بہت تھک گیا تھا۔

جب ان تھکے ماندے مسافروں نے غارِ ثور کے باہر خاموشی اور رازداری سے عبداللہ اور اسماء کو خدا حافظ کہا اور عرب کی خاموش اور سنسان راتوں میں جگمگاتے تاروں کی روشنی کے سہارے آگے بڑھنے کا قصد کیا تو عالم انسانیت نے دنیا کے ایک بہت بڑے اور تاریخی ڈرامہ کو ظہور پذیر ہوتے دیکھا۔

سیزر اور کیخسرو نے اپنے اطراف افواج کا ایک عظیم الشان لشکر جمع کر لیا تھا۔ یہ لوگ دنیا سے لمبی لمبی جنگیں کرتے رہے۔ معرکۃ الآرا مقابلوں کا سامنا محض اس لیے کرتے تھے کہ دنیا پر ان کی بالادستی قائم ہو لیکن دنیا جانتی ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب رہے اور کس حد تک ناکام۔ ان کے برخلاف بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس یہ چار عرب خاموشی سے حجاز کے پہاڑوں کے درمیان سے اس طرح نکلتے ہیں کہ ان کا وہاں سے اس بے سروسامانی کی حالت سے نکلنا ایک ایسی تحریک کی کامیابی کا باعث بنتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر دنیا میں ایک عظیم الشان اور عالمی

Marfat.com

سلطنت کا وجود عمل میں آتا ہے۔ سیزر اور کیخسرو کی اپنی اپنی سلطنتیں نیست و نابود ہو جاتی ہیں اور ان کے حدود مملکت پر اسلامی علم لہرانے لگتا ہے۔ عبداللہؓ اور ان کی بہن اسماءؓ غار ثور کے باہر پہاڑوں کی اونچی نیچی سطح پر حسرت و یاس کے مجسمے بنے کھڑے رہتے ہیں۔ پیدلے پاتا ہے کہ فی الحال بھائی اور بہن دونوں مکہ ہی میں رہیں گے۔

دوسرے دن صبح قریش کے سربرآوردہ حضرت ابوبکرؓ کے گھر جاتے ہیں معلوم کرنا چاہتے تھے کہ حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ اسماء دروازہ پر جاتی ہیں۔ آنے والے اسماء سے دریافت کرتے ہیں۔ اسماء اپنی لاعلمی کا اظہار کرتی ہیں۔ ابوجہل جو ایک کرخت اور بدتمیز آدمی تھا ابن اسحق کی روایت کے مطابق اسماء کو اس زور سے تھپیڑ مارتا ہے کہ اسماء کے کان کے بندے زمین پر گر جاتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے والد ابو قحافہ مکہ ہی میں رہتے تھے۔ وہ ضعیف بھی تھے اور بڑی حد تک بصارت سے بھی محروم۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ مکہ چھوڑ کر چلے گئے ہیں تو اپنی پوتی اسماء کے گھر گئے۔ اسماء سے کہا کہ ان کا خیال ہے کہ ابوبکرؓ جاتے وقت شاید کچھ رقم چھوڑ گئے ہیں تاکہ تمہاری ضروریات کی تکمیل ہوتی رہے۔

اسماء کی عمر اس وقت بمشکل ۱۹ یا ۲۰ برس ہو گی۔ بڑے باپ کی اس بڑی بیٹی نے اپنے دادا کو جواب دیا کہ ہاں حضرت ابوبکرؓ بہت ساری رقم ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ اسماء نے کچھ پتھر جمع کر کے اس مقام پر رکھ دیئے جہاں حضرت ابوبکرؓ اپنی رقم رکھا کرتے تھے ان پتھروں پر اسماء نے ایک کپڑا ڈال دیا تھا۔ اپنے نابینا دادا کا ہاتھ ان پتھروں کے قریب لے جا کر اور انہیں مس کروا کر اپنے دادا سے اسماء کہنے لگیں کہ دیکھیے دادا جان کتنی بڑی رقم ابا ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ دادا نے اپنی پوتی سے کہا کہ بیٹی پھر تو ہمارے لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ انہوں نے بہت اچھا کام کیا جو ہمارے لیے اتنی رقم چھوڑ کر گئے۔

Marfat.com

واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ جاتے ہوئے اسماءؓ کے لیے کوئی بڑی رقم چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔

ہجرت کرنے والی جماعت نے یثرب کا بید ھا راستہ اختیار نہیں کیا وہ سمندر کے ساحل سے ہوتے ہوئے پہلے تو عسفان پہنچے پھر شمال کی طرف جاتے ہوتے قدید سے گزرے اور پھر پہاڑوں کے درمیان سے شمال مشرق کی طرف روانہ ہوتے۔

یثرب کے مسلمانوں کو حضورؐ کے مکّہ سے غائب ہو جانے کی اطلاع تو مل چکی تھی لیکن آپ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں اس کے متعلق وہ بالکل لاعلم تھے اس لیے کافی پریشان تھے۔

ہر روز صبح تڑکے وہ اپنی سواریوں کو لے کر یثرب کے اُس اونچے مقام پر چلے جاتے تھے جہاں سے ان کو مکّہ سے آنے والے قافلے دور ہی سے نظر آجاتے تھے۔ روزانہ دوپہر تک وہ انتظار کرتے اور پھر جب سورج اپنی پوری تمازت پر آجاتا تو مایوس ہو کر پھر اپنے مقام پر قبا میں لوٹ جاتے۔

۲۸، جون ۶۲۲ء کی دوپہر جب کہ حضورؐ کا انتظار کرنے والے صبح سے ۱۲ بجے تک انتظار کرنے کے بعد مایوس ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس ہو جاتے ہیں۔ تین تھکے ماندے اونٹ یثرب کی شاداب وادی میں داخل ہوتے ہیں اور قبا کی حدود کے باہر ایک زیتون کے درخت کے نیچے یہ مسافر اپنی سواریوں پر سے اترتے ہیں اور اونٹوں کو ستانے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

سب سے پہلے ان مسافروں پر ایک یہودی کی نظر پڑتی ہے وہ مسلمانوں کے پاس دوڑا دوڑا جا کر اطلاع دیتا ہے کہ جس آدمی کے آنے کا تم سب کو انتظار ہے وہ آچکا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے گھر سے باہر نکل آتا ہے، مسرت و انبساط کی کیفیت ہر ایک پر طاری ہو جاتی ہے اور سب کی زبانوں پر "وہ آگئے" "وہ آگئے" کے استقبالی

Marfat.com

نعرے تھے، جوش وجذبہ اور فرطِ مسرت کے ساتھ جانے والوں میں سے بعض کو یہ جاننا مشکل ہو گیا تھا کہ آنے والی جماعت میں کونسی ہستی رسول اللہ کی ہے۔ کون ابو بکرؓ ہیں۔ یہ معمہ خود بخود اس طرح حل ہو گیا کہ جب لوگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت ابو بکرؓ ایک چادر کو لکڑی پر تھامے حضورؐ کو سایہ کر رہے تھے تاکہ دھوپ کی تمازت اور شدت سے بچیں۔

کلثوم ابن ہدم نے جو اس مقام کے قریب رہتے تھے حضورؐ کو دعوت دی کہ ان کے مکان میں مہمان رہیں۔ حضرت ابو بکرؓ ایک دوسرے مکان میں جو کلثوم کے مکان کے قریب تھا ٹھہر گئے۔ مکہ سے آئے ہوئے کافی مہاجرین اس جگہ مقیم تھے جو آپ کی آمد سے پہلے ہی یثرب پہنچ چکے تھے۔

آپ کے مشن کا پہلا باب اب ختم ہو چکا۔ یہاں کوئی حضورؐ کی بے حرمتی اور ہتک کرنے والا یا مخالفت کرنے والا نہیں۔ یہاں سے حضورؐ کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہونے والا ہے۔

یثرب پہنچنے کے بعد آپ نے تین دن تک قبا میں آرام کیا۔ تیسرے دن حضرت علیؓ مکہ سے یثرب پہنچے۔ حضورؐ کے غیاب میں مکہ میں جو رقمی معاملات حضورؐ کی طرف سے طے کرنے تھے حضرت علیؓ نے اس کی تکمیل کی۔ جن جن کو رقمیں یا قرض وغیرہ دینے تھے حضرت علیؓ نے ادا کر دیئے۔ اچانک مکہ چھوڑنے کی وجہ سے آپ کو یہ موقع نہیں ملا تھا۔ کہ ان فرائض کی تکمیل کریں۔ آپ کی غیر موجودگی میں حضرت علیؓ نے حضورؐ کی نیابت کی۔ حضرت علیؓ اس وقت ۲۱ سال کے تھے۔

یثرب آنے کے بعد آپ کو کئی راتوں تک نیند نہیں آتی تھی۔ یہاں آپ نسبتاً محفوظ تھے۔ خطروں کے امکانات کم تھے۔ ہو سکتا ہے کہ مکہ میں چونکہ آپ کے قتل کی سازشیں ہو رہی تھیں شاید اسی لیئے آپ کے ذہن پر اس کا بار پڑا ہو یا پھر تین دن تک غارِ ثور میں آپ جس بے سروسامانی کی حالت میں رہے اس کا بھی اثر ہوا ہو۔ اس کے علاوہ

Marfat.com

جس طریقے سے آپ مکہ سے رخصت ہوئے اس کا بھی اثر ہو سکتا ہے۔ یہ سب باتیں آپ کی نیند پر یقیناً اثرانداز ہوئی ہوں گی۔

آہستہ آہستہ ان سب باتوں کا اثر زائل ہوا۔ حسبِ معمول پھر آپ کو راتوں میں نیند آنے لگی۔

قریش نے یا تو اپنے روایاتی تجاہل اور تغافل کے پیش نظر یا پھر اپنی قومی روایات کے مطابق اپنے آپ کو اتنا نیچے نہیں گرایا تھا کہ ہجرت کی وجہ سے آپ کے یا ابوبکرؓ کے رشتہ داروں سے اس کا بدلہ لیں جیسا کہ یورپ میں طریقہ رہا ہے کہ عورتوں، بچوں یا رشتہ داروں کو معتوب کیا جائے۔

حضورؐ کی زوجہ سودہؓ حضرت علی ابن ابی طالب، حضرت ابوبکرؓ کے فرزند عبداللہؓ اور عبداللہ کی بہنوں نے خیریت و سلامتی کے ساتھ مکہ کو خیرباد کہا۔ کسی نے بھی ان کے قریب ترین لوگوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ابوجہل نے اسماء کو طمانچہ مارا تھا، سوائے اس واقعہ کے کسی کا بھی بال بیکا نہیں ہوا۔

چونکہ تمام مسلمان مکہ چھوڑ چکے تھے اس لیے ان مسلمانوں کے بت پرست قرابت داروں نے اپنے مسلمان رشتہ داروں کی جائداد اور دیگر اثاثوں کو بیچ کر اس کی رقم خود ہی رکھ لی۔ مکہ کے بہت سے بت پرست اس صورتحال کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ مکہ سے مسلمانوں کا نکل جانا ان کے لیے مکہ میں امن و امان اور اس کی پائیداری کا ضامن تھا۔ اب مذہبی مناظرے اور گرما گرم بحثوں اور اس کی وجہ سے خواہ مخواہ کی تلخیوں کا بہت ہی کم امکان تھا۔

حضورؐ نے اپنی آمد کی اطلاع اسعدؓ بن زرارہ کو کر دی تھی۔ یثرب کے جو لوگ پہلے پہل مسلمان ہوئے تھے، ان میں سے ایک اسعد تھے۔ اسعد پہلی بیعت عقبہ میں

Marfat.com

شریک تھے اور دوسری بیعت عقبہ میں نہ صرف عہد کرنے والوں میں تھے بلکہ اُن بارہ آدمیوں میں سے بھی ایک تھے جن کو سب نے مل کر جماعت کا لیڈر چنا تھا۔ ان کا تعلق خزرج کی شاخ بنی نجار سے تھا۔ اسی شاخ سے سلمیٰ کا تعلق تھا جو ہاشم سے بیاہی گئی تھیں۔ ہاشم حضورؐ کے پڑدادا ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر حضورؐ بنی نجار سے خاندانی تعلقات کے بھی خواہش مند تھے۔

دوشنبہ کے دن حضورؐ قبا تشریف لائے، جمعہ کو قبا کے شمال کی طرف روانہ ہوئے یہ مقام یثرب کے مرکزی مقام پر واقع ہے۔ روایات کے مطابق جہاں جہاں سے آپ گزرتے تھے لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل کر آپ سے درخواست کرتے تھے کہ ان کے مہمان رہیں۔ حضورؐ کسی کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ جہاں پر اور جس کسی کے گھر کے سامنے اس اونٹ کو ٹھہرا دے گا میں وہیں اُتر جاؤں گا اور اُسی کے ہاں قیام کروں گا۔

حضورؐ کے رشتہ دار بنی نجار کی رہائش گاہ کے سامنے جہاں ایک سائبان بھی تھا اور جو کھجوروں کے گوداموں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اونٹ رُک جاتا ہے۔ رُک کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر دوبارہ اٹھنے سے انکار کرتا ہے۔ حضورؐ اونٹ سے اتر جاتے ہیں۔

بنی نجار کا ایک نوجوان خالد ابن زید آپ کا سامان اپنے گھر میں لے جاتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ آپ اس کے مہمان رہیں۔ خالد ان لوگوں میں ہیں جو بہت پہلے ایمان لائے تھے اور دوسری بیعت عقبہ میں حضورؐ کے ہاتھ پر عہد کیا تھا۔

کچھ لوگ آپ کے پاس آکر عرض کرتے ہیں کہ ان کے مہمان رہیں، حضورؐ جواب میں فرماتے ہیں کہ آدمی اور اس کا سامان الگ الگ نہیں رہنا چاہیئے۔ حضورؐ کا سامان پہلے ہی خالد کے مکان میں جا چکا تھا۔ حضورؐ نے دریافت کیا کہ یہ کھجور کا باغ کس کی ملکیت ہے

جواب دیا جاتا ہے کہ یہ باغ دو یتیم بچّوں کی ملکیت ہے۔ ان یتیم بچوں کے والی باغ کو فروخت کرنے کی پیش کش کرتے ہیں۔ باغ کی رقم یتیم بچوں کے والی کو اسی وقت دے دی جاتی ہے۔ یہ رقم حضرت ابوبکرؓ ادا کرتے ہیں۔ اس باغ کو خریدنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے پاس جو رقم بچ جاتی ہے وہ دنیا کی اس پہلی مسجد کی تعمیر پر صرف کی جاتی ہے۔

حضورؐ نے مکّہ سے یثرب ہجرت کر جانے والے مسلمانوں کو مہاجرین سے مخاطب کیا اور یثرب کے مقامی مسلمانوں کو انصار کا لقب دیا۔ اب مہاجرین اور انصار دونوں نے مل کر رضا کارانہ کام شروع کر دیا۔ زمین کو ہموار کرنا، اینٹیں بنانا اور مختلف عمارتوں اور گھروں کی تعمیر ان کا مشغلہ بن گیا۔ حضورؐ خود بھی ان سب کے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔

عرب کام کرتے ہوئے اکثر گایا کرتے ہیں۔ ایک ہی مصرعہ یا شعر کو اس وقت تک دہراتے ہیں جب تک کہ ان میں سے کوئی کسی اور مصرعہ یا شعر کو موزوں کر کے گرہ نہ لگائے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔

ان میں سے ایک گاتا ہے کہ اگر اللہ کے رسول کام کرتے رہیں اور ہم بیٹھے رہیں تو کہا جائے گا کہ ہم ناکارہ لوگ ہیں۔

دوسرا کہتا ہے کہ اصل زندگی تو وہ ہے جو کٹنے والی ہے۔ اے اللہ مہاجرین اور انصار کو وہ اصل زندگی عطا کر۔

یہ سُن کر علیؓ ابن ابی طالب کہتے ہیں۔ دن اور رات محنت کر کے گارے اور مٹی سے کوئی مسجد بناتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دل کے گرد و غبار کو بھی صاف کرتا رہتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ گرد و غبار میں آلودہ ہونا عثمانؓ ابن عفان کو پسند نہیں تھا وہ عمارتوں وغیرہ کی تعمیر میں جسمانی طور پر حصّہ نہیں لیا کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی شادی حضورؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ سے ہوئی تھی۔

عمار ابن یاسر جو ایک آزاد کردہ غلام تھے اینٹوں کا وزن اپنے سر پر اٹھائے لوگوں

Marfat.com

سے کہتے تھے کہ لوگ مجھے مارنا چاہتے ہیں۔ اتنا زیادہ وزن وہ خود تو نہیں اٹھاتے مگر مجھ پر لاد دیتے ہیں۔

ام سلمہؓ جو آگے چل کر حضورؐ کی زوجیت میں آئی ہیں فرماتی ہیں کہ عمّار ابن یاسر کے الفاظ سن کر حضورؐ نے تھوڑی دیر خاموشی اختیار کی اور پھر انکے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عمّار سے کہا کہ تم کو یہ لوگ نہیں ماریں گے۔ تم کو مارنے والے تو چند خبیث ہوں گے۔

حضورؐ کے وصال کے کئی سال بعد جب حضرت علیؓ کی طرف سے عمّار ایک خانہ جنگی میں حصّہ لے رہے تھے حضرت علیؓ کے مخالفین نے ان کو نشانہ بنایا اور عمّار لڑائی میں مارے گئے۔

یہاں پر حضورؐ کی پیش گوئی پوری ہوئی کہ عمّار کا قتل خبیثوں کی ایک جماعت کرے گی۔

حضورؐ عمارتوں پر بے دریغ پیسہ خرچ کرنے کے مخالف تھے۔ اس کے باوجود سلاطینِ اسلام نے عالیشان اور پُرشکوہ مساجد، خوبصورت محلات اور مضبوط قلعے تعمیر کروائے۔

مسجد کے متصل آپ کے لیے اہل و عیال کے لیے کمرے بنائے گئے۔ کیچڑ کی بنی ہوئی اینٹیں ان کمروں کی تعمیر کے لیے استعمال کی گئیں۔ لکڑی کم یاب تھی۔ چند حجروں میں دروازے لگائے گئے۔ چند حجرے بغیر دروازوں کے رہے۔ ان پر ٹاٹ کے پردے ڈال دیئے گئے۔ مسجد اور حجروں کی تعمیر میں ایک سال کے قریب عرصہ لگ گیا۔

حضورؐ کی زوجہ حضرت سودہؓ کے لیے ایک کمرہ مختص کر دیا گیا۔ یثرب آنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد حضرت ابو بکرؓ کی صاحبزادی بی بی عائشہؓ حضورؐ کے نکاح میں آئیں۔ اس وقت عائشہؓ کی عمر ۹ سال تھی اور آپ ۵۳ سال کے تھے نکاح کے بعد جب حضرت عائشہ حضورؐ کے گھر لائی گئیں تو وہ اپنے ساتھ اپنے کھلونے بھی لیتی آئیں۔ فرش پر بیٹھے اکثر وہ اپنے کھلونوں سے کھیلا کرتی تھیں۔

زندگی کے آخری وقت تک بی بی عائشہؓ حضورؐ کی سب سے چہیتی بیوی بنی رہیں۔

Marfat.com

یثرب میں آپ کا آکر بس جانا مقامی نام یعنی یثرب کی تبدیلی کا باعث ہوا۔ اب یہ جگہ یثرب کی بجائے مدینۃ النبی کہلانے لگی۔ اس کے لفظی معنیٰ ہوتے ہیں نبی کا شہر۔ آگے چل کر یہ مقام مدینۃ النبی سے مدینہ کہلایا جانے لگا۔

حضورؐ کو اپنے دشمنوں سے چھٹکارا مل گیا تھا۔ اب آپ اپنے دوستوں اور چاہنے والوں کے درمیان تھے۔ اس کے باوجود مستقبل خود آپ کے ذہن میں ایک سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

تقریباً ۸۰ مہاجرین مکّہ سے مدینہ چلے آئے تھے۔ کچھ لوگوں کے ساتھ ان کے اہل و عیال بھی تھے۔ کچھ اپنی بیوی بچّوں کو مکّہ ہی میں چھوڑ کر آئے تھے۔ انصار تعداد میں زیادہ تھے۔ اوس اور خزرج قبیلوں کے اکثر لوگ ابھی بُت پرست ہی تھے۔ ان کے علاوہ یہودی قبیلے جو تعداد میں اوس اور خزرج کے قبیلوں سے نسبتاً کم تھے وہ بھی اپنی جگہ آپ کے لیے ایک معمہ بنے ہوئے تھے۔

ایک اہم بات جو اکابرین قریش کو مکہ میں آگ بگولہ کرتی تھی وہ یہ تھی کہ ایک شخص جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس پر وقتاً فوقتاً اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے کس طرح حکومت اور سیاست میں دخل اندازی کر سکتا ہے۔ کوئی آدمی بھی جس کو قدرت کی طرف سے مختلف احکام ملتے رہتے ہیں۔ اس بات کے لیے تیار نہ ہوگا کہ وہ اپنی برادری یا جماعت یا ملک کے لوگوں پر حکومت کرے جب کہ برادری کی ہر بات اللہ کی طرف سے آنے والی وحی میں نہ صرف رد کی جاتی ہے بلکہ برادری کے ہر فیصلے کی توہین کی جاتی ہے اور اسے غلط قرار دیا جاتا ہے۔

یہاں اس بات کا اعادہ کرنا ضروری ہے کہ یثرب کے دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ خزرج کے ایک نامی گرامی سردار عبداللہ ابن ابی نے اس آپس کی خانہ جنگی میں حصّہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔

Marfat.com

عبداللہ ابن ابی کی اعتدال پسندی اور فراست نے ان دونوں قبیلوں کو مفاہمت پر آمادہ کیا۔ ان دونوں قبیلوں نے عبداللہ ابن ابی کی قیادت پر اپنے اعتماد کا اعلان کیا۔ اُسے یثرب کا سب سے بڑا بااثر اور ذمہ دار سربراہ قرار دیا۔

اب یثرب کے اسٹیج پر حضورؐ نمودار ہوتے ہیں۔ آپ کے اطراف آپ کے حامی اور چاہنے والے جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک نئے آدمی کی آمد اور اس کا اس طرح سے استقبال اور روز بروز اس کی مقبولیت میں اضافہ نے فطری طور پر یثرب کے پرانے سربراہ کے دل میں حسد کی آگ کے شعلے بھڑکا دیئے۔ ان نئی صورتحال نے عبداللہ ابن ابی کو حضورؐ کا حاسد بنا کر رکھ دیا۔

اس حسد کے باوجود ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ عبداللہ ابن ابی فطری طور پر ایک امن پسند اعتدال پسند اور ذہین آدمی تھا۔

حضورؐ کو اب یثرب کے حالات کے پیش نظر اپنی پالیسی متعین کرنی تھی۔ آپ نے دو نئی باتوں کو اپنایا۔ ایک تو یہ کہ آپ نے انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ پیدا کیا۔ برادرانہ تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش کی۔ اس بھائی چارگی کے نتیجے کے طور پر حضرت ابو بکرؓ قبیلہ خزرج کے خارجہ ابن زہیر کے بھائی بن گئے۔ عمرؓ بن خطاب قبیلہ خزرج کے التیھان ابن مالکؓ کے بھائی بنائے گئے۔ اسی طرح مکہ سے آیا ہوا ہر مہاجر مسلمان یثرب کے کسی نہ کسی مسلمان انصاری کا بھائی بن گیا۔

اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ایک ایسی جگہ جہاں نہ کوئی حکومت ہو اور نہ ہی پولیس یا فوج فطری طور پر ہر آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کی اپنی ذات اور اس کے مال و اسباب اور اہل و عیال کی حفاظت ہوتی رہے۔ اس انفرادی حفاظت کی ذمہ داری قبیلہ پر ہوتی تھی۔ مسلمانوں نے اسلام قبول کر لینے کے بعد اپنے اپنے قبیلوں سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ ان کے لیے اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اپنی حفاظت کا ذمہ مدینہ

Marfat.com

کے قبیلوں کو ہی دے دیں جن میں سے اکثر مسلمان بھی ہو گئے تھے۔

حضورؐ کے مدینہ تشریف لانے کے کچھ ہی عرصہ بعد بنی نجار کے سردار اسعد ابن زرارے کا انتقال ہو گیا۔ حضورؐ کی پڑدادی سلمیٰ کا تعلق بنی نجار سے تھا۔ اسعد کے انتقال کے بعد اسی خاندانی تعلق کے باعث لوگوں نے مل کر حضورؐ کو اسعد ابن زرارہ کا جانشین مقرر کیا۔ اس جانشینی کی وجہ سے مدینہ میں حضورؐ کا اثر و رسوخ اور بڑھ گیا۔[1]

دوسرا قدم جو آپ نے اٹھایا وہ یہودیوں سے دوستی کا معاہدہ پر مبنی تھا۔ حضورؐ کا کہنا تھا کہ جس مذہب کی آپ تبلیغ کر رہے ہیں وہ وہی مذہب ہے جو مذہب ابراہیمؑ کا تھا۔ آپ کے الفاظ میں آپ مذہب ابراہیمی کی ہی ترویج کر رہے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ توریت کے قصص قرآن میں بیان کیے گئے ہیں اور حضرت موسٰیؑ کا ذکر بار بار قرآن میں آیا ہے۔ یہاں پر یہ فرض کیا گیا تھا کہ یہودی اپنے مذہب سے ذرا ہٹ گئے ہیں۔ مذہب ابراہیمی سے دور ہو گئے ہیں۔ اسی لیے آپ کا وجود اس غرض سے عمل میں لایا گیا کہ آپ لوگوں کو راہ راست پر لائیں۔ جن غلطیوں کے وہ مرتکب ہو رہے تھے ان غلطیوں سے ان یہودیوں کو پاک کریں۔

آپ نے فرمایا کہ آپ حضرت ابراہیمؑ کے اصل مذہب کو اس کے اصلی رنگ و روپ میں پیش کر رہے ہیں۔ بت پرستوں کے برخلاف اہل یہود اور اہل اسلام دونوں ایک اللہ کو مانتے ہیں۔ حضورؐ نے جب مسلمانوں کے لیے نماز کی ابتداء کی تو آپ نے یروشلم کو اپنا قبلہ بنایا۔ تمام مسلمان یروشلم کے رخ پر نماز پڑھا کرتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کا معراج کا سفر یروشلم سے شروع ہوا تھا۔ اسی یروشلم سے شروع کیے ہوئے سفر معراج میں آپ کو آسمانوں کی سیر کروائی گئی۔ آپ اللہ کے دیدار سے مشرف کیے گئے۔

یہ تمام باتیں امید دلاتی تھیں کہ آپؐ کی تحریک اور تبلیغ میں اہل توریت نہ صرف یار و مددگار

Marfat.com

ثابت ہوں گے بلکہ وہ آپ کو اپنا مسیحا تک بھی تسلیم کر لیں گے۔ مدینہ میں ابتدائی قیام کے دوران یہودیوں کے تعلقات آپؐ سے انتہائی دوستانہ رہے۔

ابن اسحاق نے اپنی تاریخ میں ایک ایسی دستاویز کا ذکر کیا ہے جو ایک معاہدہ تھی۔ مہاجرین انصار اور یہودیوں کے درمیان۔ اس دستاویز کے چند اقتباسات یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ یہ دستاویز اللہ کے رسول محمدؐ کی طرف سے ہے۔ مسلمانانِ قریش اور مسلمانانِ مدینہ اور ان تمام لوگوں کے تعلق سے جو محمد الرسول اللہ کی پیروی کرتے ہیں۔ مسلمانانِ قریش، مسلمانانِ مدینہ اور دیگر پیروان محمد الرسول اللہ ایک خاص جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو مختلف ہے دیگر تمام لوگوں سے۔"

یہ دستاویز کافی طویل ہے۔ اس میں ایک جگہ ملتا ہے "ایک مسلمان کسی کافر کی خاطر دوسرے مسلمان کو ایذا نہ دے۔" چونکہ مخاصمت اور دشمنی کی بنیادیں اکثر و بیشتر ایک دوسرے کے قتل پر مبنی ہوتی تھیں اسی لیے ان سے کہا گیا کہ اگر ایک مسلمان کے ہاتھ سے کسی کافر کا قتل ہوا ہو تو دوسرے مسلمان کو اس کافر کے قتل کا بدلہ قاتل مسلمان سے نہ لینا چاہیئے۔"

چونکہ اس زمانے میں ہر فرد کے جان و مال کی ذمہ داری قبیلہ پر ہوتی تھی اور قبیلہ جان و مال کی حفاظت کرتا تھا اسی لیے قبیلہ واری بنیادوں پر بدلہ لینے کو منع کیا گیا تھا۔

لوگوں کا تعلق ان کے اپنے اپنے قبیلوں سے ختم کر کے ایک اسلامی برادری کو جنم دیا گیا۔ اب لوگوں کی حفاظت کا ذمہ قبیلے سے ہٹ کر اسلامی برادری پر آپڑا۔ اب مسلمان اپنے قبیلوں کے جواب دہ نہ رہے بلکہ اسلامی جماعت کی وفاداری اور اطاعت کو ان کا فرض قرار دیا گیا۔ جو حقوق اور فرائض ایک قبیلہ اور فرد کے تھے اب ان کو اسلامی جماعت اور ایک مسلمان کے تفویض کیا گیا۔

اسی دستاویز میں ایک جگہ لکھا ہے "وہ یہودی جو ہمارا اتباع کریں گے۔ ہماری مدد

Marfat.com

اور برابری کے مستحق رہیں گے۔ ان لوگوں کو نہ تو کوئی نقصان پہنچائے گا اور نہ ہی ان یہودیوں کے دشمنوں کی مدد کی جائے گی۔ یہودی جنگ کے اخراجات میں مالی تعاون کریں گے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ جنگوں میں یہودی مسلمانوں کے طرف دار رہیں۔"

پھر لکھا ہے۔

" بنی عوف کے یہودی ایک جماعت کی حیثیت سے تسلیم کیے گئے ہیں یہ اور مسلمان دونوں ایک جماعت ہیں۔ یہودی اپنے مذہب پر چلیں گے اور مسلمان اپنے مذہب پر۔"

" آپس میں معاہدہ کرنے والی ان تینوں جماعتوں پر یہ فرض ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں خصوصاً اس وقت جب کہ یثرب پر کوئی حملہ ہو۔"

" غداری اور ظلم کو روکنے کے لیے وفاداری شرط ہے۔ اللہ اس دستاویز کو قبول فرمائے۔"

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ یہ معاہدہ بہت ہی طویل طویل ہے۔ ابن اسحٰق نے اس کو حسبِ ذیل سُرخی دی ہے۔

" مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان معاہدہ۔"

کسی جگہ دستخط کرنے والوں کے نام بیان نہیں کیے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک معاہدہ نہیں تھا بلکہ دو مختلف معاہدے تھے ان کے دریافت ہونے پر مورخین نے دونوں معاہدوں کو یکجا کر کے ایک معاہدہ بنا دیا۔

دستاویز کا ابتدائی حصّہ مہاجرین اور انصار کے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے، اس کا مقصد شاید یہ ہو کہ مہاجرین اور انصار کے تعلقات کو مستحکم کیا جائے اور اتحاد اور برادرانہ تعلقات پیدا کر کے ایک اسلامی جماعت تشکیل دی جائے۔

دستاویز کا دوسرا حصّہ مسلمان اور یہودی قبیلوں کے تعلقات کو ظاہر کرتا ہے یثرب کے یہود بظاہر تو عرب جیسے تھے لیکن ان میں یہودی خون آجانے کی وجہ سے مخلوط النسل ہو گئے تھے جو یہودی ابتداء میں تبلیغ کی غرض سے یثرب گئے تھے اُن

Marfat.com

کے ہاں بس جانے کی وجہ سے دو قوموں کی آپس میں آمیزش ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود ان کا طرز زندگی اور رہن سہن دیگر ملکوں کے یہودیوں جیسا ہی تھا۔ صنعت و حرفت، تجارت اور لین دین کے کاروبار میں یہ لوگ کافی آگے تھے۔ کافی دولت مند تھے۔ خصوصاً مدینہ کے یہودی سودی کاروبار میں بہت مشہور تھے۔ عربوں کے مقابلے میں یہودی تعلیم میں بھی آگے تھے۔ یثرب میں توریت پڑھانے کے لیے باقاعدہ ایک اسکول تھا۔ ان کی مادری زبان عربی تھی۔ زبان پر اُن کو عبور حاصل تھا۔ عربی میں شعر کہا کرتے تھے۔ عرب شعراء کے مقابلے میں اپنی شاعری کو بھی پیش کرتے ہیں۔

مسلمانوں اور یہودیوں کے آپس کے معاہدے کے اقتباسات اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ کس طرح مدینہ آتے ہی حضورؐ کی ذات گرامی مقامی سیاست، انتظام مملکت اور انصاف کے معاملات میں گھر گئی تھی۔

ایک قابل سربراہ کے لیے جس کی اپنی جماعت روبہ ترقی ہو اور اس کے ارکان میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہو یہ بات ناگزیر ہو جاتی ہے کہ وہ اُن امور پر توجہ نہ دے جو معاشرت معیشت اور انصاف کے لیے ضروری ہیں۔

یہاں سے آپ کی زندگی میں یکسر تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کی رسم و راہ بدلنے لگتی ہے۔ ایک بے بس اور ہر طریقہ سے ستائے جانے والا آدمی دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیاست دان اور حکمران میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ تبدیلی اس وقت حقیقی تبدیلی سے زیادہ ظاہری تبدیلی تھی آپ نے بہت پہلے ہی شاید یہ اندازہ لگا لیا ہو کہ آپ کا مشن ایک دن آپ کا رُخ سیاست کی طرف موڑ دے گا۔

یہودیوں سے معاہدہ کی میعاد بہت تھوڑی تھی۔

عرب دن میں کئی کئی گھنٹے اپنے گھروں میں بیٹھے مدینہ کے یہودیوں کے طرزِ زندگی پر گفتگو کیا کرتے تھے۔

Marfat.com

یہودی علماء عوام کے سامنے حضورؐ سے مختلف قسم کے سوالات اور خاص طور پر توریت کے قصص کا اعادہ کرتے۔ ان علماء کے سوالات کرنے کا منشا محض یہ ہوتا تھا کہ آپ کے علمی ذخیرے کا جائزہ لیا جائے اور آپ کی معلومات کو ناقص ٹھہرا کر لوگوں کے سامنے تمسخر کیا جائے کسی موقع پر انہوں نے آپ سے اس واقعہ کو بیان کرنے کے لیے کہا جس میں حضرت موسیٰؑ نے نو مرتبہ آسمانی آفات و بلیات کو اہل مصر پر نازل کیا تھا۔

ایک بار انہوں نے حضورؐ سے کہا کہ وہ آپ کو مسیحا ماننے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو حضرت داؤدؑ کی اولاد ثابت کریں۔ یہ اس لیے تھا کہ ان کی تعلیمات کے پیش نظر مسیحا کا وجود صرف حضرت داؤد کی اولاد ہی میں سے ہو سکتا تھا۔

چونکہ آپ اپنے کو داؤد علیہ السّلام کی اولاد بتانے سے قاصر تھے اس لیے آپ کی نبوت و رسالت کو تسلیم کرنے سے اُن لوگوں نے انکار کر دیا تھا۔

بعض اوقات اس قسم کے مضحکہ خیز سوالات کرنے کا منشاء یہ ہوتا تھا کہ آپ کو برسرِعام شرمندہ کریں۔ مہمل سوالات کر کے آپ کو غصّہ دلائیں۔ بعض اوقات اس قسم کی محفلیں شور و شغف، ہڑبونگ اور خفیف سی مار پیٹ پر ختم ہوا کرتی تھیں۔

ایک دو یہودیوں نے ان کی مذہبی پیش گوئی کے مطابق آپ کو اپنا مسیحا بھی تسلیم کیا اور اسلام میں داخل ہو گئے۔

مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان آپس کی چپقلش میں آہستہ آہستہ اضافہ ہونے لگا کبھی کبھی یہ رقابت گھونسہ بازی کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔

ایک بار حضرت ابوبکرؓ غریب مسلمانوں کے لیے چندہ اکٹھا کر رہے تھے۔ قرآن میں بیان کردہ ایک مضمون کو بار بار دہرا رہے تھے کہ کون ہے جو خدا کو قرضِ حسنہ دے۔ راستہ سے گزرنے والے ایک یہودی نے حضرت ابوبکرؓ کی اس مانگ کو سن کر کہا کہ اگر خدا کو قرض کی ضرورت ہے تو یقیناً تمہارا خدا قلاّش ہے اور عسرت و تنگ دستی

Marfat.com

میں ہے۔ حضرت ابوبکرؓ جو فطرتاً نرم مزاج تھے، غصے میں آ گئے اور اس یہودی کو ایک گھونسہ رسید کیا۔ ان دنوں مدینہ کے دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج کے لوگ بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے تھے۔

تاریخی مواد سے کسی بھی بڑے آدمی کی شخصیت اور اس کی کامیابی کا جائزہ لینا اور اس کی کامیابی کی کنجی ڈھونڈ نکالنا بڑا مشکل مسئلہ ہے۔ بڑے آدمیوں کی شخصیتیں پُراسرار ہوتی ہیں ان کی شخصیت پر سے پردہ اٹھانا تاریخی مواد کے بس کی بات نہیں۔ تاریخیں اس سلسلے میں بالکل مدد نہیں کرتیں۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں اگر کہا جائے کہ حضورؐ کی شخصیت غیر معمولی طور پر پُرکشش اور جاذب نظر واقع ہوئی تھی۔ آپ لوگوں کے دل موہ لیتے تھے۔ دوسروں کو متاثر کرنے کا آپ کو ملکہ حاصل تھا۔

بہت سے واقعات ایسے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ بُت پرست اور کافر آپ کے ہاں تمسخر اور مذاق کے ارادے سے آتے تھے۔ مگر مختصر سی ملاقات کے بعد اُن کا یہ حال ہوتا تھا کہ نہ صرف وہ مسلمان ہو جاتے تھے بلکہ زندگی بھر اسلام کے ایک سچے خادم بنے رہتے تھے۔

حضورؐ کی دن دونی رات چوگنی ترقی نے عبداللہ ابن ابی کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی چونکہ آپ کے مدینہ آنے سے قبل عبداللہ ابن ابی کی حیثیت یثرب کے سب سے بڑے سردار کی تھی اس لیے آپؐ کی کامیابی اُسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ عبداللہ ابن ابی نہ صرف ایک ذہین اور چالاک آدمی تھا بلکہ اس کو اپنے دل کی بات چھپانے میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ اس نے اپنے مسلمان ہونے کا زور شور سے اعلان کیا، مسلمان ہو جانے کے بعد ایک حد تک وہ ان لوگوں کا سرغنہ بنا رہا جو علانیہ یا خفیہ طور پر آپ کی تعلیمات کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ مسلمانوں کے ہجرت کر کے مدینہ میں آ کر رہ جانے سے جو نتائج پیدا ہونے کے امکانات تھے ان کے تاریک پہلو بیان کر کے یثرب کے لوگوں کے جذبات کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

Marfat.com

ایسے لوگ جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے لیکن جن میں خلوص کا فقدان تھا اُن کو اسلام نے منافقین سے خطاب کیا ہے۔ حضورؐ پر اکثر وحی کا نزول ہوا ہے جن میں اُن سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں جن کو لوگ آپ سے دریافت کیا کرتے تھے اور ساتھ ہی منافقین کی مذمت کی گئی ہے۔ ایک آدمی حنظل ابن حارث حضورؐ کی مجلسوں میں باقاعدہ شریک ہوا کرتا تھا۔ ان مجالس میں جو کچھ بھی بیان کیا جاتا نمک مرچ لگا کر وہ منافقین کو سنایا کرتا تھا۔ ایک بار یہ قول اُس سے منسوب ہوا کہ حضورؐ ہر بات سُن لیتے ہیں اور جو کچھ بھی کہا جاتا ہے اُس پر یقین کر لیتے ہیں۔

قرآن کے سورۂ توبہ کی ۶۱ ویں آیت میں اُس کا جواب دیا گیا ہے۔" ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پیغمبر کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص ہر کہی ہوئی بات پر یقین کر لیتا ہے۔ اُن سے کہہ دو کہ اگر وہ سُنی ہوئی بات پر یقین کرتے ہیں تو تمہاری بھلائی کے لیے وہ اللہ کی اور مومنوں (کی بات کا) یقین رکھتے ہیں اور جو لوگ تم میں ایمان لائے ہیں وہ ان کے لیے رحمت ہیں اور جو لوگ رسول اللہ کو رنج پہنچاتے ہیں ان کے لیے عذابِ الیم تیار ہے۔"

یادگار تاریخیں

آنحضورؐ کی پیدائش	۵۷۰ء
بعثت	۶۱۰ء
اسلام کی تبلیغ کی ابتداء	۶۱۳ء
ابو طالب کی وفات	۶۱۹ء
طائف کو روانگی	۶۱۹ء
عقبہ کی پہلی بیعت	۶۲۱ء
عقبہ کی دوسری بیعت	۶۲۲ء
مسلمانوں کی مدینہ کو ہجرت	۶۲۲ء
حضورؐ کی مکہ سے مدینہ کو روانگی	۱۸، جون سنہ ۶۲۲ء
قبا میں آنحضورؐ کی آمد	۲۸، جون سنہ ۶۲۲ء

Marfat.com

غزوۂ بدر

مدینہ آنے کے بعد ابتدائی چند مہینے مہاجرین کے لیے بڑے صبر آزما رہے۔ مدینہ میں پانی کی افراط اور باغبانی کی وجہ سے مچھر پائے جاتے تھے۔ ان مچھروں کی وجہ سے لوگوں کو بخار آیا کرتا تھا۔ مکہ میں پانی کی کمیابی کی وجہ سے لوگ ملیریا سے واقف نہ تھے۔ چونکہ مکہ کے لوگوں میں اس بیماری کے تعلق سے قوت مدافعت نہیں تھی اس لیے ان میں سے اکثر و بیشتر اس نئی بیماری کا شکار ہونے لگے۔

مہاجرین کی اکثریت اپنا سارا اثاثہ مکہ میں چھوڑ آئی تھی۔ اس لیے مالی حیثیت سے بہت ہی کمزور تھے۔ ان میں سے بعض اپنے بیوی بچوں تک کو چھوڑ آئے تھے اس لیے نہ صرف مالی پریشانی کا شکار رہے بلکہ بیوی بچوں کے قریب نہ رہنے سے انسان کو جو مختلف مادی اور ذہنی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُن سے بھی یہ گزر رہے تھے۔ ان کے اپنے گھر نہ تھے۔ خوش قسمتی سے مدینہ میں بارش بہت کم ہوتی ہے اور آب و ہوا معتدل ہے اس لیے لوگ مسجد میں یا پھر کھلے میدان میں یا گھروں کے صحن میں سو جایا کرتے تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آنحضورؐ نے مہاجرین اور انصار میں بھائی چارہ پیدا کر کے مدینہ کے مسلمانوں کو مکہ سے آئے ہوئے مسلمانوں کا بھائی بنا دیا تھا۔ میزبان اور مہمان

Marfat.com

دونوں خاندان کے افراد ایک ساتھ رہنے لگے۔ مہاجر اور انصار ایک دوسرے کی عملی طور پر مدد کرتے تھے۔ خلوصِ دل سے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔

فطری طور پر انصار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ مکہ سے آتے اُن کے مسلمان بھائی یعنی مہاجرین اپنا ذریعہ معاش آپ تلاش کریں اور کام کریں۔ بدقسمتی سے مکہ کے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ زراعت کس کو کہتے ہیں اور زرعی کام کس طرح سے کیا جاتا ہے زراعت ہی وہ واحد پیشہ تھا جو مدینہ میں عام تھا۔ مکہ میں زراعت نہیں ہوتی تھی بلکہ لوگوں کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔

آنحضورؐ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو جب ایک انصاری کا بھائی بنایا تو انہوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو بڑی خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ اپنا سارا مال و اثاثہ لا کر ان کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ یہ میری زندگی بھر کا اثاثہ ہے۔ اس میں سے آپ آدھا لے لیں اور آدھا میں رکھ لیتا ہوں۔ میری دو بیویاں ہیں۔ ان دونوں میں سے جس کو آپ پسند کر لیں اُسے میں طلاق دے دیتا ہوں اور آپ اس سے شادی کر لیں۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ نے یہ سب سن کر جواب میں کہا کہ خدا کی رحمتیں تمہارے اور تمہارے خاندان کے شامل حال ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہاں کا بازار کہاں ہے۔

ایک چھوٹی سی رقم قرض لے کر حضرت عبدالرحمٰنؓ بازار گئے۔ کسی چیز کو خریدا اور منافع پر بیچ دیا۔ خرید و فروخت کا سلسلہ اسی طرح جاری رکھا۔ اللہ نے ان کے کاروبار میں وہ برکت دی کہ انہوں نے اپنی تجارت کے منافع سے مدینہ میں ایک مکان خریدا۔ مقامی لڑکی سے شادی کی۔ شادی کے دن ایک بڑی دعوت کی۔ اس مثال سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ مدینہ کے زراعت پیشہ اور مکہ کے تجارت پیشہ لوگوں میں کتنا بڑا

Marfat.com

بدر کا نقشہ

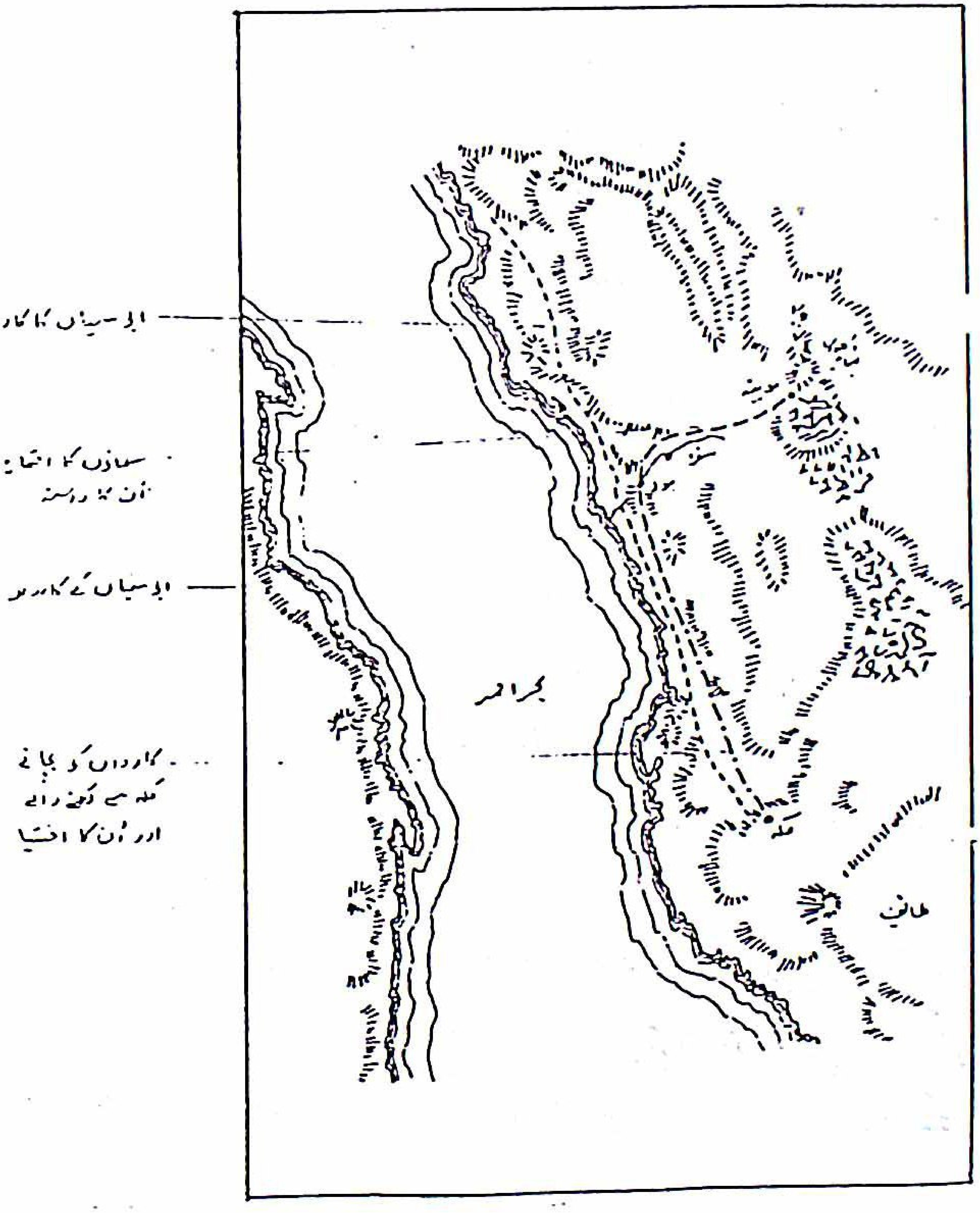

Marfat.com

ذرق تھا نذرعی طریقوں سے لاعلمی کی وجہ سے حضورؐ کو خود بھی کئی بار کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا مدینہ کے لوگ عام طور پر کھجور کے نخلستانوں کو اپنا ذریعہ معاش بنائے ہوتے تھے۔ ان درختوں میں بعض اور درختوں کی طرح چند نر درخت ہوتے ہیں اور چند مادہ۔ کھجوروں کی فصل کی تیاری کے لیے آدمیوں کو نر درخت پر چڑھنا پڑتا ہے۔ اوپر جا کر اس کا عنصر نکالنا پڑتا ہے اور پھر اُسے مادہ درختوں میں داخل کرنا پڑتا ہے آنحضورؐ نے اس عمل کو ناپسند فرمایا اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ اس عمل سے باز رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب فصل کے پکنے اور کٹنے کا زمانہ آیا تو مسلمانوں کے درخت کھجوروں سے خالی تھے۔ یہ دیکھ کر آنحضورؐ نے اپنی لاعلمی محسوس کی اور اس کا اعتراف بھی فرمایا۔

یہاں مسلمانوں کے لیے ایک نکتہ نکل آیا۔ آنحضورؐ جب کوئی بات کسی وحی کی بناء پر فرماتے تو وہ مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل ہو جاتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے اس حکم پر عمل کرنا فرض ہو جاتا تھا۔

وحی سے ہٹ کر اگر کوئی بات آنحضورؐ اپنی طرف سے کہتے تو یہ بات ایک بشر کی بات ہوتی تھی۔ انسان کی باتوں میں خطا و نسیان کی گنجائش ہوتی ہے۔ جیسے عام انسانوں سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں ایک انسان ہونے کے ناطے حضورؐ سے بھی سرزد ہو سکتی تھیں اس لیے حضورؐ کی باتیں جو وحی سے ہٹی ہوئی ہوتی تھیں لوگوں پر فرض نہیں ہوتی تھیں۔

بخاری کی روایت کے مطابق مدینہ میں اس وقت پندرہ سو مسلمان رہتے تھے ڈاکٹر حمید اللہ کے بیان کے مطابق سارے مدینہ کی آبادی دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ اس آبادی میں بُت پرستوں کی تعداد بہ نسبت یہودی قبیلوں کے افراد کے زیادہ تھی۔

یہ اعداد و شمار ناقابلِ اعتماد اور مشکوک ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ

Marfat.com

آبادی مدینہ کی کچھ ہی کیوں نہ ہو مسلمان بہرحال اقلیت میں تھے۔

مدینہ میں اس وقت ایک عیسائی کے رہنے کا ذکر آتا ہے۔ اس کا نام ابو عامر تھا۔ یہ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ایک راہب تھا۔ ابو عامر نے آنحضورؐ کے دعویٰ نبوت کو تسلیم نہیں کیا۔ مدینہ چھوڑ کر مکّہ کے بت پرستوں کے درمیان جا کر رہنے کو ترجیح دی۔

آنحضورؐ کے مدینہ آنے کے سترہ یا اٹھارہ مہینے بعد مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان خلیج پیدا ہونے لگی۔ نتیجے کے طور پر مسلمانوں کے طریقۂ عبادت میں ایک بڑی تبدیلی آئی۔

واقعہ معراج کے بعد سے حضورؐ نے مسلمانوں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ نماز کے وقت وہ اپنا قبلہ بیت المقدس کو بنائے رکھیں۔ یہودیوں سے مفاہمت اور تعاون کو ترک کرنے کے لیے پہلا قدم جو اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ اب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس نہ رہا بلکہ کعبہ ہو گیا۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اب وہ قبلہ رُو ہوں تو مکہ کی طرف ہوں۔ بیت المقدس یا یروشلم کے رُخ پر نماز نہ پڑھیں۔ دوسری تبدیلی یہ فرمائی کہ ہفتہ کو جو یہودیوں کے لیے مبارک اور مقدس دن ہوتا ہے اور جو مقامی طور پر اہمیت کا دن تھا جمعہ سے تبدیل کر دیا گیا۔

یہودی اور عیسائی اپنے اپنے مقدس دن یعنی ہفتہ یا اتوار کو بہت سے ایسے کام ہیں جو نہیں کرتے اور مذہباً اُن کاموں کا کرنا منع ہے۔ آنحضورؐ نے مسلمانوں کو جمعہ کے دن اس قسم کی پابندیوں سے آزاد رکھا۔ جمعہ کی اہمیت میں اضافہ صرف اس طرح کر دیا کہ اُس دن دوپہر کے وقت ایک خاص نماز جو نماز جمعہ کہلاتی ہے ادا کرنے کا حکم دیا۔ یہ نماز صرف مساجد ہی میں باجماعت پڑھی جاتی ہے۔

Marfat.com

آنحضورؐ کے مدینہ میں قیام کے پہلے سال سارے مسلمان آپس میں شیر و شکر رہے ان کی تعداد ہزار اور پندرہ سو کے درمیان تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں ارکان اسلام کی تشکیل عمل میں آئی۔ ان ہی ارکان میں سے ایک رکن پانچ وقت کی نماز ہے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ کونسی تاریخ اور کونسے دن نماز پنج وقتہ کو مسلمانوں پر باقاعدہ فرض کیا گیا۔

بعض راویوں کا کہنا ہے کہ آنحضورؐ کے زمانہ حیات میں صرف تین وقت کی نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔

مسلمانوں پر نماز کے بعد جو دوسرا فرض اسی زمانہ میں عاید کیا گیا وہ زکوٰۃ تھا۔ زکوٰۃ کی تشریح بڑی ہی واضح اور متعین ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کی انفرادی دولت کا ایک مخصوص حصہ ہر سال زکوٰۃ کے طور پر نکالا جائے۔ زکوٰۃ کی حیثیت ایک ٹیکس کی ہے نہ کہ بخشش یا خیرات کی۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں زکوٰۃ غریبوں یا ناداروں میں تقسیم کی جاتی تھی۔ صاحبِ زکوٰۃ ہر سال زکوٰۃ کی رقم علیحدہ کرتے اور حاجت مندوں میں تقسیم کرتے تھے۔

اسلام کا تیسرا رکن جو اسی زمانے میں مسلمانوں پر فرض کیا گیا وہ رمضان میں روزہ رکھنا تھا۔

بعض مغربی مصنفین کا بیان ہے کہ آنحضورؐ نے روزہ کو یہودیوں سے اپنایا مدینہ میں چونکہ کافی یہودی رہا کرتے تھے اور یہ لوگ بھی سال میں دس دن روزہ رکھا کرتے تھے اس لیے آنحضورؐ نے بھی ان کے اس عمل کو پسند کرتے ہوئے مسلمانوں میں بھی روزہ کی ترویج کی۔ یہودیوں سے امتیاز کی خاطر مسلمانوں کو بجائے دس دن کے رمضان کا پورا مہینہ روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

یہاں یہ بات کرنا ضروری ہے کہ نماز، زکوٰۃ اور روزہ یہودی مذہب کی

Marfat.com

بنیاد رہے ہیں یہودیوں کی مذہبی کتاب MATHEW VI میں جب فرعونوں کی ظاہرداری، دکھاوٹ اور بناوٹ کا ذکر آتا ہے تو فرعونوں کی اسی لیے مذمت کی گئی کہ وہ اپنے آپ کو نیک اور پارسا ظاہر کرنے کے لیے نمازیں پڑھتے تھے، روزہ رکھا کرتے تھے اور زکوٰۃ دیا کرتے تھے۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے وہ بھی نیک اور پارسا ہیں۔

مغربی مصنفین جب کہتے ہیں کہ اسلام یہودیت کا چربہ ہے تو مسلمان اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ اسلام دین ابراہیمی ہے۔ حضرت ابراہیم پہلے مسلمان تھے اسلام اور یہودیت میں مشابہت کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بہت سی باتوں میں ان دونوں مذاہب میں بڑی مشابہت ہے۔

مسلمانوں کو اجازت ہے کہ نماز چاہیں تو اکیلے پڑھ لیں یا باجماعت ادا کریں۔ جو لوگ نماز کے لیے مسجد جا سکتے ہیں جوق در جوق مسجدوں کا رُخ کرتے ہیں مسجد میں صفیں باندھی جاتی ہیں۔ اُن کے آگے ایک امام کھڑا رہتا ہے جو نماز پڑھاتا ہے تمام نمازی اس امام کی پیروی کرتے ہیں۔ جو عمل امام کرتا ہے وہ عمل اس کے مقتدی کرتے ہیں۔

بعض مغربی ماہرینِ نفسیات نے مسلمانوں کی نماز باجماعت کا مشاہدہ کیا تو نماز میں جس بے نظیر تنظیم اور اطاعت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اس کو فوج کے نظم و نسق اور اطاعت و تنظیم سے تشبیہہ دی۔

جب مسلمان مسجدِ نبوی میں ہر نماز کے وقت باقاعدہ جمع ہونے لگے تو اس بات کو محسوس کیا گیا کہ کوئی ایسا طریقہ کار اختیار کیا جائے جس کے نتیجے کے طور پر تمام مسلمان ایک وقت میں نماز کے لیے جمع ہو سکیں۔ یہودی اس مقصد کے لیے ناقوس استعمال کرتے تھے۔ آنحضورؐ بھی اسی طریقے کو اپنانا چاہتے تھے۔ یہودیوں اور مسلمانوں میں

Marfat.com

رقابت زیادہ ہو جانے کی وجہ سے اس خیال کو ترک کر دیا۔

عیسائی اس مقصد کے لیے گھنٹہ بجایا کرتے تھے۔ اس پر بھی غور کیا گیا لیکن اس طریق کار کو بھی ناپسند کیا گیا۔ ایک دن ایک انصاری آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ انہوں نے خواب میں دیکھا ہے کہ نماز کے لیے لوگوں کو مسجد پر بلوانے کے لیے انسانی آواز کو استعمال کرنے کا کسی نے مشورہ دیا ہے۔ آپ نے اس مشورہ کو پسند فرمایا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ صادر فرمایا۔

ایک حبشی غلام جس کو اس کے مالک نے مکہ میں ظلم و ستم کا نشانہ بنا رکھا تھا اور جس کو حضرت ابوبکرؓ نے آزاد کر دیا تھا اس کام کے لیے چنا گیا۔ اس غلام کا نام بلالؓ تھا۔ اسلام کے پہلے مؤذن حضرت بلالؓ ہیں جن کو اذان دینے کے فرائض سپرد کیے گئے جن الفاظ کو آنحضورؐ نے حضرت بلالؓ کے ادا کرنے کے لیے چنا تھا وہی الفاظ آج بھی ہر مسجد کے منارے سے مؤذن کی زبان سے ادا ہوتے ہیں اور سنے جا سکتے ہیں۔

اذان میں کہا جاتا ہے

اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔

نماز کے لیے آؤ۔ نماز کے لیے آؤ۔

نماز تمہاری فلاح و بہبودی کا باعث ہے۔

اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔

نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔

حضرت بلالؓ مسجد نبوی کے قریب کسی ایک گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دیتے اور اس طرح مسلمانوں کو نماز کے لیے بلاتے۔ منارہ جو بعد میں چل کر مسلم طرز تعمیر کا ایک

Marfat.com

جز دبن گیا اُس وقت اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔

مدینہ آنے کے کچھ مہینے بعد ہی مہاجرین کو فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اس لیے کہ انصار نے ابتدا میں جوش و خروش اور فیاضی کا مظاہر کیا تھا اس میں آہستہ آہستہ کمی ہونے لگی تھی۔ مکہ سے آئے ہوئے مسلمانوں کے تعلق سے یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ فاقہ سے مجبور ہو کر گھاس پات کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اُن کا لباس بمشکل ان کی ستر پوشی کرتا تھا۔ جو لوگ مکہ میں تجارت کرتے تھے اور ہجرت کی وجہ سے اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ آئے تھے پھر سے تجارت کی طرف رجوع ہو گئے، حضرت عبدالرحمٰنؓ ابنِ عوفؓ کا ذکر ہم ابھی اوپر کر چکے ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ بازار میں کھڑے ہو کر کپڑا بیچا کرتے تھے۔ حضرت عثمان ابن عفان کھجوروں کا کاروبار کرتے تھے۔

حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو بالٹی میں پانی لے جا کر اس شخص کو دیتے ہوئے دیکھا گیا جو اپنا گھر مٹی کی اینٹوں سے بنا رہا تھا۔ حضرت علیؓ کو اس کام کے معاوضے میں ۱۶ کھجور دیئے گئے تھے۔

آنحضورؐ کو بھی ان تمام دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑ رہا تھا جن سے عام مسلمان گزر رہے تھے۔ بعض اوقات خود آپ کو بھی فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ کے خاندان کے افراد کا گزارہ کھجوروں پر تھا۔ جب کھانے پینے کا کوئی سامان تحفے میں ملتا تو آپ اس کو اُن بے بس اور نادار مسلمانوں میں تقسیم کیا کرتے جو اپنی غربت اور محتاجی کی وجہ سے مسجد نبوی میں قیام کیا کرتے تھے۔ جب آنحضورؐ نے حضرت عائشہ بنت ابو بکرؓ سے نکاح کیا تو اس موقف میں نہیں تھے کہ کسی دعوت وغیرہ کا اہتمام کرتے۔ اس وقت حضورؐ کے گھر میں کھانے کی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔

آنحضورؐ کے مدینہ آنے کے تقریباً سات مہینے بعد مختلف قسم کی مخالفتوں اور رقابتوں

Marfat.com

کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ قریش کے تجارتی کاروان پر جو دھاوا بولا گیا وہ مسلمانوں کی ناداری اور غربت کا نتیجہ تھا یا مسلمانوں نے مکہ کے لوگوں سے بدلہ لینے کے لیے ایک سوچا سمجھا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ چونکہ مسلمان معاشی اعتبار سے ابتر ہو گئے تھے اس لیے شاید اپنی اس ابتری کو دور کرنے کے لیے انہوں نے یہ قدم اٹھایا ہو یا پھر مکہ کے بت پرستوں سے بدلہ لینا ان کا مقصد رہا ہو۔ بہر حال اس حملہ کے پس منظر کے تعلق سے کچھ کہنا محض قیاس آرائی کرنا ہے۔

بعض مسلمان اس حملے کو اللہ کی رضا سمجھ رہے تھے۔ بعضوں نے اسے اسلام کی خدمت سمجھا اور اسی جذبے نے ان کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں اور سگے بھائیوں کے مدمقابل ہو جائیں۔

عقبہ کی دوسری بیعت مدینہ کے مسلمانوں نے آنحضورؐ کے ہاتھ پر کی تھی۔ اس کی روح مدافعت پر مبنی تھی۔ ساری بیعت میں مدافعانہ پہلو اختیار کیا گیا تھا۔ انہوں نے دشمنوں سے محفوظ رکھنے کا ذمہ تو ضرور لیا تھا لیکن اس بات کا اقرار نہیں کیا تھا کہ وہ آپ کی خاطر قریش کے لوگوں پر حملہ کریں گے یا آپ کے دشمنوں سے جارحانہ طرز عمل اختیار کریں گے۔ بیعت کے اسی پہلو کے پیش نظر قریش کے تجارتی کاروان پر حملہ کرنے والوں میں انصار بالکل شریک نہیں ہوتے۔ حملہ کرنے والے سارے کے سارے مہاجرین تھے۔

یورپ کے مصنفین جو عرب کی سماجی زندگی سے واقف نہیں ہیں۔ قریش کو بھی ویسا ہی ایک قبیلہ سمجھتے ہیں جیسے غطفان، ہوازن یا طے تھا۔

بدوی قبیلوں کا وجود باہمی جنگوں کا مرہون منت ہے۔ وہ اپنی بقا کے لیے جنگ کیا کرتے تھے۔ جنگ ان کی زندگی کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ ان بدوی قبیلوں کے برخلاف قریش تجارت پیشہ لوگ تھے۔ ان کی زندگی کا منشا، دولت کا حصول تھا۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے وہ سرگرداں رہا کرتے تھے۔ جنگ کے وہ خواہش مند نہیں تھے۔ خصوصاً

Marfat.com

ایسی جنگ اُن کو بھاتی نہیں تھی جو صرف عزت وشوکت کے اظہار کی خاطر لڑی جاتی ہے جنگ چونکہ تجارت کے فروغ میں رکاوٹ بنتی ہے اس لیے قریش کی خواہش یہ رہتی تھی کہ سارے عرب میں ہمیشہ کے لیے امن وامان رہے تاکہ ان کی تجارت کامیابی کے ساتھ چلتی رہے اور تجارت کے فروغ کی وجہ سے ان کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا رہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے قریش کے تاجر ریگستانی راستوں سے اُسی طرح ناواقف تھے جیسے آج کا ایک تاجر۔ آج کے تاجر کو دنیا کے کسی بھی حصّہ میں جانا ہو تو وہ یا تو پائلٹ پر بھروسہ کرے گا یا ٹرین ڈرائیور پر۔ بالکل اسی طرح اس زمانے میں قریش کے تاجر راستوں کی رہنمائی کے لیے بدویوں کی خدمات حاصل کرتے تھے۔

شہریوں اور دیہاتیوں میں ہمیشہ رقابت رہا کرتی ہے۔ بدوی شہر میں رہنے والے قریش کے لوگوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔

جب عرب تاریخ دانوں اور محدثوں نے کتابیں لکھنی شروع کیں تو اس وقت قریش کے خلفاء، بادشاہوں اور شہنشاہوں کا سکّہ چلتا تھا۔ قریش خاندانوں سے تعلق رکھنے والے ان بااثر لوگوں نے تاریخ دانوں اور محدثوں کو ہدایت کی کہ جب کبھی قریش کا ذکر آئے ادب سے آئے۔ کسی جگہ بھی قریش کے ساتھ بے ادبی یا بے حرمتی نہ ہونے پائے خلیفہ چونکہ خود قریش سے تعلق رکھتا تھا اس لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ تاریخ میں قریش کو کسی بھی طریقے سے ہدفِ ملامت بنایا جائے۔ ان کی ان ہدایتوں اور سختیوں کے باوجود تاریخ کے بین السطور یہ بات پڑھی جاسکتی ہے کہ عرب کے اور قبیلے قریش کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کو بیوپاری، دکاندار یا شہری سے مخاطب کرتے تھے۔ ان کو بنیئے اور بقال سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف مکّہ کے لوگ یعنی قریش شہر سے باہر رہنے والے بدوی قبیلوں کو جنگلی، وحشی، غیر مہذب اور جاہل سمجھتے تھے ان لوگوں کو گنوار اور گاودی کہا جاتا تھا۔

Marfat.com

قریش کے اس تجارتی کاروان پر مسلمانوں نے جو پہلا حملہ کیا وہ خاطر خواہ کامیاب نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے حملہ کیا تھا ان کا تعلق مکہ سے تھا۔ ان پر شہریت غالب تھی۔ بدویت کا فقدان تھا۔

اگر عرب کے نقشہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ ایک ایسے مثالی محل وقوع کا مالک تھا جہاں سے ان کاروانوں پر آسانی سے حملہ کیا جا سکتا تھا جو مکہ سے شمال کی طرف شام جایا کرتے تھے۔

غالباً جنوری ۶۲۳ء میں مسلمانوں نے آنحضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کی قیادت میں پہلی مرتبہ قریش کے تجارتی کاروان پر حملہ کر کے اُسے لوٹنے کی کوشش کی۔ حضرت حمزہؓ کی قیادت میں اس کام کو انجام دینے کے لیے تقریباً ۳۰ آدمی تیار ہوئے۔ ابوجہل کی قیادت میں جو تجارتی کاروان اپنا راستہ طے کر رہا تھا اس کو لوٹنا ان لوگوں کا مقصد تھا۔ حضرت حمزہؓ کاروان کو وادی عیص تک لے آئے۔ جہاں ایک مقامی قبیلہ کے سردار نے بیچ بچاؤ کر کے ان دونوں جماعتوں کو لڑنے سے باز رکھا۔ کاروان صحیح سلامت گزر گیا۔ حضرت حمزہؓ اپنی جماعت کے ساتھ مدینہ واپس لوٹ گئے۔

فروری ۶۲۳ء میں ساٹھ آدمیوں پر مشتمل مسلمانوں کی ایک جماعت نے قریش کے ایک اور کارواں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس کاروان کی قیادت ابوسفیان ابن حرب کر رہا تھا۔ رابغ کے مقام پر مسلمانوں نے اس کاروان کو پکڑ لیا۔ اس موقع پر بھی دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے سے لڑنے بغیر اپنا اپنا راستہ لیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ سعدؓ ابن وقاص نے جو ابتداء میں مسلمان ہونے والوں میں سے ہیں اپنا تیر قریش کی طرف پھینکا۔ یہ تیر اسلام کا پہلا تیر تھا اور سعد ابن وقاص پہلے مسلمان ہیں۔ جنہوں نے اسلام کی خاطر تیراندازی کی۔

جون ۶۲۳ء میں آنحضورؐ مسلمانوں کا ایک دستہ لیے ہوئے اس امید سے باہر نکلے

کہ قریش کے کاروان کو پکڑ لیں ۔ دشمن کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ نبی کنانہ کی ایک شاخ بنی حمزہ کے کچھ لوگ مسلمانوں کو مل گئے ۔ آنحضورؐ بجائے اس کے کہ اس جماعت کے لوگوں سے لڑتے، آپ نے ان لوگوں سے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔ ان کے سربراہوں کو اپنا حلیف بنا لیا۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ آنحضورؐ لڑائی کو ناپسند کرتے تھے ۔ آپ کے میٹھے بول اور اخلاقِ حسنہ نے اسلام کی جس بہترین طریقے سے خدمت کی اور اس کو پھیلایا وہ تلوار کے بس کی بات نہیں تھی۔

پندرہ دن تک آنحضورؐ اور آپ کے ساتھی مدینہ سے اور اپنے اپنے گھروں سے باہر رہے ۔

جون اور اکتوبر ۶۲۳ء کے دوران تین تین چار چار آدمیوں کی ایک جماعت قریش کے کاروانوں کی تلاش میں مدینہ سے باہر جاتی تھی اور خالی ہاتھ واپس آتی تھی ۔

نومبر ۶۲۳ء میں کچھ بدوی مدینہ کے اونٹوں پر ڈاکہ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے قریش کی دونوں جماعتیں یعنی مکہ کے بت پرست اور مدینہ کے مہاجرین ایک دوسرے سے بدلہ لینے کے لیے بہت ہی بے چین تھے ۔ مدینہ کے انصار کو ان کی آپس کی اس چپقلش سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انہوں نے ابتدا ہی سے اپنے آپ کو اس سے الگ رکھا۔

مسلمان یہ محسوس کرنے لگے کہ بدوی قبیلوں کے تعاون اور مدد کے بغیر قریش کے کاروانوں کو روکنا یا ان پر حملہ کرنا ناممکن ہے ۔ اُس زمانے میں طریقہ تھا کہ ہر قبیلہ یہ ذمہ داری لیتا تھا کہ اس کے اپنے حدود سے کاروان بہ سلامتی تمام آگے بڑھے گا اور کسی بھی کاروان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ قبیلوں کی یہ ذمہ داری کاروانوں کی حفاظت کا مؤثر طریقہ سمجھی جاتی تھی۔ مسلمان اس وقت تک کاروانوں پر حملہ نہیں کر سکتے تھے جب تک کہ وہ مقامی قبیلوں کو اپنی طرف نہ کر لیں ۔ یہی وجہ تھی کہ آنحضورؐ نے بنی ضمرہ

ے دوستی کا معاہدہ کیا تھا۔ یہ معاہدہ قریش اور مسلمان کے تنازعات کے سلسلے میں ایک بہت
را قدم تھا۔

ستمبر ۶۲۳ء میں آنحضورؐ ڈیڑھ سو آدمیوں کا ایک دستہ لے کر مکہ سے شام جانے والے
قریش کے ایک قافلے کو گھیرنے کے لیے ذی العشیرہ تک گئے۔ جس کاروان کے تعاقب
میں یہ دستہ نکلا تھا وہ کاروان اس مقام سے آگے نکل چکا تھا۔ آنحضورؐ نے اس موقع کو
ضائع ہونے نہیں دیا۔ ایک مقامی قبیلہ مدلج سے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔

اس قسم کے حملوں کا مسلمانوں کو کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے منصوبوں
کو راز میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ جب کبھی وہ اس کام کے لیے آپس میں جمع ہوتے ان میں
ہر شخص یہ جان لیتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ آنحضورؐ نے ان خامیوں کو محسوس کیا اور
دوسری دفعہ چھاپہ مارنے کے منصوبہ کو راز میں رکھا۔

نومبر ۶۲۳ء میں ۸ مسلمانوں پر مشتمل ایک جماعت عبداللہؓ ابن جحش کی سرکردگی میں
اس کام کے لیے روانہ ہوئی۔

آنحضورؐ نے ایک خط عبداللہؓ کے حوالے کیا اور فرمایا کہ جب تم مشرق کے راستے پر روانہ
ہو تو دو دن بعد اس خط کو کھول کر اس کی تحریر پڑھنا۔ عبداللہؓ نے ایسا ہی کیا۔ خط میں لکھا
تھا کہ اپنی جماعت کے ساتھ نخلہ کی طرف جاؤ۔ طائف سے مکہ جانے والے راستے پر قریش
کے کاروان کو پکڑو۔ اگر اس کاروان کا تعاقب پیچیدگی اختیار کرے تو یہ کہا جائے کہ ہم
تو محض کاروان اور اہل کاروان کو دیکھنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ ابھی یہ لوگ اپنے بتائے
ہوئے مقام پر پہنچے ہی تھے کہ چار آدمیوں پر مشتمل ایک کارواں مکہ کی طرف جا رہا تھا۔ ان
کے ساتھ طائف کی پیداوار تھی۔ کشمش، چمڑا، شراب وغیرہ۔ یہ رجب کا آخری دن تھا۔
رجب عربوں کے ہاں ایک مقدس مہینہ سمجھا جاتا تھا۔ لڑائی جھگڑا کرنا اس مہینہ میں نہ صرف
ایک عیب بلکہ گناہ سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کر کے اس کاروان پر حملہ کر

Marfat.com

دیا۔ کاروان کا ایک آدمی عبداللہ ابن حضرمی مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ان میں سے دو گرفتار ہوئے۔ ان میں ایک فرار ہو گیا۔ کاروان کا سارا سامان مالِ غنیمت کے طور پر مدینہ لایا گیا۔

مسلمانوں نے عربوں کے مقدس مہینے کی بے حرمتی کی تھی۔ عرب سال میں چار مہینوں کو مقدس سمجھتے تھے۔ ان مہینوں میں قتل و غارت کرنا حرام سمجھا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں جہاں قتل و خون کے سلسلے دوامی طور پر چلتے رہتے ہیں ان چار مہینوں کی تخصیص عام لوگوں کے لیے ایک سکون اور اطمینان کا باعث بنتی تھی۔ ان لوگوں کو ان مہینوں میں اپنی جان محفوظ نظر آتی تھی۔ مال کے لٹنے کا ڈر نہیں رہتا تھا۔ اس مہینے کی بے حرمتی مدینہ کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے ایک سانحہ تھی۔ سب کے سب اس واقعہ سے رنجیدہ ہوئے۔ مدینہ میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ اس بات کا تصفیہ کرنا ہمارے لیے مشکل ہے کہ آیا آنحضورؐ نے رجب کے مہینے کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا تھا یا جب اس کام کا حکم دیا تھا اس مہینہ کی حرمت آپ کے ذہن میں نہیں تھی وہ لوگ جب مالِ غنیمت لے کر واپس آئے تو آنحضورؐ نے اپنا حصّہ جو کل مالِ غنیمت کے پانچویں حصّہ پر مشتمل تھا۔ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک بات اور بھی قابلِ تجسس ہے کہ آنحضورؐ نے اپنے بند لفافے میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ اُن آٹھ آدمیوں کی جماعت میں سے جو شخص حملہ میں حصّہ لینا چاہے وہ بخوشی مدینہ واپس جا سکتا ہے کیا آپ نے اپنے حکم میں اس بات کی گنجائش رکھی تھی کہ اس جماعت کے لوگ جو رجب کے مہینہ کی حرمت کے خیال سے لڑنا نہ چاہیں وہ واپس آ جائیں یا انسانی کمزوری پیش نظر تھی کہ اس لیے سفر سے اگر کوئی تھک جائے اور آگے بڑھنا نہ چاہے تو وہ واپس روانہ ہو جائے۔

اُن آٹھوں میں سے کوئی بھی مدینہ واپس نہیں ہوا۔ البتہ دو آدمی غائب ہو گئے

Marfat.com

کچھ دن بعد مدینہ آکر کہنے لگے کہ ان کی سواری کے اونٹ غائب ہو گئے تھے۔ اسی لیے وہ سب کے ساتھ واپس نہ ہو سکے۔ مدینہ کے مسلمان جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کشش و پنج میں مبتلا تھے حتی کہ آنحضورؐ پر وحی نازل ہوئی ۔ سورۂ بقر کی ۲۱۷ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے

"اے محمدؐ، لوگ آپ سے مقدس مہینوں میں لڑائی کرنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ ان میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور وہ اللہ کی راہ سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ میں جانے) سے (بند کرنا) اور اہل مسجد کو اس میں سے نکال دینا (جو یہ کفار کرتے ہیں) اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ (گناہ) ہے اور فتنہ انگیزی خون ریزی سے بھی بڑھ کر ہے اور یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ اگر بس چلے تو آپ کو آپ کے دین سے پھیر دیں اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر کر کافر ہو جائے گا اور کافر ہی مرے گا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں برباد ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں، جس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

مقدس مہینہ کی حرمت کا ضرور ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کی اہمیت اس وقت باقی نہیں رکھی گئی جب کہ قریش کے جرائم سے مسلمانوں کو سابقہ پڑ رہا تھا۔

مسلمانوں کے ہاتھوں پہلا خون جو بہا وہ عبد اللہ ابن حضرمی کا تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں رجب کے حرمت والے مہینے میں عبد اللہ مارا گیا۔ بد قسمتی سے عبد اللہ مکہ کی مشہور اور با اثر شخصیت عتبہ ابن ربیعہ کا حلیف تھا۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری عتبہ نے لے رکھی تھی۔

مضبوط لوگ کمزوروں کو پناہ دیا کرتے تھے۔ اپنے فرض کو پوری طریقہ سے بناتے تھے۔ لوگوں کو پناہ دینا اور پناہ دیے ہوئے لوگوں کا مارا جانا عربوں میں اکثر جنگ و

جدال کا باعث ہوا کرتا تھا۔ اس قتل کے نتیجہ کے طور پر عتبہ ابن ربیعہ نے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔

کاروان پر قبضہ اور عبداللہ کا قتل ان دونوں باتوں نے مکہ کے لوگوں اور مسلمانوں کے درمیان بہت بڑی کشیدگی پیدا کر دی۔ اس کا نتیجہ ایک کھلی جنگ کی صورت میں سامنے آیا۔

۶۲۳ء کی خزاں کا زمانہ تھا۔ قریش کا سالانہ تجارتی قافلہ مکہ سے شام کی طرف جا رہا تھا۔ مدینہ کے مغرب سے بحر احمر کے کناروں سے ہوتا ہوا یہ قافلہ آگے بڑھ گیا۔ یہ کارواں ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل تھا۔ بہت ہی قیمتی اور انمول تجارتی سامان سے سارے اونٹ لدے ہوئے تھے۔ کارواں کی قیادت ابوسفیان کر رہا تھا۔ یہ مکہ کا ایک بااثر لیڈر تھا۔ مکہ میں حضورؐ کے مخالفین میں پیش پیش رہا کرتا تھا۔ مسلمان اس دفعہ اس کارواں کو پکڑنے میں ناکام رہے۔

امید یہ تھی کہ یہ کارواں جنوری ۶۲۴ء میں دمشق سے واپس ہو گا۔ آنحضورؐ نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کاروان کو پکڑ کر رہیں گے۔ اس کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا وہ اپنی نوعیت سے بہت ہی اہم تھا۔ سارے مکہ کی سالانہ آمدنی کا ایک بیشتر حصہ اس کاروان کے قبضے میں تھا۔ گو مکہ کے امیر تاجروں کا حصہ اس کارواں میں زیادہ تھا۔ لیکن مکہ کے عام لوگ بھی کچھ نہ کچھ سامان اس کاروان کے حوالے کرتے تھے تاکہ اس کی فروخت سے ان کو فائدہ ہو اور اس آمدنی سے ان کا سال بھر کا خرچ چلتا رہے اگر مسلمان اس سالانہ کاروان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو سارے مکہ کی سال بھر کی دولت راتوں رات ان کے قبضے میں آجاتی اور دولت پر قبضہ جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کا ایک بڑا سبب بن جاتا۔

ناتجربہ کاری کی وجہ سے مسلمان اپنے اس منصوبے کو راز میں نہ رکھ سکے۔ کسی طریقہ

Marfat.com

سے اس منصوبہ کی اطلاع ابوسفیان کو ہو گئی۔ ابوسفیان اس وقت زرقہ میں تھا۔ زرقہ شام سے جنوب کی طرف تقریباً سو میل دور ہے۔ یہ مقام آج کل اردن کی سلطنت کا ایک حصہ ہے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی ابوسفیان نے ایک تیز اونٹنی سوار کو فوراً مکہ روانہ کیا۔ قریش کو کہلا بھیجا کہ کاروان کی مدد اور حفاظت کے لیے ایک مسلح دستہ فوری روانہ کیا جائے جو اس کاروان کو بہ حفاظت تمام شام سے مدینہ کے راستے مکہ لے جائے۔

۸ مارچ ۶۲۴ء کو آنحضورؐ تین سو تیرہ مسلمانوں کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ ان ۳۱۴ میں ۸۳ مہاجرین تھے اور ۲۳۱ انصار۔ مسلمانوں کی غربت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۳۱۴ آدمیوں کے لیے صرف ۷۰ اونٹ اور دو گھوڑے تھے۔ تین تین چار چار آدمی باری باری سے اونٹ پر سوار ہوا کرتے تھے۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ ابن حارثہ کو اپنا ساتھی بنا لیا تھا۔ ان تینوں حضرات کا ایک ہی اونٹ تھا۔ صحرائے عرب میں اس قسم کی بے سروسامانی مسلمانوں کے لیے ایک کڑا امتحان تھی۔

اس دفعہ مسلمانوں کو مدینہ سے صرف ۸۰ میل ہی دور جانا پڑا۔

اُدھر ابوسفیان کا قاصد تیزی سے مکہ پہنچ گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ جیسے ہی وہ مکہ پہنچا اپنے اونٹ کو لے کر سیدھے کعبہ کی دیواروں تک پہنچ گیا۔ اونٹ پر کھڑے ہو کر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ جو اس بات کی علامت تھی۔ زور زور سے چلانے لگا کہ اے قریش کاروان، کاروان۔ محمدؐ اور ان کے ساتھی تمہاری دولت کو جو تم نے ابوسفیان کے قبضے میں دے رکھی ہے لوٹنے کے لیے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں۔ تم وقت پر ابوسفیان کی مدد نہیں کر سکو گے۔ مدد۔ المدد۔

اس کے اس اعلان نے عربوں پر ایک دھماکے جیسا اثر کیا۔ لوگ دائیں، بائیں آگے پیچھے دوڑنے لگے۔ ہتھیاروں کو اکٹھا کرنے لگے۔ ایک آدمی نے جو خاموشی سے پیچھے کھڑا تھا اور بعض مجبوریوں کی وجہ سے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے خود نہ جا سکتا تھا دوسرے

Marfat.com

آدمی کو اُجرت دے کر اپنا قائم مقام بنا کر لڑنے کے لیے روانہ کیا۔

حضورؐ کے جانی دشمن اور رشتہ میں چچا ابولہب نے بھی اُجرت دے کر کسی اور کو ابوسفیان کی مدد کے لیے روانہ کیا۔

اُمیہ ابن خلف بوڑھا بھی تھا اور موٹا بھی۔ گھوڑے یا اونٹ پر اپنی فربہی کی وجہ سوار نہ ہو سکتا تھا۔ اس ہنگامہ کے دوران شہر کے چوراہے پر اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا اس کو اس اطمینان سے بیٹھا دیکھ کر مکہ کے ایک دوسرے آدمی نے اُسے عطر پیش کیا اور کہا کہ اپنے آپ کو معطر کر لو اور عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھ کر سولہ سنگھار کرتے رہو۔ بوڑھے کی حمیت جوش میں آئی۔ اس نے اپنے آپ کو لڑنے والوں کی حمایت میں مرنے کے لیے شامل کر لیا۔

آنحضورؐ مدینہ سے باہر نکل گئے۔ جنگ کا علم مصعبؓ ابن عمیرؓ اٹھائے ہوئے تھے وہ تمام لوگوں کے آگے آگے چل رہے تھے۔ یہ اسلام کا پہلا علم تھا۔ مصعب ابن عمیر اسلام کے پہلے علمبردار ہیں۔

حضورؐ کے بالکل آگے دو کالے جھنڈے تھے۔ ایک علیؑ ابن ابی طالب تھامے ہوئے تھے اور دوسرا جھنڈا کسی انصاری کے ہاتھ میں تھا۔ مسلمانوں کا منشاء یہ تھا کہ کارواں والوں کو پریشان اور خوف زدہ کریں۔ قریش کا کاروان بدر کے مقام پر اپنے اونٹوں کو پانی پلانے میں مصروف تھا۔ مسلمانوں نے دو مقامی قبیلوں کے آدمیوں کو کارواں تلاش کرنے کے لیے پہلے ہی سے روانہ کر دیا تھا۔

یہاں یہ بات پھر دہرائی جاتی ہے کہ مکہ اور مدینہ کے لوگ راستوں کی تلاش اور رہنمائی کے لیے بدویوں کو استعمال کرتے تھے اور معاوضے پر ان کی خدمات حاصل کر لیتے تھے۔

ان دونوں بدویوں نے کنویں کے قریب اپنے اپنے اونٹوں پر سے پانی کی مشکیں

Marfat.com

نکالیں تاکہ ان میں پانی بھر لیں۔ کنویں پر دو مقامی لڑکیاں بھی پانی بھر رہی تھیں۔ ان کے علاوہ جہینہ کا ایک آدمی بھی اسی کام میں مشغول تھا۔ دونوں بدوی جب اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے تو انہوں نے اُن دونوں لڑکیوں کو آپس میں بات کرتے سنا کہ قریش کا کاروان پانی لینے کے لیے کل پھر اس کنویں پر آئے گا۔ جیسے ہی بدویوں نے لڑکیوں کی اس بات کو سُنا فوراً حضورؐ کی خدمت میں واپس ہوتے اور اس خبر کو گوش گزار کر دیا۔

شمال کی طرف سے کاروان پانی کے لیے اس کنویں پر پہنچ رہا تھا۔ ابوسفیان بڑا پریشان تھا۔ اُس کو یقین تھا کہ مسلمانوں کو کاروان پر حملہ کرنا ہی ہے تو ان کے لیے بدر کے کنویں سے بہتر اور کوئی مقام نہیں ہو سکتا۔ اس کو ابھی تک مکہ سے ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی کہ اس کی مدد کے لیے لوگ آ بھی رہے ہیں یا نہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود ہی تن تنہا بدر کے کنویں تک جائے۔ جب وہ بدر پہنچا تو اس کو جہینہ کا وہی آدمی نظر آیا جو اس وقت بھی وہاں تھا جب کہ مسلمانوں کے روانہ کردہ دو بدوی کنویں پر پانی لینے گئے تھے۔ ابوسفیان نے بدوی سے دریافت کیا کہ تم نے یہاں کسی اور کو بھی دیکھا ہے؟ بدوی نے جواب دیا کسی خاص آدمی کو نہیں۔ البتہ یوں ہی دو اونٹ سوار کچھ دیر پہلے یہاں آکر پانی کے مشکیزے بھر کر واپس ہوئے ہیں۔

ابوسفیان اُن دونوں اونٹ سواروں کے اونٹوں کے پیر کے نشان جدھر جدھر پڑے تھے ان کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جب اُس نے اونٹوں کی مینگنیاں دیکھیں تو اُسے اپنے ہاتھ میں اٹھا کر ملنے لگا اُسے اس میں کھجوروں کے بیج ملے جسے اونٹ ہضم نہیں کر سکے تھے۔

بدویوں میں آج بھی یہ طریقہ ہے کہ اونٹ کے فضلہ کو دیکھ کر وہ پہچان لیتے ہیں کہ اونٹ کی قسم کیا ہے اور کہاں کا ہے۔ بدویوں کے ساتھ رہنے والے اونٹ گھاس پات پر اپنی گزر کرتے ہیں۔ شہر میں رہنے والے اونٹوں کو کھجور کھلاتے جاتے ہیں جب

Marfat.com

فضلہ میں سے کھجور کے بیج نکل آئے تو ابو سفیان سمجھ گیا کہ اونٹ بدویوں کے نہیں ہو سکتے اونٹ یقیناً مدینہ کے ہیں۔ اونٹ سوار بدوی نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کے خبر رساں ہیں۔

جلدی سے اپنے اونٹ پر سوار ہو کر اونٹ کو ایسا سرپٹ دوڑایا کہ سیدھے اپنے کاروان پر پہنچ کر ہی دم لیا۔ مغرب کی طرف سے سمندر کے ساحل سے ہوتے ہوئے بغیر کہیں رُکے ہوئے اپنے اونٹ کو دوڑاتا رہا۔ رات بھر اپنے سفر کو جاری رکھا مسلمان مشرق کی طرف سے آگے بڑھ رہے تھے۔ مقام صفرا سے گزرنے کے بعد حضورؐ نے اپنی جماعت کو رُک جانے کا حکم دیا۔ یہاں پر مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ قریش کے لوگ کاروان کی حفاظت اور اس کو اپنی نگرانی میں لے جانے کے ارادے سے مکہ سے نکل چکے ہیں۔ آپ کو ابوسفیان کی نقل و حرکت کی اطلاع نہ مل سکی۔ تمام مسلمانوں کو اکٹھا کر کے صورت حال پر روشنی ڈالی۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور مہاجرین نے باتفاق اپنی خدمات پیش کیں اور کہا کہ حضورؐ جو بھی فیصلہ کریں وہ فیصلہ ان تمام کے لیے قابلِ قبول ہوگا اور ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔

انصار کے متعلق حضورؐ کو تشویش تھی۔ عقبہ کی دوسری بیعت کی رو سے انصار صرف اُسی صورت میں دوسروں سے لڑ سکتے تھے۔ جب کہ لڑائی مدافعت کے لیے ہو۔ یہاں پر حضورؐ کو تشویش اس لیے تھی کہ انصار نے اس سے پہلے کبھی یہ معاہدہ نہیں کیا تھا کہ وہ حملہ آور کی حیثیت سے قریش کے کاروان پر قبضہ کریں گے۔ کاروان والوں سے مدینہ سے اَسّی میل دور جا کر لڑیں گے۔

انصار سے حضورؐ مخاطب ہوئے۔ اس سلسلے میں ان کی رائے مانگی۔ ایک انصاری حضرت سعد ابن معاذؓ (جو بنی اوس کے سردار تھے) نے بڑے ہی جوش و خروش سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول۔ آپ پر ہمارا ایمان ہے۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے ہمیں حق سے روشناس کروایا۔ ہم آپ سے آپ کی اطاعت کا عہد کر چکے ہیں۔ آپ اگر سمندر

میں چھلانگ لگائیں تو ہم بھی آپ کی پیروی میں کود پڑیں گے۔ ہم آپ کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے ہر طرح سے تیار ہیں۔

مدینے کے لوگوں سے اس قسم کی ہمت افزاء اور اطاعت گزاری کی بات سن کر حضورؐ کو یک گونہ اطمینان ہوا۔ جواباً فرمایا کہ مردانہ وار آگے بڑھو، اللہ کا وعدہ ہے کہ دو جماعتوں میں سے ایک ضرور ہمارے ہاتھ لگے گی۔ اس کے بعد مسلمانوں کی جماعت اور آگے بڑھی۔ چھ سات میل دور جانے کے بعد بدر کے چشموں کے قریب ان لوگوں نے اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔ دوسری دو جماعتیں یعنی کاروان اور مکہ کے قریش بھی اسی طرف رواں دواں تھے۔ ان تینوں جماعتوں میں سے کسی بھی جماعت کو ایک دوسرے کی نقل و حرکت کا علم بالکل نہیں تھا۔

اندھیرا ہو جانے کے بعد جاسوسی کے لیے ایک مختصر سی جماعت بدر کے کنوؤں کی طرف روانہ کی گئی۔ اس جماعت نے چند اونٹ سواروں کو کنویں سے پانی لیتا ہوا پایا۔ مسلمانوں کی اس جماعت نے دو اونٹ سواروں کو گرفتار کیا اور انہیں حضورؐ کی خدمت میں لے گئے تاکہ ان سے پوچھ گچھ کی جا سکے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کا تعلق اسی جماعت سے ہے جو کاروان کی حفاظت کے لیے مکہ سے روانہ ہوئی تھی۔ یہ لوگ بدر کے جنوب میں دو یا تین میل دور اپنا پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے تفتیش کے دوران مزید اس بات کا انکشاف ہوا کہ مکہ سے آئے ہوئے لوگوں کی تعداد ایک ہزار آدمیوں پر مشتمل ہے۔ قریش کے تمام بڑے سردار اس میں شامل ہیں۔ یہ تفصیلات مسلمانوں کے لیے حوصلہ شکن ثابت ہوئیں۔ وہ تو یہ خیال کر رہے تھے کہ کاروان پر راتوں رات قبضہ کر کے بے انتہا دولت کے مالک ہو جائیں گے اور ان کو کاروان کے صرف تیس یا چالیس آدمیوں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔

جیسے ہی ابوسفیان نے اپنے آپ کو خطرے سے باہر پایا اس نے اپنا قاصد قریش

Marfat.com

کے ہاں روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ وہ معہ اپنے کاروان کے بحفاظت تمام بدر سے آگے بڑھ چکا ہے۔ جب قریش کو ابوسفیان کی یہ رپورٹ ملی تو اکابرین قریش میں پھر اختلاف ہو گیا اور دو نقاط نظر پیش کیے گئے۔

قبائلیت ان لوگوں کو لڑنے سے روک رہی تھی اس لیے کہ انہی قبائل کے اکثر لوگ مہاجرین میں شامل تھے۔ وہ اپنے ہی قبیلے کے افراد کی قتل و غارت گری نہیں چاہتے تھے۔ مہاجرین مکہ کے بُت پرست قبیلوں ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ بت پرست اپنے ہی خاندان کے مسلم افراد کا خون نہیں بہانا چاہتے تھے۔

حضورؐ کی والدہ محترمہ جس قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں یعنی بنی زہرہ وہ سارے کا سارا قبیلہ مکہ واپس ہو گیا۔ ابو طالب کے سب سے بڑے لڑکے طالب بھی بنی ہاشم کے لوگوں کو لے کر مکہ چلے گئے۔ عمرؓ بن خطاب کے رشتہ دار بنی عدی ابن کعب بھی مکہ چلے گئے ربیعہ کے بیٹے عتبہ اور شیبہ دونوں قریش کے بڑے سرداروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ یہ مکہ کے معززین اور قابل اعتماد شہریوں میں تھے۔ عتبہ نے قتل و غارت گری اور لڑائی کی مخالفت اس خیال سے کی کہ اپنے ہی قبیلے کے لوگ مارے جائیں گے چاہے وہ قریش کے بُت پرست ہوں یا مسلمان۔

یہاں یہ بات ذہن میں تازہ کی جائے کہ عبداللہ بن حضرمی جس کی حفاظت کا عتبہ نے ذمہ لیا تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں نخلہ میں قتل ہوا تھا۔ عبداللہ کا بھائی عامر حضرمی عتبہ کو طعنہ دے رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اُسے جوش دلا رہا تھا کہ عتبہ اس کے بھائی کے قتل کا بدلہ لے اور مسلمانوں سے لڑے۔

حضورؐ کا جانی دشمن ابوجہل بڑا ہی کڑیل، صحت مند اور توانا آدمی تھا لڑائی پر شدت سے مصر تھا۔ اس کا شدید اصرار تھا کہ مسلمانوں سے بہر حال جنگ کی جائے۔ اس کے اصرار اور ضد نے قریش کو اس بات پر راضی کر لیا کہ مسلمانوں سے جنگ کی

Marfat.com

جاتے۔ یہ لوگ جنگ کے ارادے سے بدر کی طرف بڑھنے لگے۔

جہاں قریش کے لوگوں میں اپنے خون، قبیلہ اور خاندان کا پاس و لحاظ تھا اور اسی بنا پر وہ مسلمانوں سے لڑنا پسند نہیں کر رہے تھے وہیں مسلمانوں کے نزدیک خون، قبیلے اور خاندان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔

بنیادی طور پر آنحضورؐ نے قبائلی وفاداری کے تصور کو سرے سے ختم ہی کر دیا تھا۔ ان تمام پرانی وفاداریوں کی جگہ ایک نئی وفاداری کا تصور پیش کیا اور وہ وفاداری تھی اسلام سے۔ اپنے آپ کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے وقف کر دینا اب وفاداری کا تقاضا تھا۔ اس نئے تصور کو جوشیلے مسلم نوجوانوں نے صدقِ دل سے قبول کیا تھا۔

مسلمانوں کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ جب سے انہوں نے وطن چھوڑا غربت و ناداری ان کا پیچھا کرتی رہی۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جن کے بیوی بچے ابھی تک مکہ میں زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ اپنے خاندان کے افراد کو مکہ میں چھوڑنے پر یہ لوگ مجبور ہو گئے تھے۔ سوائے تلوار کے اب دنیا میں ان کے لیے کوئی اور کشش باقی نہیں رہی تھی۔ مال و دولت، جائداد اور اثاثہ، بیوی بچے سب کچھ ان سے چھن چکے تھے۔ ان کو ان تمام مظالم کا بدلہ لینا تھا۔

مسلمان آگے بڑھ کر کنوؤں کے شمال مشرق میں جا کر رک گئے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ مسلمان حضورؐ کے احکام وحی میں اور حضورؐ کی ذاتی رائے میں کافی فرق کرتے تھے۔ وحی کے احکام کی تعمیل کو فرض سمجھتے تھے اور حضورؐ کی ذاتی رائے سن کر مشورہ دیتے اور سب کے مشورہ سے کسی بھی کام کی تکمیل ہوتی تھی۔

حضورؐ نے مسلمانوں کو جب اسی جگہ رک جانے کا مشورہ دیا تو حباب ابن منذرؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کیا اللہ نے آپ کو اس جگہ رک جانے

Marfat.com

کا حکم دیا ہے یا یہ آپ کا اپنا فیصلہ ہے اس لیے کہ اس جگہ سے فتح کی صورت میں نہ ہم آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ ہی شکست کی صورت میں پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔

جب حضورؐ نے فرمایا کہ یہاں ٹھہرنے کا فیصلہ میرا اپنا ہے تو حباب ابن منذر نے مشورہ دیا کہ مسلمانوں کو اور آگے بڑھنا چاہیئے اور آگے بڑھ کر کنوؤں پر قبضہ کر لینا چاہیئے۔ اس صورت میں دشمنوں کو پانی کے استعمال سے روکا جا سکتا ہے جب کہ مسلمان اپنی ضروریات کے لیے جتنا پانی چاہیں استعمال میں لا سکتے ہیں۔

حضورؐ نے حباب ابن منذر کے اس مشورہ کو قبول فرمایا۔ مسلمانوں نے آپؐ کے لیے ایک چھوٹا سا سائبان تیار کیا جس پر کھجور کے پتے ڈال دیئے اس سائبان کے عقب میں آپ کا اونٹ باندھ دیا گیا۔

حضرت سعد ابن معاذؓ نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر تم لوگوں کو اس میدان میں شکست ہو تو اپنے اونٹوں پر سوار ہو کر مدینہ کا رُخ کر سکتے ہو۔ اسی لمحہ مسلمانوں نے دیکھا کہ قریش کا لشکر پہاڑی پر سے نیچے اتر رہا ہے اور کنوؤں کی طرف بڑھ رہا ہے۔

۱۵ مارچ ۶۲۴ء سورج ابھی طلوع ہی ہو رہا تھا کہ حضورؐ نے دیکھا کہ دشمن کا لشکر آگے بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ آپ نے جذباتی انداز میں فرمایا کہ اے اللہ قریش کے لوگ بڑے ہی غرور و تکبر اور شان و شوکت کے ساتھ تجھ سے لڑنے یہاں آئے ہیں اور تیرے رسول اور پیغمبر کو جھٹلانا چاہتے ہیں میرے اللہ اپنے وعدہ کے مطابق میری مدد فرما۔ ان کو آج کے آج تباہ و برباد کر دے۔"

اب مسلمان اور کافر آمنے سامنے تھے۔ عربوں کی لڑائی کی رسم کے مطابق ایک آدمی دوسرے کو پکارتا تھا اور دو بہادروں کے درمیان لڑائی ہوتی تھی۔

حضورؐ نے مسلمانوں کی صفیں سیدھی کیں۔ مسلمانوں کا رُخ مغرب کی طرف رکھا سورج

جو ابھی طلوع ہو رہا تھا مسلمانوں کی پشت پر تھا۔ سورج کی تیز شعاعوں سے کافروں کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ یہ جب آگے بڑھ رہے تھے تو ان کا رخ سورج کی طرف تھا۔

ساتویں صدی کے عربوں کے لیے یہ بات افتخار کا باعث تھی کہ ان کا کمانڈر اپنے مخالف فوج کے کمانڈر کو لڑنے کی دعوت دے۔ اس کام کے لیے قریش کا سپہ سالار عتبہ جو بذاتِ خود لڑائی کے خلاف تھا آگے بڑھتا ہے اس کی سیدھی طرف اس کا بھائی شیبہ اور بائیں طرف اس کا بیٹا ولید ہیں۔ یہ تینوں للکار کر مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے میں سے تین آدمیوں کو لڑنے کے لیے میدان میں بھیجوائیں۔ انصار میں سے تین حضرات اس للکار کے جواب میں آگے بڑھتے ہیں۔ قریش ان سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کون ہیں؟

جب انصار اپنا تعارف کرواتے ہیں تو عتبہ جواب دیتا ہے کہ تم تو سادہ لوح اور شریف لوگ ہو۔ ہم اپنے آدمیوں یعنی مہاجرین سے لڑنا چاہتے ہیں۔ پھر چیخ کر کہتے ہیں کہ محمدؐ ہم سے لڑنے کے لیے ہماری برابری کے اور ہمارے اپنے قبیلے کے لوگوں کو آگے کرو۔

حضورؐ اپنے چچا حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ ابن ابی طالب اور حضرت عبیدہؓ ابن حارث کو طلب کرتے ہیں۔ عبیدہؓ ایک ادھیڑ عمر کے مسلمان تھے۔ حضرت علیؓ حضورؐ کے داماد یعنی سیدہ فاطمہؓ کے شوہر ہیں۔

عبیدہؓ عتبہ سے لڑنے لگے۔ دونوں کی تلواریں خوب خوب چلتی رہیں۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ تلوار چلانے میں اپنی مثال آپ تھے۔ حضرت حمزہؓ نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے حریف شیبہ کو قتل کر دیا۔ علیؓ ابن ابی طالب کی تلوار نے ولید کا کام تمام کر دیا۔ عبیدہؓ سخت زخمی حضورؐ کی خدمت میں لائے گئے۔ عبیدہؓ نے سوال کیا "اے اللہ کے رسول۔ کیا میں شہید نہیں ہوں؟" حضورؐ نے جواب دیا "بے شک تم شہیدوں میں

Marfat.com

ہو۔ حضورؐ کا یہ کہنا تھا کہ عبیدہ کے چہرہ پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ان کی روح قفسِ عنصری سے عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔

قریش کے سرداروں کا خاتمہ اب ان کی پست ہمتی، اخلاقی انحطاط اور زوال کا باعث بن رہا تھا۔ حضورؐ نے یہ فرمادیا تھا کہ اللہ مسلمانوں کی طرف سے خود لڑ رہا تھا مکہ کے بہت سے لوگ خوف زدہ ہو رہے تھے کہ ان کے مخالفین یعنی مسلمانوں کو ایک غیبی طاقت اور ان دیکھی مدد حاصل ہے حضورؐ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لیے اپنے سائبان کی طرف لوٹے۔ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ پروردگار اگر آج یہ تیرے جانثار، وفادار اور نام لیوا بندوں کا خاتمہ ہو جاتے تو اس دنیا میں تیرا نام لینے والا پھر کوئی نہیں رہے گا۔" حضرت ابوبکرؓ تھوڑی دیر خاموش رہے پھر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول۔ آپ کی بار بار کی التجائیں شاید اللہ کو ناگوار گزریں۔ اللہ تو آپ کی مدد کا وعدہ فرما چکا ہے"۔ حضورؐ اپنے سائبان سے پھر میدان کی طرف گئے۔ مسلمانوں سے فرمایا کہ آج کے دن اللہ کی راہ میں جو بھی مارا جائیگا سیدھا جنت میں جائیگا"۔ ایک جوان آدمی نے جو حضورؐ کے قریب کھڑا کھجور کھا رہا تھا، سوال کیا کہ میرے اور جنت کے درمیان صرف موت ہی حائل ہے؟ وہ موت جو کافروں کے ہاتھوں واقع ہو"۔ حضورؐ نے فرمایا "ہاں"

کھاتے ہوئے کھجور کو پھینک کر اس نوجوان نے تلوار نیام سے نکالی اور سیدھے میدانِ جنگ کا رُخ کیا اور شہید ہونے تک لڑتا رہا۔

اب لڑائی میں شدت آچکی تھی۔ سارا میدان تلواروں سے چمک رہا تھا۔ قبیلوں کے لوگوں کو باقاعدہ جنگ کرنا کہاں آتا تھا؟ جنگ کے فن سے وہ کہاں واقف تھے؟ قریش کے لوگوں کو کافی ہزیمتیں اٹھانی پڑ رہی تھیں۔ ان کے اختیار کردہ موقف نے ان کو کئی طریقوں سے جگہ جگہ نقصان پہنچایا۔ کافروں کو مسلمانوں تک آنے کے لیے ریت

Marfat.com

میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ ریتیلی زمین ناہموار تھی۔ مسلمان ہموار اور سخت زمین پر کھڑے ہوئے تھے۔ جب کافر اپنی صفوں کو ترتیب دے رہے تھے تو ہوا کے جھونکے چلنے شروع ہوئے کہ کافروں کی آنکھوں میں ریت اڑ اڑ کر گرنے لگی۔

حضورؐ نے فرمایا: "جبریل ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ کافروں پر ٹوٹ پڑے ہیں" اچانک آپؐ نے مٹھی بھر ریت اٹھائی اور دشمنوں کی طرف پھینکتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دشمن پراگندہ ہو جائیں۔

کچھ دیر لڑائی ایسے ہوتی رہی جس میں پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کون جیت رہا ہے اور کون ہار رہا ہے۔ اب قریش پیچھے ہٹنے لگے۔ مسلمان آگے کی طرف تھے۔ اچانک دشمنوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا جس کو جو راستہ فرار کا ملتا تھا اختیار کر رہا تھا۔ جنگ کا میدان چھوڑ کر سارے کافر فرار ہو گئے۔

اندازہ کے مطابق قریش کے ۴۹ اور ستر آدمیوں کے درمیان لوگ مارے گئے اسی تعداد کے لگ بھگ گرفتار بھی ہوئے۔ مسلمانوں میں سے ۱۴ آدمی شہید ہوئے قریش کے جن لوگوں کی موت واقع ہوئی ان میں بنی مخزوم کا سردار ابوجہل بھی تھا۔ یہی وہ ابوجہل تھا جو حضورؐ کا سخت ترین دشمن تھا۔ آپؐ نے اپنے خادم کو ابوجہل کی نعش تلاش کرنے کے لیے میدان میں روانہ کیا۔ جب خادم نے ابوجہل کی نعش کا پتہ چلا لیا تو اس کا سر اس کے جسم سے جدا کر کے آپ کی خدمت میں لے آیا اور ابوجہل کے سر کو حضورؐ کے قدموں میں ڈال دیا۔ آپؐ پر رقت طاری ہو گئی۔ فرمایا "اللہ کے دشمن کا سر؟ ساری تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے، کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔"

آپ نے مسلمانوں کو تاکیداً کہا کہ قریش کے ایک سردار ابوالبختری کو کوئی قتل نہ کرے، ان کو کسی بھی قسم کا نقصان نہ پہنچائے، گو وہ بت پرست تھا لیکن مکہ میں ہمیشہ وہ ان لوگوں کو رد کا کرتا تھا جو حضورؐ کو اذیت اور نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ ایک

Marfat.com

قیدی کی حیثیت سے لائے گئے۔ ان کے ساتھ اُن ہی کے اونٹ پر ایک اور صاحب سوار تھے جن کا نام جنادہ تھا۔ جب مسلمانوں نے انہیں گرفتار کیا تو ان سے کہا کہ حضورؐ کا حکم ہے کہ انہیں قتل نہ کیا جائے۔ ابوالبختری نے کہا کہ میرے ہمسفر جنادہ کے متعلق کیا حکم ہوا ہے۔ جواب دیا گیا کہ ہم تو انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ صرف آپ کی جاں بخشی کا حکم دیا ہے۔ یہ سُن کر اس بوڑھے ابوالبختری نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو میں بھی جنادہ کے ساتھ مر جاؤں گا۔ مکہ کی عورتیں یہ طعنہ نہیں دیں گی کہ میں نے اپنے آپ کو تو زندہ رکھا اور اپنے دوست کی جان کی سلامتی کو بھول گیا۔

بوڑھے اور موٹے امیہ ابن خلفؓ جن کو مکہ کے بازار میں عطر پیش کیا گیا تھا اب حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے قیدی بنے ہوئے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ اور اُمیہ بچپن کے دوست تھے۔ ان دو دوستوں کو اسلام نے جدا کر دیا تھا۔ عبدالرحمٰنؓ کو اُمیہ نے اپنی تلوار پیش کی جس کو حضرت عبدالرحمٰن نے قبول کر لیا۔ وہ اب اُمیہ کو حضورؐ کی خدمت میں لے جا رہے تھے۔ جب یہ دونوں راستہ میں تھے حضرت بلالؓ سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ حضرت بلالؓ اُمیہ کے غلام رہ چکے تھے۔ حضرت بلالؓ نے جب اسلام قبول کیا تھا اُمیہ ان کو دھوپ میں باندھ کر وحشیانہ سزائیں دیا کرتا تھا۔ جیسے ہی حضرت بلالؓ نے اپنے پرانے آقا کو دیکھا فوری اس کی طرف لپکے اور کہنے لگے اے ناہنجار خدا کے دشمن۔ اُمیہ ابن خلف۔ اگر تو زندہ رہا تو میں زندہ نہیں رہوں گا۔

یہ دیکھ کر حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن عوف نے احتجاج کیا۔ عبدالرحمٰنؓ نے کہا کہ اُمیہ تو اب میرا قیدی ہے۔ اس نے میرے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں میں نے اسے پناہ دے دی ہے۔ وہ اب میری حفاظت میں ہے۔

حضرت بلالؓ نے اس کے باوجود اپنا غصہ جاری رکھا۔ مسلسل کہتے جاتے تھے اے ناہنجار۔ اے خدا کے دشمن۔ لوگوں کو پکار کر کہنے لگے کہ اے خدا کی مدد کرنے والو۔

Marfat.com

بہت سے لوگ ان کی پکار پر جمع ہو گئے۔ سارے مجمع نے اُمیہ ابن خلف کی تکہ بوٹی کر کر ڈالی۔ عبدالرحمٰنؓ ابن عوف مُنہ تکتے رہ گئے۔

اس موقع پر اس قسم کے کئی واقعات ہوئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عرب جب کسی کو پناہ دے دیتے ہیں اور حفاظت کا ذمہ لے لیتے تھے تو کس طرح اپنے فرض کو بہادری سے پورا کرتے تھے۔ یہ اور اسی قسم کی روایات اس وقت سے لے کر آج تک کے بدوی عربوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان سارے چودہ سو سالوں میں عربوں نے اپنی روایات کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔ روایات سے انحراف صرف جنگ یا استثنائی صورتوں میں ہوا اور وہ بھی مذہبی بنیادوں پر۔ جب کبھی مذہبی رقابتیں وجود میں آئیں عربوں نے اپنی صدیوں سالہ پرانی روایات کو بالائے طاق رکھ دیا۔ مذہبی جوش اور اسلامی غیرت نے جہالت کی رسموں پر فتح پائی۔ اللہ اور اس کے احکام کی تعمیل نے اوّلیت اختیار کی۔ امیہ ابن خلف خدا کا دشمن تھا اور مسلمان خدا کے دشمن کی کیا پرواہ کرتے تھے۔

آنحضورؐ نے حکم دیا کہ ایک بڑا گڑھا کھودا جائے۔ سارے مقتول مشرکین کی لاشیں اس گڑھے میں ڈال دی جائیں۔

جب قریش کے ایک معزز اور با اثر سربراہ عتبہ کی لاش گڑھے میں ڈالی جا رہی تھی تو عتبہ کا بیٹا جو مسلمان ہو چکا تھا اور حضورؐ کے ساتھ مہاجرین میں شامل تھا، حضورؐ کے بازو کھڑا اپنے باپ کا یہ حشر دیکھ کر کچھ مغموم سا ہو گیا۔ حضورؐ نے اُن سے سوال کیا "کیا تمہیں اپنے باپ کے مرنے کا غم ہے؟" عتبہ کے مسلمان بیٹے نے جواب دیا "میں جانتا ہوں کہ میرا باپ عقلمند، شائستہ اور کئی خوبیوں کا مالک تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور مسلمان ہو جائے گا۔" "مجھے غم تو اس بات کا ہے کہ اس کی موت مشرکین کے ساتھ حالتِ کفر میں ہوئی۔"

جب سارے مشرکین کی لاشوں کو گڑھے میں پھینک دیا گیا تو فرمایا کہ اے گڑھے

Marfat.com

والو۔ تم کو اب تو یقین آ گیا ہو گا کہ خدا کا غضب تم پر نازل ہو کر رہا۔ میں نے جو پایا وہ یہ کہ میرے خدا نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو کر رہا۔"

اس اثناء میں مسلمان مالِ غنیمت کی تقسیم پر آپس میں تو تو میں میں کر رہے تھے۔ جس کسی نے جس کسی کو مارا مقتول کے ہتھیار اور اس کے ذاتی اثاثہ پر اپنا حق جتا رہا تھا۔ جو لوگ رسول اللہ کی حفاظت کر رہے تھے کسی خاص مقتول کے ہتھیاروں یا اثاثوں پر اپنا حق جتا نہیں سکتے تھے۔ میدانِ جنگ میں جا کر لڑنے والوں سے یہ لوگ اپنا حق مانگ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر آپ نے حکم دیا کہ سارا مالِ غنیمت ایک جگہ جمع کیا جائے۔ سارے کا سارا مال تمام مسلمانوں میں یکساں اور مساوی طور پر تقسیم کیا جاتے۔ آپ نے مالِ غنیمت کی تقسیم کے لیے جس طریقہ سے ابتداء کی اسی کا آگے چل کر مسلمانوں میں رواج ہو گیا۔

روانگی سے قبل قاصد مدینہ روانہ فرمائے تاکہ اہل مدینہ کو خوشخبری مل جائے پھر فتح مند فوج کو لے کر حضورؐ مشرق کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔

صفرا اور مدینہ کے درمیان اہل مدینہ کے وفد نے تمام مدینہ والوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں فتح کی مبارک باد پیش کی۔

اس قافلے میں وہ قیدی بھی تھا جس کا نام نضر ابن حارث تھا۔ یہ وہی بدبخت تھا جو مکہ میں پند و نصائح کے دوران ایرانی عشق و محبت کی داستانیں بیان کر کے سوال کرتا تھا کہ کیا میری کہانیاں آپ کے قصوں سے زیادہ دلچسپ نہیں ہیں؟ جب آپ صفرا سے آگے بڑھے تو علیؓ ابن ابی طالب کو حکم دیا کہ نضر کا سر قلم کر دیا جائے۔ اس بات کی کوئی توجیہہ نہیں کہ مسلمانوں نے جنگ کے بعد سے اب تک نضر کو کیوں باقی رکھا۔ اُسے جنگ کے فوری بعد کیوں نہ قتل کر دیا گیا۔

ذرا اور آگے بڑھنے کے بعد آپ نے ایک اور کافر عقبہ ابن ابی معیط کے قتل کا حکم

دیا۔ وہ چلانے لگا کہ میرے بعد میرے اہل وعیال کا کیا ہوگا۔ ان کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ آپ نے اس کی حرکات کے پیش نظر سرد مہری سے جواب دیا جہنم کی آگ۔

قریش کے لیڈروں کا قتل اور مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی ذلت نے عام لوگوں میں ایک عجیب ذہنی ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ آپ کی بیوی حضرت سودہؓ سے ایک روایت منسوب ہے۔ آپ مہاجرین میں کسی کے گھر پرسہ دینے گئیں۔ اس گھر کے دو افراد جنگ میں کام آچکے تھے۔ یہ اطلاع بی بی سودہؓ کو اس وقت ملی تھی جب کہ مسلمان فاتحین قیدیوں کو لے کر مدینہ پہنچ چکے تھے۔ ابن اسحاق کے بیان کے مطابق یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ پردہ کے احکام ابھی نہیں آئے تھے۔

حضرت سودہؓ پرسہ دے کر گھر آجاتی ہیں اور حضورؐ کو اپنے گھر میں پاتی ہیں دیکھتی کیا ہیں کہ ابو یزید سہیل ابن عمرو کے ہاتھوں کو ان کی گردن کے پیچھے باندھ دیا گیا ہے اور وہ ایک کونے میں کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر بی بی سودہؓ کہتی ہیں کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری آنکھیں مجھے دھوکہ دے رہی ہیں۔ مجھے اُن کی اس حالت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں نے کہا کہ ابو یزید تم نے بہت ہی آسانی سے اپنی شکست تسلیم کرلی۔ اس سے بہتر تو یہی تھا کہ تم بہادروں کی طرح مر گئے ہوتے۔

حضورؐ نے جیسے ہی بی بی سودہؓ کے یہ الفاظ سُنے ڈانٹ کر کہا کہ سودہؓ کیا تم اللہ اور اس کے رسول کے خلاف فتنہ بپا کرنے پر تلی ہوئی ہو۔

بی بی سودہؓ نے حضورؐ سے کہا کہ خدا کی قسم میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں ابو یزید کو اس حالت میں دیکھوں گی۔ جب میں نے ان کو اس حالت میں دیکھا تو بے اختیار میری زبان سے وہ الفاظ نکل گئے جن کو ابھی آپ سُن چکے ہیں۔

قرآن کے سورۂ انفال میں جنگ بدر کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے "(اے محمدؐ مجاہدین) آپ سے غنیمت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ غنیمت اللہ اور اس

کے رسول کا مال ہے۔ خدا سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو۔ اگر ایمان رکھتے ہو تو خُدا اور اس کے رسُول کے حکم پر چلو۔ جس طرح آپ کے پروردگار نے آپ کو تدبیر کے ساتھ اپنے گھر سے نکالا اس وقت مومنوں کی ایک جماعت ناخوش تھی۔ وہ لوگ حق بات میں اس کے ظاہر ہوئے بغیر آپ سے جھگڑنے لگے۔ گویا موت کی طرف دھکیلے جاتے ہیں اور اُسے دیکھ رہے ہیں۔ جب خدا نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک گروہ (مسخر) ہو جائے گا اور آپ چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے شوکت ہے وہ آپ کے ہاتھ آجائے۔ خدا چاہتا تھا کہ اپنے فرمان سے حق کو قائم رکھے۔ کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ جب آپ اپنے پروردگار سے فریاد کرتے تھے تو اس نے آپ کی دعا قبول کر لی۔ ہم ہزار فرشتوں سے جو ایک دوسرے کے پیچھے آتے جائیں گے آپ کی مدد کریں گے۔ اُس مدد کو خدا نے محض بشارت بنایا تھا کہ آپ کے دل اس سے اطمینان حاصل کریں۔ مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہے۔" بے شک خدا غالب اور حکمت والا ہے۔"

Marfat.com

یادگار تاریخیں

آنحضورؐ کا مدینہ تشریف لانا	جون ۶۲۲ء
حضرت حمزہؓ کی قیادت میں مسلمانوں کا پہلا حملہ	جنوری ۶۲۳ء
رابغ میں مسلمانوں کا دھاوا	فروری ۶۲۳ء
اسلام کا پہلا تیر۔ سعدؓ ابن ابی وقاص کی کمان سے	فروری ۶۲۳ء
بنی ضمرہ سے معاہدہ	جون ۶۲۳ء
مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے دھاوے	جون سے اکتوبر ۶۲۳ء
قبیلہ مدلج سے مسلمانوں کا معاہدہ	ستمبر ۶۲۳ء
مسلمانوں کے ہاتھوں پہلا قتل	نومبر ۶۲۳ء
پہلا کافر جو مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا	عبداللہ بن الحضرمی
یہودی قبیلوں سے معاہدہ کا ٹوٹنا	نومبر ۶۲۳ء
بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ بنانا	۶۲۳ء
ہفتہ کی بجائے جمعہ کو مسلمانوں کا اہم دن قرار دینا	۶۲۴ء
رمضان میں روزہ رکھنے کی ابتداء کرنا	جنوری ۶۲۴ء
جنگِ بدر	۱۵ مارچ ۶۲۴ء

Marfat.com

جنگِ اُحد

بدر کی فتح نے مسلمانوں کے موقف کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ان کے انداز فکر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اب وہ مستحکم اور مضبوط تھے۔ ان کے ذہنی ارتقا کا اندازہ کرنا آج ہمارے لیے بہت ہی مشکل ہے۔ بدر کی فتح نے ان میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ کل تک جو لوگ ظلم و ستم کا شکار بنے رہے اور دنیا کی نظر میں معتوب رہے۔ آج وہ اپنے آپ کو فاتحین میں پا رہے تھے۔

آنحضورؐ کے سخت ترین دشمنوں میں سوائے ابو سفیان کے سب کے سب اس جنگ میں مارے گئے۔ وہی مکہ کے لوگ جو مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے اور جن کی زندگی کا مقصد ہی مسلمانوں کو ایذا دینا تھا آج اپنے آپ کو قعر مذلت میں پا رہے تھے۔ ذلت و رسوائی کی شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اگر مسلمان اس موقع پر فتح کے نشہ میں خوب مست رہے ہوں۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ فتح اور کامیابی کی سرشاری بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ کامیابی اور فتح مندی کے نشہ کی مثالیں آج بھی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھا کرتے ہیں۔

تعجب نہیں اگر حضورؐ خود بھی اس فتح سے کافی خوش ہوئے ہوں۔ آپ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان تھے۔ حضورؐ نے کئی بار اپنی زبان مبارک سے اس بات کو کہا

ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا بعد کی ہونے والی جنگوں میں آپ نے رحم دلی اور حسن سلوک کا مظاہرہ کیا۔ بدر کے موقع پر حضورؐ کے ذہن میں وہ ساری باتیں تازہ تھیں جن کا اہل مکہ سے سابقہ پڑا تھا۔ اس کو حسن اتفاق کہیئے کہ حضورؐ کا چچا ابولہب جو بدترین دشمن تھا اور جو بدر کی لڑائی میں نہ جا سکا تھا جنگِ بدر کے چند دنوں بعد ہی مکہ میں کسی بیماری کے باعث اس دنیا سے چل بسا۔

آپ کے ایک اور چچا عباس جو بدر میں مسلمانوں کے خلاف لڑ رہے تھے گرفتار کیے گئے۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ ان کو ان کے دو بھتیجوں کو اس وقت گرفتاری کی حالت میں رکھا جائے جب تک وہ ایک بڑی رقم اپنی جان کے بدلے مسلمانوں کو نہ دے دیں۔ اس حکم کو سن کر عباس نے کہا کہ میں تو مسلمان ہو گیا تھا مگر کم بخت مکہ کے لوگوں نے مجھے آپ کے خلاف لڑنے پر مجبور کیا۔ جواب دیا کہ چچا آپ کے مسلمان ہونے کا خدا ہی کو علم ہے بظاہر تو آپ کافروں کے ساتھ مسلمانوں سے لڑ رہے تھے آپ کو فدیہ دینا ہو گا۔

جنگ کے قیدیوں میں آپ کے ایک داماد ابوالعاص ابن الربیع بھی شامل تھے۔ ان کا نکاح حضورؐ کی صاحبزادی بی بی زینبؓ سے ہوا تھا، حضرت زینب ابھی مکہ ہی میں تھیں ابوالعاص خدیجہ کے بھانجے بھی ہوتے تھے۔ بی بی خدیجہ ہی کی خواہش پر ان کا نکاح ابوالعاص سے کیا تھا۔ حضورؐ کی بعثت سے قبل یہ شادی ہوئی تھی۔ بی بی زینبؓ نے رقم جمع کی اور اپنے شوہر کو آزاد کروانے کے لیے یہ رقم روانہ کی اسی کے ساتھ وہ ہار بھی روانہ کیا جو بی بی خدیجہؓ نے اپنی بیٹی کو شادی کے موقع پر تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ جب حضورؐ نے وہ ہار دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بی بی خدیجہ حضورؐ کو بے اختیار یاد آ گئیں۔ آپ نے مسلمانوں سے درخواست کی کہ بی بی زینبؓ کے شوہر کو بغیر فدیہ کے آزاد کر دیں اور یہ ماں کی نشانی بیٹی کو لوٹا دیں۔

یہ اور اسی قسم کے واقعات جو ہم تک پہنچے ہیں اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ

Marfat.com

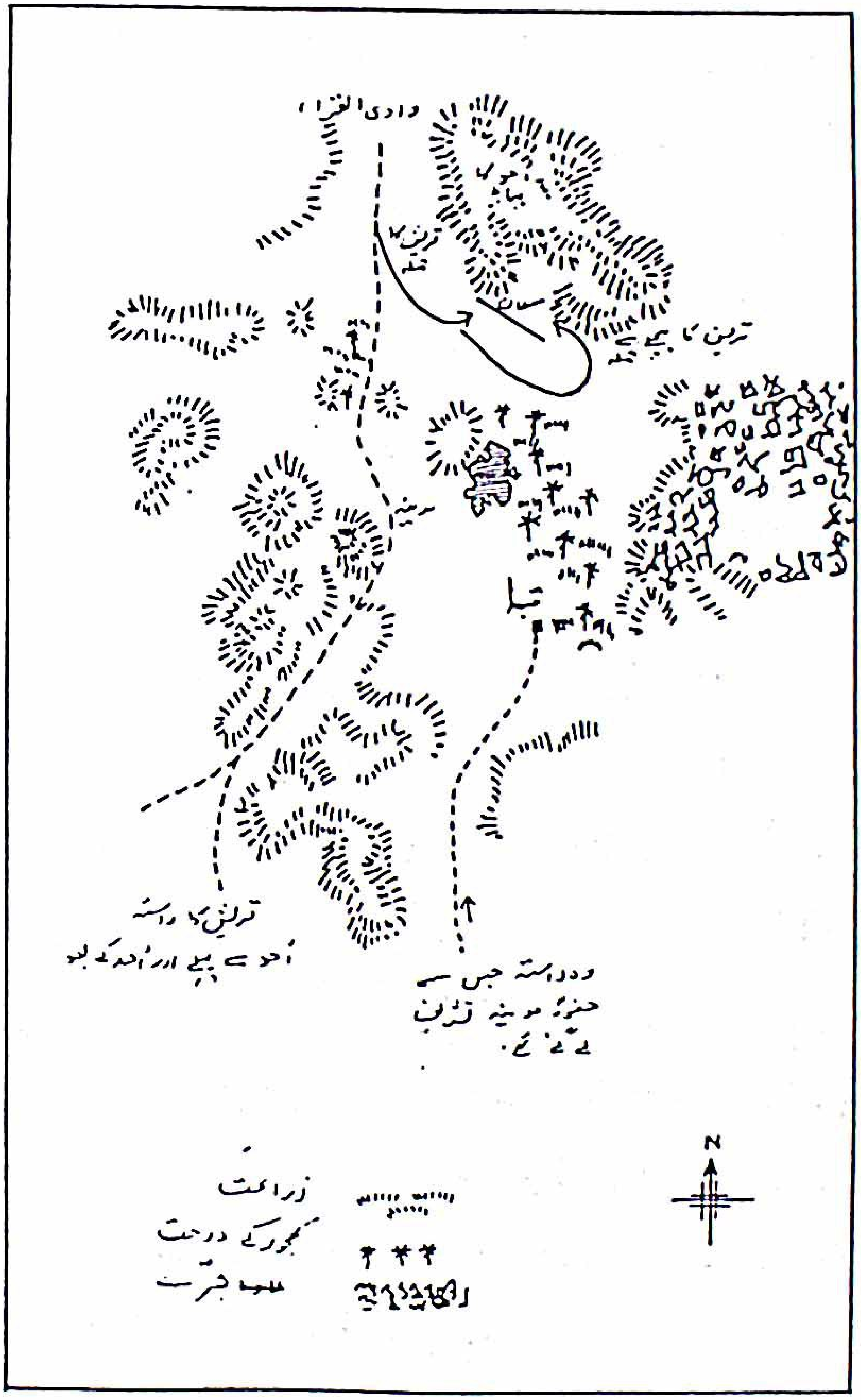
وادی القریٰ
قریش کا راستہ
احد سے پہلے اور احد کے بعد
وہ راستہ جس سے
حضورؐ مدینہ تشریف
لے گئے۔
قبا
زراعت
کھجور کے درخت
N

کس طرح خاندانوں کا بٹوارہ ہو گیا تھا۔ باپ مسلمان ہے تو بیٹا بت پرست، داماد مسلمان ہے تو خسر کافر۔

ایک ہی خاندان کے مختلف افراد ایک دوسرے کے حریف اور ایک دوسرے کی جان کے پیاسے۔ اس دشمنی کا مکمل کر مظاہرہ جنگِ بدر میں ہوا۔ مسلمانوں کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ کئی خاندانوں میں ایسا ہوا کہ ان کا سب سے کم عمر لڑکا مسلمان ہو گیا اور ماں باپ اپنے دوسرے بچوں کے ساتھ مکہ میں رہے۔

اسلام کا نشہ ان نوجوانوں پر ایسا طاری ہوا کہ خون اور رشتے کے بندھنوں کو انہوں نے سرے سے توڑ ڈالا۔ مسلم نوجوان اپنے مشرک ماں باپ کو اسلام کی خاطر جان سے مار ڈالنے پر نہ صرف تیار ہونے لگے بلکہ اس خیال سے خوشی محسوس کرنے لگے۔

حضورؐ کی تعلیمات کا یہ فیضان نہیں تو اور پھر کیا ہے کہ نوجوان مسلمان ایک انقلابی ذہنیت کے مالک ہو گئے۔ عربوں کی ساری معاشرتی زندگی کا دار و مدار ہی ان کی خاندانی شیرازہ بندی پر تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مقاطعہ کے دوران کس طرح بنی ہاشم حضورؐ کے نگران بنے رہے حالانکہ بنی ہاشم کے اکثر لوگ اس وقت بت پرست تھے۔ خونی رشتے اور خاندانی وفاداریاں جاہلیت کی باتیں قرار دی گئیں۔ مسلمانوں میں بھائی چارہ اور برادری کا ایسا گہرا تصور پیش کیا گیا جس کے بعد ایک مسلمان ہی دوسرے مسلمان کا بھائی بن سکتا ہے۔ اخوت اور محبت دو مسلمانوں کے درمیان ہی ہو سکتے ہیں۔ اسلام میں رہ کر ہی آپس کے رشتوں کو مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ہٹ کر دوسری باتوں پر تعلقات کا استوار ہونا قصۂ پارینہ بنا دیا گیا۔

جنگِ بدر کا جو سب سے اہم نتیجہ نکلا وہ مسلمانوں کے حوصلوں کا بلند ہونا تھا۔ مسلمانوں کے حوصلے بلند ہوئے۔ بہت بلند ہوئے۔ ذہنی طور پر یہ بہت بلند مقام پر

Marfat.com

فائز ہوتے۔ مادی طور پر بھی ان کا فائدہ ہوا۔ مال غنیمت کے طور پر ایک سو پچاس اونٹ دس گھوڑے اور بے شمار ہتھیار مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ جو لوگ جنگ میں مارے گئے تھے ان کا بھی ساز و سامان مسلمانوں کو ملا اور جو لوگ گرفتار ہوئے تھے ان کا سامان بھی مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ قیدیوں کو رہا کرنے کے لیے الگ رقم وصول کی گئی۔ امیر قیدیوں کو آزاد کرنے کے لیے فی کس چار ہزار درہم مقرر کیے گئے۔ غریب اور اوسط قسم کے قیدیوں سے کم رقم لی گئی۔

قرآن کے سورۂ انفال میں واضح طور پر یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ جنگ سے جو کچھ بھی ہاتھ آئے وہ سب کا سب خدا اور اس کے رسول کا حق ہے۔ حضورؐ نے مالِ غنیمت میں سے پانچواں حصّہ اپنے لیے رکھ لیا۔ بقیہ چار حصّے تمام مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے۔

ایک اور دلچسپ بات ہوتی رہی۔ مکہ کے مشرکین جو مدینہ میں حالتِ گرفتاری میں اپنے اپنے فدیوں کا انتظار کر رہے تھے (جو ان کے لیے مکہ سے روانہ کیے جا رہے تھے) مدینہ کے مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے میں مشغول رکھے گئے۔

یہاں یہ بات پھر ظاہر ہو رہی ہے کہ مکّہ کے لوگ جن کا ذریعہ معاش تجارت تھا پڑھے لکھے ہوتے تھے اور مدینہ کے لوگ جو زراعت پر اپنی گزر بسر کرتے تھے، پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔

اب مسلمانوں کے موقف میں عظیم تبدیلی ہو گئی تھی۔ اگر قریش کا پلہ بھاری ہو جاتا اور بدر میں ان کو فتح ہو جاتی تو دنیا سے مسلمانوں کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ جن مسلمانوں نے جنگِ بدر میں عملی حصّہ لیا امت کی نظر میں وہ عظیم اور فخر و مباہات کا باعث بنے۔ امت ان کو اپنا ہیرو سمجھنے لگی۔ حضورؐ نے اس فتح کو تائید ایزدی سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن پاک کے سورۂ آل عمران کی ۱۲۴ ویں آیت میں ذکر ہے کہ اللہ تعالےٰ نے تین ہزار فرشتوں کو مسلمانوں کی مدد کے لیے روانہ کیا تھا۔

Marfat.com

جب تم مومنوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ پروردگار تین ہزار فرشتے نازل کر کے تمہیں مدد دے ۔ ہاں اگر تم دل کو مضبوط رکھو اور (خدا سے) ڈرتے رہو اور کافر تم پر جوش کے ساتھ دفعتاً حملہ کریں تو پروردگار پانچ ہزار فرشتے جن پر نشانیاں ہوں گی تمہاری مدد کو بھیجے گا ۔

جنگِ بدر کی فتح کے بعد جو سب سے پہلا قدم اٹھایا گیا وہ مدینہ کے مسلمانوں میں تنظیم پیدا کرنے کی صورت میں تھا ۔ جس طریقہ سے آج کے زمانے میں اخبارات کو ، ان کے اداریوں کو اور ان میں چھپنے والے مواد کو اہمیت دی جاتی ہے اسی طریقے سے اُس زمانے میں عربوں کی شاعری کو وہی اہمیت حاصل تھی ، عربوں کی شاعری اُن ہی مقاصد کو پورا کرتی تھی جن مقاصد کو آج کے اخبارات پورا کرتے ہیں ۔ حضورؐ نے شعراء کے کلام کو اہمیت دی ۔ شعراء اپنے کلام میں حکمرانوں تک کا مذاق اڑایا کرتے تھے ۔ اسماء بنت مروان پانچ بچوں کی ماں تھی ۔ یہ اپنے وقت کی ایک ممتاز شاعرہ تھی ۔ شاعری میں طنز و مزاح اس کی خصوصیت تھی ۔ اس نے اپنی شاعری میں حضورؐ کے خلاف مضمون باندھنے شروع کیے یہ شاعرہ اپنے پانچوں بچوں کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھوں ختم ہوئی ۔ اس کی موت کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک اور شاعر ابو عفک مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا ۔

بہت سے مغربی مصنفین نے اس قسم کے قتل کی کافی مذمت کی ہے بعضوں نے اسے مسلمانوں کی ظلم و زیادتی پر محمول کیا ہے ۔

جہاں قانون کا دور دورہ ہو ؛ جہاں عدل و انصاف کا رائج ہو ، جہاں فوج اور پولیس کی طاقت موجود ہو ، وہاں سیاسی بنیادوں پر اس قسم کے قتل کی کوئی بھی توجیہہ نہیں کی جا سکتی ۔ ساتویں صدی عیسوی کے عرب میں نہ قانون کا دور دورہ تھا ، نہ عدل و انصاف کے لیے کوئی جگہ ، نہ فوج اور نہ ہی پولیس ، لوگوں کی حفاظت کا دار و مدار خاندانوں پر ہوتا اور ہر قبیلہ اپنے قبیلے کے افراد کی جان و مال کا نگران ہوتا تھا ۔ آنحضورؐ نے مکّہ کے خاندانی

اور قبائلی طریقے ہی کو جبر ڈل سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ اسلام کو ساری وفاداریوں کا مرکز قرار دے کر معاشرتی نظام میں ایک بنیادی تغیر پیدا کر دیا تھا۔ اب ایسی حالت میں اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے سوائے تشدد کے کوئی اور چارہ باقی نہ رہا تھا۔

سر جارلس پٹرے ایک مستند اور مشہور تاریخ داں گزرے ہیں۔ ایک قتل کے عدالتی فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں جو ۱۵۳۵ء میں ہنری ہشتم کے ہاتھوں سر تھامس مور کا ہوا تھا۔

" یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس زمانے میں یعنی ۱۵۳۵ء میں عالمی طور پر سب ہی لوگ اس بات پر متفق تھے کہ لوگوں کے خطرناک قسم کے رجحانات اور باغیانہ انداز فکر کو روکنے کے لیے تشدد بہرحال ضروری ہے۔"

یاد رہے کہ انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم کا زمانہ حضورؐ کے زمانے کے نو سو سال بعد کا زمانہ ہے۔ نو سو سال بعد یعنی ۱۵۳۵ء میں تمام دنیا کے لوگ خطرناک رجحانات کو روکنے کے لیے تشدد ہی کو واحد علاج سمجھتے تھے۔

حضورؐ اپنے آپ کو اسلام کی تبلیغ کے لیے وقف کر چکے تھے۔ آپ کا ایمان اور ایقان تھا کہ آپ خدا کی طرف سے اس کام کے لیے چنے گئے ہیں۔ شعراء اس کوشش میں لگے رہے کہ مسلسل آپؐ کا مذاق اڑایا جائے۔ کوئی قانونی طریقہ تو ایسا نہیں تھا جس کا سہارا لے کر شعراء کو ان کی بدتمیزیوں سے روکا جائے۔ ہمارے ذہنوں میں یہ بات آتی ہے کہ اُن شعراء پر غداری کا الزام لگا کر انہیں گرفتار کیا جانا چاہیئے تھا اور پھر ان پر مقدمہ چلایا جا سکتا تھا۔ یہ ذہنیت اِس زمانے کی ہے۔ اُس زمانے میں کسی کو اس طرح گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا پولیس کا وجود نہیں تھا۔ پہلے تو ایسا قانون ہی کوئی نہیں تھا جس کی خلاف ورزی کا اُسے مورد ٹھہرایا جا سکے اور دوسرے عدالت ہی سرے سے ناپید تھی جہاں لے جا کر اُس پر مقدمہ چلایا جا سکے۔

Marfat.com

اپنے خلاف اور اسلام کے خلاف شاعری کرنے والوں کے لیے حضورؐ نے ایک اچھا نسخہ ڈھونڈ ھ لیا۔ وہ یہ تھا کہ آپ نے کچھ ایسے شعراء کو اپنی سرپرستی میں لے لیا جو مدافعت کرتے ہوئے مخالف شعراء کو منہ توڑ جواب دے سکتے تھے۔ شعرائے وقت میں حسانؓ ابن ثابت ایک ممتاز شاعر تھے۔ وہ ادھیڑ عمر کے تھے اور مشرقی شام کے شہزادوں کے درباروں سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔

حضورؐ نے حسان سے سوال کیا کہ کیا وہ مخالف شعراء کا جواب دے سکتے ہیں حسانؓ ابن ثابت نے جواب دیا کہ کوئی زرہ ایسی نہیں جس کو وہ اپنی شاعری کے نیزے سے چھلنی نہ کر دیں۔

ایک طرف شعرا کی طنز و مزاح اور مخالفانہ شاعری سے حضورؐ کو واسطہ پڑ رہا تھا، اور دوسری طرف جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ویسے ویسے یہودیوں کی شرارتیں نت نئے طریقوں سے سامنے آنے لگی تھیں۔ حضورؐ کو یہ امید تھی کہ مدینہ کے یہود آپ کی ہمنوائی کریں گے۔ بت پرستوں کے خلاف آپ کی مدد کریں گے۔

حضورؐ نے ان سے یہ تک کہہ دیا تھا کہ اگر وہ نہ چاہیں تو آپ کو اپنا مسیحا تسلیم نہ کریں آپ نے یہودیوں کی کتاب توریت کے بہت سے قصوں کو اپنی زبان مبارک سے ارشاد بھی فرمایا تھا۔ یہودیوں کے قبلے کو اپنا قبلہ بھی تسلیم کر لیا تھا۔ عبادت کے طریقوں میں بھی تھوڑی بہت مشابہت پیدا کر دی تھی۔

اگر مدینہ کے یہودیوں میں تھوڑی بہت بھی بصیرت ہوتی اور انداز فکر میں وسعت ہوتی تو وہ یقیناً کوئی ایسا فارمولا اختیار کرتے جس کے تحت مسلمان اور یہودی ملے جلے رہتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حضورؐ کے وصال کے سیکڑوں برس بعد تک یہ دونوں قومیں یا دونوں مذاہب ایک دوسرے کے دست و بازو بنے رہتے اور ان دونوں قوموں نے مل کر عیسائیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہوتا۔ مگر یہودیوں میں بصیرت پیدا ہی کیسے ہو سکتی تھی اور ان کے انداز فکر

Marfat.com

یں وسعت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا جب کہ ان کا تعلق مدینہ سے تھا۔ جیساکہ ہم پڑھ چکے ہیں وہ مقامی عرب تھے۔ اپنے آبائی مذہب کو ترک کرکے انہوں نے یہودیت اختیار کر رکھی تھی۔ ان کی روزمرہ زندگی کا دارومدار یا تو باغبانی پر تھا یا چھوٹی موٹی صنعت پر۔

یہ صحیح ہے کہ ان میں کئی ایک عالم تھے۔ اپنی دینی کتابوں پر انہیں عبور حاصل تھا لیکن ان کا یہی سطحی علم ان کو لے ڈوبا۔

حضورؐ نے یہودی کتابوں کے قصص کو جس طریقے سے پیش کیا اور بعض جگہ حضورؐ کے بیان میں جو واقعاتی غلطیاں ہوئیں ان کو رد کرتے یا ان میں اصلاح یا درستگی کرنے کی نہ ان میں جراءت تھی اور نہ ہی ان کے سطحی علم نے انہیں اس قابل رکھا تھا۔ انہوں نے بھی انہیں غلطیوں کا اعادہ کیا جو اس وقت کے شعراء سے سرزد ہو رہی تھیں۔ حضورؐ کا مذاق اڑانا یا طنز و مزاح کے پیرائے میں حضورؐ کی تعلیمات پر تبصرہ کرنا ان کا مشغلہ بن گیا تھا۔

لڑائی کے لیے تو یہ لوگ تیار تھے ہی نہیں۔ بے تیغ و تفنگ طنز و مزاح کے سہارے مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔

بدر کی جنگ نے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ ان کے عزائم میں بلندی آگئی تھی۔ وہ باحوصلہ ہو گئے تھے۔ اس خود اعتمادی اور بلند حوصلگی نے حضورؐ کو اب اس بات پر راغب کیا کہ یہودیوں کے خلاف ایک مضبوط قدم اٹھائیں۔

قرآن کے سورۃ آل عمران کی ۱۱ سے ۱۳ تک کی آیتوں میں اسی طرف اشارہ ہے۔

" ان کا حال بھی فرعونوں اور اس سے پہلے لوگوں کا سا ہوگا۔ جنہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تھی تو خدا نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب عذاب میں پکڑ لیا تھا اور خدا سخت عذاب کرنے والا ہے۔ (اے پیغمبر) کافروں سے کہہ دو کہ تم (دنیا میں بھی) عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے اور (آخرت میں) جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ بُری جگہ ہے تمہارے دو گروہوں میں جو (بدر کے دن) آپس میں بھڑ گئے نشانی تھی۔ ایک گروہ خدا کی راہ میں

لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ (کافروں کا) ان کو اپنی آنکھوں سے دگنا مشاہدہ کر رہا تھا اور خدا اپنی نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے جو اہلِ بصیرت ہیں اُن کے لیے اس میں بڑی عبرت ہے۔" مسلمانوں نے سب سے پہلے جن یہودیوں کے خلاف قدم اٹھائے وہ بنی قینقاع کے یہود تھے۔ ان کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ پیشے کے لحاظ سے سنار تھے۔ ان کا شمار امیر ترین یہودیوں میں ہوا کرتا تھا۔ ان کی تعداد کے تعلق سے مشہور ہے کہ ان میں تین سو مسلح تھے اور چار سو غیر مسلح۔ وہ ہتھیار بھی بنایا کرتے تھے۔ ان کے قبضے میں باغات یا کسی اور قسم کے زمین نہیں تھی۔

بدر کی جنگ کے تھوڑے ہی دنوں بعد بنی قینقاع کے بازار میں یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان ناچاقی ہوگئی۔ اس موقع پر بازار میں حضرت حمزہ اور حضرت علی بھی تھے۔ یہی ناچاقی آگے چل کر رنگ لائی۔ ابن اسحاق کے بیان کے مطابق ایک یہودی نے ایک عرب عورت کے ساتھ ناشائستہ حرکت کی اور یہی حرکت جھگڑے کی بنیاد بن گئی۔

جیسا کہ عام طریقہ تھا۔ مدینہ کی وادی میں بنی قینقاع کے لوگ سب ایک ہی جگہ اور ایک دوسرے کے قریب رہا کرتے تھے۔ ان کے مکانوں کے اطراف فصیل ہوا کرتی تھی جو قلعہ کا بھی کام کرتی تھی۔ مسلمانوں کے ہاں ایسے ذرائع مفقود تھے جن سے کام لے کر وہ فصیلوں کو مسمار کر سکیں۔ دو ہفتوں تک محاصرہ جاری رہا۔ مدینہ کے دوسرے یہودی قبیلوں نے اپنے ہم مذہبوں کی کوئی مدد نہیں کی۔

دو ہفتے بعد یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان کوئی خون خرابہ نہیں ہوا۔

بنی قینقاع نے عرب کے دو قبیلوں سے دوستی کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ ایک قبیلہ اوس تھا اور دوسرا خزرج۔ ان دونوں قبیلوں کے سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اوس کا سردار عبادہ ابن صامت حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کی کہ

Marfat.com

اے خدا کے رسول ۔ میری دوستی تو اللہ اور اس کے رسول سے ہے ۔ مسلمانوں کا میں محب ہوں ۔ میرا جو معاہدۂ دوستی یہودیوں کے ساتھ ہوا تھا اب میں اس کی تنسیخ کر دیتا ہوں ۔

یہودیوں کا دوسرا حلیف عبداللہ ابن ابی تھا ۔ اس کا تعلق خزرج سے تھا ۔ یہ آدمی خون خرابہ اور دنگا فساد کو ناپسند کرتا تھا ۔ اپنی امن پسندی کے لیے مشہور تھا ۔ اوس اور خزرج کے درمیان جب لڑائی ہو رہی تھی اس نے اپنے آپ کو غیر جانب دار رکھا ۔ اسی غیر جانبداری کی وجہ سے لوگوں نے اُسے سارے مدینہ کا سردار تسلیم کیا تھا ۔ حضورؐ کے مدینہ تشریف لانے تک عبداللہ ابن ابی مدینہ کا سب سے زیادہ بااثر آدمی سمجھا جاتا تھا ۔ عبداللہ ابن ابی نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا ۔

جیسے ہی عبداللہ ابن ابی کو بنی قینقاع کے ہتھیار ڈال دینے کی اطلاع ملی دوڑا دوڑا حضورؐ کی خدمت میں گیا اور عرض کی کہ " اے محمدؐ ۔ میرے حلیفوں کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آیئے ۔" حضورؐ یہ سُن کر دوسری طرف پلٹ گئے ۔ عبداللہ ابن ابی نے حضورؐ کی ردائے مبارک کا ایک کونہ پکڑ لیا ۔ ابنِ اسحاق کی روایت کے مطابق حضورؐ کو غصہ آ گیا اور حضورؐ کا چہرہ سُرخ ہو گیا ۔ حضورؐ نے فرمایا مجھے جانے دو ۔ عبداللہ ابن ابی نے کہا کہ خدا کی قسم میں آپ کو اس وقت تک نہیں جانے دوں گا جب تک آپ میرے حلیفوں کے ساتھ رحم و مہربانی سے پیش آنے کا وعدہ نہ کریں ۔ چار سو بے ہتھیار اور تین سو مسلح لوگوں نے ہمیشہ مجھے میرے دشمنوں سے محفوظ رکھا ۔ کیا آپ اُن سب کو ایک دن میں تہہ تیغ کر دیں گے ؟ خدا کی قسم میں ان لوگوں میں ہوں جو حالات کے بدلنے کے ڈر سے ہمیشہ خوف زدہ رہتے ہیں ۔

یہ سُن کر حضورؐ نے جواب دیا کہ صرف تمہاری خاطر ان کو معاف کیا جاتا ہے ۔

ابنِ اسحٰق نے عبداللہ ابن ابی کا یہ جو جملہ نقل کیا ہے کہ کیا آپ ان سب کو ایک دن میں تہہ تیغ کر دیں گے اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں نے ان سب کے

Marfat.com

قتل کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مسلم مورخین نے عبداللہ ابن ابی کا ذکر ہمیشہ درشتگی کے ساتھ کیا ہے ان میں سے اکثر وں کا خیال ہے کہ عبداللہ منافقین کا سردار تھا۔ ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ اسلام کے انقلابی نظریہ نے اس کو کتنے مشکل موقف میں ڈال دیا تھا۔ قبائلی معاہدوں پر قائم رہنا اور ان پر پوری طرح عمل کرنا عربوں کے لیے ان کی اپنی زندگی کا ایک قیمتی اثاثہ تھا۔

عبداللہ ابن ابی ان یہودیوں کا ممنونِ کرم تھا۔ ان لوگوں نے ہمیشہ اس کی حمایت کی تھی۔ وہ اپنے کیے ہوئے وعدوں کو بہر حال نباہنا چاہتا تھا۔ اب عبداللہ مسلمان ہو چکا تھا۔ حضورؐ نے قبائلی وفاداریوں کی جڑ کاٹ دی تھی۔ اس کے باوجود عبداللہ یہودیوں کے ساتھ رحم و کرم کا طالب ہوا۔

مسلم مورخین کے برخلاف ہم کو عبداللہ ابن ابی پر ترس آتا ہے۔ سورۂ مائدہ کی ۵۷ ویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"اے ایمان والو۔ جن لوگوں کو تم سے پہلے کتابیں دی گئی تھیں ان کو اور کافروں کو جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے دوست نہ بناؤ۔ مومن ہو تو خدا سے ڈرتے رہو۔ جب تم لوگ نماز کے لیے اذان دیتے ہو تو یہ اسے بھی ہنسی اور کھیل بناتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ سمجھ نہیں رکھتے۔"

اس سے پہلے سورۂ مائدہ کی ۵۱ ویں آیت میں ارشاد ہوا ہے۔

"اے ایمان والو۔ یہودیوں اور مسیحیوں کو اپنا دوست مت بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ جو بھی تم میں سے ان کو اپنا دوست بنائے گا وہ ان میں سے ایک ہو گا۔ بے شک خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق) کا مرض ہے تم ان کو دیکھو گے کہ ان میں دوڑ دوڑ کر ملے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں خوف ہے کہ کہیں ہم پر زمانے کی گردش نہ آ جائے۔ سو قریب ہے کہ خدا فتح بھیجے اور اپنے پاس

Marfat.com

سے کوئی اور امر نازل فرمائے۔ پھر یہ اپنے دل کی باتوں کو جو چھپایا کرتے تھے پشیمان ہو کر رہ جائیں گے ۔"

ان آیات کی وجہ سے حضورؐ اور بھی شدت کے ساتھ یہودیوں سے پیش آنے پر مجبور ہو گئے تھے ۔

بنی قینقاع کو حکم دیا گیا کہ وہ مدینہ چھوڑ کر شام چلے جائیں۔ ان کے مدینہ چھوڑنے سے پہلے ان یہودیوں کی ساری دولت اور ان کے مکانات مسلم مہاجرین میں تقسیم کر دیئے گئے ان مسلم مہاجرین میں اب تک کئی ایسے تھے جن کا گزر بسر خیرات پر ہوا کرتا تھا بنی قینقاع کا یہ حشر دیکھ کر دوسرے یہودی قبیلے اور بت پرست چوکنے ہو گئے ۔

جب مکہ کے شکست خوردہ بدر سے واپس ہوئے تو ابوسفیان نے قسم کھائی تھی کہ جب تک قریش کے مقتولوں کا وہ بدلہ نہ لے گا اس وقت تک وہ کوئی مرغن غذا نہیں کھائے گا

اپریل ۶۲۴ء میں سو اور دوسو کے درمیان آدمیوں کو لے کر اس نے مدینہ کے جنوبی حصہ پر حملہ کیا۔ دو تین آدمی مارے گئے۔ دو گھروں کو جلایا۔ ہنستا کھیلتا مکہ واپس ہو گیا ۔

مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ بہت آگے نکل چکا تھا۔ اپنے جانوروں کو ہلکا کرنے کے لیے انہوں نے اپنے ساتھ جو ستو رکھ لیا تھا وہ پھینکنا شروع کیا تاکہ جانوروں پر سے وزن کم ہو جائے اور وہ تیز دوڑ سکیں ۔

مئی ۶۲۴ء میں حضورؐ کی قیادت میں دوسو کے قریب مسلمانوں نے دو بدوی قبائل پر حملہ کیا۔ یہ قبائل بنی غلفان اور بنی سلیم تھے۔ پانچ سو اونٹ مسلمانوں کے ہاتھ لگے ۔ ان جانوروں کو مدینہ لایا گیا۔ اس حملے کو تاریخ بن الکدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے

بنی طئے کا ایک عرب کعب بن الاشرف یہودیوں کے ایک قبیلے بنی نضیر کے ساتھ رہا

Marfat.com

کرتا تھا۔ کعب کے باپ نے ایک یہودن سے شادی کی تھی۔ یہ عورت بنی نضیر سے تعلق رکھتی تھی۔ کعب خود ایک شاعر تھا۔ اس نے بدر میں مارے جانے والے قریش کے لوگوں پر ایک مرثیہ لکھا تھا۔ پھر خود مکہ گیا تاکہ قریش کے سربراہوں سے آئندہ لائحہ عمل کے متعلق بات چیت کرے۔

ابنِ اسحٰق کے بیان کے مطابق حضورؐ نے لوگوں سے پوچھا کہ ابن اشرف سے کون چھٹکارا دلا سکتا ہے۔ ایک انصاری محمد ابن مسلمہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے آپ کو اس کام کے لیے پیش کیا۔ محمد ابن مسلمہ نے حضورؐ سے کہا کہ مجھے اس سلسلے میں مصلحت سے کام لینا ہوگا۔

محمد ابنِ مسلمہ نے کعب کے مُنہ بولے بھائی سلکان کی خدمات حاصل کیں۔ سلکان مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ بھی شاعر تھے۔ محمد ابن مسلمہ اور سلکان کعب کے مکان گئے رات کے ابتدائی حصے میں دونوں بھائی اپنی اپنی شاعری سے کعب ابن اشرف کو خوش کرتے رہے جب کافی رات ہو گئی تو محمد ابن مسلمہ اور سلکان مل کر کعب کو گھر سے باہر لے آئے اور اُسے قتل کر دیا۔ یہ واقعہ جولائی ۶۲۴ء کا ہے۔

ابنِ اسحٰق کے بیان کے مطابق حضورؐ نے یہ فرما دیا تھا کہ جو یہودی بھی تمہارے ہاتھ آ جائے اُسے قتل کر دو۔ اس حکم کو سامنے رکھتے ہوئے حویصہ ابن مسعود نے ایک یہودی تاجر ابن سینہ کو قتل کر دیا۔ ابنِ مسعود کو اس مقتول یہودی کے بڑے بھائی نے مارنا شروع کر دیا اور کہا کہ تم نے اُسے مارا ہے جس کے پیسے سے تم نے اپنے پیٹ کی چربی کو رات دن بڑھایا ہے۔ ابن مسعود نے جواب دیا کہ جس نے مجھے اُسے مارنے کا حکم دیا تھا اُسی نے مجھے تمہیں بھی مارنے کا حکم دیا ہے۔ میں اب تمہارا بھی سر تمہارے تن سے جدا کر دوں گا۔

جون ۶۲۴ء میں حضورؐ ساڑھے چار سو مسلمانوں کو لے کر غطفان پر حملہ کرنے کے ۹۹

ارادہ سے نکلے۔ جیسے ہی ان قبیلوں کو اس کی اطلاع ملی وہ اپنے اپنے مقام کو چھوڑ کر کہیں اور نکل گئے۔ مسلمان بغیر لڑے واپس ہو گئے۔ اس حملہ کو ذوالعمر کے حملہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

اگست ۶۲۴ء میں پھر تین سو مسلمانوں کو لے کر حضورؐ بنی سلیم پر حملہ کرنے کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ مسلمانوں کی یہ جماعت بحرین تک گئی جو مدینہ کے مشرق میں واقع ہے۔ لڑائی کسی سے بھی نہیں ہوئی۔ مسلمان مدینہ واپس لوٹ آئے۔

اب وہ دن آ گئے جس میں مکہ کا سالانہ تجارتی قافلہ شام جایا کرتا تھا۔ قریش کی آمدنی اور دولت کمانے کے دو ہی بڑے ذرائع تھے۔ ایک تجارتی قافلہ شام روانہ کیا جاتا تھا اور دوسرا یمن۔ اسلام سے قبل ان قافلوں کا لوٹا جانا تقریباً ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ جن جن راستوں سے قافلے کا گزر ہوتا تھا وہاں کے مقامی قبائل کا تعاون حاصل کیا جاتا تھا۔ ان قافلوں کی نگرانی اور رہبری میں کاروان ان کے حدود سے بہ حفاظت تمام آگے بڑھتے تھے۔ تعاون، رہبری اور نگرانی کرنے والے قبائل اور افراد کو کافی معاوضہ دیا جاتا تھا۔

بدویوں کے آپس میں ایک دوسرے پر حملے اُن کے تفریحی مشغلوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی آپس کی لڑائیاں بہ حیثیت مجموعی ان کی تجارت پر کبھی اثر انداز نہیں ہوتی تھیں۔

موجودہ صدی کی ابتدا تک بھی عرب اس اصول پر پابند تھے۔

مغربی مصنفین کا یہ الزام کہ آنحضورؐ کے زمانہ میں سارا عرب شروع سے آخر تک ایک خونی حمام بنا رہا سراسر غلط ہے۔ ایک سوچے سمجھے اور مرتب کئے ہوئے نظام پر وہ کاربند تھے۔ آپس کی ناچاقیاں اور قبائلی جھگڑے ان کے معاشی نظام پر یا ان کی تجارت میں خلل انداز نہیں ہوتے تھے۔ سیکڑوں سال کے عرصہ میں اگر اس

Marfat.com

نظام میں کبھی کوئی برہمی ہوئی بھی ہے تو اس کی دو وجوہ رہیں۔

شاہی خاندان جیسے الحمریوں اور بنی غسان اپنی سیادت منوانے کے لیے بعض اوقات جابرانہ طریقے استعمال کرتے تھے۔ ان کی جارحانہ روش بعض اوقات تجارت پر اثرانداز ہوتی تھی۔

قبیلوں اور تاجروں کا آپس میں جو مربوط نظام تھا اس کو متاثر کرنے میں دوسری چیز مذہبی تحریکات رہی ہیں۔

ان قبیلوں کے درمیان نہ نسلی امتیاز تھا اور نہ ہی اخلاقی اقدار میں اختلاف سماجی تضادات بھی ایسے نہیں تھے جن کی بنیادوں پر وہ واقعی آپس میں خونریزی کرتے۔ کسی کے دو چار اونٹ یا بھیڑوں کو بھگا لے جانا ان کے ہاں ایسا ہی تفریحی مشغلہ تھا۔ جیسے آج کل پولو یا فٹ بال۔

دو چار اونٹوں اور بکریوں کی خاطر وہ انسانوں کو مرتا نہیں دیکھ سکتے تھے، ان کو معلوم تھا کہ اگر آج وہ کسی قبیلے کے دو اونٹ بھگا کر لے بھی جائیں تو کل اسی قبیلے کے لوگ ان کے چار اونٹ بھگا لے جائیں گے۔

مسلمانوں نے جو جنگیں لڑی ہیں ان کی نوعیت ہی سرے سے جداگانہ ہے مسلمانوں نے اپنے آپ کو اونچے مقام پر پایا۔ ان کا ایقان تھا کہ وہ خدا کے حکم پر جنگ کر رہے ہیں خدا کا حکم ہے کہ اس کے دشمنوں کو تہہ تیغ کیا جائے۔ بدویوں کی لڑائی میں بمشکل ایک دو آدمی مارے جاتے تھے۔ بدر کی لڑائی میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ستر کے لگ بھگ لوگ مارے گئے۔ اسی طریقے سے مسلمانوں کا مکہ کے کاروانوں کی آمد و رفت کو روکنے کی کوشش کرنا مخالفت اور دشمنی کا ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ گو وقفہ وقفہ سے عرب میں کاروانوں کو لوٹا جاتا تھا لیکن عام طور پر یہ حملہ کرنے والے پیشہ ور قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ بادشاہ نعمان کا کاروان لوٹا گیا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں ایک بڑی جنگ

Marfat.com

بھی کی تھی۔

اپنے اقتدار کو منوانے کے لیے کاروانوں کی مزاحمت اس وقت کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

یہ کہنا خلاف واقعہ ہے کہ آنحضوؐ اپنے زمانہ کے اُن لوگوں میں سے تھے، جو عرب کے مسلمہ اصولوں پر کاربند ہوکر یا زمانے کی عام راہوں کو اختیار کرکے خون کے پیاسے عربوں سے نبرد آزما ہوتے۔ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

آپ نے جو طریقے اختیار کئے ان میں جدت تھی۔ نیا پن تھا۔ ان طریقوں کو بدویوں کی آپس کی خانہ جنگیوں یا لڑائیوں سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ ہاں اگر مشابہت پائی جاتی ہے تو شاہی خاندانوں کے طریقۂ کار سے پائی جاتی ہے۔

جنگِ بدر کے بعد سے مکّہ کے لوگوں میں اپنی معیشت کے تعلق سے پریشانی بڑھنے لگی۔ آپس میں کافی بحث و مباحثہ کرنے کے بعد انھوں نے بہت ہی غور و فکر کرکے یہ طے کیا کہ شام کو جانے والا قافلہ بحرِ احمر کے کناروں سے نہ روانہ کیا جائے بلکہ نجد کا راستہ اختیار کیا جائے۔

ابنِ اسحٰق کے بیان کے مطابق اس قافلے کو عراق کے راستے سے روانہ کیا گیا۔ اُس وقت عراق، شام اور فلسطین پر ایران کی حکومت تھی۔ مکّہ کے قافلے کو کسی اور حکومت کے مقبوضہ علاقوں سے نہیں گزرنا پڑتا تھا۔ قریش نے راستہ بتانے اور رہبری کرنے کے لیے بدویوں کی خدمات حاصل کیں۔

قریش میں صحیح قیادت کا فقدان تھا۔ ان کے تساہل، تجاہل، تغافل اور ناکارکردگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ قریش کا یہ منصوبہ اور ان کے راستہ کا منصوبہ سیدھے مدینہ مسلمانوں تک پہنچ گیا۔ دوسری طرف مسلمانوں کی کارکردگی اور تنظیمی صلاحیت میں کافی اضافہ ہوگیا تھا۔

اس موقع پر قریش کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ مسلمانوں نے اُن کی

Marfat.com

مزاحمت کا منصوبہ بھی بنالیا ہے۔

حضورؐ کے متبنیٰ زید ابن حارثہ کی قیادت میں ایک سو سوار کارواں کی مزاحمت کے لیے روانہ کیے گئے۔

نجد میں قردہ کے کنویں پر مسلمانوں نے اس کارواں کو جا پکڑا۔ بہت بڑی دولت مسلمانوں کے ہاتھ لگی۔ دولت کا بڑا حصہ چاندی پر مشتمل تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ درہم مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔

بدر کی شکست کے بعد قریش میں جو سربراہ باقی رہ گئے تھے ان سب نے مل کر یہ تجویز پیش کی کہ ایک فنڈ اکٹھا کیا جائے۔ اس کی رقم سے ایک ایسی فوج تیار کی جائے جو مسلمانوں پر ایک ہی وقت حملہ کر کے ہمیشہ کے لیے ان کو ختم کر دے تاکہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ اس تجویز پر قریش کے سارے لوگوں نے لبیک کہا۔ دل کھول کر چندہ دیا۔ خصوصاً مکہ کے تاجروں نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کا ان کے کاروانوں پر حملہ کرنا ان کی تجارت کی تباہی ہے۔

بنی کنعانہ کے لوگ سمندر کے کناروں پر رہا کرتے تھے۔ روایاتی طور پر یہ قریش کے معاونین میں تھے۔ مکہ والوں نے اپنے نمائندوں کو بنی کنعانہ کے ہاں روانہ کیا۔ ان سے درخواست کی گئی کہ مسلمانوں سے آئندہ جو جنگیں اور جھڑپیں ہوں گی ان میں وہ مکہ والوں کا ساتھ دیں۔

حسبِ معمول شاعروں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں تاکہ وہ اپنی شاعری سے بنی کنعانہ کے لوگوں کے جذبات برانگیختہ کریں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے ہمدردیاں بھی اپنے لیے حاصل کریں۔

جنگِ بدر میں قریش کے بہت سارے اکابر مارے جانے کے بعد مکہ میں ابوسفیان بن حرب کو اب کافی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ سب نے مل کر ابوسفیان کو اس مہم کا سردار

Marfat.com

تھے جن کے افراد

پر مشتمل تھی ان

تھے۔ چند

کا جنوبی حصّہ

کے شمالی حصّے

اس لیے پہاڑ

مدینہ کے شمالی

وہ تھی مسلمانوں

کے ساتھ آپس

Marfat.com

ہیں کہ بنی قینقاع کی پختہ عمارتوں پر حملہ کر کے مسلمان ناکام ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ قریش کے ہاں سامانِ رسد کی فراہمی کے خاطر خواہ ذرائع نہیں تھے۔ وہ لوگ زیادہ دن تک مدینہ کا محاصرہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔

آنحضورؐ نے جنگِ بدر کی کامیابی کو ایک معجزہ تبلایا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ بدر کی جنگ میں خدا نے مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا۔ دشمنوں سے لڑنے کے لیے آسمان سے فرشتے بھجوائے تھے۔ اگر تائید غیبی مسلمانوں کے شامل حال تھی ہی تو لڑنے والوں کی تعداد ایک ضمنی بات ہو کر رہ جاتی ہے اور تعداد کو نظر انداز کر دیا جا سکتا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کئی نوجوان مسلمان اپنی جان کو ہتھیلی میں لیے ہوئے جنگِ بدر کے میدان میں کود پڑے تھے۔ اسی بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس موقع پر بھی نوجوان کھلے میدان میں جنگ کرنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ اس طرف عبد اللہ ابن ابی مسلسل حضورؐ سے کہا جا رہا تھا کہ جنگ مدافعتی ہو اور شہر میں رہ کر ہو۔

عبد اللہ ابن ابی نے کہا "اے اللہ کے رسول۔ آپ مدینہ ہی میں ٹھہرے رہیں۔ مدینہ سے باہر تشریف نہ لے جائیں۔ ہم اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لیے کبھی بھی مدینہ کو چھوڑ کر باہر نہیں گئے۔ ہم مصیبتوں کا مقابلہ کر چکے ہیں۔ جس نے بھی مدینہ والوں پر حملہ کیا اس کو ذلت و رسوائی نصیب ہوئی۔ اگر ہم یہیں ٹھہرے رہیں جہاں اب ہیں اور ہمارے دشمن وہیں رہیں جہاں وہ اب ہیں تو ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر وہ ہم پر حملہ کرنے آئیں تو ہمارے آدمی ان سے لڑیں گے۔ ہماری عورتیں اور ہمارے بچے دیواروں پر سے ان پر پتھر برسائیں گے۔

جنگ شہر کے اندر ہو یا شہر کے باہر کھلے میدان میں یہ بحث جمعرات کے سارے دن ہوتی رہی اور اس کا سلسلہ جمعہ کی دوپہر تک چلتا رہا۔ حضورؐ نماز جمعہ پڑھا کر جب مسجد سے باہر تشریف لا رہے تھے تو نوجوان اطراف جمع ہو گئے اور درخواست کی کہ جنگ شہر سے

Marfat.com

جب ہتھیار باندھ کر آپ اپنے مکان سے باہر نکلے تو مجمع نے اپنا ارادہ بدل دیا اور لوگ کہنے لگے کہ ہم نے آپ کے مشورہ کو رد کر کے غلطی کی ہے۔ آپ شہر میں رہ کر لڑنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ شہر ہی میں رہنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے لیے تیار ہیں۔

آپ گزشتہ ۳۶ گھنٹوں سے ذہنی کشمکش میں تھے کہ جنگ شہر کے باہر جا کر ہو یا شہر کے اندر رہتے ہوئے۔ اب آپ شہر سے باہر جا کر لڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ آپ نے مجمع سے کہا کہ نبی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ہتھیاروں سے لیس ہو جائے اور پھر بغیر جنگ کے اپنے ہتھیار اتار دے۔ یہ کہہ کر ایک ہزار آدمی کے ساتھ آپ جنگ کے لیے روانہ ہو گئے۔

جب یہ فوج کچھ راستہ طے کر چکی تھی تو آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں کے پیچھے پیچھے ایک اور جماعت آ رہی ہے۔ دریافت فرمایا یہ کون لوگ ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ یہودی ہیں۔ عبداللہ ابن ابی کے حلیف ہیں۔ ہماری مدد کے لیے ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے۔ بے دینوں کی حمایت ہمیں منظور نہیں کیا ایک بے دینوں کی جماعت دوسری بے دینوں کی جماعت سے لڑے گی؟ یہودیوں کو کہا گیا کہ وہ واپس ہو جائیں۔

مسلمانوں کی فوج نے رات میں شیخین کے مقام پر اپنا پڑاؤ ڈالا۔

دوسرے دن صبح صبح مسلمانوں نے آگے بڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ ان پر دشمنوں کی نظر پڑ گئی۔ عبداللہ ابن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو ساتھ لے کر مدینہ واپس ہو گیا۔ اس نے کہا کہ آپ نے میرا کہا نہ مان کر ان نوجوانوں کی باتوں پر عمل کرنا شروع کیا ہے جن کو زندگی کا کوئی تجربہ ہی نہیں۔

عبداللہ ابن ابی کو جو پہلے ہی سے حسد کی آگ میں جل رہا تھا یہ بہانہ خوب ہاتھ آیا کہ اس کے مشورہ کو رد کر دیا گیا۔ اس نے مدینہ میں جائے پناہ ڈھونڈی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ قریش کہیں کامیاب نہ ہو جائیں۔ مدینہ پر ان کا قبضہ نہ ہو جائے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو

Marfat.com

تاکید کردی تھی کہ اگر قریش فتح یاب ہو جائیں اور شہر میں گھس آئیں تو وہ لوگ عبداللہ کو قریش کے شر سے محفوظ رکھیں۔

عبداللہ ابن ابی کا تین سو آدمیوں کو لے کر لوٹ جانا اب مسلمانوں کی تعداد کو سات سو پر لے آیا۔ جن کا مقابلہ تین ہزار مشرکین سے تھا۔

حضورؐ نے مشورہ طلب کیا کہ دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے موزوں محل وقوع کیا ہو۔ اچانک حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ قریش کے بالمقابل مسلمانوں کی فوج آکر رک گئی۔ میدانِ جنگ میں فوج کو ترتیب دینا شروع کیا گیا۔ سات سو مسلمانوں میں کسی کے پاس بھی گھوڑا نہیں تھا۔ صرف سو لوگوں کے پاس زرہ بکتر تھی۔ مسلم مورخین کے بیان کے مطابق قریش کی فوج میں دو سو گھوڑے سوار تھے۔ سات سو آدمی زرہ بکتر میں ملبوس تھے۔

آپ نے پچاس تیراندازوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی تیراندازی صرف گھوڑے سواروں پر کریں۔ ان کی طرف سے آتے ہوئے تیر پھر انہی کی طرف لوٹائیں۔ کسی حالت میں بھی چاہے فتح ہو یا شکست اپنی مقررہ جگہ سے نہ ہٹیں۔ حضورؐ نے خود بھی زرہ بکتر پہن رکھی تھی۔ اپنا علم مصعب ابن عمیر کو عطا فرمایا۔ مصعبؓ ابن عمیر عبدالدار کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ عبدالدار کا خاندان قریش کے علم کو روایاتی طور پر اپنے پاس رکھا کرتا تھا۔ ان کا خاندان عبدالدار سارے قریش کا علم بردار تھا۔ یہاں اس بات کو ملحوظ رکھا جائے کہ آپ نے قبیلہ واری روایات کو ابھی پورے طریقے سے نظرانداز نہیں کر دیا تھا۔

حضورؐ نے اپنی چمکتی ہوئی تلوار نیام سے نکال کر اعلان فرمایا کہ کون ہے جو اس تلوار کا حق ادا کرے گا۔ روایات میں ہے کہ آپ کے اس اعلان کو سن کر عمرؓ ابن الخطاب اور زبیرؓ ابن العوام آگے بڑھے۔ حضورؐ نے اپنی تلوار ان دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں دی آخر اپنی تلوار ابو دجانہ کے حوالے کی۔ اور فرمایا کہ دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ یہاں تک لڑو کہ یہ تلوار بے کار ہو جائے۔

Marfat.com

دونوں فوجوں کے درمیان ابو دجانہ اپنی تلوار چمکاتے جا رہے تھے اور رجز پڑھتے جا رہے تھے۔ اپنی قسمت پر نازاں تھے کہ رسول اللہ نے انہیں اپنی تلوار عنایت فرمائی کہنے جا رہے تھے کہ اس تلوار کو صحیح طریقے سے استعمال ہونا چاہیئے اور خدا کی راہ میں یہ استعمال ہو گی۔

عربوں میں ایک روایت یہ بھی تھی کہ جنگ کے موقع پر وہ اپنے ساتھ اپنی عورتوں کو بھی لے جایا کرتے تھے۔ ان عورتوں کا کام ہوتا تھا کہ وہ ایسے گانے گائیں جس سے فوج کے لوگوں میں ولولہ پیدا ہو۔ جوش اور جذبہ عود کر آئے۔ خون میں گرمی پیدا ہو۔

ابوسفیان اپنے ساتھ اپنی بیوی ہندہ کو لے آیا تھا۔ ہندہ عتبہ ابن ربیعہ کی بیٹی تھی۔ یہ وہی عتبہ ہے جو جنگ بدر میں حضرت حمزہؓ کے ایک وار سے ڈھیر ہو گیا تھا مسلمانوں کی علمبردار مصعبؓ ابن عمیر کی ماں بھی قریش کی فوج میں شامل تھی۔ اس کا ایک اور بیٹا یعنی مصعبؓ کا بھائی کافروں کی طرف سے لڑ رہا تھا۔

یہ ایک اور مثال ہاتھ آئی کہ کس طرح اسلام نے خاندانوں کا بٹوارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک بھائی مسلمانوں کی طرف سے لڑ رہا تھا اور وہ بھی مسلمانوں کے علمبردار کی حیثیت سے اور اسی علم بردار کی ماں کافروں کی طرف سے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آئی تھی اسی علمبردار کا مشرک بھائی اپنے بھائی کے خون کا پیاسا بن کر آیا تھا۔ ہندہ اس ارادے سے آئی تھی کہ وہ حمزہؓ ابن عبدالمطلب کو قتل کر کے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک حبشی غلام کی خدمات حاصل کی تھیں۔ غلام کا نام وحشی تھا ہندہ نے غلام سے وعدہ کیا تھا کہ وہ حمزہؓ کو قتل کر دے تو وہ اسے آزاد کروا دے گی۔ وحشی نیزہ پھینکنے کے فن میں کافی مشہور تھا۔ اس طریقے سے مارنے کی رسم حبشہ کی تھی۔

قریش نے بھی اپنا علم عبدالدار قبیلہ کے کسی سردار کو دیا تھا۔ ایک دن پہلے ابوسفیان

Marfat.com

نے عبدالدار قبیلہ کے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے بنی عبدالدار، تم نے بدر کے موقع پر بھی ہمارا علم اٹھایا تھا۔ تم دیکھ چکے ہو کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ اس موقع پر یا تو اپنے علم کو کامیابی کے ساتھ تھامے رکھو یا اگر ایسا نہیں کر سکتے ہو تو علم ہمیں دے دو۔ ہم تمہیں ہر مصیبت سے محفوظ رکھیں گے۔ ہم وہ ہیں جو اس علم کو تمہیں سونپ رہے ہیں۔

یہ سن کر قبیلہ عبدالدار کے لوگوں نے جواب دیا کہ کل تم دیکھ لینا۔ ہم کس طرح سے لڑیں گے۔

دونوں فوجیں جب ایک دوسرے کے مقابل ہو کر ایک دوسرے سے قریب ہو رہی تھیں قریش کی عورتوں نے فوجوں کی صفوں کے پیچھے سے گانا شروع کیا کہ ہم حسین ہیں، ہم خوبصورت ہیں۔ آگے بڑھو۔ ہم سے بوس وکنار کی تم کو عام اجازت ہے۔ ہمارے معطر بستر تمہاری آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر تم جنگ سے کتراؤ گے تو ہم تم سے کترائیں گے ہماری محبت اور چاہت صرف بہادروں کے لیے ہے۔ آگے بڑھو۔

اب مسلمان اور قریش کی فوجیں آمنے سامنے ہو گئیں۔ علم کو بنی عبدالدار کا سردار طلحہ ابن عبدالعزیٰ نے تھام رکھا تھا۔ ابو سفیان کے طنز اور غیرت دلانے والے الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ کہتا تھا کہ ہے کوئی مسلمان جو مجھ سے مقابلہ کی جرأت کرے۔ علیؓ ابن ابی طالب بے اختیار آگے بڑھتے ہیں۔ اپنی تلوار کے ایک وار سے اس کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ قریش کا علم زمین پر گر جاتا ہے۔ حضرت علیؓ کے اس وار کو دیکھ کر مسلمان جوش سے اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہیں۔

عبدالدار کے لوگ تو لڑنے اور مرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ جیسے ہی طلحہ اپنے علم کے ساتھ نیچے گرتا ہے اس کا بھائی عثمان آگے بڑھ کر پھر سے علم کو اٹھا لیتا ہے۔ مقابلہ کی دعوت دیتا ہے۔ اس دفعہ حمزہؓ آگے بڑھتے ہیں اور کچھ دیر کی شمشیر زنی کے بعد حمزہؓ عثمان کو قتل کر دیتے ہیں۔ مشرکین کا علم پھر سے زمین پر گرا نظر آتا ہے۔

Marfat.com

عثمان کے قتل کے بعد عبدالدار کے اور تین آدمی یکے بعد دیگرے آگے بڑھتے ہیں۔ علم سنبھالتے ہیں۔ لڑتے ہیں تھوڑی ہی دیر میں مارے جاتے ہیں۔ پھر سے ان کا علم زمین بر س نظر آتا ہے۔

عین اس موقع پر مسلمان اپنی اپنی صفوں سے آگے بڑھ کر جوش و غضب سے دشمنوں پر اسی طریقے سے ٹوٹ پڑتے ہیں جیسے وہ بدر میں دشمنوں پر پل پڑے تھے۔

ابو دجانہؓ حضورؐ کی تلوار لیے ہوئے دشمنوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے میدان کے بیچوں بیچ سے دشمنوں کی اس آخری صف تک چلے جاتے ہیں جس کے پیچھے وہ عورتیں تھیں جو گلتے بجلتے ہوئے اپنے مردوں کو شجاعت اور بہادری سے لڑنے کے لیے اکسا رہی تھیں۔

عبدالدار کا ایک حبشی غلام قریش کے علمبردار سے علم چھین کر اپنی حمیت و غیرت کا مظاہرہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ مسلمانوں نے اس کے دونوں ہاتھ اس کے تن سے جدا کر دیئے۔ اس کے ہاتھوں میں تھما ہوا علم خون سے لت پت ہو کر نیچے گرنے ہی والا تھا کہ اس نے اس کو علم اپنے سینے پر لے لیا۔ مسلمانوں کی تلوار نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ مرتے وقت وہ کہہ رہا تھا کہ اے خدا کیا میں نے اپنے فرض میں کوئی کوتاہی کی ہے؟ یہ واقعہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ حبشی غلام کس طرح اپنے عرب آقاؤں کے وفادار اور ان کے لیے وقف ہوا کرتے تھے۔

اسی اثنا حضرت حمزہؓ اپنی شجاعت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ کافروں کو تہہ تیغ کیے جا رہے تھے۔ گھسان کی لڑائی اب شروع ہونے ہی والی تھی کہ عتبہ ابن ربیعہ کی بیٹی ہند نے وحشی کو دیکھ لیا۔ اس کے قریب گئی۔ کہا کہ نزدیک آ۔ پھر کہا کہ اے تاریکی کے باپ۔ ہمارے جذبہ انتقام کی لاج رکھ۔

وحشی کا اپنا بیان ہے کہ خدا کی قسم۔ میں حمزہؓ کو دیکھ رہا تھا کہ اپنی تلوار سے ایک

Marfat.com

کے بعد دوسرے کا قتل کیے ہی جا رہے تھے۔ کسی کو نہیں بخش رہے تھے۔ میں ان کی سمت بڑھتا گیا۔ جھاڑیوں اور پہاڑیوں کے پیچھے پیچھے سے اس طرح بڑھ رہا تھا کہ مجھے کوئی دیکھنے نہ پائے۔ میں نے اپنے نیزے کو زہرآلود کر لیا تھا۔ جب میں نے اپنے نشانہ پر حمزہؓ کو پایا تو فوراً نیزہ پھینکا۔ حمزہؓ کے جسم کے نچلے حصّے کو کاٹتے ہوئے نیزہ پیروں کے درمیان کے حصّہ میں نکلا۔ حضرت حمزہؓ لڑکھڑاتے ہوئے آگے کی طرف گر گئے اور بے ہوش ہو گئے۔ میں اپنا کام تمام کر کے لوٹ آیا۔ اس کے علاوہ تو مجھے کوئی اور کام نہیں کرنا تھا۔ جب ہم مکہ واپس ہوئے تو مجھے آزاد کر دیا گیا۔

حضرت حمزہؓ کی شہادت کے باوجود بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کو اس دن فتح نصیب ہو گی۔ مسلمانوں میں فتح کا جوش اور جذبہ تھا اس جذبہ سے وہ بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ دوسری طرف مشرکین میں سے بعض لوگ رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ اسی دوران وہ پچاس تیرانداز جن کو آنحضورؐ نے مختلف مقامات پر متعین کر دیا تھا اپنے اپنے مقام کو چھوڑ کر ان تلوار چلانے والوں میں شامل ہو گئے جو آگے بڑھ کر لڑ رہے تھے اور مالِ غنیمت پر قبضہ کرتے جا رہے تھے۔

قریش کے گھڑسواروں کی قیادت خالد ابنِ ولید اور عمرو ابن العاص کر رہے تھے ان دونوں نے دیکھ لیا کہ مسلمان تیرانداز اپنے اپنے مقام کو چھوڑ چکے ہیں اور مسلم فوج کی حفاظت کے بجائے اب وہ کسی اور ہی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ان گھوڑے سواروں کو موقع ملا۔ انہوں نے اپنے گھوڑوں کو دوڑا کر مسلمانوں کی آگے بڑھتی ہوئی صفوں کے پیچھے پہنچ کر جنگ شروع کر دی۔

چند مسلمانوں کے ساتھ حضورؐ بھی آگے بڑھتی ہوئی صفوں کے پیچھے پیچھے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ دشمنوں نے پیچھے سے حملہ کیا تھا۔ ان کو ابھی یہ نہیں معلوم تھا کہ حضورؐ بہ نفسِ نفیس ان ہی صفوں میں ہیں جن پر دشمن حملہ کر رہے تھے۔ بنی کنعانہ کا ایک

Marfat.com

آدمی ابن قمیہ مسلمانوں کے علم بردار مصعبؓ ابنِ عمیر پر قاتلانہ حملہ کرتا ہے اور مصعبؓ شہید ہو جاتے ہیں۔

مصعبؓ کو شہید کر کے وہ اس غلط فہمی میں رہتا ہے کہ اس نے حضورؐ کو شہید کر دیا ہے۔ فاتحانہ انداز سے نعرہ لگاتا ہے کہ محمدؐ شہید ہو گئے ہیں۔ میں نے محمدؐ کو شہید کر ڈالا ہے۔ ایک طرف اس کے ان نعروں اور چیخ و پکار سے اور دوسری طرف قریش کے مسلسل عقبی حملوں سے مسلمانوں میں ابتری پھیل گئی ان کی صفیں ٹوٹنے لگیں۔

حبشی غلام کے قتل کیے جانے کے بعد سے اب تک قریش کا علم گرد و غبار اور خون میں لت پت پڑا تھا۔ بنی عبدالدار کی ایک باہمت لڑکی امراء بنت القمہ آگے بڑھ کر گرے ہوئے علم کو اٹھا لیتی ہے۔ اس کو اونچا کرتی ہے۔ علم کو جیسے ہی مشرکین ایستادہ دیکھتے ہیں اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ مکہ کے مشرکین کا پلّہ اب بھاری ہو جاتا ہے اور وہ مسلمانوں پر جوابی حملہ شروع کر دیتے ہیں۔ مسلمان پناہ لینے کے لیے اُحد کی گھاٹیوں کا رُخ کرتے ہیں۔ اتنے حواس باختہ ہو جاتے ہیں کہ حضورؐ کے قریب سے گزرتے ہیں مگر پہچان نہیں سکتے۔ چند مسلمان آپ کو گھیرے رہتے ہیں۔ آپ بہ آواز بلند ارشاد فرماتے ہیں کہ "تم لوگ کدھر جا رہے ہو۔ واپس آؤ۔ میں خدا کا رسول ہوں۔"

مسلمان اتنے سراسیمہ ہو جاتے ہیں کہ حضورؐ کی یہ آواز ان تک نہیں پہنچتی۔

ڈاکٹر منٹگمری واٹ کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں یہ ابتری اور حواس باختگی ان کی تعداد کی زیادتی کی وجہ سے تھی۔ بدر میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی انہوں نے باوجود تعداد کی کمی کے جم کر جرات اور ہمت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس وقت اسلام غربت میں تھا مظلوم تھا۔ لوگ محض خلوص اور للّٰہیت کی خاطر لڑ رہے تھے۔

اُحد میں لڑنے والوں کی اکثریت ان لوگوں کی تھی جن کے پاس خلوص کا فقدان تھا مالِ غنیمت میں حصہ دار بننے کی خاطر انہوں نے جنگ میں شرکت کی تھی۔ جب لوگوں

نے سُنا کہ حضورؐ شہید ہو گئے ہیں ایک مسلمان انس ابن النضر نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جب رسول خدا شہید ہو گئے ہیں تو ہمارا کیا کام ہے۔ کیوں نہ ہم بھی مر جائیں تلوار لیے ہوئے میدانِ جنگ میں جاتے ہیں۔ کافروں سے خوب لڑتے ہیں۔ دائیں اور بائیں دونوں ہاتھ کا زور دکھاتے ہیں۔ زخموں سے چور چور ہو کر گر پڑتے ہیں۔

دشمن اس مقام پر آجاتے ہیں جہاں حضورؐ مع اپنے چاہنے والوں کے تشریف رکھتے تھے۔ اس چھوٹی سی جماعت پر پتھروں اور تیروں کی بارش کی جاتی ہے۔ حضورؐ کے چہرہ مبارک پر ایک پتھر آکر لگتا ہے اور آپؐ کا ایک دانت شہید ہو جاتا ہے۔

تلوار کا ایک وار آپ کے سر پر پڑتا ہے۔ چونکہ آپ خُود اوڑھے ہوئے تھے اس لیے وہ کٹ کر آنکھوں تک آجاتا ہے۔ آپؐ کے چہرے سے خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔

میری خاطر کون اپنی جان بیچنے کو تیار ہے؟ آپ نے حاضرین سے پوچھا۔ پانچ انصار اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔ حضرت طلحہؓ حضورؐ کے زخم کو صاف کرتے ہیں۔ یہ زخم اتنا گہرا تھا کہ زندگی بھر اس کا نشان چہرہ پر رہا۔ آپ زمین پر گر گئے۔ کافی خون بہتا رہا۔ کہ والے آپ کو پہچان نہ سکے۔ اب چاروں طرف مسلمان جمع ہو گئے۔ شجاعت اور مردانگی کے پیکر علیؓ ابن ابی طالب اور حضورؐ کے یارِ وفادار حضرت ابو بکرؓ فوراً حضورؐ کے پاس پہنچ گئے۔

حضرت طلحہؓ حضورؐ کو سہارا دے کر کھڑا کرتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ مل کر حضورؐ کو اُحد کی ڈھلوان پہاڑیوں پر سے لے کر نیچے اترتے ہیں اور ایک گھاٹی میں پناہ لیتے ہیں۔

حضرت علیؓ ابن ابی طالب زخم کو صاف کرنے کے لیے پانی لے آتے ہیں۔

حضورؐ فرماتے ہیں کہ "وہ لوگ کس طریقے سے کامیاب ہو سکتے ہیں جو اپنے

Marfat.com

رسول سے اس طرح پیش آتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کو اللہ کے لیے بلائے اور وہ فرار کی راہ اختیار کریں۔"

جنگ ختم ہو گئی۔ بہت سے مسلمان فرار ہو گئے۔ بکھرے ہوئے مسلمان اُحد کے میدان کی پہاڑیوں سے نیچے آ گئے۔

اُحد کے میدان میں قریش اب دندناتے پھر رہے تھے۔ ابوسفیان کی بیوی ہند مسلم شہدا کی لاشوں کی بے حرمتی کرتی پھر رہی تھی۔ لاشوں کا مثلہ کیا جا رہا تھا۔ جب ہند کو حضرت حمزہؓ کی نعش ملی تو اس نے کلیجہ نکالا اور چبانے کی کوشش کی۔ جب کھا نہ سکی تو اُگل دیا۔ شہیدوں کے اعضاء کے ہار گلے میں ڈالے پھر رہی تھی۔

کلیجہ چبانے کی رسم پرانی تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ کسی بہادر اور شجیع مرنے والے کا کلیجہ کھا لینے سے کھانے والے میں مرنے والے کی بہادری آ جاتی ہے۔

مسلمانوں نے جہاں پناہ لی تھی اس کے مقابل کھڑے ہو کر ابوسفیان نے کہا کہ جنگ میں فتح کنوئیں کے ڈول کی مثال ہے جو کبھی اوپر جاتا ہے اور کبھی نیچے۔ آج ہم نے بدر کا بدلہ لے لیا ہے۔ یہ کہہ کر نعرہ لگایا کہ اے ہبل اپنی طاقت کا مظاہرہ کر۔

حضورؐ نے عمرؓ بن خطاب کو جواب دینے کے لیے فرمایا کہ ہمارے شہیدوں کی جگہ جنت ہے۔ تمہارے مقتولوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ یہ سُن کر ابوسفیان نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ قریب آ کر اُس سے بات کریں۔ حضورؐ کی اجازت سے حضرت عمرؓ ابوسفیان کے پاس گئے۔ دونوں نے آپس میں باتیں کیں۔ ابوسفیان نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ کیا ہم نے محمدؐ کو واقعی قتل کر دیا ہے۔ خُدا کے لیے سچ سچ کہو۔

حضرت عمرؓ نے جواب دیا بخدا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے آپے سے باہر ہو کر ابوسفیان سے کہا کہ حضورؐ زندہ ہیں اور ہماری بات چیت بھی سُن رہے ہیں۔ جب حضرت عمرؓ یہ کہہ کر واپس جا رہے تھے، ابوسفیان نے حضرت عمرؓ کو پھر سے

آواز دی اور واپس آنے کے لیے کہا۔ جب حضرت عمر واپس آئے تو ابو سفیان نے کہا کہ تمہارے شہیدوں میں سے چند ایک کی بے حرمتی کی گئی ہے اور ان کی لاشوں کا مثلہ کیا گیا ہے۔ میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ ہم آئندہ سال تم لوگوں سے بدر میں پھر ملیں گے۔ قریش نے اپنے مقتولین کے ہتھیار جمع کیے۔ اونٹوں پر سامان لادا اور خود گھوڑوں پر پا بہ رکاب ہو گئے۔

Marfat.com

یادگار تاریخیں

حضورؐ کی پیدائش	۵۷۰ء
تبلیغ کی ابتداء	۶۱۳ء
مدینہ کو ہجرت	جون ۶۲۲ء
جنگِ بدر	مارچ ۶۲۴ء
اسماء بنت مروان کا قتل	مارچ ۶۲۴ء
بنی قینقاع کا اخراج	اپریل ۶۲۴ء
ابوسفیان کا حملہ	اپریل ۶۲۴ء
ذوالعمر کا حملہ	جون ۶۲۴ء
کعب بن اشرف کا قتل	جولائی ۶۲۴ء
بحران پر حملہ	اگست ۶۲۴ء
قردہ میں کاروانوں پر حملہ	ستمبر ۶۲۴ء
جنگِ اُحد	مارچ ۶۲۵ء

Marfat.com

حملے اور مسلمانوں کے لئے قواعد وضوابط

جس دن اُحد کی جنگ ہوئی مسلمانوں کی صفوں کے پیچھے اُحد کا پہاڑ تھا۔ ان کے سامنے قریش تھے۔ مسلمانوں اور مدینہ کے درمیان اب قریش حائل ہو گئے تھے اپنی فتح کے بعد مکہ کے لوگ اگر مدینہ کا رُخ کرتے تو شاید ان کو عبداللہ ابن اُبی کی حمایت حاصل ہو جاتی اور ساتھ ہی ساتھ یہودی بھی ان کے ہم نوا ہو جاتے۔ اس طرح جنگ کی فتح کے ثمرات سے وہ خاطر خواہ مستفید ہو سکتے تھے۔

دوسری صورت جو وہ اختیار کر سکتے تھے وہ یہ تھی کہ جہاں اُن کے کئی آدمی مارے گئے وہیں چند اور کی موت واقع ہوتی، اُحد کے پہاڑ پر چڑھ جاتے اور حضورؐ کا اور ساتھ ہی اُن جانثار مسلمانوں کا جو پروانوں کی طرح شمع محمدیؐ سے لپٹے ہوئے تھے خاتمہ کر دیتے۔ ابوسفیان نے جب حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ کیا محمدؐ شہید ہو گئے ہیں اور اُسے جواب دیا گیا تھا کہ بخدا نہیں۔ اس کے باوجود ابوسفیان نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

ہمارے اپنے زمانہ میں جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد ہر قسم کے سفاکانہ اور ظالمانہ سلوک اپنے دشمنوں کے ساتھ روا رکھے جاتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عرب قبیلے محض اپنے دشمنوں کی جان لینے یا ان کو نیست و نابود کرنے جنگ نہیں لڑتے تھے۔ بنی کنانہ اور چند ایک اور قبیلوں کے افراد کے علاوہ جتنے لوگوں نے بھی قریش کی

Marfat.com

طرف سے جنگ میں حصّہ لیا تھا اُن میں خانہ بدوش قبیلوں سے کوئی بھی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ قریش تاجر تھے۔ تجارت کے لیے امن بہرحال ضروری سمجھا جاتا تھا۔

قریش نے اُحد کی جنگ محض اس لیے لڑی تھی کہ بدر میں ان کے ۴۹ ، اور ۷۰ ، کے درمیان آدمی مارے گئے تھے۔ ان کو اپنے مقتولین کا بدلہ لینا تھا۔ اُحد کی لڑائی میں نتیجہ بدر کے برعکس ہوا۔ ۷۴ ، مسلمان شہید ہوئے۔ گو مشرکین کو فتح حاصل نہ ہوسکی لیکن وہ اپنا بدلہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔

ساتویں صدی عیسوی کے ایک عام عرب کے نزدیک مکمل اور کامیاب ترین فتح کے تصور سے بڑا اور اہم تصور بدلہ اور انتقام لینا تھا۔ مکہ کے ہر مکتبِ خیال نے اس بات کو کافی سمجھ لیا کہ انہوں نے بدر میں مارے جانے والوں کا بدلہ اچھی طرح سے لے لیا ہے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ان کو اس بات سے خوشی ہو رہی تھی کہ جس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ یہاں تک آئے ہیں اس میں انہیں کامیابی ہو گئی ہے ابوسفیان کا یہ کہنا کہ یہ بدر کا بدلہ ہے، مکہ والوں کی فکر و نظر کی ترجمانی کر رہا تھا۔

بے شک انہوں نے اس بات کو بھی ملحوظ رکھا ہو گا کہ مدینہ کی بستیوں پر حملہ کر کے ان پر قبضہ کر لینا ان کے بس کی بات نہیں۔ گو عبداللہ ابن ابی نے جنگ میں حصّہ نہیں لیا تھا لیکن مدینہ واپس ہو کر وہ شہر کی مدافعت کا بندوبست کر رہا تھا۔

عبداللہ ابن ابی کا یہ عمل اس کی ہوشیاری کا نتیجہ تھا۔ قریش اس بات کو ملحوظ رکھے ہوئے تھے۔ اس کا یہ عمل مسلمانوں کے لیے بہت ہی سودمند ہو جاتا اگر قریش مدینہ پر حملہ یا قبضہ کرنے کی کوشش کرتے۔

اُحد کے پہاڑ پر سے مسلمان یہ دیکھ رہے تھے کہ قریش اپنے سامان کو اکٹھا کر کے اونٹوں پر لاد رہے تھے۔ حضورؐ نے خطرہ کو بھانپتے ہوئے حضرت علیؓ کو مکہ والوں کے پیچھے پیچھے یہ دیکھنے کے لیے روانہ کیا کہ کہیں یہ لوگ مدینہ کا رُخ تو نہیں کر رہے ہیں۔

Marfat.com

حضرت علیؓ جب واپس آئے تو حضورؐ کو اطلاع دی کہ وہ لوگ مدینہ کی حدود کے باہر سے ہوتے ہوئے مکہ جانے کا راستہ اختیار کر چکے ہیں۔

اب مسلمان اپنی اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکلنے لگے۔ تھکے ماندے اور زخموں سے چُور مسلمان اپنے اپنے قرابت داروں کو گنج شہیداں میں ڈھونڈنے لگے۔

حضورؐ نے جب حضرت حمزہؓ کی لاش کی تلاش کی تو وہ مثلہ کی ہوئی ملی۔ اس دردناک منظر کو دیکھ کر قسم کھائی کہ وہ حمزہؓ کی نعش کے بدلہ میں ۳۰ قریشیوں کی نعشوں کا مثلہ کریں گے جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو آپ نے اپنی قسم کو توڑ دیا۔ مسلمانوں کو حکم دیا کہ آئندہ جنگوں میں کبھی بھی نعش کا مثلہ نہ کیا جائے۔

جنگِ اُحد میں ۷۴ مسلمان شہید ہوئے۔ ان میں ساٹھ اور ستر کے درمیان انصار تھے۔ چار یا پانچ مہاجرین تھے۔ ۲۲ مشرکین قتل ہوئے۔ حضورؐ نے مسلمان شہیدوں کی نماز جنازہ ادا کی اور پھر ان کو دفن کیا گیا۔

اسی اثنا میں کئی ایک مسلمان عورتیں مدینہ سے وہاں پہنچ گئیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئیں۔ زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ انہی کے ساتھ حضورؐ کی چچی صفیہؓ جو حمزہؓ کی بہن تھیں، اپنے بھائی کی شہادت کی خبر سن کر میدان میں تشریف لائیں۔ صفیہ زبیر بن العوام کی ماں بھی تھیں۔ زبیرؓ وہ ہیں جو حضورؐ کے جانثاروں میں شامل ہو کر اس موقع پر آپ کی حفاظت کر رہے تھے۔

حضورؐ نے اپنے منہ بولے بیٹے زیدؓ کو صفیہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ ان کے ذریعہ صفیہؓ کو کہلا بھیجا کہ وہ میدان سے واپس ہو جائیں تاکہ اپنے بھائی کی مثلہ کی ہوئی نعش نہ دیکھ سکیں۔ صفیہؓ نے جواب دیا کہ میں جانتی ہوں کہ میرے بھائی کی نعش کو مثلہ کیا گیا ہے۔ قدرت کی طرف سے جو کچھ بھی ہوا۔ اس پر میں راضی بہ رضا ہوں۔ میں اپنے آپ کو انشاءاللہ صابر رکھوں گی۔ سب کچھ دیکھ کر بھی اپنی زبان اور اپنے جذبات پر قابو رکھوں

Marfat.com

گی۔ یہ کہہ کر وہ خاموشی سے آگے بڑھیں اور اپنے بھائی کے جنازہ پر دعائے مغفرت پڑھی۔
آپ کی دعائے مغفرت کے بعد مسلمانوں نے تمام شہیدوں کو جنگ ہی کے میدان میں
دفن کیا اور تھکے ماندے مدینہ واپس ہوئے۔

دوسرے دن حضورؐ نے مدینہ کی تمام بستیوں میں اپنا نقیب روانہ کیا۔ وہ ان تمام لوگوں
کو حاضر ہونے کے لیے کہہ رہا تھا جو لڑنے کے لیے اُحد گئے تھے۔

آپ اُن تمام لوگوں کو لے کر دشمن کے تعاقب میں پھر نکلے اور مدینے سے کوئی پچاس
میل دور حمراۃ الاسد میں جا کر رُکے۔ آگ روشن کی گئی۔ تاثر یہ دیا گیا کہ ایک بہت ہی
بڑی فوج اس مقام پر آئی ہوئی ہے۔ یہ مسلمانوں کے حوصلے بلند کرنے کے بڑا ہی دانشمندانہ
قدم اٹھایا گیا تھا۔ جہاں ایک طرف مسلمانوں کے حوصلے بڑھانا مقصود تھا۔ وہیں قریش کو
یہ دکھلانا تھا کہ مسلمان ابھی ہارے نہیں ہیں۔

پہلے دن کا سفر ختم کرنے کے بعد رات میں قریش نے اپنا پڑاؤ ڈالا۔ اب وہ کفِ
افسوس مل رہے تھے کہ موقع ملنے کے باوجود انہوں نے مسلمانوں کا قلع قمع کیوں نہ کر ڈالا۔
لوگوں نے آوازیں لگانی شروع کیں کہ مدینہ واپس چلا جائے۔ فتح کو حتمی صورت دی جائے
اتفاق سے یہاں قبیلہ خزاعہ کا ایک بدوی جو مدینہ سے آرہا تھا اور حضورؐ کو معہ آپ کی
جماعت کے دیکھ چکا تھا مکہ والوں سے ملتا ہے اور مسلمانوں کی جماعت کے بارے میں
ذکر کرتا ہے۔ ابوسفیان اُس بدوی کو اپنے قریب بُلا کر اس سے تفصیلات دریافت
کرتا ہے۔

خزاعہ کے تعلقات مسلمانوں سے دوستانہ تھے۔ ابھی اُن کی اکثریت بُت پرست
تھی۔ اُس بدوی نے قریش کے سربراہوں سے کہا کہ مسلمان ایک بڑی فوج کے ساتھ قریش
کا پیچھا کر رہے ہیں اور اتنے غضب آلود ہیں کہ وہ اپنے شہیدوں کا بدلہ بہرحال لینا
چاہتے ہیں۔ قریش کی فوج نے جب یہ سُنا تو فوراً اپنا بوریہ بستر اٹھایا اور جلدی جلدی

Marfat.com

مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ رات میں کہیں سنسناہٹ خطرہ کا باعث سمجھا۔

بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں دنیا میں ایک بڑے تہلکہ کا باعث بن جاتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے اتفاقات دنیا کو ایک نئی موڑ پر لا کھڑا کر دیتے ہیں۔ اگر یہ بدوی ابوسفیان کے سامنے مسلمانوں کی اصل صورت حال رکھ دیتا تو شاید ابوسفیان اپنی بڑی فوج لے کر مسلمانوں کی جماعت کی تلاش میں نکلتا اور سب کو ہلاک کر دیتا۔

احد کی شکست کا جواز پیش کرنا اس وجہ سے بھی مشکل ہے کہ بدر کی فتح کو حضورؐ نے تائید غیبی کا نتیجہ قرار دیا تھا۔

قرآن کے سورہ آل عمران کی ۱۲۰ سے ۱۹۹ آیتوں میں تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کی اس شکست کا ذکر آیا ہے۔

متعلقہ آیات کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

"اور (دیکھو) بے دل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا۔ اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔"

"اگر تمہیں زخم (شکست) لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی ایسا زخم لگ چکا ہے اور یہ دن ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں۔ اس سے یہ مقصود تھا کہ خدا ایمان والوں کو متمیز کر دے اور تم میں سے گواہ بنائے۔ خدا بے انصافوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ بھی مقصود تھا کہ خدا ایمان والوں کو خالص (مومن) بنا دے اور کافروں کو نابود کرے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ (بے آزمائش) بہشت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی خدا نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو تو اچھی طرح معلوم کیا ہی نہیں اور (یہ بھی مقصود ہے) کہ وہ ثابت قدم رہنے والوں کو معلوم کرے۔ تم موت کے آنے سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے سو تم نے اس کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اور محمدؐ تو صرف پیغمبر ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو گزرے ہیں۔ بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟

اور جو لڑے پھرے گا تو خدا کا کچھ نقصان نہیں کر سکے گا۔ خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دیا یعنی اُس وقت جب کہ تم کافروں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ جو تم چاہتے تھے خدا نے تم کو دکھا دیا۔ اس کے بعد تم نے ہمت ہار دی اور حکم (پیغمبر) میں جھگڑا کرنے لگے۔ اس کی نافرمانی کی۔ بعض تو تم میں سے دنیا کے خواستگار تھے اور بعض آخرت کے طالب۔ اس وقت خدا نے تم کو ان سے پھیر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا۔ خدا مومنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ (وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے) جب تم لوگ دور بھاگے جاتے تھے اور کسی کو پیچھے پھر کر نہیں دیکھتے تھے اور رسول اللہ تم کو تمہارے پیچھے کھڑے بلا رہے تھے تو خدا نے تم کو غم پر غم پہنچایا تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہی یا جو مصیبت تم پر واقع ہوئی ہے اس سے رنجیدہ نہ ہو اور خدا تمہارے سب اعمال سے خبردار ہے۔

جو لوگ تم میں سے (اُحد کے دن) جب کہ (مومنوں اور کافروں کی) دو جماعتیں ایک دوسرے سے گتھ گئی تھیں بھاگ گئے تو ان کے بعض افعال کے سبب شیطان نے ان کو پھسلا دیا۔ مگر خدا نے ان کا قصور معاف کر دیا۔ بے شک خدا بخشنے والا اور بردبار ہے۔

مشرکین اور مسلمانوں کی اس باہمی رنجشوں اور مخالفتوں کا اثر ان قبیلوں پر پڑنا شروع ہوا جو مکہ اور مدینہ کے قرب وجوار میں رہا کرتے تھے۔

حضورؐ نے پہلے ہی سے خزاعہ اور جہینہ قبیلوں سے دوستانہ تعلقات استوار کر لیے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بنی کنعانہ کے بعض لوگ مکہ کے مشرکین کے ساتھ اُحد میں مسلمانوں سے لڑ چکے تھے۔ اُحد کے واقعہ کے دو مہینے بعد مئی ۶۲۵ء میں کچھ قبیلوں کے لوگ جو مکہ اور مدینہ کے درمیان رہا کرتے تھے۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان لوگوں نے درخواست کی کہ ان کے قبیلے کے لوگوں کو اسلام سے روشناس کروانے کے لیے کچھ مسلمانوں کو ان کے ساتھ ان کے علاقوں میں روانہ کیا جائے۔ حضورؐ نے ان کی اس دعوت کو قبول کر لیا

Marfat.com

چھ ایسے مسلمانوں کو ان کے ساتھ روانہ کیا جو لکھ پڑھ سکتے تھے۔ یہ جماعت آگے بڑھی۔ مکہ سے تیس میل کے فاصلے پر پانی لینے کے لیے یہ لوگ رک گئے۔ اس مقام پر عضل قبیلے کی ایک شاخ بنی لحیان نے اس جماعت پر حملہ کیا۔ چھ مسلمانوں میں سے تین شہید کیے گئے۔ تین کو حراست میں لے لیا گیا۔ ان تین میں سے بھی ایک مسلمان شہید کیا گیا جو فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ باقی دو جو رہ گئے تھے ان میں سے ایک خبیب ابن عدی تھے اور دوسرے زید ابن دثنہ ان دونوں حضرات کو قریش کے ہاتھوں بیچ دیا گیا۔

الحارث ابن عامر ابن نوفل کے خاندان والوں نے خبیبؓ کو خریدا۔ الحارث جنگ بدر میں خبیب کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ الحارث کے لوگ حضرت خبیبؓ کو قتل کرنے کے لیے مکہ کے باہر ایک ایسے مقام پر لے گئے جو اس غرض سے استعمال میں لایا جاتا تھا اور مقدس بھی سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنے قاتلوں سے درخواست کی کہ قتل سے قبل ان کو دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ ان کی درخواست منظور کی گئی۔ اسی واقعہ کے بعد سے مسلمانوں میں یہ روایت چل پڑی کہ اگر کوئی مسلمان قتل ہو رہا ہو تو اپنے قتل سے قبل دو رکعت نماز پڑھ لے۔

جب حضرت خبیب نے اپنی نماز کی تکمیل کر لی اور اپنے جذبہ عبودیت کو سرشار کر لیا تو ان کو صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ رومی صلیب پر چڑھا کر کیلیں ٹھونکا کرتے تھے۔ عرب رسی سے باندھ دیتے تھے۔

ان کو باندھ کر جب صلیب کو اونچا کیا گیا تو ہونے والے مصلوب نے زور زور سے کہنا شروع کیا۔ اے اللہ، تو ان سب سے اپنا حساب لے جو آج یہاں جمع ہیں۔ ان کو ایک ایک کر کے نیست و نابود کر۔ ان میں سے کوئی بھی بچنے نہ پائے۔

اس موقع پر ابوسفیان بھی اپنے بیٹے معاویہ کے ساتھ یہاں تھا۔ معاویہ کا لڑکپن تھا۔ اس واقعہ کے ۴۰ سال بعد حضرت معاویہؓ مسلمانوں کے خلیفہ بنتے ہیں اور عالم اسلام

Marfat.com

پر اس طرح حکومت کرتے ہیں کہ روئے زمین پر اس وقت ان سے بڑا کوئی اور بادشاہ یا حکمران نہیں تھا۔

حضرت معاویہؓ اپنی ذہنی یادداشت کو تازہ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ جب خبیب نے صلیب پر سے کوسنا شروع کیا تو ان کا باپ ابوسفیان غصہ سے آگ بگولہ ہو گیا حضرت خبیب کو صلیب پر سے زمین پر دے پٹکا۔ ابوسفیان کا مقصد یہ تھا کہ خبیب کی بددعا کا شکار سب سے پہلے وہ خود ہوں۔

الحارث کا کم سن بیٹا عتبہ اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے حضرت خبیب کے قریب لایا گیا۔ بچے کے ہاتھ میں ایک نیزہ دیا گیا اور اس کے بازو ایک اور آدمی کو کھڑا کیا گیا۔ بچے کے ہاتھ پر اس آدمی کا ہاتھ رکھ کر نیزہ حضرت خبیب کو چبھایا جانے لگا حتیٰ کہ خبیب کی روح نفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

دوسرے قیدی زید تھے۔ ان سے اُمیہ ابن خلف کا بدلہ لیا گیا۔ زید نے اُمیہ بن خلف کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا تھا۔ حضورؐ نے ایک اصول یہ بھی وضع فرمایا تھا کہ خون بہا دینے کے لیے سارے مسلمان ایک خاندان تصور کیے جائیں اسی لیے زید مسلم خاندان کے ایک فرد قرار دیئے گئے حالانکہ امیہ کے قتل سے ان کو دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

اس قسم کے سفاکانہ اور بہیمانہ قتل پھر ایک بار اس تضاد کو پیش کرتے ہیں جو عربوں میں پائے جاتے تھے۔ ایک طرف تو ان کی بہادرانہ اور جراءت مندانہ لڑائیاں تھیں اور دوسری طرف خون کا بدلہ لینے کے لیے ہر قسم کی سفاکانہ حرکت اختیار کرنے پر وہ تیار رہتے تھے۔

ابوسفیان نے اُحد کے میدان میں عمرؓ ابن الخطاب سے بالمشافہ بات کی تھی۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کے رشتہ دار کو قتل نہیں کیا تھا۔ اس کے برخلاف ابوسفیان کی بیوی ہند نے حضرت حمزہؓ کی نعش کی بے حرمتی کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت حمزہؓ نے ہند کے باپ عتبہ کو قتل کیا تھا۔ اسی طرح یہاں ایک بچہ کو اکسایا گیا کہ اپنے باپ کے قتل

Marfat.com

کا بدلہ لے۔

قبیلہ عضل نے مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ غداری کی تھی۔ ان کو غداری کا مزہ چکھانے کے لیے حضورؐ نے ایک مسلمان کو روانہ کیا۔ جون ۶۲۵ء میں اس مسلم سرفروش نے اس قبیلہ کے سردار کا سر قلم کر دیا۔

دو آدمی ابو سفیان کے قتل کے لیے مکہ روانہ کیے گئے۔ ایک تو مکہ ہی کا آدمی تھا اور دوسرا انصار میں سے تھا۔ مکہ کا آدمی تو راستہ میں پہچان لیا گیا۔ جیسے ہی اُسے پہچانا گیا اس نے چیخ و پکار اور آہ و زاری شروع کر دی۔ اس طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اس کا پیچھا کرنے والوں میں سے ایک مارا گیا۔ واپسی میں اس نے دو بت پرستوں کو قتل کیا ایک آدمی کو قیدی بنا کر حضورؐ کی خدمت میں لے آیا۔ حضورؐ نے اس کی تعریف فرمائی۔

حضورؐ کے احکام پر کسی کا قتل کرنا یا قتل ہونا ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بن کر رہ گیا ہے چند مغربی مصنفین نے اس قسم کے قتل کو سیاسی استبداد سے تعبیر کیا۔ بعض یہ کہہ کر اس عمل کی حمایت کرتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی میں یہ ایک عام طریقہ اور عربوں کا شعار تھا۔

ان دونوں میں سے کسی کا بھی نظریہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ بظاہر تو اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ لوگوں کو قتل کرنا واقعی عربوں کا شعار تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سارے لوگ تشدد اور بہیمانہ طریقے سے قتل کا شکار ہوتے تھے لیکن ان کی دو بڑی وجوہ رہی ہیں۔

ایک تو غصہ میں آپے سے باہر ہو کر کسی کا قتل کر دینا یا میدانِ جنگ میں مقابلہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کوشش کرنا۔

ان دونوں صورتوں میں خاندانی بنیادوں پر قاتل سے بدلہ بہر حال لیا جاتا تھا۔ قاتل کو اور اس کے رشتہ داروں کو اپنی زندگی کی میعاد کم نظر آنے لگتی تھی۔ بدلہ لینے کا تصور اتنا گہرا ہوتا تھا کہ قتل کرنے سے قبل قاتل کو کئی بار سوچنا پڑتا تھا۔ اسی لیے کسی کا قتل کرنا ان کے ہاں بظاہر اتنا آسان نہیں تھا۔

Marfat.com

حضورؐ کی ساری زندگی میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں ملتا کہ کسی نے حضورؐ کو قتل کرنے کے ارادہ سے کسی کو روانہ کیا ہو یا خود اس کی کوشش کی ہو۔ دو آدمیوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ قتل کرنے کے ارادہ سے حضورؐ تک پہنچے مگر جیسے ہی قریب پہنچے ان کے اوسان خطا ہو گئے اور ان کی نبض چھوٹ گئی۔ قتل کی ہمت نہ کر سکے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ جب مکہ میں رہتے تھے کس طرح آپ کا خاندان آپ کو ہر قسم کے شر و فساد سے محفوظ رکھتا تھا۔ خاندان والوں ہی کے ڈر سے مکہ کے مشرکین آپ کے ساتھ کسی بھی تشدد سے پیش نہیں آتے تھے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضورؐ جب مدینہ میں تشریف رکھتے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ مکہ والوں کی خوش حالی کا دیوالیہ نکل جائے کہیں یہ ذکر نہیں ملتا کہ قریش کے لوگوں نے کسی شخص کو روانہ کر کے حضورؐ کو قتل کرنے کی کوشش کی ہو۔

اس کے برخلاف مسلمانوں نے ابو سفیان کو قتل کرنے کے لیے لوگوں کو مکہ روانہ کیا۔ دشمنوں نے آپ کو قتل کرنے میں جو اجتناب کیا اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے نزدیک ایسا کرنا گناہ تھا۔ ان کو ایسا کرنے سے آپ کے خاندان کا خوف مانع تھا۔

ابن قیمہ کا یہ کہنا کہ اُحد کی جنگ میں وہ قتل کر سکتا تھا چرب زبانی اس لیے نہیں تھی کہ اس کا تعلق قریش سے نہیں تھا بلکہ بنی کنعانہ سے تھا۔

حضورؐ نے قریش کے لوگوں کے خلاف جو قدم اٹھایا وہ آپ کی جرات اور ہمت کا نتیجہ تھا۔ آپ خاندانی ڈر اور حفاظت کے جذبہ کو پسِ پشت کرنا چاہتے تھے جس کا سہارا لے کر قریش کے لوگ آپ کے خلاف قدم اٹھانے سے ڈرتے تھے۔

مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جانے والے اب وہ لوگ تھے جو اسلامی تحریک کے مخالف تھے۔ حضورؐ سے ذاتی مخاصمت ان کے قتل کا باعث نہ تھی۔ نہ ہی آپ کا کسی کو پسند نہ کرنا اس کی موت کا باعث بنا۔ یہی وجہ تھی کہ عبداللہ ابن اُبی کو قتل کرنے کی کوئی کوشش

Marfat.com

نہیں کی گئی اس لیے کہ وہ بظاہر مسلمان ہو چکا تھا۔

خاص طور پر اس اصول کا اطلاق یہودیوں پر ہوتا تھا۔ حضورؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے وہ شرطیں عاید نہیں کی تھیں جو بُت پرستوں کے لیے تھیں۔ ان کو اپنا مذہب بدلنے کے لیے مجبور نہیں کیا گیا تھا۔

مدینہ کے تین یہودی قبیلوں کو شہر بدر کرنے کے بعد بھی کافی تعداد میں یہودی مدینہ میں رہا کرتے تھے۔ اپنے کاروبار کو بغیر کسی روک ٹوک کے جاری رکھے ہوئے تھے۔ یہودی قبیلوں کو جو شہر بدر کیا تھا وہ اس لیے نہیں کہ آپ کو یہودیت یا عیسائیت سے نفرت تھی۔ اس لیے ان کو نکالا گیا کہ وہ اسلام کی تعلیمات کو شک اور شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہر بات میں توریت کے قصص کو بیان کر کے آپ کی تعلیمات میں نقص نکالا کرتے تھے۔

اس بات کو قبول کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کی کہ اس وقت سے لے کر آج تک اس قسم کے قتل مسلم معاشرے کا جزو بنتے گئے اور اپنا دور رس اثر چھوڑتے گئے۔ مسلم ممالک میں سیاسی نوعیت کے قتل اکثر و بیشتر ہوتے رہے ہیں۔

رجیع کے سانحے کے کچھ عرصہ بعد ایک نئی کروٹ لی۔ مئی یا جون ۶۲۵ء میں نجد کا ایک سردار ابو براء حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ ایک ضعیف العمر آدمی تھا۔ ہوازن کی ایک شاخ بنی امیر ابن ساسا کا سردار بھی تھا۔ اس نے کہا کہ اگر اس کے قبیلے کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر رضامند کر لیا جائے تو وہ بھی اسلام قبول کر لے گا۔ اس نے حضورؐ سے درخواست کی کہ کچھ مسلمان نجد روانہ کیے جائیں تاکہ وہ لوگوں کو اسلام سے روشناس کرائیں۔

الرجیع میں چونکہ مسلمانوں کو، جو اسی مقصد کے لیے روانہ کیے گئے تھے، شہید کر دیا گیا تھا اس کے پیش نظر حضورؐ اس کی درخواست پر رضامند ہونے سے تامل فرماتے ہے

Marfat.com

تھے۔ ابو براء نے وعدہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو اپنی حفاظت اور نگرانی میں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ابن اسحاق کے بیان کے مطابق چالیس مسلمانوں کو اس کے ساتھ کر دیا گیا۔ طبری نے ان کی تعداد ستر بیان کی ہے۔ واقدی نے چالیس اور ستر دونوں کا ذکر کیا ہے۔

مدینہ کے جنوب مشرق میں ۵۰ میل کے فاصلے پر بیر معونہ کے قریب یہ جماعت رُکی۔ اس جماعت پر بنی سلیم نے حملہ کیا۔ حملہ پر اکسانے والوں میں امیر ابن طفیل تھا جو ابو براء کا بھتیجہ تھا۔ مسلمانوں نے آخر دم تک مقابلہ کیا اور شہید ہوتے۔ اس دوران دو آدمی اپنے اونٹوں کو چرانے کے لیے بیر معونہ سے کچھ دور نکل گئے۔ جب واپس ہوئے تو دیکھا کہ تمام مسلمان اور بنی سلیم کے اکثر لوگ مرے پڑے ہیں ان میں سے ایک نے کہا کہ دشمنوں کی نظر ہم پر نہیں پڑی ہے اس لیے ہم کو سیدھے مدینہ جانا چاہیئے اور حضورؐ کو مطلع کرنا چاہیئے۔ دوسرے نے کہا کہ اس کے تمام ساتھی شہید ہو چکے ہیں اب وہ زندگی میں لذت حاصل نہیں کر سکے گا۔ یہ کہہ کر اس نے خودکشی کر لی۔

بیر معونہ پر جو مسلمان شہید ہوئے تھے۔ ان میں ایک عامر ابن فہیرہ بھی تھے یہ وہی عامر ہیں جن کو حضرت ابوبکرؓ نے غلامی سے چھڑوا کر آزاد کروایا تھا اور ہجرت میں یہ حضورؐ اور ابوبکرؓ کے ساتھ تھے، بیر معونہ کے قتل سے بچا ہوا واحد مسلمان جب مدینہ واپس ہو رہا تھا اس کو راستے میں ابو براء اور عامر ابن طفیل کے قبیلوں کے دو افراد ملے۔ یہ دونوں جو مدینہ سے آرہے تھے بیر معونہ کے واقعے سے بالکل لاعلم تھے، ان کے ساتھ کوئی مسلح نگراں کار بھی نہیں تھا۔ عامر نے اپنے ساتھی شہیدوں کا بدلہ لینے کے لیے ان دونوں افراد کو قتل کر دیا۔ حضورؐ نے اس کی اس حرکت کو سخت ناپسند فرمایا۔

ابو براء اور قبیلہ عامر کے لوگوں سے حضورؐ کے دوستانہ تعلقات تھے۔ انہوں نے خود حضورؐ سے درخواست کی تھی کہ اسلام کی تبلیغ کے لیے مسلمانوں کو ان کے قبیلوں

Marfat.com

میں روانہ کیا جائے۔

ابو برہ کا بھتیجہ اپنے چچا کے اس اقدام کو جو اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں تھا بذاتِ خود ناپسند کرتا تھا۔ اس کے قبیلے کے لوگ اس کے ہم خیال نہیں تھے۔ اس کی مدد یا حمایت کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ بالآخر اس نے بنی سلیم کو بہکا کر مسلمانوں کی قتل و غارت گری کے لیے آمادہ کیا۔

چونکہ بنی سلیم نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا اس لیے بدلہ اب بنی سلیم سے لینا تھا حضورؐ دانشمندی کے پیشِ نظر بنی عامر سے اب کوئی خصومت نہیں مول لینا چاہتے تھے۔ بنی عامر خود مسلمان ہونے کے قریب تھے۔ طے یہ ہوا کہ مقتولین کا خون بہا مسلمان ادا کریں۔

چار مہینوں کے اندر باہر مسلمانوں کو یکے بعد دیگرے تین ناگہانی حادثات سے دوچار ہونا پڑا۔ اُحد کا واقعہ، الرجیع میں مسلمانوں کا شہید ہونا، پھر اس کے بعد بیر معونہ میں مسلمانوں کا جانی نقصان۔

"تاریخ میں کہیں اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ ان واقعات کی وجہ سے آپ پست ہمت ہوئے ہوں یا مسلمان ان حادثات سے دل برداشتہ ہو کر دین سے برگشتہ ہوئے ہوں۔ اس کے برخلاف یہ ضرور ہوا کہ مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کرنے اور کافروں کو یہ بتلانے کے لیے کہ مسلمان اُن سے ڈرنے والے نہیں، حضورؐ نے ایک فتح مندانہ قدم اٹھانے کی ضرورت محسوس کی۔ اُحد کی جنگ کے بعد عرب کے مختلف قبیلوں میں قریش نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ اب مسلم تحریک زوال پذیر ہے اور مستقبل قریب میں اسلام ختم ہو جائے گا۔"

بنی عامر کے جن دو لوگوں کو قتل کیا گیا تھا ان کا خون بہا ادا کرنے کے لیے حضورؐ نے مسلمانوں سے رقم جمع کی۔

حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کو اپنے ساتھ لیے حضورؐ بنو نضیر کے

Marfat.com

یہودیوں کی بستی میں تشریف لے گئے۔ ان سے مالی امداد کی درخواست کی۔ یہودیوں نے خندہ پیشانی سے حضورؐ کا استقبال کیا اور مالی مدد اور تعاون پر رضامندی ظاہر کی۔

ابن اسحٰق کے بیان کے مطابق اس موقع پر یہودیوں نے آپس میں مشورہ کرنا شروع کر دیا کہ حضورؐ کو جان سے مار ڈالنے کا یہ سنہرا موقع ہے۔ اس کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ حضورؐ اس وقت کھلے میدان میں ایک گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر تشریف فرما تھے ایک یہودی عمر ابن جحاش اس بات کے لیے تیار ہوا کہ وہ گھر کی چھت پر چڑھ کر اوپر سے سرمبارک پر ایک بڑا پتھر پھینکے۔ مسلمان یہودیوں کی اس سازش سے واقف ہو گئے۔

ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ حضورؐ کو غیب سے اس خطرہ سے آگاہ کر دیا گیا تھا آپ فوراً وہاں سے اٹھ کر باغ کی طرف تشریف لے گئے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ وہیں ٹھہرے رہیں۔

حضورؐ وہاں سے مدینہ تشریف لے گئے۔ مسلمانوں کو جمع کیا اور یہودیوں کی سازش کو بیان کر کے کہا کہ بنی نضیر سے جنگ کرنی چاہیئے۔

یہودیوں نے اپنے آپ کو اپنے قلعہ بند قسم کے گاؤں میں محصور کر لیا۔

عبداللہ ابن ابی اور اس کے ہم خیالوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے بنی نضیر کے یہودیوں سے کہا کہ وہ مسلمانوں کے حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور وہ ان کی مدد کے لیے تیار ہیں۔ بنی نضیر کاشت کار تھے۔ ان کی بستیوں کے آس پاس بہترین قسم کے کھجور کے باغات تھے۔

حضورؐ نے حکم دیا کہ سزا کے طور پر ان کے کھجوروں کے درخت کاٹ ڈالے جائیں بنی نضیر اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر سے واویلا مچا رہے تھے اور کہتے تھے کہ اے محمدؐ آپ ہی نے تو ہمیں تباہی و بربادی سے منع کیا تھا۔ اب آپ کیوں ہمارے کھجور کے درختوں کا ناس کر رہے ہیں۔

Marfat.com

بظاہر یہ بات تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ ان باغات کی تباہی کا حکم دیا تھا جب کہ وہی باغات مسلمانوں کی خوش حالی کا باعث بن سکتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ اس بات کا خطرہ محسوس فرمارہے ہوں کہ عبداللہ ابن اُبی یہودیوں کی مدد کے لیے آرہا ہو۔ اس کی مداخلت کی وجہ سے شاید یہودیوں سے کوئی فیصلہ کن جنگ ہو۔ آپ کے اس فیصلہ پر کسی بھی قسم کے اعتراض کو قرآن نے رد کر دیا ہے

سورہ حشر کی پانچویں آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

" آپ نے جن کھجوروں کے درختوں کو کاٹ دیا ہے یا جنہیں باقی رکھا ہے وہ سب خدا کے حکم سے کیا ہے اور مقصد یہ تھا کہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔

ستمبر ۶۲۵ء میں یہ محاصرہ ختم ہوا۔ بنی نضیر نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیئے کہ وہ مدینہ سے ہجرت کر کے شام چلے جائیں گے۔ سارا اثاثہ اپنے ساتھ لے جائیں گے اور اپنے ہتھیار مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے۔

سورہ حشر میں بیان فرمایا گیا ہے۔

" وہی تو ہے جس نے کفار اہل کتاب کو حشر اوّل کے وقت ان کے گھروں سے نکال دیا۔ تمہارے خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور وہ لوگ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اُن کے قلعے ان کو خدا (کے عذاب) سے بچالیں گے۔ مگر خدا نے ان کو وہاں سے آلیا۔ جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی کہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں اور مومنوں کے ہاتھوں سے اُجاڑنے لگے۔ اے آنکھیں رکھنے والو عبرت پکڑو۔ اگر خدا نے ان کے بارے میں جلاوطن کرنا نہ لکھ رکھا ہوتا تو ان کو دنیا میں بھی عذاب دیدیتا اور آخرت میں تو ان کے لیے آگ کا عذاب تیار ہے۔

بنی نضیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شام جاتے وقت اپنی ایک ایک چیز لیتے گئے حتیٰ کہ اپنے گھروں کے دروازے تک اُکھاڑ کر لے گئے۔ ان کے دو سردار سلام ابن ابی الحقیق

Marfat.com

اور حیؓ ابن اخطب نے خیبر میں رہائش اختیار کی۔

یہودیوں نے جلتے وقت اچھا تاثر چھوڑنے کی خاطر مدینہ میں ایک خوشگوار فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بانسریوں کی بین اور لڑکیوں کے ناچ میں یہ لوگ رخصت ہوئے۔ ان میں سے دو یہودیوں نے اسلام بھی قبول کر لیا اور مدینہ ہی میں رک گئے۔ اپنی ساری جائیداد کو اپنے ہی قبضے میں رکھا۔

بنی نضیر کا مسئلہ بغیر کسی خون خرابے کے اپنا آپ طے ہو گیا۔ ان کی چھوڑی ہوئی ملکیت کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ امن کی صورت میں حاصل کیا ہوا مال پیغمبر کی ملکیت ہوتا ہے اور رسول جس کو چاہیں یہ مال دے سکتے ہیں۔ اس تقسیم میں دو انصار شریک کیے گئے اور بقیہ مہاجرین تھے۔

مکے کے جو لوگ بے سرو سامانی کی حالت میں مدینہ آئے تھے اب دن بہ دن مال دار بنتے جا رہے تھے۔

اُحد کی جنگ کے بعد ابوسفیان نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ آئندہ سال وہ مسلمانوں سے بدر کے میدان میں پھر ملے گا۔ حضورؐ نے اس کے اس چیلنج کو منظور کر لیا۔

اپریل ۱۲۶ء میں مسلمانوں کی ایک جماعت بدر روانہ کی گئی۔ ابوسفیان بھی اپنی کہی ہوئی بات کو بھولا نہیں تھا۔ ایک لڑنے والی جماعت کو لے کر مکہ سے نکلا۔ آدھے راستے تک آنے کے بعد پھر وہ مکہ واپس لوٹ گیا۔ اس کی کیا وجوہ تھیں۔ ہمارے علم میں نہ آسکیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بہانہ کیا کہ بارش کی کمی کی وجہ سے گھاس نہیں ہے چارہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے جانوروں کے مرجانے کا امکان تھا۔

مسلمانوں کا بدر جانا اور قریش کا چیلنج کر کے بدر نہ آنا مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کرنے میں بڑا معاون ثابت ہوا۔ اُحد کی جنگ کے بعد مقامی قبائل کا مسلمانوں سے طرزِ عمل یہ تبلا رہا تھا کہ وہ اس خیال خام میں تھے کہ قریش کو مکمل فتح ہو کر رہے گی۔

Marfat.com

اب پندرہ سو مسلمان بدر کے میدان میں قریش کا انتظار کر رہے تھے اور قریش کا وہاں کوسوں پتہ نہیں تھا۔

خاص طور پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اُحد کی شکست اور بعض دوسرے ناموافق حالات ظہور میں آنے کے باوجود حضورؐ سنہ ۶۲۶ء میں بدر تشریف لے جاتے ہیں۔ اپنے ساتھ اُس سے دگنے آدمی لے جاتے ہیں جتنے آپ اُحد میں لے کر گئے تھے۔ آدمیوں کا زیادہ ہونا خود اس بات کی دلیل تھی کہ اسلام میں دن بہ دن لوگ جوق در جوق داخل ہو رہے تھے۔

سلام ابن ابی الحقیق جس کو ابو رافع کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہودیوں کا سردار تھا اس نے دوسروں کے ساتھ شام کو ہجرت نہیں کی تھی بلکہ خیبر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مئی سنہ ۶۲۶ء میں مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت نے اس کو ختم کر ڈالا۔

مئی یا جون سنہ ۶۲۶ء میں حضورؐ مسلمانوں کی ایک جماعت کو لے کر غطفان پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ مسلمان ذات الرقاع تک پہنچے جو مکہ کے شمال مشرق میں مکہ سے ۶۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں پر بنی غطفان کی ایک طاقتور جماعت سے مسلمانوں کا سامنا ہوا۔ لڑائی نہیں ہوئی۔ دونوں جماعتیں ایک دوسرے سے خائف تھیں۔ دونوں نے دو مختلف راستے اختیار کیے۔ کہا جاتا ہے کہ نمازِ خوف پڑھنے کی ابتدا حضورؐ نے اسی مقام پر کی۔ یہ نماز آگے چل کر مسلمانوں میں عام ہو گئی۔

اس موقع پر آدھے مسلمان باجماعت نماز پڑھتے تھے اور بقیہ آدھے ہتھیار بند ہو کر نماز پڑھنے والوں کی حفاظت کرتے تھے۔

جب کبھی بدوی قبیلے مسلمانوں کے خلاف جمع ہونے لگتے، مسلمانوں کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ خواہ مخواہ ان سے نہ لڑا جائے۔ مسلمان ان سے لڑنے میں پس و پیش کرتے خصوصاً ان اوقات میں جب کہ حضورؐ بھی مسلمانوں کے ساتھ ہوں۔ حضورؐ کی موجودگی میں مسلمانوں کا غیر ضروری لڑائیوں سے احتراز کرنا اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ آپ کو بے مقصد اور بے معنیٰ

Marfat.com

لڑائیاں ناپسند تھیں۔ خون خرابے سے آپ کو نفرت تھی۔ جب کبھی دشمنوں سے آپ کو واسطہ پڑتا تو آپ کی کوشش ہوتی تھی کہ ان سے بات چیت کی جائے۔ افہام و تفہیم ہو، غلط فہمیوں کو دور کیا جائے۔ حقیقت کا انکشاف کیا جائے۔ اگر یہ طریقے ناکام ہو جاتے تھے تو پھر آپ ان سے دستبردار ہو جاتے تھے۔

جب کبھی حضورؐ مسلمانوں کے درمیان ہوتے تو مسلمان لڑائی جھگڑے پر تیار نہیں دکھائی دیتے تھے۔ محض اس خوف سے کہ کہیں ان کی لڑائی کا اثر آپ پر نہ پڑے اور ذات گرامی پر کوئی آنچ نہ آئے۔

یہ بات وہ محسوس کرتے تھے کہ ذات گرامی کا خطرے میں آجانا پوری اسلامی تحریک کو خطرے میں ڈال دینے کا باعث بن سکتا تھا۔

بدوی قبائل سے افہام و تفہیم کا طریقہ استعمال کرتے ہوئے اور ان سے لاحاصل جنگ نہ کرکے حضورؐ نے قبائلی بنیادوں پر قتل و غارت گری کو ناممکن بنا دیا تھا۔ اس قسم کی جنگوں میں محض خون کا بدلہ لینے کی خاطر قتل پر قتل ہوا کرتے تھے۔ اس کا سلسلہ لامتناہی ہوتا تھا۔

اُن لوگوں کے درمیان جس قسم کے معرکے ہوتے تھے اُن پر انگریزی کے لفظ WAR یعنی جنگ کا اطلاق مغربی ذہنوں میں یہ شک پیدا کرنے لگتا ہے کہ اس زمانے کے خانہ بدوش بزدل اور پست ہمت تھے۔ جب ان پر حملے ہوتے تھے تو وہ جم کر مقابلہ نہیں کرتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اُن کی آپس کی چپقلشوں کا مطمع نظر ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ قبائل آپس میں ایک دوسرے سے نفرت کبھی نہیں کرتے تھے۔ ایک دوسرے پر حملہ کرنا ان کا ایک شغل تھا، بیکاری کا مشغلہ تھا۔ دل بہلانے کا ذریعہ تھا۔ جہاں مطمح نظر یہ ہو تو ان کی آپس کی نیزہ بازی، تیر اندازی یا تلواروں کی چمک کو جنگ کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

جس طریقے سے مسلمانوں نے بدویوں کے حملوں سے گریز کرتے ہوئے انسانی جانوں

کی حفاظت کی یہ بات قریش کے حملے کے وقت نہ ہو سکی۔

بدر اور اُحد کی جنگوں میں آدمی کو زیادہ نہیں مرے اس کے باوجود یہ جنگیں میدانِ جنگ میں جم کر لڑی گئیں۔ ان جنگوں کی نوعیت بدوی قبیلوں کے حملوں سے بالکل جداگانہ تھی۔ ان دونوں جنگوں میں نہ تو مسلمان ایک شغل کی خاطر قریش سے لڑے اور نہ ہی قریش نے دل بہلانے کی خاطر مسلمانوں سے جنگ کی۔ ان جنگوں کا واحد مقصد طاقت کا حصول تھا۔ طاقت کے حصول کی خواہش ہی انسان سے سب کچھ کرواتی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان اپنے مذہب اور اس کی بقا کی خاطر جنگ لڑ رہے تھے۔ یہی وہ جذبہ تھا جو ان کو جنگ کے لیے اُکسا رہا تھا۔

ان ہی دو جذبوں کو سامنے رکھ کر وہابیوں نے بھی ۱۹۲۰ء میں ایک قیامت برپا کر دی تھی۔ وہابیوں نے مذہب کی خاطر جنگ کی۔ وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ عہدِ اوّل کے مسلمانوں کی وہ بازگشت ہیں۔

عرب میں ان کی جنگوں کی وجہ سے بہت ہی خون خرابہ ہوا۔ ان لوگوں نے حملوں کے وہی طریقے اختیار کیے جو تیرہ سو سال پہلے عربوں میں رائج تھے۔ ان کے حملے بھی ایک شغل کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ غیر وہابی قبائل ان کے حملوں کا شکار ہوتے تھے۔ جنگ کے دونوں طریقوں کو یکجا کر کے ان وہابیوں نے بیسویں صدی میں عرب میں وہی صورتحال پیدا کر دی تھی جو آج سے تیرہ سو سال پہلے عرب میں پائی جاتی تھی۔

ساتویں صدی عیسوی کے ایک مکالمے کو ابن اسحٰق نے محفوظ کر کے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ مکالمہ ذات الرقاع پر حملے کے سلسلے میں پیش کیا گیا ہے۔ حضرت جابر ابن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں۔

"حضورؐ کے ساتھ میں بھی اپنے بوڑھے اور لاغر اونٹ پر سوار ہو کر ذات الرقاع گیا تھا۔ جب ہم واپس ہو رہے تھے تو ہمارے بہت سے ساتھی ہم سے آگے نکل گئے

Marfat.com

تھے۔ جب میں پیچھے رہ گیا تو حضورؐ واپس تشریف لائے۔ مجھ سے سوال فرمایا کہ تم اتنے پیچھے کیوں رہ گئے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میرا اونٹ بہت ہی آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ حضورؐ نے اونٹ کو بٹھانے کے لیے فرمایا۔ میں نے اپنے اونٹ کو زمین پر بٹھا دیا۔ حضورؐ نے بھی اپنے اونٹ کو بٹھا دیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تمہارے ہاتھ میں جو چھڑی ہے وہ مجھے دے دو۔ میری چھڑی حضورؐ نے اپنے ہاتھ میں لے کر اونٹ کی خوب خبر لی۔ اس کے بعد مجھ سے فرمایا کہ اونٹ پر سوار ہو جاؤ۔ میں اپنے اونٹ پر سوار ہو گیا، حضورؐ اپنے اونٹ پر سوار ہو گئے۔ ہم نے اپنا سفر پھر سے شروع کیا۔ اس کی قسم جس نے حق دے کر اپنے پیغمبر کو اس دنیا میں روانہ کیا ہے میں سچ کہتا ہوں کہ میرا اونٹ تیز تیز چلنے لگا اور حضورؐ کے اونٹ کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔

گفتگو کے دوران حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تم اپنا اونٹ مجھے بیچنے کے لیے تیار ہو میں نے کہا کہ میں اونٹ آپ کی نذر کرنے کو تیار ہوں، حضورؐ نے اصرار کیا کہ آپ اس کی قیمت ادا فرمائیں گے۔ میں نے حضورؐ سے اونٹ کی قیمت دریافت کی۔ حضورؐ نے فرمایا ایک درہم میں نے اونٹ کو بیچنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ حضورؐ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ اس پر حضورؐ نے کہا کہ اچھا تو پھر دو درہم۔ میں نے اس کو بھی رد کر دیا۔ حضورؐ نے اونٹ کی قیمت بڑھاتے بڑھاتے ڈھائی تولہ سونا کر دی۔ جب حضورؐ نے ڈھائی تولہ سونا کہا تو میں نے کہا کہ کیا حضورؐ اس لین دین اور قیمت پر مطمئن ہیں حضورؐ نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اب تمہارا یہ اونٹ میرا اونٹ ہے۔

حضورؐ نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا تم شادی شدہ ہو۔ کیا تمہاری بیوی شادی سے پہلے کنواری تھی یا وہ بیوہ تھی۔ میں نے کہا کہ وہ پہلے شادی شدہ تھی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تمہیں کوئی کنواری لڑکی نہیں مل سکتی تھی، میں نے کہا کہ میرے باپ جنگِ اُحد میں مارے گئے انہوں نے سات بیٹیاں چھوڑیں۔ میں نے اسی لیے ایک ایسی عورت کا انتخاب کیا ہے جو ان سات لڑکیوں کی اچھی طریقے سے دیکھ بھال کر سکے۔ حضورؐ نے فرمایا تم نے بہت اچھا

Marfat.com

کیا۔ انشاء اللہ جب ہم سرار پہنچیں گے تو وہاں اونٹوں کو ذبح کریں گے اور اس دعوت میں تم بھی رہو گے۔

سرار مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ جب ہم سرار پہنچے تو حضورؐ نے اونٹوں کو ذبح کرنے کا حکم دیا ہم نے تمام دن وہاں گزارا۔ جب رات ہوئی تو ہم سب لوگ اپنے اپنے گھر واپس ہو گئے۔

میں نے اپنی بیوی سے وہ تمام باتیں کہیں جو حضورؐ نے مجھ سے کی تھیں۔ میری بیوی نے کہا کہ حضورؐ نے جو فرمایا ہے اس پر عمل کرو۔ جب صبح ہوئی تو میں اپنا اونٹ لے کر دراقدس پر پہنچا۔ اونٹ باہر چھوڑ کر میں مسجدِ نبوی چلا گیا۔ جب حضورؐ باہر تشریف لائے تو فرمایا کہ یہاں اونٹ کس نے چھوڑا ہے۔ میں نے سفر کے دوران جو گفتگو ہوئی تھی اس کا اعادہ کر دیا۔
حضورؐ نے ارشاد فرمایا میرے بھتیجے یہ اونٹ تمہارا ہے۔ تم اُسے اپنے گھر لے جاؤ۔ آپ نے بلالؓ کو بلوایا اور حکم دیا کہ مجھے ڈھائی تولے سونا دے دیا جائے۔ حضرت بلالؓ نے حکم کی تعمیل کی۔ ڈھائی تولے سے زیادہ سونا مجھے دیا۔ خدا کی قسم اس واقعہ کا مجھ پر گہرا اثر پڑا۔ اوپر کا واقعہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ حضورؐ کے تعلقات مسلمانوں سے کتنے گہرے تھے۔ کتنے مربیانہ تھے۔ کتنے دوستانہ تھے۔ آپ کی فیاضانہ سرپرستی مسلمانوں کے لیے اور بالخصوص غریب مسلمانوں کے لیے ہمیشہ وقف رہا کرتی تھی۔

یہ واقعہ کہ مدینہ سے باہر قافلے کو روک کر حضورؐ نے ایک دن گزارا تھا اس بات کی تعلیم تھی کہ مسلمان گھر جانے سے پہلے اپنی عورتوں کو مطلع کر دیں تاکہ وہ گھر کی صفائی کر لیں ازدواجی زندگی کا ایک خوشگوار پہلو اس واقعہ میں نمایاں ہوتا ہے۔
بخاری اور مسلم کی روایات کے مطابق حضورؐ نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ جو لوگ ایک لمبے عرصے کے لیے اپنے گھروں سے باہر رہے ہوں رات میں اچانک اپنے گھروں پر نہ پہنچیں۔ اطلاع دے کر جائیں تاکہ عورتیں اپنے شوہروں کا اچھی طریقے سے استقبال کر

Marfat.com

سکیں۔ اپنے آپ کو پاک صاف کر لیں۔ کنگھی چوٹی کر لیں۔

حضورؐ بہ نفس نفیس انتہائی صفائی پسند واقع ہوتے تھے۔ آپ کے کپڑے ہمیشہ پاک صاف رہتے تھے۔ صفائی اور پاکیزگی میں آپ ہمیشہ ہر ایک سے ممتاز رہے۔ لانبی مونچھیں جو کھانا کھاتے وقت بدتمیزی کا باعث بنتی ہیں۔ حضورؐ کو سخت ناپسند تھیں۔ حضورؐ کی مونچھیں بہت ہی مختصر تھیں۔ حضورؐ کو خوشبو پسند تھی۔ آپ سخت قسم کی بو کو ناپسند کرتے تھے۔ کھانے میں پیاز یا لہسن کا کبھی آپ نے استعمال نہیں کیا۔ ان کو آپ نے کبھی چھوا تک نہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ جب سفر سے واپس ہوتے تو آپ کے گھر کے بچوں نے آپ کا استقبال کیا۔ عبداللہ ابن جعفر ابن ابی طالب کہتے ہیں۔

" جب رسول اللہ سفر کے بعد واپس پہنچے تو آپ کے گھر کے بچوں نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ میں ان سب میں آگے تھا۔ حضورؐ نے مجھے اٹھا لیا۔ سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے دونوں صاحبزادے حضورؐ کے آگے لائے گئے۔ حضورؐ نے ان دونوں کو اپنے ہی اونٹ پر بٹھا لیا۔ صاحبزادوں کے ساتھ آپ ایک ہی اونٹ پر مدینہ میں داخل ہوتے۔"

بخاری اور مسلم نے ایک اور روایت بیان کی ہے جس سے اس لگاؤ کا پتہ چلتا ہے جو حضورؐ کو اپنے خاندان سے تھا۔ آپ سے یہ قول منسوب ہے کہ سفر ایک طرح کی سزا ہے جو آدمی کو اپنے گھر کے سکون سے محروم رکھتی ہے اپنے مقصد کو پورا کر لینے کے بعد مسافر کا فرض ہے کہ سیدھے اپنے گھر کا رخ کرے۔ اہل خانہ کے ساتھ وقت گزارے گھر واپس ہونے میں غیر ضروری تاخیر نہ کرے۔

اگست یا ستمبر ۶۲۶ء میں حضورؐ نے ایک اور دستے کی قیادت کی جو تقریباً ایک ہزار مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ دومتہ الجندل پر حملہ کرنے کا ارادہ تھا۔ اب اس مقام کا نام جاوف ہے۔ اس دفعہ بھی بغیر لڑائی کے واپسی ہوئی۔ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ قریش

Marfat.com

چونکہ مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے اس لیے غطفان سے وہ مدد اور دوستی کے خواہاں تھے۔ یہودی سردار سلام خیبر میں قتل کر دیا گیا تھا اس لیے کہ اس نے بنی غطفان کو اسلام کے خلاف اکسانے کی کوشش کی تھی۔

سلام کا قتل، ذات الرقاع پر حملہ، پھر دومتہ الجندل کو روانگی ان سب باتوں کا واحد مقصد یہ تھا کہ بدوی قبیلوں پر یہ واضح کر دیا جائے کہ مسلمان طاقت ور ہیں۔ وہ قریش کی کسی بھی دھمکی سے ڈرنے والے نہیں اس لیے بدوی قبیلوں کو مسلم طاقت سے باخبر رہنا چاہیئے۔

مغربی مستشرقین اکثر و بیشتر حضورؐ کی مکی اور مدنی آیات کے متن میں ایک امتیاز محسوس کرتے ہیں۔ مکہ کی آیات مختصر ہوا کرتی تھیں۔ لہجے میں نرمی ہوتی تھی۔ لوگوں میں ایک جوش و جذبہ پیدا کرتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں حضورؐ کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ حضورؐ کی ذات کو ہر بدتمیزی کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔

قرآن کے سورہ اخلاص میں بیان کیا گیا ہے:۔

" کہو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ کوئی اس کا ہمسر نہیں۔"

سورہ فلق میں ارشاد ہوتا ہے۔

" کہو کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔ سب چیز کی برائی سے جو اس نے بنائی۔ شبِ تاریک کی برائی سے جب اس کا اندھیرا چھا جائے۔ گنڈوں پر پھونکنے والیوں کی برائی سے۔ حسد کرنے والے کی برائی سے جب وہ حسد کرنے لگے۔"

سورۃ الناس میں ارشاد ہوتا ہے:۔

" کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔ لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی۔ لوگوں کے معبود برحق کی۔ وسوہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے (خواہ وہ) جنات سے (ہو) یا انسانوں میں سے۔"

مدینہ کو ہجرت کرنے کے بعد حضور کو سیاست سے سابقہ پڑا۔ پھر جنگوں سے واسطہ پڑا اور آخر میں انتظام مملکت اور ملت کے نظم و نسق سے مثال کے طور پر سورہ نسا میں ارشاد فرمایا گیا ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔

" یتیموں کا مال اُن کے حوالے کر دو۔ اُن کے پاکیزہ اور عمدہ مال کو اپنے ناقص اور سستے مال سے نہ بدلو۔ ان کا مال اپنے مال میں ملا کر مت کھاؤ۔ ایسا کرنا سخت گناہ ہے یتیموں کو بالغ ہونے تک کام کاج میں مصروف رکھو۔ جب ان میں عقل کی پختگی دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو۔ اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔ اس کو فضول خرچی میں اور جلدی میں اڑا نہ دینا۔ جو شخص آسودہ حال ہو اس کو پرہیز کرنا چاہیئے۔ جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔"

مکہ والے محمدؐ اور مدینہ والے محمدؐ کے درمیان جو امتیاز نظر آتا ہے وہ مذہب کے اہم مسائل پر بھی اثر انداز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

ایک طرف ایک مبلغ یا پیغمبر کی تبلیغ اور پیغمبرانہ وعظ و نصائح۔ لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے جذبات کا سہارا، دعوؤں کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت کی فراہمی، تعلقات کو اس طرح سے پیش کرنا جو لوگوں کو اپیل کر سکے، ان کے دلوں کو اپنی طرف راغب کر سکے، خود سراپا زندگی بن کر دوسروں کو زندگی کے اسرار سے واقف کروانا تاکہ ان میں بھی زندہ رہنے کی امنگ رہے۔ یہ مکہ کی زندگی کا خاصہ تھیں۔

دوسری طرف اخلاق سدھار کے سخت ضابطے اور اصول، عبادات کے طریقے مذہبی نظام کا استحکام مدینہ کی زندگی کے لوازم ہیں۔

Marfat.com

انسانی کمزوری کے پیش نظر ضابطہ اور اصول ضروری ہیں۔ جب تک پیغمبر اپنے ماننے والوں کے درمیان بقیدِ حیات ہے اپنے حلقہ کے تمام لوگوں کو اپنی ذات سے مستفید کر سکتا ہے۔ اپنے مافی الضمیر سے روشناس کروا سکتا ہے۔ اپنی روحانی طاقت کا اظہار کر سکتا ہے۔ اپنی وجدانی کیفیت نمایاں کر سکتا ہے۔ جب پیغمبر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی بھر کی کوششوں کا اثر جو اس کی ایک خاص تبلیغ کی صورت میں منظرِ عام پر رہتا ہے آہستہ آہستہ زائل ہونے لگتا ہے۔ اس کو اسی صورت میں دوام مل سکتا ہے جب کہ اس کی تبلیغ کے اصول وضع کیے جائیں۔ اس کے پیغام کو ضابطوں کی صورت دی جائے۔ مذہبی عبادات کو ایک نظام کی صورت میں پیش کیا جائے۔

بعض اوقات اس طریقہ کار کو اختیار کرنے کی وجہ سے مذہب کی روح فنا ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ لوگ حکم کے منشاء اور مقصد کو بھول جاتے ہیں۔ صرف ظاہری باتوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

منشا اور مقصد کو پیش نظر رکھنے کے لیے ایک ایسی مقتدر تنظیم کی ضرورت ہے جس کے ارکان کا کام ہو کہ وقتاً فوقتاً کسی رسم یا روایت کے پس منظر میں جو روح کارفرما تھی اُسے عوام کے آگے پیش کرتے رہیں تاکہ عوام رسم و روایت کے ساتھ ساتھ اس کی غایت اور منشاء اور مقصد سے بھی واقف ہوتے رہیں۔

اگر آنحضورؐ ان بے شمار قوانین اور ضوابط کو وضع نہ کرتے تو شاید آپ کی وفات کے بعد آپ کا پیغام اس صورت میں ہمارے آگے نہ ہوتا جیسے آج ہے۔

اسلام کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں ایک اور بات نے بھی آسانی پیدا کر دی۔ قریش کے ہاں پنڈتوں، واعظوں یا مذہبی لوگوں کی کوئی ایسی جماعت نہیں تھی جو متحد ہو کر اسلام کی مخالفت کرتی۔ ان کے ہاں کوئی ایسے قانونی یا عبادات کے طریقے نہیں تھے جن کا سہارا لے کر قریش یا مکہ کے لوگ حضورؐ کی تبلیغ کی مخالفت کرتے۔ عربوں کی

Marfat.com

بت پرستی میں کسی بھی پنڈت یا مذہبی ٹھیکیدار کے لیے کوئی جگہ تھی ہی نہیں۔ لات، العزیٰ یا ہبل سے ان کی وابستگی ایسے ہی تھی جیسے انگریزوں کو اس زمانے میں آثار قدیمہ سے یا گاؤں کے چھوٹے پیر زادے سے ہوتی ہے۔ پرانی چیزوں کو دیکھنے سے جو بات ذہن میں جاتی ہے وہ یہی ناکہ ماضی کے لوگ یا ماضی کی چیزیں زمانہ حال کے لوگوں یا چیزوں سے کسی حد تک مختلف تھے۔

قریش کے سرداروں نے حضورؐ کی جو مخالفت کی اس کی بڑی وجہ سیاسی تھی۔ ایک ایسا آدمی جس کو براہ راست خدا سے حکم ملتا ہے اور شب و روز جس کو خدائی رہنمائی حاصل ہے اس قابل ہوتا ہے کہ وہ حکمران ہو۔ ان کو پہلے ہی دن سے جس بات کا خطرہ تھا حضورؐ کے مدینہ جانے کے بعد کے واقعات اُن کے اس خطرے کو حق بجانب ٹھہرا رہے تھے۔

جب مدینہ میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا تو ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز کمیاب ہونے لگی۔ دولت، زمین، مکانات، جانور، ہتھیار، غذا ان سب چیزوں کی کمی محسوس کی جانے لگی۔ ضروریات کی فراہمی حضورؐ کے ذمے تھی۔ ان ساری ضروریات زندگی کے لیے مسلمانوں کی نظریں حضورؐ کی طرف اُٹھا کرتی تھیں۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے حضورؐ کو خلوت کے بہت ہی کم مواقع ملتے تھے۔ فرصت کے اوقات عنقا ہونے لگے۔ ہر وقت کسی نہ کسی گتھی کو سلجھانے میں آپ مصروف رہتے تھے۔ اگر آپ اپنے روزانہ کے فرائض سے غافل ہوتے تو ساری تحریک اسلامی کو نقصان پہنچنے کا خدشہ لگا رہتا تھا۔

روزمرہ کے واقعات اور ان میں تغیر و تبدیلی اسلام کے مستقبل پر اپنا دیرپا اثر چھوڑنے لگی۔ حضورؐ کی وفات کے بعد جانشین آپ کے قدم بہ قدم چلنا چاہتے تھے۔ حضورؐ اپنی ذات میں ایک ہی وقت میں پیغمبر بھی تھے، سیاست داں بھی تھے، قانون ساز بھی تھے، اور فوج کے کمانڈر بھی۔

Marfat.com

ان ساری خصوصیات کا ایک ذات میں جمع ہو جانا اور اپنی ہر خصوصیت کو بر وقت بروئے کار لانا دنیا کی ساری مسلم حکومتوں کے لیے ایک مثال اور نمونہ کا کام کر گیا۔

گزشتہ چودہ سو سال سے سارے مسلم ممالک میں شخص واحد کی حکمرانی رہتی آئی ہے نظریاتی طور پر ہر مسلم ملک کا حکمران یہی سمجھتا ہے کہ اس کی ذات میں بھی وہی خصوصیات جمع ہیں جو قدرت نے ذاتِ اقدس میں جمع کر دی تھیں۔ اسی وجہ سے ہر مسلم حکمران اپنے آپ کو سیاست داں بھی سمجھتا ہے، قانون داں بھی، کمانڈرِ افواج بھی اور امام وقت بھی۔ ان سارے فرائض کو انجام دینا ہر مسلم حکمران اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔

اسلام میں یہ ضروری نہیں ہے کہ حکمران کسی بادشاہ کا بیٹا ہی ہو۔ سلطان ابن سلطان ہی ہو۔ بادشاہت کے امیدواروں میں جو سب سے زیادہ موزوں رہتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے بادشاہت کا وہی حق دار رہتا ہے۔ عظمت و شان کا وہ بھوکا نہیں رہتا۔ گو وہ پہلا شہری سمجھا جاتا ہے لیکن شہنشاہیت کے نشہ سے وہ پاک رہتا ہے۔ وہ اپنی تمام رعایا کے درمیان اس طرح سے رہتا ہے کہ اس کی رعیت جب چاہے اور رعیت کا جو فرد بھی چاہے اپنے حکمراں تک رسائی حاصل کر لے۔

Marfat.com

یادگار تاریخیں

حضورؐ کی پیدائش	۵۷۰ء
مدینہ کو ہجرت	۶۲۲ء
جنگِ بدر	مارچ ۶۲۴ء
جنگِ اُحد	" ۶۲۵ء
الرجیع کا واقعہ	مئی ۶۲۵ء
بیر معونہ پر مسلمانوں کا قتلِ عام	جون ۶۲۵ء
بنو نضیر کا محاصرہ اور اخراج	اگست ستمبر ۶۲۵ء
بدر کو دوبارہ روانگی	مارچ ۶۲۶ء
ذات الرقاع	جون ۶۲۶ء
دومتہ الجندل	اگست ۶۲۶ء

Marfat.com

خندق

قبل اس کے کہ ہم واقعاتی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے چلیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی ذاتی اور سماجی زندگی پر ایک نظر ڈال لیں اس لیے کہ یہ اس وقت سے لے کر آج تک بحث طلب رہی ہے۔

آپؐ کے عقد میں حفصہؓ بنت عمر بن خطاب آئیں۔ حضرت حفصہؓ کے شوہر جنگ بدر میں مارے گئے تھے۔ عمر ابن الخطاب نے اپنی صاحبزادی حفصہؓ کو حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا اور حضورؐ نے ان سے نکاح کیا۔ حضرت حفصہؓ اپنے والد کی طرح بہت ہی گرم مزاج جذباتی اور غصیلی طبیعت کی تھیں۔

حضرت حفصہؓ کی وجہ سے حضورؐ کو کافی پریشانی رہا کرتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ حضورؐ کے دو بازو تھے۔ حضرت عائشہؓ پہلے ہی حضورؐ کے حبالۂ عقد میں آ چکی تھیں۔ بی بی عائشہؓ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی تھیں۔ حفصہؓ بی بی کو نکاح میں لینے کا منشا شاید حضورؐ کا یہی ہو کہ اپنے دونوں بازوؤں کو اپنے سے قریب تر رکھیں۔ بی بی حفصہؓ بیوہ ہونے کے باوجود نکاح کے وقت صرف سترہ سال کی تھیں۔

حضرت حفصہؓ سے شادی کے بعد حضورؐ نے زینبؓ بنت خزیمہ کو اپنے نکاح میں لیا۔ حضرت زینبؓ کے شوہر جنگِ احد میں مارے گئے تھے۔ غریبوں سے سلوک اور خیر وخیرات

Marfat.com

بی بی زینبؓ کی خصوصیات تھیں۔ اس نکاح کے کچھ ہی دنوں بعد غالباً جنوری ۶۲۶ء میں حضورؐ نے ام سلمہؓ سے شادی کی۔

جب مسلمانوں نے پہلی دفعہ حبشہ کو ہجرت کی تھی تو حضرت اُم سلمہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ گئی تھیں۔

زینبؓ بنت جحش حضورؐ کے رشتہ کی بہن تھیں۔ حضورؐ نے ان سے شادی کی۔ یہ شادی اس وقت بہت ہی متنازعہ فیہ مسئلہ بن گئی۔ یہ بات ہم پڑھ چکے ہیں کہ ایک غلام لڑکے زید بن حارثہ کو حضورؐ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ جب حضورؐ نے زید کو اپنا لیا تو وہ گھر کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اسی طرح جیسے علیؓ ابن ابی طالب۔ لوگ زید کو زید بن محمدؐ کے نام سے پکارتے تھے۔ زیدؓ چونکہ غلام رہ چکے تھے اس لیے آپ نے پہلے ایک ایسی عورت سے شادی کی تھی جو آزاد کر دیئے جانے سے پہلے خود بھی غلام تھی۔

بعد میں زیدؓ نے زینبؓ بنت جحش سے شادی کی۔ زیدؓ کو حضورؐ کا پورا پورا اعتماد حاصل تھا ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک فوج جب قریش پر حملہ کرنے کی غرض سے نجد روانہ کی گئی تھی، زید کے سپرد فوج کی قیادت دی گئی تھی۔ غالباً اسی زمانے کی بات ہے کہ جنگ احد کے بعد ۶۲۶ء میں حضورؐ نے زینبؓ سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

زیدؓ کو اپنی بیوی زینبؓ سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا اس لیے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے پر رضامند ہو گئے۔ اس طلاق کے بعد زینبؓ کا نکاح حضورؐ سے ہوا۔

حضورؐ کے مخالفین اس شادی پر شد و مد سے اعتراض کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام سے قبل جن لڑکوں کو اپنا لیا جاتا تھا اُن سے ویسا ہی سلوک ان کے منہ بولے ماں باپ کیا کرتے تھے جیسا وہ اپنے حقیقی اور اصل بیٹوں سے کرتے تھے۔ حضورؐ نے بعثت سے قبل زیدؓ کو مکہ میں کعبہ کے روبرو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔

اس سلسلے میں دوسری بات جو بیان کی جاتی ہے وہ یہ کہ اسلام سے قبل جب کوئی

آدمی مرجاتا تھا تو اس کی تمام بیویاں اس کے بیٹے کی ملکیت بن جاتی تھیں۔ خود حضورؐ نے اس رسم کو مٹایا اور ایسا کرنے سے منع فرمایا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ باپ کی بیویوں سے شادی کرنا ایک شرمناک بات ہے۔

اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ آنحضورؐ نے اپنے بنائے ہوئے قانون کو خود ہی توڑا۔

اس واقعہ کا اثر اس وقت زائل ہوا جب کہ حضورؐ پر وحی نازل ہوئی جس میں حقیقی اور معنوی اولاد میں فرق بتلایا گیا۔ متبنیٰ کے وہ حقوق نہیں رکھے گئے جس کے مستحق حقیقی بچے ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے کے طور پر اسلامی قانون نے رضاعت کو تسلیم نہیں کیا۔

خدا نے وحی کے ذریعہ اجازت دی کہ آپ زینبؓ کو اپنے نکاح میں لا سکتے ہیں ساتھ ہی آپ اس سلسلے میں جس کشمکش دپیچ میں تھے اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ پس و پیش محض لوگوں کی وجہ سے تھا۔

سورۃ احزاب کی ۳۷ ویں آیت میں اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔ زیدؓ کا نام خاص طور پر قرآن میں آیا ہے۔

"اور جب تم اس شخص سے جس پر خدا نے احسان کیا اور تم نے بھی احسان کیا یہ کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دے اور خدا سے ڈر اور تم اپنے دل میں وہ بات پوشیدہ کرتے تھے۔ جس کو خدا ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔ پھر جب زیدؓ نے اس سے حاجت متعلق نہ رکھی یعنی اس کو طلاق دے دی تو ہم نے تم سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مومنوں کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے میں جب وہ ان سے اپنی حاجت متعلق نہ رکھیں یعنی طلاق دے دیں کچھ تنگی نہ رہے اور خدا کا حکم واقع ہو کر رہنے والا تھا۔"

ایک روایت میں ہے کہ زینبؓ بذاتِ خود ایک نہایت ہی شریفانہ اور خدا ترس

Marfat.com

طبیعت کی مالک تھیں۔ حضورؐ سے شادی کرنے میں آپ ہچکچا رہی تھیں۔ آپ کی ہچکچاہٹ اس وقت دور ہوئی جب کہ خدا نے آپ کو شادی کی اجازت دے دی۔

(پروفیسر سید نواب علی رضوی نے اپنی کتاب سیرت رسول اللہ میں لکھا ہے

' ابن سعد لکھتے ہیں کہ زینب بنت جحشؓ آنحضرتؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ مکہ میں معہ اپنے خاندان کے ابتدائے اسلام میں ایمان لائیں۔

ان کے بھائی عبد اللہ اور عبید اللہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی جہاں آخر الذکر نے دین عیسوی اختیار کر کے انتقال کیا۔ مگر اس کی بیوی ام حبیبہ بنت ابو سفیان دین اسلام پر قائم رہیں۔ بعد کو آنحضرتؐ سے نکاح ہوا۔ اب عبد اللہ نے پھر مدینے میں معہ اپنے خاندان کے ہجرت کی اور غزوۂ احد میں شریک ہوئے جس کے بعد آنحضرتؐ نے ان کی بہن زینبؓ کا نکاح زید بن حارثہ سے کرنا چاہا۔

زید اگرچہ شریف خاندان سے تھے مگر عہدِ جاہلیت میں جب ان کی ماں سعدیٰ ان کو لے کر کہیں جا رہی تھیں بدویوں نے حملہ کیا اور زید کو پکڑ کر عکاظ کے بازار میں حکیم بن حزام کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ حکیم نے ان کو لے کر اپنی پھوپی حضرت خدیجہؓ کی نذر کیا۔ انہوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے زید کو آزادی بخشی۔ مگر وہ خدمت میں حاضر رہے۔ اتفاقاً زید کے باپ اور چچا مکہ آئے۔ زید کو دیکھ کر پہچان لیا اور چاہا کہ زرِ خرید دے کر ہمراہ لے جائیں آنحضرتؐ نے فرمایا کہ خرید کی ضرورت نہیں ہے۔ زید کو اختیار ہے جہاں چاہے رہے۔ مگر زید نے پھر بھی آپ کی خدمت سے علیحدگی کو گوارا نہ کیا۔ اگرچہ باپ نے طعنہ بھی دیا کہ آزادی کو کیوں قربان کرتا ہے اور اپنے خاندان سے منہ موڑتا ہے۔ آنحضورؐ نے یہ دیکھ کر مزید شفقت سے فرمایا " لوگو۔ گواہ رہنا۔ میں زید کو اپنی متبنیٰ کرتا ہوں۔" تب حارثہ کو تسلی ہوئی اور وہ بیٹے کو چھوڑ کر چلا گیا۔

آنحضرتؐ نے پھر زید کا نکاح اپنی دایہ ام ایمن کے ساتھ کر دیا اس شادی سے اسامہ

Marfat.com

پیدا ہوتے۔ زیدؓ نے آنحضرتؐ کے ساتھ ہجرت کی۔

بدر و اُحد میں شریک ہوئے۔ الغرض جب آنحضرتؐ نے زید کی صلاحیت اور خوبیوں کے لحاظ سے اور اس وجہ سے بھی کہ غلاموں کو لوگ ذلیل نہ سمجھیں اپنی پھوپی زاد بہن کا نکاح ان کے ساتھ کرنا چاہا تو زینبؓ نے اپنے حسب و نسب کے خیال سے ایک ایسے شخص کے ساتھ نکاح گوارا نہ کیا جو اگرچہ رسول اللہ کا متبنیٰ تھا لیکن غلامی کا داغ اٹھا چکا تھا تب یہ آیت نازل ہوئی۔

سورۂ احزاب میں ہے

" اور نہیں کسی مومن مرد اور مومن عورت کو اختیار ہے اپنے کاموں پر جب اللہ اور اس کا رسول ان کا کوئی امر طے کر دے۔"

اس آیت کے پیشِ نظر زینبؓ نے اپنے قومی تفاخر اور عجب کو خدا اور رسول کی اطاعت پر قربان کر دیا۔ لیکن عقد کے بعد بمقتضائے بشریت میاں بیوی کے تعلقات خوشگوار ثابت نہ ہوئے۔ اُدھر زینب کو یہ خیال کہ میں نے کتنی بڑی قربانی دی ہے کہ ایسی گر کر شادی کی۔ شوہر کو چاہیئے کہ میرے اشاروں پر چلے اور غلام بن کر رہے۔ اُدھر زید کو یہ تکلیف وہ تصور کہ میں بیوی کی نظروں میں ذلیل ہوں۔ آخر برداشت نہ ہوئی اور طلاق دینا چاہی اس وقت جو کیفیت آنحضرت کی تھی وہ قرآن مجید کے سورہ احزاب میں یوں مذکور ہے۔

" اور جب تو کہتا تھا اس شخص سے جس کو اللہ نے نعمت دی اور تو نے نعمت دی کہ روک رکھ اپنی عورت کو اپنے پاس اور اللہ سے ڈر اور تو چھپاتا تھا اپنے دل میں جو اللہ کھولنے والا تھا اور تو آدمیوں سے ڈرتا تھا اور اللہ مستحق تر ہے کہ تو اس سے ڈرے۔"

مباح چیزوں میں طلاق سے زیادہ بُری کوئی اور شئے خدا کے نزدیک نہیں ہے آنحضرتؐ نے زید کو سمجھایا کہ خدا اور رسول کے احسان کو یاد کرے اور طلاق نہ دے لیکن زید

Marfat.com

کے پیمانہ صبر وضبط کو لبریز دیکھ کر یہ اندیشہ ہوا کہ اگر اس نے طلاق دے دی تو زینبؓ کا حشر کیا ہوگا؟ زینبؓ نے محض آپ کے فرمانے سے ایک غلام کے ساتھ نکاح کیا تھا، اب دوسرا شخص ایک غلام کی مطلقہ کو عزت و وقار کے ساتھ کس طرح رکھتا۔ اس لیے آنحضرتؐ نے ان کی دلجوئی اور مرتبہ بلند کرنے کے لیے چاہا کہ خود ان کو اپنے عقد میں لے لیں۔ البتہ متبنّیٰ کی بیوی ہونے کے لحاظ سے رسم و رواج کے خلاف ورزی کرتے ہوئے آنحضرتؐ کو زبانِ خلق کا اندیشہ ہوا لیکن خاصانِ خدا اگر رسم و رواج کے بندے ہوتے تو دنیا میں کبھی اصلاح اور ترقی نہ ہوتی۔ تبنّیت کی رسم مٹائی گئی۔

جب زیدؓ نے طلاق دے دی تو آپ نے وحی الٰہی کی تعمیل فرمائی۔

"پھر جب زید نے پوری کر لی حاجت نکاح کر دیا ہم نے تیرا اُس سے تاکہ نہ رہے ایمان والوں پر تنگی۔ بی بیوں میں ان کے لے پالکوں کی جب کہ پوری کر چکیں ان سے حاجت اور ہے کام اللہ کا کیا گیا۔"

(جلیب)

سورۂ نساء میں قرآن نے مسلمانوں کے لیے بیویوں کی حد مقرر کر دی ہے اور وہ حد چار ہے۔ جس وقت یہ حکم نازل ہوا، حضورؐ کی ازواج مطہرات کی تعداد چار سے زیادہ تھی۔

سورۂ احزاب میں فرمایا گیا ہے۔

"اے پیغمبر ہم نے تمہارے لیے تمہاری بیویاں جن کو تم نے ان کو مہر دیئے ہیں حلال کر دی ہیں اور تمہاری لونڈیاں جو خدا نے تم کو کفار سے بطور مال غنیمت دلوائی ہیں اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تمہارے ماموؤں کی بیٹیاں اور تمہاری خالاؤں کی بیٹیاں جو تمہارے ساتھ وطن چھوڑ کر آئی ہیں (سب حلال ہیں) اور کوئی مومن عورت اگر اپنے

Marfat.com

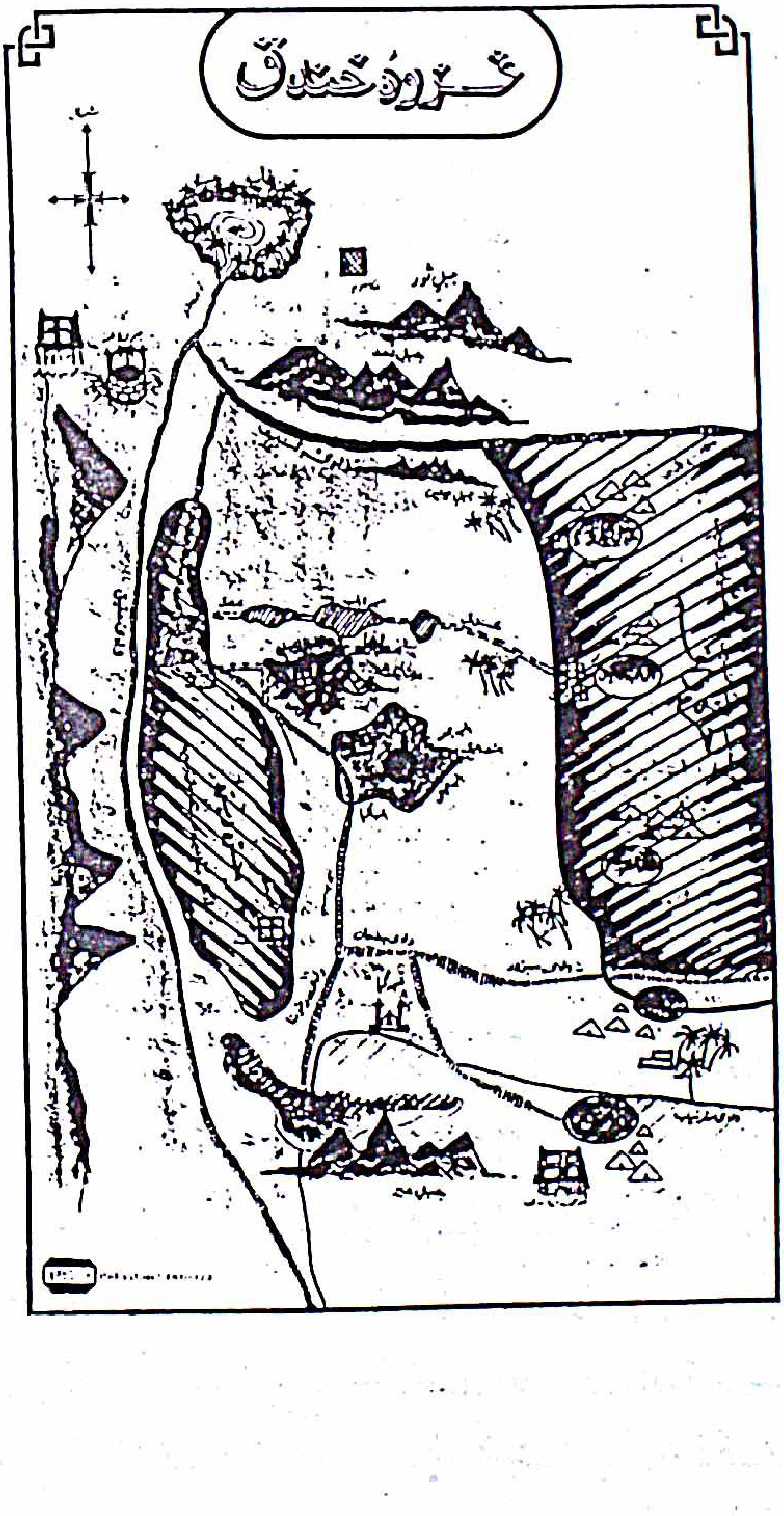

Marfat.com

تئیں پیغمبر کو بخش دے بشرطیکہ پیغمبر بھی ان سے نکاح کرنا چاہیں یہ اجازت (اے محمدؐ) خاص تم ہی کو ہے۔ سب مسلمانوں کو نہیں۔ ہم نے ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں جو مہر مقرر کر دیا ہے ہم کو معلوم ہے اس لیے کہ تم پر تنگی نہ رہے۔ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔"

سورۂ نساء کی ۵۳ ویں آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

"اور تم کو یہ شایاں نہیں کہ پیغمبر خدا کو تکلیف دو اور نہ یہ کہ ان کی بیویوں سے کبھی ان کے بعد نکاح کرو۔ بے شک یہ خدا کے نزدیک بڑا گناہ ہے۔"

جب ان آیات کا نزول ہوا جن میں زینبؓ سے حضورؐ کو شادی کرنے کا حکم ہوا تو حضرت عائشہؓ جو حضورؐ کی وہ واحد بیوی تھیں جن کی یہ جرات ہوتی تھی کہ حضورؐ سے گستاخانہ اور بے تکلفانہ گفتگو کریں، ان احکام کو سن کر حضورؐ سے کہنے لگیں:۔

"آپ کا خدا آپ کی خواہشات کی تکمیل کے لیے یقیناً بے چین نظر آتا ہے۔"

حضورؐ کی یہ متعدد شادیاں بحث و مباحثہ کا موضوع رہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس بحث میں پڑیں۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ حضورؐ کی ساری بیویوں میں بی بی عائشہؓ ہی وہ واحد بیوی تھیں جو شادی کے وقت باکرہ تھیں۔

زینبؓ بنت جحش ایک مطلقہ تھیں۔ باقی تمام بیوہ تھیں۔ ان میں سے کئی ایک ایسی تھیں جو حسن سے عاری تھیں اور جاذبِ نظر بالکل نہیں تھیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضورؐ نے جب بی بی خدیجہ سے شادی کی تو اس وقت آپ کی عمر ۲۵ سال تھی۔ بی بی خدیجہؓ عمر میں آپ سے بڑی تھیں۔ بیوہ تھیں اس کے باوجود حضورؐ اپنی بیوی خدیجہؓ کے ہمیشہ غمگسار، وفادار اور مثالی شوہر رہے۔ یہ ازدواجی تعلقات پورے بیس سال تک یعنی حضرت خدیجہ کی وفات تک رہے۔

Marfat.com

دوسرے یہودیوں کے ساتھ ان دونوں نے شام کو ہجرت نہیں کی تھی خیبر جا کر دوبارہ آباد ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ یہودی سردار مکہ جا کر قریش سے ملے۔ اپنی مدد اور حمایت کی پیش کش کی۔ جب مکہ کے سرداروں نے ان کی مدد اور حمایت کو قبول کر لیا اور ان دونوں جماعتوں میں باقاعدہ اتحاد ہو گیا تو یہودیوں نے بدوی قبیلہ غطفان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ قریش اور یہودیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑیں۔

ان کی سرگرمیوں کا واحد منشا یہ تھا کہ مدینہ پر قابض ہو جائیں جو کام دو سال پہلے کرنا چاہیئے تھے اس کام کو کرنے کی انہیں اب سوجھی، اگر قریش میں ذرا بھی بصیرت ہوتی اور واقعی وہ کارگزار ہوتے تو جنگِ اُحد کے فوراً بعد مدینہ کو اپنے قبضے میں لے لیتے۔ قریش نے اس مہم کے لیے دس ہزار آدمیوں کو جمع کیا۔ ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی۔

مکہ کے چار ہزار آدمی تھے جن میں قریش، ان کے ساتھی اور ان کے یار و مددگار تھے۔ بنی کنعانہ کے سوا الگ تھے۔ غطفان نے دو ہزار سے زیادہ آدمی فراہم کیے تھے۔ بنی سلیم اپنے ساتھ سات سو سواروں کو لے آئے۔ ان کے علاوہ بنی اسد کے لوگ تھے۔ سب مل ملا کر تقریباً دس ہزار تھے۔

فوج کی تعداد قیاساً بیان کی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ بھی ہو۔

مدینہ میں جو لوگ مسلمان ہوئے تھے ان میں ایک بڑے جوشیلے آدمی تھے وہ ایک زمیندار کے بیٹے تھے۔ لڑکپن میں ان کو عیسائی بنایا گیا۔ شام میں انہوں نے مذہبی تعلیم حاصل کی۔ مختلف عیسائی درسگاہوں سے استفادہ کیا۔ جب ان کے عیسائی استاد کا انتقال ہو گیا تو یہ سُن کر کہ ایک نئے رسول کی آمد ہوئی ہے حجاز کا رُخ کیا۔ دورانِ سفر ان کو لوگوں نے پکڑ کر ایک یہودی کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہودی کے پاس کام کاج کرتے ہوئے آپ نے کچھ رقم جمع کی۔ حضورؐ نے بھی مالی مدد دے کر آپ کو غلامی سے نجات دلائی۔ اس کے بعد آپ اسلام کے سچے جانثاروں میں شامل ہو گئے۔ ان حضرت کا نام سلمان ہے

جب مسلمانوں کو مکہ سے آنے والی فوج کا علم ہوا تو ان لوگوں نے آپس میں سوچ بچار شروع کر دی کہ مدافعت کس طرح کی جائے۔

جنگ اُحد سے قبل جو بات بحث و مباحثے کا عنوان بنی تھی پھر وہی زیر بحث آئی کہ لڑائی شہر سے باہر ہو یا شہر میں رہ کر ہو۔

ایران کے دارالسلطنت میں سلمانؓ نے پرورش پائی تھی۔ ثقافت اور تہذیب کے گہوارے میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ اس کے بعد اُن کی زندگی کے کچھ سال شام میں بسر ہوتے۔ شائستگی اور شہریت کے لحاظ سے شام مانا ہوا شہر تھا۔ انہوں نے بیزنطینی اور ایرانی جنگوں کے تعلق سے بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان جنگوں کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا ہو۔

روایات کے مطابق سلمان نے مشورہ دیا کہ شہر کے اطراف خندق کھود کر مدینہ کی حفاظت بہتر طریقے سے کی جا سکتی ہے۔ سلمان کا مشورہ قبول کر لیا گیا۔ حضورؐ نے بذاتِ خود اس کام میں پہل کی۔ پہلے نشان ڈالا گیا۔ بیل، پھاوڑا اور درانتی لیے ہوتے حضورؐ گڑھا کھودنے آگے بڑھے۔ مسلمان آپ کے اطراف جمع ہو گئے۔ چونکہ وقت بہت ہی کم رہ گیا تھا اس لیے سب کے سب دیوانہ وار اس کام میں لگے رہے۔ آپ لوگوں کی ہمت افزائی کرتے جاتے تھے۔

جس طریقے سے مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت حضورؐ مسلمانوں سے باتیں بھی کرتے تھے اور کام بھی کرتے تھے اُسی طریقے سے اس موقع پر بھی آپ کام کرتے ہوئے پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے۔ گرد و غبار میں اَٹ جاتے تھے۔ خندق کی کھدائی میں مصروف رہتے تھے۔ آپ کام کرتے ہوئے رجزیہ اشعار میں آواز بھی ملاتے تھے۔

" اے اللہ ہم کو اس کا اجر جنت کی صورت میں دے۔ مہاجرین اور انصار کی نظریں تجھ پر ہیں اور تیری مدد پر۔"

جب حضورؐ ان اشعار کو پڑھتے جس کا مطلب اوپر لکھا گیا ہے تو مسلمان جواب میں دوسرا شعر پڑھتے جس کا مطلب ہے:۔

"اے اللہ کے رسول۔ ہماری ساری وفاداریاں آپ کے لیے ہیں ہم آپ کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے ہیں۔ موت سے ہم ڈرنے والے نہیں۔"

جو منافقین تھے محض دکھاوے کی خاطر تھوڑا بہت کام کرتے تھے۔ حضورؐ کی نظروں سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ سے اجازت لیے بغیر وہ اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے اکثریت اُن لوگوں کی تھی جو کہیں جانے سے قبل اجازت لے کر جایا کرتے تھے۔

ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق سورۂ نور کی ۶۲ ویں آیت میں اس صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔

"صرف وہی لوگ مومن ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر یقین رکھتے ہیں جب وہ لوگ اُن (محمدؐ) کے ساتھ رہتے ہیں جب کہ وہ ایک اجتماعی کام میں مصروف ہیں، وہ اس وقت تک ان سے جُدا نہیں ہوتے جب تک اُن (محمدؐ) کی اجازت نہ لے لیں۔ جو اُن (محمدؐ) کی اجازت لیتے ہیں، وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والوں میں ہیں۔"

خندق کی کھدائی ۳۱ مارچ ۶۲۷ء کو بمشکل ختم ہی ہوئی تھی کہ دشمن آنا شروع ہو گئے۔ قریش کے ساتھ ان کے تنخواہ دار محافظ تھے اور بنی کنعانہ کے لوگ تھے ان کے بعد غطفان کے لوگ آنا شروع ہوئے۔ اپنا ڈیرہ مدینہ کے شمال میں ڈالا یہ اُحد کی سمت تھا۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ عورتوں اور بچوں کو گھروں اور قلعوں میں منتقل کر دیا جائے۔

سارے مسلمان خندق کے اس پار جمع ہو کر اپنا مورچہ قائم کرنے لگے۔ غالباً یہ شہر کا شمالی حصہ تھا۔

Marfat.com

کافروں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ بنی نضیر کا یہودی سردار حیی ابن اخطب بنی قریظہ کی بستی میں گیا۔ مدینہ میں اب یہی ایک یہودی قبیلہ رہ گیا تھا۔ یہ لوگ مدینہ کے جنوب میں سب سے الگ تھلگ رہا کرتے تھے۔

بنی قریظہ کا سردار دوستی کا عہد کر چکا تھا۔ پہلے تو اس نے حیی ابن اخطب کی مدد کرنے سے انکار کر دیا مگر پھر حیی کے اصرار پر وہ مسلمانوں سے کیے ہوئے معاہدہ کو توڑنے پر آمادہ ہو گیا۔

جب حضورؐ کو یہ اطلاع ملی کہ حیی ابن اخطب بنی قریظہ کے ہاں گیا ہے اور دونوں قبیلوں میں ساز باز ہو رہی ہے تو آپؐ نے بنی اوس کے سردار سعدؓ ابن معاذ اور خزرج کے سربراہ سعدؓ ابن عبادہ کو بنی قریظہ کے ہاں روانہ کیا۔ ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق یہودیوں نے حضورؐ کے نمائندوں کو جواب دیا۔

"کون ہیں خدا کے رسول ؟ محمدؐ سے تو ہمارا کوئی معاہدہ ہوا ہی نہیں تھا۔"

اس اثنا میں مدینہ کے مسلمانوں کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ منافقین گمراہ کن افواہیں پھیلا رہے تھے۔ لوگوں کو یہ کہہ کر خائف کرتے تھے کہ محمدؐ نے تو خدا کی مدد اترنے کی آس دلائی تھی۔ مسلمانوں کو کافروں پر فتح کی خوش خبری دی تھی۔ کہاں ہے وہ خدا کی مدد؟ تمہاری جانیں اور تمہارے خاندان کے افراد اور تمہارے بال بچے سب خطرے میں ہیں۔

اس بات کا ذکر کئی بار ہو چکا ہے کہ عرب قبیلوں کے نزدیک لڑائیاں اور جنگیں ان کی فطرت کا تقاضا تھیں۔ انسانی زندگی کے معمولات میں سے ایک معمول تھا امن اور پائیدار امن ان کے ہاں ایک بے معنی بات تھی۔ پائیدار امن میں ان کے لیے کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ لڑائیوں اور جنگوں کی جہاں اور کئی وجوہ تھیں وہیں مالِ غنیمت کا حاصل کرنا بھی ایک بڑی وجہ رہتی تھی۔ دشمن کی غارت گری ایک ضمنی مقصد ہوتا تھا۔

یہ اتفاقیہ اور شوقیہ قسم کی لڑائیاں جو قبیلوں کے درمیان ہوا کرتی تھیں، جنگی فنون کے

Marfat.com

ارتقا، اور ترقی میں ایک سدراہ بنی رہیں۔ جنگوں کا مقصد تو دشمن کو سرے سے نیست و نابود کرنا ہوتا ہے۔ اپنی اور دشمن کی تباہی اور بربادی کو پیش نظر رکھتے ہوئے جنگوں کے اصول وضع کیے جاتے ہیں۔ مگر جہاں لڑائیوں کا مقصد ہی دشمن کو تباہ و برباد کرنا ہو تو پھر ایسی صورت میں کیسے اصول اور کہاں کے جنگی قوانین۔ اگر عرب قبیلے اپنے مقصد کے حصول کے لیے خفیہ اور رازدارانہ طریقے اختیار کرنے کی سوچتے تو یہ بات خود ان کی اپنی نظروں میں گری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اُسے اپنے وقار اور عزت کے منافی سمجھتے تھے۔ ببانگ دُہل میدان میں آنا ان کا قومی شعار تھا۔ اسی طریقہ کو وہ جنگ کا مثالی طریقہ سمجھتے تھے۔

ایک خوشگوار تاریخی حقیقت کو ہمارے ذہنوں میں محفوظ رکھنا چاہیئے کہ حضورؐ کے انتقال کے سو سال کے اندر اندر ہی عرب مصر کو فتح کر لیتے ہیں۔ شمالی افریقہ کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں، سارا اسپین ان کے قبضے میں آجاتا ہے۔ فرانس کے آدھے شمالی حصہ پر قابض ہو جاتے ہیں۔ بعد میں فرانس سے نکالے جانے پر آٹھ سو سال تک انہوں نے اسپین پر حکومت کی۔

ان ۸ سو برسوں میں ان عربوں نے اسپین، فرانس اور پھر انگلستان پر جنگ کا جو تاثر چھوڑا وہ اس صورت میں تھا کہ جنگ کا مقصد عزت کا حصول ہے۔ دشمن کی تباہی نہیں۔

شیکسپیئر نے ہنری پنجم کی زبان سے یہ الفاظ ادا کروائے ہیں

"خدا کی قسم میں سونے چاندی یا ہیرے جواہرات کا لالچی نہیں ہوں۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ میرے خرچ پر کتنے آدمی اپنا پیٹ پالتے ہیں مجھے اس کا خیال کبھی نہیں آتا کہ میرے پیسے سے کون اپنے ملبوسات تیار کرواتا ہے۔ اس قسم کی آنی جانی اور فانی چیزیں میری خواہشات اور میری آرزو کے احاطے سے باہر ہیں۔

میرے نزدیک اپنی عزت و ناموس پر کسی بھی قسم کی آنچ آنے دینا سخت گناہ ہے۔

جب ایسا ہوتے دیکھتا ہوں تو میری رگِ حمیت پھڑک اٹھتی ہے۔ میں سراپا حملہ آور بن جاتا ہوں۔"

شیکسپیر کی یہ ساری تقریر جو ہنری پنجم کے منہ سے ادا کروائی گئی ہے بالکل بدوی عرب کے لب ولہجے میں ہے۔ عربی ذہنیت اس میں پنہاں ہے۔

مغرب میں جنگ کا واحد مقصد دشمن کی تباہی رہتا ہے۔ ہر وہ طریقہ جو جنگ میں فتح و نصرت کا باعث بن سکتا ہے اپنا لیا جاتا ہے، جائز طریقے اگر کارگر نہ ہوں تو ناجائز طریقوں کو استعمال کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی۔ اس قسم کے بے لگام اور جابرانہ طور طریق کی ابتداء تو بہت پہلے ہو چکی تھی لیکن آئے دن اس میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اگر رفتار یہی رہی تو عجب نہیں کہ ساری دنیا اور انسانیت فنا کی لپیٹ میں آ جائے۔

لوگ بہت کم اپنے گردو پیش کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس بات کی بہت کم کوشش کرتے ہیں کہ جن حالات میں وہ گھرے ہوئے ہیں اُن حالات کے پیدا ہونے کی اصل تک پہنچیں۔ نتیجہ کے طور پر سیکڑوں سال تک مغربی یورپ کی افواج پر عربوں کا چھوڑا ہوا اثر اس طریقے سے رہا کہ عزت کا حصول، شان و شوکت کا مظاہرہ اور بہادری کے جوہر دکھانا مغربی افواج کی لڑائیوں کا مطمعِ نظر بن گیا۔ اس جذبے کے ساتھ ساتھ فتح کے حصول کی خواہش اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ کار کا اختیار کرنا ان کا مسلک بن گیا۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں جذبوں میں، یعنی عزت کا حصول اور اس کے لیے بہ ہر قیمت کی قید، بعد المشرقین کا فرق ہے۔

افواج کی عظمت و شان کا جو بچا کھچا جذبہ باقی رہ گیا تھا اس کے پیشِ نظر مغربی افواج نے مہلک ہتھیار کی نشوونما اور فروغ کی ہمیشہ سے مخالفت کی۔ بہت سے ایسے سرآورد

آج بھی فوج میں مل جاتے ہیں جو تیر و کمان کے استعمال پر اب بھی زور دیتے ہیں آتشیں اسلحہ کے استعمال کی نہ صرف مخالفت کرتے ہیں بلکہ ان کے استعمال کو وہ اپنے لیے ذلت کا باعث سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں اس کا استعمال انسانی عظمت کے منافی ہے۔

فوج کے جنرل اب بھی ان دنوں کو یاد کرتے ہیں جن کی یاد سے ان کی اپنی بہادری اور شجاعت ان کے ذہنوں میں تازہ ہو جاتی ہے۔ ہاتھ میں تلوار، نمائندوں اور پیغام رسانوں کے ذریعہ اپنے دشمن کے کمانداروں سے رابطہ اور اسی قسم کے شجاعت سے بھرپور عمل غیر مؤثر سہی لیکن عربی شجاعت، دلیری، اولالعزمی اور جراءت کے عناصر سے بھرپور نظر آتے ہیں جو بعد میں چل کر مغربی دنیا کی تہذیب و شائستگی کو مالا مال کرتے رہے ہیں۔

مغربی مصنفین کو یہ حقیقت تسلیم کرنے میں دقت محسوس نہیں ہوتی جب وہ سنتے ہیں کہ مخالفین کو روکنے کے لیے مسلمانوں نے خندق تیار کی اور قریش کے لیے یہ خندق تعجب کا باعث بنی۔

شہر کے جو حصے کھلے تھے ان کے کناروں پر خندق کھودی گئی تھی۔ بقیہ حصوں کے لیے گھروں کی دیواریں فصیل کا کام دے رہی تھیں۔ گھروں پر حملہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریش اس خیال سے آئے تھے کہ مسلمان شہر سے باہر میدان میں جنگ لڑیں گے جیسا کہ احد میں ہوا تھا۔ قریش نے مدینہ کے گھروں پر حملہ کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔

جن لوگوں کے پاس صرف برچھی بھالے، تلوار نیزے یا تیر و کمان ہوں ان کے حملوں کو گھروں کی دیواروں پر سے آسانی سے ناکام بنایا جا سکتا ہے۔ اگر وہ خندق پار بھی کر لیتے تو عمارتوں پر حملہ کرنے سے روکا جا سکتا تھا۔ ذاتی طور پر مجھے یہ تجربہ ہوا ہے کہ ایک مسلح

Marfat.com

جماعت کو لے کر جن کے ہاں بندوقیں تھیں میں کسی کو حراست میں لینے گیا۔ مخالف جماعت کے لوگ بند گھروں میں تھے۔ ہمارے لیے یہ ناممکن ہو گیا تھا کہ مخالفین کو زیر کر سکیں یا ان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر سکیں حالانکہ ہمارے پاس بندوقیں تھیں اور ہم نے بندوقوں کا استعمال بھی کیا تھا۔

مسلم مورخین منافقین کے سردار عبداللہ ابن ابی کو صاحب الرائے سمجھتے ہی نہیں۔ وہ یہ تسلیم کرنے میں قباحت محسوس کرتے ہیں کہ قریش عمارتوں اور گھروں پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ حملہ کریں بھی تو اس میں کامیابی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ماننے میں انہیں اس لیے قباحت ہے کہ یہ مشورہ عبداللہ ابن ابی نے آنحضورؐ کو احد کی جنگ کے موقع پر دیا تھا۔ چونکہ مسلمانوں نے اس موقع پر عبداللہ ابن ابی کے سابقہ مشورہ پر عمل کیا تھا اس لیے وہ اس عمل کی کامیابی کا سہرا عبداللہ ابن ابی کے سر باندھنے کو تیار نہیں۔ وہ مسلسل یہی اصرار کیے جاتے ہیں کہ آپؐ نے جو خندق کھدائی تھی، وہی خندق دشمنوں کے لیے شکست کا باعث بنی۔

قریش اور ان کے اتحادی آتے وقت اپنے ساتھ چھ سو گھڑ سواروں کو بھی لائے تھے۔ جنگِ احد میں قریش کی کامیابی محض ان کے گھڑ سواروں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس دفعہ اپنے ساتھ اتنے زیادہ سواروں کو رکھنے کی وجہ سے ان کو اپنی کامیابی کا صد فی صد یقین تھا۔ یہ یقین اس گمان پر تھا کہ مسلمان کھلے میدان میں جنگ کریں گے۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ درمیان میں خندق حائل رہی۔ کبھی کبھی ایک دو تیروں کا لین دین ہو جاتا تھا۔ حضورؐ کی ذات گرامی پر چونکہ سارے مسلمانوں کی ذمہ داری تھی اس لیے آپ متفکر ہو جاتے تھے۔ ایک مدبر اور سیاسی سمجھ بوجھ کے حامل کی حیثیت سے آپ کی یہ خواہش تھی کہ بغیر لڑائی جھگڑے کے یہ بلا ٹل جائے۔ اس خیال کے پیش نظر آپ نے ایک پیغام ارسال کو غطفان کے سرداروں کے ہاں روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ اگر وہ

Marfat.com

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ کو مقررہ تعداد سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت قرآن نے دے دی تھی۔ سورۂ احزاب کی پچاسویں آیت ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ استثناء صرف حضور کی ذات کے لیے تھا مسلمانوں کے لیے نہیں۔

(ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب رسول اکرم کی سیاسی زندگی میں لکھا ہے

"عربوں میں چونکہ قبیلہ واری نظام ہی عام طور پر رائج تھا اس لیے رشتہ داری سے سے زیادہ مؤثر کوئی اور وجہ دوستی و حلیفی نہیں ہو سکتی۔ چاہے خود یہ بھی کتنی ہی کمزور چیز کیوں نہ ہو لیکن دیگر اسباب کے مقابلہ میں بہرحال زیادہ مستحکم و مستقل امر تھا۔

ہجرت نبوی کے بعد ایک اسلامی حکومت قائم ہو گئی جو ایک شہری مملکت سے آغاز پا کر دس سال ہی میں پورے جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی عراق و فلسطین تک کے دس بارہ لاکھ مربع میل پر محیط ہو گئی تھی۔ اُس زمانے میں پیغمبر اسلام نے جو عقد فرمائے وہ جغرافیائی نقطۂ نظر سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان میں جغرافیائی تقسیم اور ملک گیر وسعت نظر آتی ہے۔

قریب قریب ہر بڑے قبیلے کی اس میں نمائندگی ہے اور چونکہ یہ خواتین نہایت ہی شریف خاندان اور بڑے رتبے کی ہوتی تھیں اس لیے اس کے اثرات بھی دوررس ہوتے تھے۔

اہل مکہ سے باہر بی بی زینب بنت خزیمہؓ اور بی بی میمونہؓ دونوں کا تعلق یمن کے زبردست قبیلہ عامر بن صعصعہ سے تھا خاص کر بی بی میمونہ کی آٹھ نو بہنیں تھیں اور سب نہایت اچھے گھروں میں بیاہی گئی تھیں اور کتاب المحبر کے مستند مولف محمد بن حبیب (فوت ۲۴۵ھ) کو اپنی کلاسیکل کتاب میں تسلیم کرنا پڑا کہ

"پورے عرب میں کوئی اور ایسی عورت معلوم نہیں جس کے داماد اس سے زیادہ شریف ہوں بہ نسبت ہند بنت عوف کے جو بی بی میمونہ اور ان کی بہنوں کی ماں تھیں۔"

بی بی جویریہؓ بنی المصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں۔ یہ ایک نہایت ہی طاقتور اور وسیع قبیلہ تھا اور مکہ اور مدینہ کے مابین رہتا تھا۔ اس عقد کے ساتھ اسلامی مملکت کی سرحد مکہ

Marfat.com

کی سمت کوئی سو میل آگے بڑھ گئی۔

کندہ جنوبی عرب میں ایک شاہی خاندان تھا۔ اسلام سے پہلے ان کی سلطنت جنوبی عراق تک عرب کے مشرقی حصے میں پھیل گئی تھی۔ یہی حال قبائل کلاب و کلب و بنی سلیم وغیرہ کا تھا۔

خود مکہ میں بی بی خدیجہؓ کا تعلق قبیلہ بنی اسد بن عبدالعزیٰ سے تھا۔

بی بی سودہؓ کا بنی عامر بن لوئی سے

بی بی عائشہؓ کا بنی تیم سے

بی بی حفصہ کا بنی عدی سے

بی بی اُم سلمہ کا بنی مخزوم سے

بی بی اُم حبیبہؓ کا بنی اُمیہ سے

بی بی زینبؓ بن جحش کا قبیلہ بنی اسد بن خزیمہ سے

مکے میں ان سے زیادہ بااثر کوئی اور خاندان نہیں تھے۔

بی بی ماریہؓ مصر کی تھیں اور پہلے عیسائی رہ چکی تھیں۔

بی بی صفیہؓ کا تعلق خیبر کے یہودیوں سے تھا۔

اس مختصر بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کئے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ نکاحوں کے ذریعہ سے مسلمانوں میں پرانی عصبیتوں کو دور کرنے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی وسیع کوشش فرمائی اور نتائج بھی بتاتے ہیں کہ یہ کوششیں بے کار نہ رہیں۔"

جمیب)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حضورؐ کی ازواج مطہرات کے نام دے دیے جائیں:۔

۱۔ بی بی خدیجہؓ بنت خویلد۔ حضورؐ سے بی بی خدیجہؓ کی شادی ۵۹۵ء میں ہوئی۔ آپ کے

Marfat.com

متعلق کہا جاتا ہے کہ حضورؐ سے شادی کے وقت آپ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ ۶۱۹ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ بی بی خدیجہؓ کی زندگی میں حضورؐ نے کوئی اور شادی نہیں کی۔

۲۔ بی بی سودہؓ بنت زمعہ۔ آپ کا تعلق قریش تھا۔ شادی کے وقت آپ بیوہ تھیں آپ کی عمر ۳۰ سال تھی۔ سنہ ۶۱۹ء میں آپ کا نکاح حضورؐ سے ہوا۔

۳۔ بی بی عائشہؓ بنت ابوبکرؓ۔ سنہ ۶۲۳ء میں حضورؐ نے بی بی عائشہؓ سے نکاح کیا۔ حضورؐ کی تمام ازواج مطہرات میں یہ وہ واحد بی بی ہیں جو شادی کے وقت کنواری تھیں۔

۴۔ بی بی حفصہؓ بنت عمر بن خطاب۔ آپ ایک نوجوان بیوہ تھیں۔

۵۔ بی بی زینبؓ بنت خزیمہ۔ ان کا تعلق غطفان کے بنی امیر قبیلہ سے تھا۔ آپ دوبار بیوہ ہو چکی تھیں۔ حضورؐ سے آپ کا نکاح سنہ ۶۲۵ء میں ہوا۔ شادی کے کچھ مہینوں بعد ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔

۶۔ بی بی اُم سلمہؓ۔ آپ کا نام ہند تھا۔ قریش کے بنی مخزوم سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ ایک مسلمان کی بیوہ تھیں۔ شادی کے وقت آپ کی عمر ۲۹ یا ۳۰ سال ہو گی۔

۷۔ بی بی زینبؓ بنت جحش یہ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ زیدؓ بن حارثہ کے طلاق دینے کے بعد حضورؐ نے آپ سے شادی کی۔

۸۔ بی بی ریحانہؓ بنت عمرو۔ آپ ایک یہودن تھیں۔ بنی قریظہ سے آپ کا تعلق تھا۔ ریحانہ بی بی کو اس وقت پکڑا گیا تھا جب کہ سنہ ۶۲۷ء میں قریظہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

۹۔ بی بی جویریہؓ۔ بنی مصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں۔ جنوری سنہ ۶۲۸ء میں جب مصطلق پر دھاوا بولا گیا تو آپ کو گرفتار کیا گیا تھا۔

۱۰۔ بی بی اُم حبیبہؓ بنت ابوسفیان۔ آپ اپنے شوہر کے ہمراہ حبشہ ہجرت کر گئی تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد عرب واپس ہوئیں۔ حضورؐ جب خیبر کی لڑائی سے واپس

Marfat.com

ہوئے تو ۶۱ء میں بی بی اُم حبیبہؓ کے ساتھ نکاح فرمایا۔

۱۱۔ بی بی صفیہؓ بنت حیّ بن اخطب۔ خیبر کے یہودی سردار کنعانہ ابن ابی الحقیق کی بیوی تھیں۔ اس یہودی سردار کی موت مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی۔ آپ کو یہودیت سے چھڑوا کر مسلمان بنایا گیا پھر حضورؐ سے نکاح ہوا۔

۱۲۔ بی بی میمونہؓ بنت حارث۔ یہ حضرت عباس کی سالی تھیں۔ ۶۲۹ء میں آپ کا نکاح حضورؐ کے ساتھ ہوا جب کہ حضورؐ حج کے لیے مکّہ گئے ہوئے تھے۔

۱۳۔ بی بی ماریہؓ۔ یہ ایک مصری باندی تھیں۔ مصر کے فرمانروا کی طرف سے حضورؐ کی خدمت میں تحفتہً پیش کی گئی تھیں۔

ہم نہیں چاہتے کہ حضورؐ کی ازواج مطہرات کے متعلق غیر ضروری بحث میں پڑیں ہاں چلتے چلتے چند باتوں کا یہاں ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ حضورؐ کو عورتوں کی صحبت پسند تھی۔ آپ اُن کی ہمنشینی سے محظوظ ہوتے تھے۔ آپ نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے کہ

"میں تمام چیزوں سے زیادہ عورتوں کو اور خوشبو کو پسند کرتا ہوں، لیکن میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔"

عورتوں سے اُنس اور نماز کے درمیان آپ نے جو ربط قائم فرمایا ہے وہ اس بات کی شہادت ہے کہ آپ کے جذبات میں چاہے وہ عورتوں کے تعلق ہی سے کیوں نہ ہو ایک معصومیت اور پاکیزگی کا عنصر پایا جاتا تھا۔

آپ نے کبھی بھی جنسی بے راہ روی یا ہوس پرستی کی وکالت نہیں کی۔ زندگی بھر سوائے اپنی بیویوں کے کسی بھی عورت کے ساتھ آپ کے تعلقات نہیں رہے۔ اپنی بعثت سے قبل بھی جب کہ آپ نوجوانی اور جوانی کی منزلوں کو طے کر رہے تھے، ہمیشہ اللہ تعالے کی حمد و ثنا کیا کرتے تھے کہا جاتا ہے کہ آپ نے کسی بھی عورت کو سوائے اپنے

محرمات کے کسی بھی بہانے چھوا تک نہیں۔

آپ نے اُس وقت اپنی ازدواج میں اضافہ کیا جب کہ آپ کی عمر ۵۵ سال کی تھی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سوائے بی بی عائشہ کے آپ کی تمام بیویاں بیوہ تھیں اور ان میں سے بھی کئی ایک ادھیڑ عمر کی اور حسن سے عاری تھیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کو عمر رسیدہ اور سمجھدار عورتوں کی صحبت پسند تھی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضورؐ کو اولاد نرینہ کی خواہش تھی اس لیے آپ ایک کے بعد دوسری شادی کرتے رہے۔

اگر لوگوں کا یہ خیال صحیح تھا تو حضورؐ بجائے ادھیڑ عمر کی عورتوں سے شادی کرنے کے نوجوان لڑکیوں سے شادی کرتے تاکہ اولاد نرینہ کی خواہش کی تکمیل بہتر طریقے سے ہو سکے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے یہ شادیاں سیاسی مصلحت کی بناء پر کیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کا منشاء اُن عورتوں اور بچوں کی سرپرستی کرنا تھا جو جنگوں میں مارے گئے تھے۔ جنگِ اُحد میں ستّر مسلمان شہید ہوئے تھے۔ اُن مسلمانوں کی شہادت نے عورتوں اور بچوں کو امت کی ذمہ داری بنا دیا تھا۔ اُن بیوہ عورتوں کی حضورؐ نے اس طریقے سے سرپرستی کی۔

یہاں ایک اور بات قابلِ توجّہ ہے۔ حضورؐ جب جوان تھے بی بی خدیجہؓ کے بطن سے آپ کو چھ بچے ہوئے تھے۔ یہاں بارہ بیویوں سے ایک بچہ بھی نہیں ہوا۔ صرف مصری لڑکی ماریہؓ کے بطن سے ایک لڑکا تولد ہوا۔

حضورؐ کی بیویوں میں سے اکثریت اگرچہ کہ جواں نہیں تھی پھر بھی بچے جننے کے قابل تھی۔ مدینہ میں حضورؐ کو اتنا وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ آپ زندگی کے اس پہلو پر زیادہ توجہ دیتے۔ یوں بھی جب آپ کی عمر پچاس سے تجاوز کر گئی تھی، آپ ذہنی اور جسمانی طور پر اپنے آپ کو امت کے لیے وقف کر چکے تھے۔ جہاں انسان وقت کی اہم ترین

گتھیوں کو سلجھا رہا ہو اور مختلف قسم کے نازک ترین حالات میں گھرا ہوا ہو وہاں مکمل طریقے سے جنسی خواہشات کی تکمیل جو بچوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جان بوجھ کر ادھوری چھوڑ دی جاتی ہے اور یہ امت کیلئے ایک قسم کی قربانی ہے۔

حضورؐ کا انتقال ۶۲ سال کی عمر میں ہوا۔ وفات کے وقت حضورؐ کی گیارہ بیویاں تھیں۔ ان بیویوں کی تعداد کو دیکھ کر آپ پر نفس پرستی کا الزام لگانا سراسر نادانی ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کے بہترین ایام صرف ایک ہی بیوی کے ساتھ گزارے۔ زندگی کے ۵۰ سال تک آپ نے ایک ہی بیوی پر قناعت کی۔

مختلف مردوں اور عورتوں کی جسامتوں میں جس طرح فرق ہوتا ہے اسی طرح ان کے ذہن بھی مختلف ہوتے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ آپ جیسے جیسے عمر رسیدہ ہوتے گئے دن بھر کے کاروبار سے فارغ ہو کر تھکے ماندے جب گھر واپس لوٹتے تھے تو اپنی ازواج کی ہم نشینی آپ کے ذہنی سکون کا باعث بنتی ہو۔

آپ اپنی بیویوں پر انتہائی مہربان رہتے تھے۔ ان کے نقاط نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ خدا نے اس پردے میں بھی آپ پر جو عنایتیں کی تھیں اس کے لیے آپ بارگاہ خداوندی میں سجدۂ شکر بجا لاتے تھے۔

اس بات کا پتہ چلانا مشکل ہے کہ اسلام سے قبل عورتوں کو اپنے ہونے والے شوہروں کو پسند کر کے ان سے شادی کرنے کا رواج تھا یا نہیں۔ مسلم ممالک میں آج بھی اس سلسلے میں کوئی یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ دوسرے مسلم ممالک کی بہ نسبت عرب میں عورتوں کو اپنی پسند کی شادی کرنے کی آسانیاں زیادہ ہیں۔ اپنی پسند کی شادیوں کے سلسلے میں چند ایک مثالیں جو پیش کی جا سکتی ہیں ان سے یہی نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ یہ اصول شخصیات پر منحصر رہا ہے۔ ایک باپ جس کا اثر اپنی بیٹی پر گہرا ہے اپنی بیٹی کو کہہ سکتا ہے کہ وہ باپ کی پسند کے لڑکے سے شادی کرے ایک لاابالی

Marfat.com

باپ اپنی بیٹی کو آزادی دے دیتا ہے کہ وہ جس سے چاہے شادی کرلے۔

عام طور سے عرب میں لڑکیوں کی شادی اس وقت کر دی جاتی ہے جب کہ ان کی عمر ۸ یا دس سال ہوا کرتی ہے۔ لڑکیوں کے شوہروں کا انتخاب ان کے باپ یا سرپرست کرتے ہیں۔ بیوہ، مطلقہ اور غیر پریشان حال عورتیں اپنی پسند سے شادیاں کرلیتی ہیں۔

آنحضورؐ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ لڑکی کو اپنے ہونے والے شوہروں کو رد کر دینے کا پورا پورا اختیار حاصل ہے. شادی کے لیے لڑکی کی رضامندی ضروری ہے۔

ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضورؐ کی ایک صاحبزادی سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حضورؐ نے اپنی صاحبزادی کی رائے مانگی۔ جب بیٹی نے نہ کہہ دیا تو آپ نے اُس آدمی کے پیام کو رد کر دیا۔

ایک عورت کو اپنے ہونے والے شوہر کو پسند کرنے کا اتنا اختیار نہیں جتنا اسے رد کر دینے کا۔ عورت کو پورا پورا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جس آدمی کو بھی شادی کے لیے پسند نہ کرے اس کے پیام کو رد کر دے۔ اس کے اس حق کی پوری حفاظت کی گئی ہے۔ عورت کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کے بھی پلے نہیں باندھا جا سکتا۔ یہی طریقہ آج بھی اکثر عرب قبیلوں میں رائج ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ بی بی خدیجہؓ نے خود حضورؐ سے شادی کی درخواست کی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ضمنی طور پر بی بی کو اپنے چچا سے شادی کی منظوری لینی پڑی تھی لیکن بی بی خدیجہؓ کی یہ درخواست ان کے چچا رد نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ خواہش کا اظہار بی بی خدیجہؓ کی طرف سے ہوا تھا۔

مغربی مصنفین کا یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے عرب ظالم تھے، جفاکار تھے اور وحشی خصوصیات کے حامل تھے۔ اپنی عورتوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرتے تھے۔ اس قسم کا نتیجہ اخذ کرنا مصنف کو اپنے دل کا غبار نکال لینے میں

تو مردود ہو سکتا ہے لیکن یہ تعصب اور گمراہی کے دور لے پر لاکھڑا کرتا ہے۔ اس نہج پر سوچنے والوں کو ان کے مطلب کی بھی چند مثالیں مل جاتی ہیں۔

جب ہم مختلف نقاط نظر کو سامنے رکھ کر اس وقت کے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں تو عربوں پر یہ الزام کہ وہ اپنی عورتوں کو جانوروں جیسا سمجھتے تھے مبنی بر انصاف نظر نہیں آتا۔

ان کی محبت کی بے شمار داستانیں اور حسن و عشق سے بھرپور نظمیں آج بھی ہم کو عربی ادب میں مل جاتی ہیں۔

صحرا میں عورتوں کا تن تنہا سفر کرنا، عام مباحثوں میں حصہ لینا، شعرا کی نظم خوانی میں شریک ہونا، شاعری کے مقابلوں میں حصہ لینا، لڑائیوں میں جا کر عملی طور پر شریک ہونا اس طرح کی سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔

ایسی بھی مثالیں ہیں جن میں عورتوں کا اپنے شوہروں کو راہ راست پر لانا، مردوں کے کسی عمل سے متفق نہ ہونا، رائے مشورہ دینا، اپنی بات کو منوانے کے لیے سخت سے سخت رویہ اختیار کرنا اور اسی طرح کی کئی باتوں کا ذکر ہے۔

میاں بیوی میں جب کوئی جھگڑا ہو جاتا اور وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ عام طور سے عورتوں کی حمایت اور وکالت کرتے۔

جنگ اُحُد کے دو سال بعد قریش کو پھر اس بات کا موقع ملا کہ وہ مسلمانوں کی سرگرمیوں کو ختم کرنے کے لیے ایک بڑی فوج کو لے کر میدان میں آئیں۔ مسلمانوں نے ان کے شہر کی اس طرح ناکہ بندی کر رکھی تھی کہ ان کی معیشت پر اس کا بُرا اثر پڑ رہا تھا۔

مسلمان مورخین کا کہنا ہے کہ یہودیوں کے ورغلانے کی وجہ سے قریش نے محض دھاک بٹھانے اور پروپیگنڈہ کی خاطر یہ قدم اٹھایا تھا۔ قریش کی لشکر کشی خاص طور پر سلام ابن ابی الحقیق اور حی ابن اخطب پر اٹھی تھیں جو یہودیوں کے بنی نضیر کے سردار تھے۔

Marfat.com

قریش سے قطع تعلق کر کے اپنے اپنے گھروں کا رُخ کریں تو ان کو مدینہ کے کھجوروں کی کاشت کا تیسرا حصّہ بطور خوشنودی دیا جائے گا۔

دو قبیلوں کے سرداروں نے، جو جنگ سے بیزار نظر آ رہے تھے اور وہ بھی ایسی جنگ جس سے نہ تو ان کو مالی منفعت کی امید تھی اور نہ ہی اس میں کوئی اور کشش تھی حضورؐ کی اس پیش کش کو قبول کر لیا۔

حضورؐ نے قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے سربراہوں یعنی سعدؓ ابن معاذ اور سعدؓ ابن عبادہ کو بلوا بھیجا اور اپنے منصوبے کا اظہار کیا اور ان دونوں سے مشورہ مانگا۔ انہوں نے پہلے یہ سوال کیا کہ کیا یہ خدا کا حکم ہے جس کی تعمیل ہم پر فرض ہے یا یہ آپ کا خیال ہے۔ جس پر آپ ہماری رائے طلب فرما رہے ہیں۔

آپؐ نے جواب دیا کہ میں تم سب کی خاطر ایسا کرنا چاہتا ہوں۔ موجودہ صورت حال نازک ہے۔ تم لوگ دشمنوں سے گھرے ہوتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اُن سب کو منتشر کر دوں۔

سعد ابن معاذؓ نے عرض کیا کہ جب ہم بھی ان ہی کی طرح بُت پرست تھے اُن کی مجال نہیں تھی کہ ہم سے ایک کھجور بھی ڈرا دھمکا کر حاصل کریں۔ اب اس وقت جب کہ خدا نے ہماری رہنمائی کی اور مشرف بہ اسلام کیا تو کیا ہم اپنی جائیداد ان کے حوالے ایسے ہی کر دیں گے؟ قطعاً نہیں۔

یہ سُن کر فرمایا کہ اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو مجھے بھی منظور ہے۔ محاصرہ جاری رہا۔ یہ اُن کئی مواقعوں میں سے ایک موقع ہے جس میں آنحضورؐ بہ ذاتِ خود مصلحت اور مصالحت پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ لیکن اپنے پیروؤں کے رجحان کے پیشِ نظر لڑائی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

یہ عین قرینِ قیاس ہے کہ قریش اس بات کو بھانپ گئے تھے کہ غطفان کے لوگ خفیہ طریقے سے مسلمانوں کے ساتھ ساز باز کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لڑائی سے

Marfat.com

چھٹکارا حاصل کرلیں۔ اس موقع پر غطفان کی گفت وشنید نے انکے دلوں میں شک وشبہات پیدا کر دیئے۔ ان شکوک وشبہات نے وہ زور پکڑا کہ ان لوگوں کے درمیان مسلمانوں کے خلاف لڑنے کا جو معاہدہ ہوا تھا وہ ٹوٹتا نظر آیا۔

ایک دن قریش کے چار گھڑسواروں نے خندق پار کرلی۔ مسلمانوں کے سامنے جاکر کھڑے ہوگئے۔ ان کا سردار عمرو ابن عبدود مسلمانوں کو مقابلے کے لیے للکارا مسلمانوں کا خون کھولانے کے لیے کہہ رہا تھا کہ کہاں ہے تمہاری جنت جس میں تمہیں داخل ہونا ہے۔ کیوں مجھ سے مقابلے کے لیے کترا رہے ہو۔

اس کی ان باتوں کو سن کر حضورؐ نے حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو اشارہ کیا کہ اس کی دعوت مقابلہ قبول کرلیں۔ حضرت علیؓ عمرو کی طرف بڑھے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم گھوڑے پر سوار ہو اور میں زمین پر کھڑا ہوں نیچے اترو تاکہ ہم دونوں میں برابر کا مقابلہ ہو سکے۔

عمرو گھوڑے سے نیچے اتر گیا۔ اب ان دونوں میں لڑائی شروع ہوگئی۔ ان کے پاؤں کی گردش کی وجہ سے گرد وغبار اتنا اٹھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا جب غبار چھٹا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ عمرو زمین پر مرا ہوا پڑا ہے اور حضرت علیؓ اپنی تلوار عمرو کے کپڑوں سے صاف کر رہے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر مسلمانوں نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے۔ عمرو کے تین ساتھیوں نے جب عمرو کا یہ حشر دیکھا تو وہاں سے اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے جدھر سے آئے تھے ادھر واپس چلے گئے۔

اوس کے سردار سعد ابن معاذؓ نیزہ اٹھائے ہوئے تھے۔ ان کو ایک تیر لگا جس سے زخم آیا۔ یہ زخم جان لیوا ثابت ہوا۔

قبیلہ غطفان کے ایک فرد نعیم ابن مسعود مسلمان ہوکر مدینہ میں حضورؐ کی خدمت میں رہنے لگے تھے۔ قریش کے سرداروں نے بنی قریظہ کے یہودیوں کو کہا کہ وہ دوسرے

Marfat.com

رخ سے مسلمانوں پر حملہ کریں۔ اسی بات چیت کے دوران قریش نے اپنے چند آدمیوں کو بنی قریظہ کے درمیان بھی چھوڑ دیا تاکہ بنی قریظہ کے یہودیہ نہ سمجھیں کہ قریش ان کو مسلمانوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر خود مکہ فرار ہوگئے ہیں۔

نعیم ابن مسعود کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ قریش کے پاس گئے۔ ان سے کہا کہ تم جن لوگوں کو یہودیوں کے پاس بطور ضمانت چھوڑ رہے ہو ان کی جان خطرے میں ہے اس لیے کہ یہودی تمہارے افراد کو رسول اللہ کے حوالے کر رہے ہیں تاکہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات بہتر ہوجائیں۔

اس کے بعد نعیم یہودیوں کے ہاں گئے اور ان سے کہا کہ جب تک تم قریش کے چند لوگوں کو بطور ضمانت اپنے پاس نہ رکھ لو قریش کی باتوں پر یا ان کے وعدہ وعید پر بھروسہ کرنا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریش تم سے دھوکہ بازی کر رہے ہیں۔ وہ تم لوگوں کو مصیبت میں پھنسا کر خود مکہ رفوچکر ہونا چاہتے ہیں۔ نعیم کی اس شاطرانہ چال سے بنی قریظہ اور قریش ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔ بداعتمادی کی فضا پیدا ہوگئی۔

ساتویں صدی کے عرب اپنے جانوروں کو دانہ چارہ خرید کر نہیں کھلایا کرتے تھے بلکہ چراگاہوں میں چرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ قدرت کی فراہم کردہ گھاس ان جانوروں کا پیٹ بھر دیتی تھی۔ آج بھی بدوی قبائل اپنے جانوروں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں جانوروں کی بڑی تعداد ایک محدود رقبے میں تو اپنا پیٹ نہیں بھر سکتی۔ جدھر بھی وہ ہرا بھرا دیکھتے ہیں نکل جاتے ہیں۔ جو لوگ بدوی قبائل کے ساتھ اُٹھے بیٹھے ہوں وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ بدویوں کے ذہن پر ہمیشہ چراگاہیں سوار رہتی ہیں۔

قریش اور ان کے ساتھ آئے ہوئے قبائل اب اس بات سے پریشان ہو رہے تھے کہ مدینہ کے باہر جو چراگاہیں تھیں وہ ان کے جانوروں کے لیے ناکافی تھیں۔ جتنا بھی

Marfat.com

سبزہ تھا ان کے جانوروں نے اُسے ختم کر لیا تھا۔ چارہ کی قلت کی وجہ سے ان کے جانور مرنا شروع ہو گئے تھے۔

پروفیسر مار گولیتھ نے بڑی ہی حقارت کے ساتھ مدینہ میں محصور ہو جانے والوں کو بزدل کہا ہے اور ساتھ ہی ان کو نا اہل بھی۔

اس قسم کی زبان استعمال کرنے سے پہلے کسی بھی صاحبِ علم و بصیرت کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ یہی وہ لوگ تھے جو صرف اس واقعہ کے سات سال بعد دنیا میں فتح و نصرت کا جھنڈا ایسا گاڑتے ہیں جس کی مثال دینے سے تاریخ قاصر ہے۔ ان کی فتوحات کا دائرہ ایک طرف فرانس کو اپنی طرف لیتا تھا تو دوسری طرف ان کے حدود چین کی سرحدوں سے جا ملتے تھے۔

اس بات کو ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ مسلمانوں نے جب یہودیوں کے قبیلے قینقاع اور بنو نضیر کے خلاف اعلان جنگ کیا تو انہوں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ ان کے گھروں پر حملہ کیا جائے یا انہیں لوٹا جائے۔ اس وقت مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد یہودیوں سے دگنی تھی۔ مسلمانوں نے بھی صرف محاصرہ پر قناعت کی تھی۔

کافروں اور مسلمانوں کے درمیان لوگوں کو اگر کوئی فرق نظر آتا تھا تو ان کے جوش، جذبے اور حوصلے میں نظر آتا تھا۔ جہاں تک مادی اور جسمانی ہمت و قوت کا سوال تھا دونوں فریق برابر تھے۔ لیکن قریش ایک منفی جنگ لڑ رہے تھے۔ ان کی یہ لڑائی بغیر کسی مقصد کے تھی۔ وہ اپنی زندگی کی رسم و راہ میں کسی بھی قسم کی تبدیلی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے برخلاف مقصد کی موجودگی مسلمانوں کے دلوں کو گرما رہی تھی۔

مسلمانوں کے پیش نظر مثبت پہلو تھے۔ ان کو اس خیال سے تقویت ہوتی تھی کہ ساری دنیا کی نئے سرے سے تنظیم کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کی ہے خدائے تعالیٰ کے سپرد کردہ فرض کی ادائیگی کا جذبہ ان کی روحوں میں اس طرح سرایت

Marfat.com

کر گیا تھا کہ اب وہ ایک نئی منزل کی طرف گامزن تھے ان میں ایک نئی زندگی کا شعور پیدا ہو گیا تھا۔ یہی وہ شعور تھا جو مسلمانوں کے حوصلوں کو دن بہ دن بلند کر رہا تھا۔

کافروں کے ہاں ایسے کسی جذبے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہی وہ تفاوت تھا جو دونوں فریقوں کے درمیان ایک حدِ فاصل بنا ہوا تھا۔

جب کافروں نے دیکھا کہ مسلمان شہر سے باہر میدان میں جنگ نہیں کر رہے ہیں تو انہوں نے محاصرہ جاری رکھنا حماقت سمجھا۔

محاصرہ کو فوری ختم کر کے واپس جانے کا فیصلہ جس رات ہوا وہ رات بھی ایک عجیب وغریب رات تھی۔ موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ زوردار ہوا چل رہی تھی۔ پانی خیموں کے اندر آ گیا تھا۔ خیموں میں جو آگ جلائی جا رہی تھی اب وہ پریشانی کا باعث بن گئی تھی۔ پکانے کے برتن اور کھانے پینے کا سامان ہوا میں اڑ اُڑ کر صحرا میں جا کر گرنے لگا تھا۔ بارش کے ساتھ بلا کی سردی بھی ہونے لگی تھی۔ جانور ٹھٹھر کر مر رہے تھے۔ چارہ کی قلت کی وجہ سے یہ پہلے ہی سے اَدھ موتے تھے۔ جیسے ہی اس آندھی اور طوفان میں کمی ہوئی ابوسفیان نے اپنی مجلسِ مشاورت طلب کی۔ اس مجلس کے سامنے اُس نے اپنی واپسی کے ارادہ کا اعلان کیا۔ ایک مسلم جاسوس کے بیان کے مطابق جو اس وقت وہاں موجود تھا، ابوسفیان اتنا دہشت زدہ تھا اور واپس جانے کے لیے اتنا مضطرب کہ ابھی وہ اونٹ پر بیٹھنے کے لیے صرف ایک ہی پاؤں رکھا تھا کہ اونٹ کو اٹھا دیا اور اُسے دوڑانے لگا۔

قریش کے لیے محاصرہ چھوڑ کر واپس جانے کی دوسری وجہ یہ رہی کہ مکہ کے سالانہ میلے کے لیے صرف ایک مہینہ باقی رہ گیا تھا۔ جس سے ایک ماہ قبل ایک بازار لگایا جاتا تھا جس میں کافی خرید و فروخت ہوتی تھی اور مکہ والوں کو اس سے کافی فائدہ ہوتا تھا۔ قریش کے لوگ اب دوہری قربانی کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایک طرف تو ان کو مالی نقصان

Marfat.com

کا اندیشہ تھا۔ دوسری طرف وہ محاصرہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ حج کے لیے جو لوگ مکہ آتے تھے ان کے انتظامات بھی ان ہی کو کرنے تھے۔ ان کو خطرہ تھا کہ اگر محاصرہ کرتے وہ مدینہ میں رہ جائیں تو اس اعزاز سے بھی محروم رہیں گے۔

جیسے ہی قریش واپس جانا شروع ہوئے ان کے یار و مددگار بدوی قبیلے بھی صحرا میں روپوش ہونے لگے۔

مدینہ کا محاصرہ ختم ہو گیا۔ جو شخص مشرکین کی نقل و حرکت پر نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا تھا، مشرکین کے چلے جانے کے بعد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صبح کا وقت تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔

حضورؐ ایک چادر اوڑھے ہوئے نماز ادا فرما رہے تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ لوگ خندق سے باہر نکل آئیں۔ آپ اپنے مکان تشریف لے گئے۔ جنگ کے لیے جو لباس پہنا تھا وہ اتار دیا۔

اسی دن دوپہر میں حضورؐ نماز ظہر کے لیے مسجد جا رہے تھے۔ راستے میں جبرئیل سے ملاقات ہوئی۔ جبرئیل سر پر زریں عمامہ اوڑھے ہوئے تھے۔ خچر پر سوار تھے۔ خچر کی زین ریشم و کمخواب سے سجی ہوئی تھی۔ جبرئیل نے حضورؐ سے سوال کیا کہ کیا لڑائی ختم ہو چکی ہے۔ حضورؐ نے اثبات میں جواب دیا۔ جبرئیل نے کہا کہ فرشتوں نے تو ابھی تک اپنے ہتھیار نہیں اتارے ہیں" خدا نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ بنی قریظہ کے ہاں جائیں۔" جبرئیل نے کہا کہ میں خود بھی وہیں جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر فرشتہ غائب ہو گیا۔

حضورؐ نے فوری اعلان فرمایا کہ کوئی شخص اس وقت تک نماز ظہر نہ پڑھے جب تک کہ وہ بنی قریظہ کی بستی میں نہ پہنچ جائے۔ خود جانے سے قبل چند مسلمانوں کو وہاں روانہ کر دیا تھا۔ آپ نے ان لوگوں سے دریافت کیا کہ آیا انہوں نے کسی اور کو وہاں سے گزرتے دیکھا ہے۔

لوگوں نے جواب دیا کہ ہم نے دحیہ ابن خلیفہ کو ایک سفید خچر پر جس کی زین ریشم دکمخواب سے مزین تھی یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔

حضورؐ نے جواب دیا کہ وہ تو جبرئیل تھے۔ وہ اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ بنی قریظہ کے قلعوں کی دیواریں ہلا دی جائیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حیٔ ابن اخطب یہودی قبیلہ بنی نضیر کا سردار تھا۔ اسی نے قریش اور غطفان کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا تھا۔ بنی قریظہ کو مجبور کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف قریش سے مل جائیں۔ جب قریش اور دیگر قبائل محاصرہ اٹھا کر اپنے مقام کو چلے گئے تو یہ بنی قریظہ کی بستی پر پہنچا۔ اس نے ان کو مخاطب کر کے کہا اہل یہود تم دیکھ چکے ہو کہ کیا کچھ ہو چکا ہے۔ میں تمہارے سامنے تین تجاویز رکھتا ہوں۔

پہلی یہ کہ ہم انھیں اپنا پیغمبر تسلیم کر لیں۔ پھر تو ہماری جانیں، ہماری عورتیں، ہمارے بچے اور ہماری جائدادیں سب ہی محفوظ رہیں گے۔

بنی قریظہ نے جواب دیا کہ ہم کسی قیمت پر بھی اپنا مذہب ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

یہ سن کر حیؔ نے کہا کہ ایسی صورت میں ہمیں چاہیئے کہ پہلے اپنے ہی ہاتھوں اپنی عورتوں اور بچوں کا خاتمہ کر دیں اور اس کے بعد محمدؐ سے مقابلہ کریں، اب تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔

بنی قریظہ نے کہا کہ کس طرح وہ اپنے بے گناہ بچوں اور عورتوں کو اپنے ہی ہاتھوں ہلاک کر سکیں گے۔ ان کے بعد ہم کس کی خاطر جئیں گے۔ ایسی زندگی کا فائدہ ہی کیا ہوگا۔

بنی قریظہ کی ان باتوں کو سن کر حیؔ نے اپنی تیسری تجویز رکھی، کہا کہ آج کی رات ہماری مذہبی رات ہے۔ ہم کو چھپ چھپا کر مدینہ سے باہر نکل جانا چاہیئے۔ اگر ہم ایسا

Marfat.com

کرلیں تو محمدؐ اور مسلمانوں کو ہماری روپوشی پر بڑا تعجب ہو گا۔ انھیں معلوم ہے کہ ہم اپنے مذہبی دن کبھی کسی سے نہیں لڑتے اس لیے وہ ہم کو درگزر کر دیں گے۔ یہودیوں نے دہشت زدہ ہو کر سوال کیا کہ کیا ہم اپنے مذہبی دن کو گندہ اور نجس کر دیں۔

حئی نے غضب ناک ہو کر کہا کہ تم لوگ مسائل کو حل کرنے کے قابل نہیں رہے ہو۔ جو میں کہہ چکا ہوں بس اُسی پر عمل کرو۔

یہودیوں نے اپنے ایک نمائندہ کو حضورؐ کی خدمت میں روانہ کیا اور درخواست کی کہ بنی اوس کے ابولبابہ کو یہودیوں کے ہاں روانہ کیا جائے۔ بنی اوس کے تعلقات بنی قریظہ سے اچھے تھے۔ جب ابولبابہ یہودیوں کے ہاں گئے تو ان کی اس کسمپرسی کی حالت کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ ساری عورتیں اور بچے گریہ وزاری کر رہے تھے۔ مرد ہیبت کے مارے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ یہودیوں نے کہا اے ابولبابہ کیا آپ کی رائے میں یہ مناسب ہے کہ ہم محمدؐ کے آگے اپنا سر خم کر دیں۔ ابولبابہ نے کہا "ہاں" لیکن اُسی لمحہ انہوں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو گلے کی طرف لے جا کر اشارہ سے بتلایا کہ ان سب کا گلا بھی کاٹ دیا جائے گا۔ ابولبابہ بعد میں کہتے ہیں کہ میں نے ڈرتے ڈرتے یہ حرکت کی تھی۔ پھر مجھے فوری یہ احساس ہوا کہ میں نے اللہ اور رسول کی غلط ترجمانی کی ہے۔

ابولبابہ دوڑتے ہوئے مسجد نبوی واپس ہوئے۔ حضورؐ سے نظریں بچاتے رہے مسجد میں پہنچ کر انہوں نے اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ لیا۔ حضورؐ نے ان کی اس حرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ابولبابہ اگر سیدھے میرے پاس آجاتے تو میں اپنے اللہ سے درخواست کرتا کہ وہ ابولبابہ کو معاف کر دے۔ چونکہ انہوں نے خود ہی ایسی حرکت کی ہے اس لیے میں ان کو ستون سے اس وقت تک آزاد کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ جب تک کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس لغزش کو درگزر نہ فرمادے

اس رات حضورؐ ام سلمہؓ کے گھر آرام فرما رہے تھے ۔

حضورؐ کے وصال کے بعد بی بی ام سلمہؓ اس واقعہ کو یاد کر کے فرماتی ہیں کہ صبح صبح یعنی فجر کے وقت میں نے رسول اللہ کو ہنستے ہوئے دیکھا ۔ میرے سوال پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ خدا نے ابولبابہ کو معاف کر دیا ہے ۔ بی بی ام سلمہؓ نے یہ خوش خبری ابولبابہ تک لیجانے کی اجازت مانگی ، اور دوڑتے ہوئے اپنے دروازہ تک گئیں ، زور زور سے کہنے لگیں ۔ "ابولبابہ تمہیں مبارک ہو ۔ خدا نے تمہیں معاف کر دیا ہے "! یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ پردہ کے احکام ابھی نازل نہیں ہوتے تھے ۔ بی بی ام سلمہ کی آواز سن کر کئی لوگ ابولبابہ کو ستون سے الگ کرنے آگے بڑھے ۔ ابولبابہ نے ان کو روک دیا اور کہا جب تک کہ خود رسول اللہ اپنے ہاتھوں سے مجھے رہا نہ کر دیں مجھے آزاد نہ کرو ۔

دوسرے دن صبح بنی قریظہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے بنی قریظہ ۲۵ ، دن محصور رہے ۔ جب بنی کنعانہ نے بھی اسی قسم کی حرکت کی تھی تو عبداللہ ابن ابی نے حضورؐ سے درخواست کی تھی کہ ان لوگوں کو معافی دے دی جائے ۔ بنی کنعانہ بنی خزرج کے حلیف تھے اور عبداللہ خزرج کا سردار تھا ۔ جیسے ہی بنی قریظہ نے مسلمانوں کی سیادت کو تسلیم کر لیا بنی اوس نے حضورؐ سے درخواست کی کہ بنی قریظہ کے ساتھ بھی وہی سلوک ہو جو بنی کنعانہ کے ساتھ ہوا تھا ۔ بنی قریظہ بنی اوس کے حلیف تھے ۔

حضورؐ نے جواب دیا کہ اے بنی اوس ۔ تمہارے قبیلے ہی کا کوئی آدمی ان لوگوں کے متعلق اگر کوئی فیصلہ صادر کرے تو کیا تم مطمئن رہو گے ۔ کیا اس کا فیصلہ تمہارے لیے قابلِ قبول ہو گا ؟

قبیلہ اوس کے سردار سعد ابن معاذؓ کے بازو پر خندق میں ایک تیر لگنے سے زخم لگا تھا ۔ ان کے زخم میں زہر پھیل گیا تھا ۔ ان کی حالت دن بہ دن خراب ہو رہی تھی ۔ وہ بستر مرگ پر تھے ۔ چونکہ یہ بنی اوس کے سردار تھے اس لیے حضورؐ نے انہیں

Marfat.com

بلوا بھیجا۔ وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بنی اوس کے لوگوں نے اپنے سردار سے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ بنی قریظہ کے ساتھ رحم و تلطف کے ساتھ پیش آؤ اس لیے کہ حضورؐ نے ان کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے کے لیے تمہیں جج بنایا ہے بنی اوس کے کہنے پر حضورؐ نے سعد کو حکم بنایا۔ سعد ابن معاذؓ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ سارے آدمی مار ڈالے جائیں ان کی جائداد تقسیم کردی جائے۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو اپنے قبضے میں لے لیا جائے۔ سعد نے کہا یہ ہے میرا فیصلہ۔

ان کے فیصلے کو سن کر حضورؐ نے فرمایا کہ تم نے خدائی فیصلہ دیا ہے۔ اس خدا کا فیصلہ جو ہفت آسمانوں سے بھی اوپر ہے۔

حضورؐ نے سعد ابن معاذؓ کے فیصلہ کو قبول فرمایا۔ راتوں رات مدینہ کے بڑے بازار کے قریب گڑھے کھودے گئے۔ صبح یہودیوں کو آزادی دی گئی کہ چاہیں تو اب بھی وہ اسلام قبول کرلیں تاکہ ان کی جان محفوظ رہ سکے۔ بہت ہی کم لوگوں نے مسلمانوں کی اس پیش کش کو قبول کیا۔ سعد ابن معاذؓ نے فیصلہ سناتے وقت کہا تھا کہ سعد کے لیے وہ وقت آچکا ہے جب کہ اللہ کی راہ میں لوگوں کی رضامندی اور نارضامندی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ بنی اوس نے، مسلمانوں نے اور حضورؐ نے سب نے مل کر یہ عہد کیا تھا کہ سعد ابن معاذؓ جو بھی فیصلہ کریں گے وہ ان سب کے لیے قابل قبول ہوگا۔ سات یا آٹھ سو کے قریب یہودیوں کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو نجد کے بازار میں بیچ دیا گیا۔ ان میں کی ایک عورت ریحانہ بنت عمرو حضورؐ کے ازواج مطہرات میں شامل ہوئیں۔

قرآن کے سورۃ احزاب میں اس محاصرہ کا ذکر ہے۔ فرمایا گیا ہے:۔

" مومنو۔ خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جو اس نے تم پر اس وقت کی جب فوجیں تم پر حملہ کرنے کو آئیں۔ ہم نے ان پر ہوا بھیجی۔ ایسے لشکر نازل

Marfat.com

کیے جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔"

مدینہ کے محاصرہ کے اختتام کے بعد عورتوں کے لیے خاص احکام نازل ہوئے۔ حضورؐ کی بیویوں کے لیے احکام نازل ہوئے کہ وہ اپنے گھروں میں رہا کریں، اپنے زیورات کی نمائش عام لوگوں میں نہ کرتی پھریں۔ مرد اگر ان سے بات کرنا چاہیں تو وہ بات کر سکتے ہیں مگر پردہ کے پیچھے سے۔ جب وہ مجمع میں جائیں تو ان کے چہرے ڈھکے ہوئے ہوں اپنے لباس اور اپنے زیورات کی نمائش نہ کرتی پھریں بلکہ کسی کپڑے سے لباس اور زیورات کو ڈھانپے رکھیں۔ یہ احکام اصل میں حضورؐ کی ازواج مطہرات کے لیے نازل کیے گئے تھے لیکن بعد میں ان کا اطلاق تمام مسلمان عورتوں پر کیا جانے لگا۔

گرما گرم بحث کا موضوع یہ بھی رہا کرتا ہے کہ حضورؐ نے عورتوں کے مرتبہ کو گرایا ہے یا اونچا کیا ہے۔

مالی طور پر حضورؐ نے عورتوں کی مدد اس طرح سے کی کہ وہ میراث کے ایک مقررہ حصہ کی مالک ٹھہرائی گئیں۔ اپنے ماں باپ کی جائیداد کے وارثوں میں عورت کو شامل کیا گیا۔ اسلام سے قبل صرف بیٹے ماں باپ کی جائیداد کے وارث ہوتے تھے۔

حضورؐ نے نومولود لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی رسم کو بالکل ختم کر دیا۔ بیٹوں کو باپ کی بیویوں سے شادی کرنے سے منع فرمایا۔

قرآن کے سورۂ نساء کی ۳۲ ویں آیت میں عورتوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنی محنت اور مزدوری سے جو کچھ کماتی ہیں اس پر ان کا حق ہے۔ اسی سورۂ کی ۳۵ ویں آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ ازدواجی جھگڑے کی صورت میں ایک ثالث شوہر کی طرف سے ہوگا اور دوسرا ثالث بیوی کی طرف سے یہ دونوں مل کر مصالحت کی کوشش کریں گے۔

دوسری طرف حضورؐ نے سختی سے فرمایا کہ شوہر گھر کا بڑا ہوگا۔ اس کو حق حاصل

Marfat.com

ہے کہ اپنی بیوی کی تنبیہ کرے اگر وہ نالائق اور نافرمانبردار ہو۔ اچھی عورت آپ کے نزدیک وہ ہے جو اپنے شوہر کی مطیع اور فرمانبردار ہو۔

عورتوں پر آپؐ نے جو پابندیاں عائد کی ہیں وہ محض اخلاقی نوعیت کی ہیں ان میں حقارت سختی یا بے رحمی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ اس کے برخلاف آپؐ نے ہمیشہ عورتوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنے کو کہا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی وکالت کی ہے۔

آپؐ نے ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی ہے۔ جنسی بے راہ روی کے آپ دشمن تھے۔ جنسی اختلاط اور عورتوں اور مردوں کے ایک ساتھ اٹھنے بیٹھنے یا میل ملاپ کو آپ قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں۔ آپؐ نے ۱۱ عورتوں سے شادیاں کیں اس کے باوجود جنس کے تعلق سے آپ کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا سوائے اپنی بیوں کے آپ نے زندگی بھر کسی عورت کو چھوا تک نہیں۔ آپ کا ایقان تھا کہ ایسا سماج جس میں افراد خاندان کے علاوہ مرد اور عورت جہاں بے تکلفانہ آپس میں ملتے جلتے ہوں اور عورتیں اپنے جسم کی نمائش کرتی پھرتی ہوں اور غیر مردوں کی نظروں میں چھپنے کی کوشش کرتی ہوں بہت جلد جنسی بے راہ روی کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہی وہ سبب تھا جس کے پیش نظر عورتوں کے لباس اور ان کی آزادانہ بے لگام نقل و حرکت پر پابندی عائد کی تھی۔ دوسری طرف آپ نے ان کے حقوق کی حفاظت فرمائی۔ مردوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی عورتوں کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آئیں۔

مسلمانوں کا عورتوں کو سختی سے پردہ کروانا اور ان کو گھروں میں بند رکھنا مغرب کے اکثر لوگ آپؐ کے احکام سے منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں رسمیں آپؐ کے انتقال کے دو سو سال بعد ایرانیوں نے اختراع کیں۔ ایرانی اثر سے متاثر ہو کر دنیا کے اور مسلمانوں نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

Marfat.com

یادگار تاریخیں

مدینہ کو ہجرت	۶۲۲ء
جنگِ اُحد	۶۲۵ء
مدینہ کا محاصرہ	
بنی قریظہ کی بیخ کنی	اپریل ۶۲۷ء

Marfat.com

حدیبیہ

حضورؐ کے حالات زندگی تک کے ہونے والے واقعات کو بتلانے میں ہم ایسے منہمک رہے کہ آپ کے جاری کردہ قوانین، امتناعات اور اصلاحات کا ذکر نہ کر سکے۔ یہ وہ قوانین اور اصلاحات ہیں جو حضورؐ نے مدینہ میں ابتدائی قیام کے دوران مسلمانوں کے لیے نافذ فرمائے تھے۔ قانون یا حکم کے نفاذ کی قطعی تاریخ دینا بہت مشکل ہے۔ جن حالات میں یہ قانون وضع کیے گئے وہ قانون کے منشا اور اس کی علت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اسلام سے قبل عرب شراب کے عادی تھے۔ قبلِ اسلام شاعر شراب کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیتے تھے۔ بُت پرست عرب مدہوشی کو بُرا سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک مدہوشی انسانی عظمت کے منافی تھی۔

شراب کا نشہ انسانی عظمت اور اس کی بزرگی اور بلندی کو قعرِ مذلت میں دھکیل دیتا ہے۔ نشہ کے عالم میں انسان کیسی کیسی گری ہوئی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ اسی لیے بعض لوگ شراب کے اثر کو کم کرنے کے لیے اس میں پانی ملا کر یا بعض شہد ملا کر پیتے تھے۔

Marfat.com

شراب کی قطعی ممانعت کا اعلان حضورؐ نے مدینہ میں فرمایا۔ جنگ اُحد سے پہلے یا اس کے فوری بعد شراب حرام قرار دی گئی۔ حضرت حمزہؓ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حالتِ نشہ میں اُحد میں جنگ کے لیے گئے تھے۔ شاید حمزہ کی شہادت ہی نے شراب کو قطعیت کے ساتھ حرام کرنے میں آسانی فراہم کر دی ہو۔

قرآن کے سورۂ المائدہ کی ۹۰ ویں آیت میں ارشاد ہوا ہے

"اے ایمان والو۔ شراب اور جُوا اور بت اور پانسے یہ سب ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں۔ ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ"۔

پھر ارشاد ہوتا ہے

"شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جُوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈالوا دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو تم کو ان کاموں سے باز رہنا چاہیئے"۔

سورۂ بقر کی ۲۱۹ ویں آیت میں پھر ارشاد ہوتا ہے :۔

"اے پیغمبر لوگ تم سے شراب اور جُوئے کا حکم دریافت کرتے ہیں۔ کہدو کہ ان میں نقصان زیادہ ہیں۔ لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ مگر ان کے نقصان فائیدوں سے کہیں زیادہ ہیں"۔

شراب کی حرمت بڑی حد تک کامیاب رہی لیکن مکمل طریقے سے کبھی بھی نہیں ان رنگین محفلوں اور مجلسوں کا ذکر ہم اب بھی پڑھتے ہیں جس میں قرونِ اولیٰ کے فاتح اپنے وقت کو رنگین بناتے تھے اور شراب سے خوب شغل فرمایا کرتے تھے۔ دمشق میں اموی خلفاء کے درباروں میں باقاعدگی کے ساتھ شراب کا استعمال ہوا کرتا تھا۔

جو لوگ اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے مشہور تھے ان میں سے بعض انہی ظاہری پارسائی برقرار رکھنے کے لیے چوری چھپے شراب پیا کرتے تھے۔ شراب کے سرور سے

وہ خانگی محفلوں میں لطف اندوز ہوتے تھے۔ آج بھی جب کہ کئی ایک مسلمان شراب پیتے ہیں اکثریت ان مسلمانوں کی ہے جنہوں نے زندگی بھر نہ تو شراب کو دیکھا ہے اور نہ ہی شراب کو چکھا ہے۔

مسلم ممالک میں عام اجتماعات اور تقریبات میں مہمانوں کو شراب پیش نہیں کی جاتی۔

تیروں سے فال جس میں بہت سارے تیروں کو اکٹھا کر کے زمین پر گرایا جاتا تھا اور کامیابی کا انحصار تیر کے گرنے کے رخ اور اس کے انداز پر رہتا تھا قمار بازی کی ایک شکل تھی۔ اس کو بھی منع کیا گیا۔

کھانے پینے اور غذا کے متعلق کم و بیش وہی احکامات ہیں جن پر یہودی عمل کرتے ہیں۔ سور کے گوشت کی ممانعت کی گئی ہے۔ مرا ہوا جانور یا گلا گھونٹ کر مارا ہوا جانور کھانے سے منع کیا گیا ہے، جانوروں کا گلا کاٹ کر ان کے خون کو پوری طرح بہا دینے کا حکم دیا ہے۔ بتوں پر قربان کیا ہوا جانور بھی حرام ہے۔

سورۂ بقر کی ۲۷۸ ویں آیت میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے

• مومنو۔ خدا سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔"

پھر اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ کہ تم اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہو اور اگر توبہ کرو گے اور اگر سود چھوڑ دو گے تو تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان اور نہ ہی تمہارا نقصان اور اگر قرض لینے والا تنگدست ہو تو اُسے کشائش کے حاصل ہونے تک مہلت دو اور اگر زر قرض بخش ہی دو تو تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے۔"

عرب ہمیشہ سے تجارت پیشہ لوگ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی تاجرانہ ذہنیت پوشیدہ رکھنے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی۔ اسلامی حکومت کے وجود میں آنے سے قبل ان کو کبھی بھی اپنی فوجوں پر ناز نہیں رہا۔

خود حضورؐ بھی ایک تجارت پیشہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کئی سال تک آپؐ خود بھی تجارت کرتے رہے۔ قرآن کی آیات میں بھی تاجرانہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ تمہارا سرمایہ تمہارے پاس ہی رہے گا۔ ہر نفس وہی خرچ کرے گا جو اس نے کمایا ہے وغیرہ۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مکہ کا ہر آدمی سالانہ اجتماع کے موقع پر وہاں کے کاروبار اور میلوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ تجارت میں اپنا سرمایہ لگاتا تھا۔ سالانہ تجارتی قافلے جو یمن اور شام جایا کرتے تھے ان میں بھی ان کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ سرمایہ کی مناسبت سے منافع بھی تقسیم ہوتا تھا۔

کاروبار میں سرمایہ لگانا اور حصہ دار کی حیثیت سے اس کاروبار سے نفع کا حاصل کرنا اسلام میں منع نہیں ہے۔ ناجائز اور ضرورت سے زیادہ سود کی اصطلاح ان لوگوں کے لیے وضع کی گئی جن کا پیشہ ساہوکاری یا مہاجنی تھا۔ ساہوکار یا مہاجن کبھی بھی تجارتی مہم میں حصہ نہیں لیتا۔ اس کے برخلاف لوگوں کو قرض دے کر زیادہ سے زیادہ سود حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، لوگوں کا استحصال کرتا ہے۔ جہاں شراب کی ممانعت بڑی حد تک کامیاب رہی وہیں سود کی حرمت کو لوگ بھولتے گئے۔

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں اس بات کو واضح کرنا بہتر رہے گا کہ مسلمان اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ حضورؐ اکرم نے مسلمانوں کے لیے اخلاق حسنہ کے معیار مقرر فرمائے ہیں۔ ذات اقدسؐ خود ایک مثال کا کام دیتی ہے۔

ایک مسلمان مصنف ڈاکٹر حمید اللہ کہتے ہیں: "آپ نے یہ نہیں کہا کہ اپنے دشمن

Marfat.com

سے محبت کرو۔ آپ نے یہ کہا کہ اس کو اسی طریقے کی ضرب پہنچاؤ جیسے اس نے تم کو پہنچائی ہے۔ اس بات کا خیال رہے کہ اس سے زیادہ نہیں۔ لیکن اگر تم اس کو معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ تم کو اس کا اجر دے گا۔"

آپ نے لوگوں کو ان کی اپنی دولت سے دستبردار ہونے کو کبھی نہیں کہا۔ آپ نے مسلمانوں سے کہا کہ دنیا اور دین دونوں کو سنبھالے رکھیں۔

قرآن کے سورۂ بقر کی ۲۰۱ ویں آیت میں بیان فرمایا گیا ہے:۔

"اور بعض ایسے ہیں کہ دعا کرتے ہیں کہ پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت سے سرفراز فرما۔ دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔"

حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو دنیوی آلام و آسائشیں اور خوشحالی سے نوازے گا لیکن آپ نے سرمایہ داری کی کبھی بھی تائید نہیں کی اور نہ زندگی میں کبھی بھی آپ نے دولت جمع کی۔

آپ نے بڑی حد تک میانہ روی کی تعلیم دی اور یہ مسلک ہی اخلاقی ضابطوں کی بنیاد پر رہا۔ ہر زمانے کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت میں تضاد پایا جاتا ہے۔ اصولوں کا وضع کرنا اور ان کا ہر زمانے اور ہر وقت اور ہر قسم کے لوگوں پر اطلاق، اس کے لیے بڑے ہی غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

مسلمانوں کا مطمع نظر کبھی بھی یہ نہیں رہا کہ اپنی ہستی کو عوام کے برابر سمجھیں۔ انکساری اور خاکساری میں حد سے تجاوز عیسائی راہبوں کا طریقہ رہا ہے۔ اسلام نے اس نظریہ کو کبھی قبول نہیں کیا کہ تکمیل ذات کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان زبردستی اپنے آپ کو مصیبتوں میں مبتلا کرے۔ اس کے باوجود حضورؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں ایک ایسے فرقہ کا وجود عمل میں آیا جن کا مقصد اپنی ذات کو فنا کے ذریعے

تک لے جانا رہا ہے۔ ان لوگوں کے برخلاف حضورؐ نے ہمیشہ گوشہ نشینی اور ترکِ دنیا کے رجحان کی مخالفت فرمائی۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت ایمان والی ہے۔ اخلاقی ضابطوں کی پابند ہے۔ سیدھی سادی ہے۔ ایک عظیم قادر مطلق کی عبادت گزار ہے۔ ہم جہاں مسلمانوں کی ان اچھی صفات کا ذکر کر رہے ہیں وہیں اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ جن مقامات پر ان عمدہ صفات کے مسلمان رہتے ہیں وہ زرعی علاقے ہیں۔ لوگوں کا ذریعہ معاش زراعت ہے۔ زرعی ممالک میں رہنے والے لوگ عام طور سے مخلص ہوتے ہیں۔ سیدھے سادے ہوتے ہیں۔

مغربی یورپ میں رہنے والوں اور مرکزی ایشیا میں بسنے والوں کے درمیان ان کے اخلاق و کردار میں جو نمایاں فرق نظر آتا ہے اس کا سبب مذہب نہیں ہے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مغربی دنیا میں چونکہ عیسائی رہتے ہیں اس لیے ان کے اخلاق و کردار گرے ہوئے ہیں اور مرکزی ایشیا میں مسلمان بستے ہیں اس لیے ان کے صفات اعلیٰ ہیں۔ مغربی دنیا میں رہنے والے لوگوں میں جو اخلاقی انحطاط نظر آتا ہے وہ ان کی اپنی تن آسانی، دولت کی افراط، شہری زندگی، اقتدار اور طاقت کی حرص اور مختلف قسم کی آسانیوں کی وجہ سے ہے۔

عرب شہنشاہیت کے زریں عہد میں مسلمانوں نے بھی اپنے اخلاق و کردار کی پستی کا وہی ناٹک کھیلے تھے جیسے آج یورپی قومیں کھیل رہی ہیں۔

مدینہ پر قریش نے زور و شور سے حملہ تو کیا تھا لیکن اس میں انھیں جو ناکامی ہوئی اس کی وجہ سے ان کے حوصلے بہت ہی پست ہو گئے تھے۔ قسمت مسلمانوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ دن بدن ان کی ترقی و کامرانی کا ستارہ روشن سے روشن تر ہو رہا تھا۔ اب لوگوں نے آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیں کہ محمدؐ تو

Marfat.com

واقعی پیغمبر نکلے۔ پڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے اب تذبذب میں پڑ گئے تھے۔ کچھ لوگ آپؐ کی عظمت کے تو قائل ہو رہے تھے لیکن آپ کو خدا کا رسول ماننے میں عار محسوس کر رہے تھے۔ ابھی ان کو وقت دیا گیا تھا۔

مسلمانوں کا یہ اصول تھا کہ کسی بھی بدتمیزی کو معاف نہ کیا جائے اور ہر ایسی حرکت کا بروقت مزہ چکھایا جائے۔ سلام ابن ابی الحقیق کا قتل اس کی ایک واضح مثال ہے بنی قریظہ کی بیخ کنی کے چھ مہینے بعد اکتوبر ۶۲۷ء میں حضورؐ نے فیصلہ کیا کہ بنی لحیان کو ان کی شر انگیزی اور فساد کا مزہ چکھایا جائے۔

بدویوں پر حملہ کرنے کے لیے سراغ رسانی بہت ہی ضروری ہوتی تھی۔ بدویوں کے خیمے اتنے منتشر اور بکھرے بکھرے رہتے ہیں اور ان کے مویشی صحرا میں ہر طرف ایسے پھرتے رہتے ہیں کہ یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کہاں اور کس خیمے میں ہے۔ اس لیے صحرا میں جو بھی راستہ چلنے والا یا مسافر مل جاتا ہے اس سے مختلف قسم کے سوالات کر کے اپنے مطلب کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قریش کے لوگ اصل میں تاجر تھے۔ حملہ آور نہیں تھے۔

حملہ کرنے کے سلسلے میں مسلمانوں کی جو ابتدائی کوششیں رہیں ان میں سے کئی کامیاب رہیں اور کئی ناکام۔ اب حملوں کے تعلق سے ان کے تجربوں میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف بدوی قبائل کے لوگ اسلام قبول کرتے جا رہے تھے۔ ان کے اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے مسلمانوں کو آسانی اور مدد اس طرح سے مل رہی تھی کہ یہ بدوی ریگستانی لڑائی اور حملوں کے سلسلے میں مشورہ دیا کرتے تھے۔ حملوں کے وقت رہبری اور راستوں کی نشاندہی کے فرائض انجام دینے لگے تھے۔

اپنے منصوبوں کو خفیہ رکھنے کی خاطر حضورؐ نے مدینہ کو جب چھوڑا تو شمال کی طرف روانہ ہوتے کا اعلان کیا جب کہ آپ کا ارادہ شام کی طرف روانہ ہونے کا تھا۔ مدینہ

Marfat.com

سے بیس میل دور جانے کے بعد مسلمانوں کی جماعت نے اپنا رُخ صحیح سمت میں کر لیا۔ کسی طرح اس کی اطلاع بنی لحیان اور عصفان کو ہو گئی۔ یہ لوگ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چلے گئے جہاں سے وہ اپنی مدافعت بہتر طریقے سے کر سکتے تھے۔ بغیر لڑائی کے مسلمان مدینہ واپس ہو گئے۔

مسلمانوں کی اس کوشش کے رائیگاں جانے کے کچھ ہی دنوں بعد غالباً نومبر ۶۲۷ء میں بنی غطفان کے کچھ لوگ حضورؐ کے اونٹوں کو بھگا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ حضورؐ کے یہ اونٹ چراگاہ میں چر رہے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جس وقت حضورؐ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تھی اس وقت آپ کے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اس وقت ماشاء اللہ اونٹوں کا ایک پورا گلہ آپ کی ملکیت میں تھا۔ آپ کی حاصل کردہ دولت آپ کے معیارِ زندگی کی کبھی بھی اونچا نہ کر سکی۔ اس دولت کو آپ نے اپنے آرام اور آسائش کے لیے استعمال نہیں کیا۔ یہ ساری دولت اور روپیہ پیسہ آپ اُس تحریک کی بقا اور اس کے نشو و نما پر خرچ کر رہے تھے جو آپ کو دل و جان سے زیادہ عزیز تھی اور وہ تحریک تھی اسلام۔

بنی غطفان کے حملہ آوروں نے حضورؐ کے اونٹوں کے گلہ بان کو قتل کر دیا۔ اس کی بیوی کو بھگا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مسلمانوں کو اس کی اطلاع ملی۔ چھ مسلمانوں کی ایک جماعت گھوڑے دوڑاتی ہوئی حملہ آوروں کے تعاقب میں مدینہ سے نکلی حملہ آوروں سے ان کا سامنا ہوا۔ ایک مسلمان شہید ہوا۔ غطفان کے سردار کا بیٹا مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ بنی غطفان کے حملہ آور جن میں سے اکثر اونٹوں پر سوار تھے مسلمانوں کو دیکھ کر ایسے حواس باختہ ہوئے کہ اپنے اپنے اونٹوں پر سے کود کر مختلف سمتوں کو بھاگ گئے تھے۔ حضورؐ بھی مسلمانوں کی ایک جماعت کو لے کر موقع واردات پر پہنچ گئے۔ دشمن کو دوڑتے دوڑتے کافی آگے نکل گئے تھے، اس

Marfat.com

لیے حضورؐ نے آگے بڑھنا بے سود سمجھا اور ایک چشمہ ذو قرد کے پاس قیام فرمایا۔ اونٹوں کو ذبح کر کے گوشت کو دَم دیا گیا۔ پر تکلف اور پر لطف غذا سے مسلمانوں نے اپنے آپ کو محظوظ کیا۔ عربوں کی ریگستانی زندگی میں اس قسم کی دعوتیں اور جشن یادگار بن جاتے ہیں اور لوگوں کے حافظوں میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ بعد میں چل کر یہ دن یوم ذی قرد کے نام سے موسوم ہوا۔

مجھے خود بھی ۱۹۲۰ء میں اس قسم کی جھڑپوں سے سابقہ پڑ چکا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس زمانے میں لوگ برچھی بھالے اور تیر و کمان سے لڑتے تھے اور ۱۹۲۰ء میں ہم نے بندوقوں کا استعمال کیا تھا۔ حادثات جتنے تیر و کمان کو استعمال میں لانے سے ہو سکتے ہیں وہی تناسب بندوقوں نے بھی برقرار رکھا۔

غطفان کے حملہ آور نفسا نفسی میں جب اپنی جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔ حضورؐ کے شہید گلہ بان کی بیوی موقع دیکھ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ اپنے ساتھ ایک اونٹ بھی لیتی آئی۔ اونٹ سے یہ چمٹ گئی تھی۔ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی، واقعہ کی ساری تفصیلات بیان کی۔ بعد میں یہ بھی کہا کہ یہی وہ اونٹ ہے جو مجھے بہ حفاظت تمام یہاں تک لایا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اگر یہ بہ حفاظت تمام مجھے فرار ہونے میں مدد دے تو میں اس کو اللہ کی راہ میں قربان کر دوں گی۔

حضورؐ نے مسکرا کر فرمایا کہ اونٹ نے تو تمہاری جان بچائی اور تم اس کی جان لینا چاہتی ہو۔ یہ خوب احسان شناسی ہے۔ یہ تو اللہ کی مہربانی تھی کہ اونٹ کو تمہارے بحفاظت بچ نکلنے کا وسیلہ بنایا۔ بہر حال کسی ایسی چیز کو قربان کرنے کی قسم کھانا یا نیت کرنا جو تمہاری اپنی ملکیت نہیں ہے جائز نہیں ہے۔ اونٹ کو ذبح کرنے کا خیال چھوڑ دو۔ اللہ پاک تم پر مہربان رہے گا۔

یہ چھوٹا سا واقعہ پھر ایک بار اس زمانے کی عورتوں کی بہادری اور ان کے با تدبر

Marfat.com

ہونے کی نشان دہی کرتا ہے۔

دسمبر ۶۲۷ء یا جنوری ۶۲۸ء میں حضورؐ کو یہ اطلاع ملی کہ بنی قضاعہ کی ایک شاخ بنی مصطلق مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ ان کے حملہ کرنے سے پہلے ہی حضورؐ نے مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کو المریسیع روانہ کیا تھا۔ یہ مقام سمندر کے کنارے تھا۔ تھوڑی سی جھڑپ کے بعد مسلمان فتح یاب ہو گئے۔ ان کی عورتیں، بچے اور جائیداد سب مسلمانوں کے ہاتھ لگے، بہت سے دشمن مارے گئے۔ مسلمانوں کا اس طرح وہاں پہنچ جانا اُن کے لیے بہت ہی تعجب کا باعث بنا۔ مسلمان آرام لینے کی خاطر ایک کنوئیں کے قریب رُکے۔ اُن کے ساتھ گرفتار کی ہوئی عورتیں بھی تھیں غالباً حضورؐ کی وفات کے چند ہی دن بعد مسلمانوں نے جنگی قیدیوں کو اپنے ساتھ لے جانے کا طریقہ متروک کر دیا تھا۔ جنگ کے دوران یا فتح کے بعد جو کافر عورتیں مسلمانوں کے قبضے میں آتی ہیں ان کو داشتہ کے طور پر استعمال کرنے کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ اس موقع پر مسلمانوں نے بنی مصطلق کی عورتوں کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کیا۔

اس قسم کی باتیں صرف جنگی قیدیوں کے ساتھ ہوتی تھیں۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی یہ نہیں سُنا کہ کسی بدوی عرب نے کوئی زنا کیا ہو۔

کنوئیں پر جب کہ جانوروں کو پانی پلایا جا رہا تھا۔ حضرت عمرؓ کا ایک بدوی ملازم بنی خزرج کے کسی آدمی سے جھگڑ رہا تھا۔ تو تو، میں میں سے بات بڑھ کر ہاتھا پائی اور مکہ بازی پر آ گئی۔ حضرت عمرؓ کا ملازم چلّایا

"مہاجرو۔ میری مدد کرو۔"

بنی خزرج کا آدمی چلّایا "انصار میری مدد کو آؤ۔"

چند لمحے ایسے گزرے جس میں مہاجرین اور انصار غصّے سے آپس میں ایک

Marfat.com

دوسرے کو گھورر ہے تھے۔ ملازمین نے بات کو بہت آگے بڑھا دیا تھا۔

حضورؐ کی مدینہ میں تشریف آوری سے قبل عبداللہ ابن اُبی مدینہ کا سردار مانا جاتا تھا اس واقعہ سے اُس کو بڑا طیش آیا۔ اس نے غصہ میں آکر اپنے آدمیوں سے کہا "ہماری برتری اور فوقیت پر وہ جھگڑتے ہیں۔ ہم کو ہمارے اپنے شہر میں انھوں نے اقلیت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب کسی چیز کو وہ ہمارے لیے موزوں نہیں سمجھتے۔ ایک پرانے مقولے کے مطابق یہ مہاجرین ایسے ہیں کہ جن کا کھاتے ہیں انھیں کے برتن میں چھید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔" قسم خدا کی جب ہم مدینہ واپس جائیں گے تو ہم میں جو بھی طاقتور اور مضبوط ہوں گے کمزور کو مار کر وہاں سے نکال دیں گے۔"

عبداللہ ابن اُبی کی ان باتوں کو ایک لڑکا سن رہا تھا اس نے حضورؐ کی خدمت میں یہ اطلاع پہنچائی۔ حضرت عمرؓ حضورؐ کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ حضورؐ سے عرض کیا کہ کسی کو بھجوا کر عبداللہ ابن اُبی کا سر قلم کروا دیا جائے۔

آپ جلد باز نہیں تھے۔ لوگوں کی باتوں میں آسانی سے نہیں آجاتے تھے آپ نے جواب دیا: "اس وقت کیا ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ محمدؐ تو اپنے ساتھیوں کو قتل کر رہے ہیں۔"

بہت سے انصار وہاں جمع تھے انھوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ ہو سکتا ہے کہ لڑکے نے غلط بیانی سے کام لیا ہو۔ عبداللہ ابن اُبی نے کچھ کہا ہو اور لڑکے نے غلط سلط سن کر حضورؐ کے آگے کچھ اور کہا ہو۔ اس وقت تک بھی بعض انصار کے دلوں میں عبداللہ ابن اُبی کی عزت اور وقعت تھی اس لیے کہ وہ ان کا سردار رہ چکا تھا۔

حضورؐ نے اس قضیئے کو رفع دفع کرنے کے لیے فوری کوچ کا حکم دیا۔ حالانکہ اس وقت دوپہر تھی اور دھوپ اور گرمی ناقابل برداشت تھی۔ آپ نے سفر کو دن تمام جاری رکھا پھر رات میں بھی چلتے رہے۔ دوسرے دن ۱۲ بجے تک سفر جاری رکھا

Marfat.com

قافلہ رو کا گیا۔ لوگ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ ان میں کا ہر آدمی نڈھال ہو کر سو گیا۔

بنی مصطلق کے جو قیدی گرفتار ہوئے تھے اُن میں ایک خاتون بھی تھی جس کا نام جویریہ تھا۔ یہ اس قبیلہ کے سردار کی بیٹی تھی۔ ابن اسحٰق کے بیان کے مطابق "جویریہ بہت ہی حسین جمیل اور خوبصورت عورت تھی۔ جس کی بھی نظر اُس عورت پر پڑ جاتی تھی وہ اس کا فریفتہ ہو جاتا تھا۔"

جویریہ حضورؐ کی خدمت میں پہنچی۔ اس نے کہا کہ اس کا باپ اس کی جان کا معاوضہ مسلمانوں کو ادا کر دے گا اس لیے اُسے رہا کر دیا جائے۔

حضورؐ نے فرمایا "کیا تم اپنی آزادی سے بہتر بھی کوئی چیز پسند کرو گی"؟ میں تمہاری جان کا فدیہ دوں گا اور اگر تم رضامند ہو جاؤ تو میں تم سے شادی بھی کر لوں گا۔"

حضورؐ کی اس تجویز کو جویریہ نے قبول کر لیا۔ جیسے ہی مسلمانوں کے علم میں یہ بات آئی کہ حضورؐ نے بی بی جویریہ سے نکاح کر لیا اور اس نکاح کی وجہ سے بنی مصطلق کے لوگ حضورؐ کے رشتہ دار بن گئے ہیں تو انہوں نے اس رشتہ کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے سارے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس شادی کی وجہ سے تقریباً سو خاندانوں کی رہائی عمل میں آئی۔

اگر ابنِ اسحٰق بی بی کے اس حُسن وجمال کا ذکر نہ کرتے ہوتے تو ہم اسی نتیجے پر پہنچتے کہ حضورؐ کی یہ شادی سیاسی مصلحت کی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ قبیلہ والوں کو رہائی حاصل ہوئی تھی اس لیے سارے قبیلے نے اسلام قبول کر لیا۔ اس شادی کی وجہ سے جتنی کامیابی ہوئی شاید جنگ کی وجہ سے اتنی نہ ہوتی۔

مسلمانوں کے ابتدائی حملوں کے دوران چند عورتیں ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ کھانا پکانا اور زخمیوں کی مرہم پٹی وغیرہ کرنا اُن کا کام ہوتا تھا۔ جب

کبھی حضورؐ کسی مہم پر مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے حضورؐ کی کوئی نہ کوئی بیوی آپ کی ہمسفر ہوتی تھیں۔

بنی مصطلق پر حملہ کرنے کے لیے حضورؐ جب مدینہ سے روانہ ہوئے تو اپنے ساتھ بی بی عائشہ کو لے کر چلے تھے۔ حضرت عائشہ حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی تھیں جب مسلمانوں کی جماعت مدینہ واپس ہو رہی تھی رات کے ابتدائی حصے میں آرام لینے کے لیے سفر ملتوی کیا گیا۔ تمام مسافر ہو گئے۔ صبح صادق سے پہلے سفر دوبارہ شروع ہوا۔ اس وقت ابھی اندھیرا تھا۔ اپنے محمل میں سوار ہونے سے قبل بی بی عائشہ رفع حاجت کے لیے کچھ دور گئیں۔ ضروریات سے فارغ ہو کر واپس ہوئیں تاکہ اونٹ پر سوار ہو جائیں۔ اس موقع پر ان کو معلوم ہوا کہ ان کے گلے میں مالا نہیں ہے اور وہ کہیں گر گئی ہے۔ اس خیال سے کہ جہاں ابھی وہ ہو آئی ہیں شاید اسی جگہ مالا گر گئی ہو۔ اندھیرے ہی میں مالا کی تلاش میں نکلیں۔

جب سفر پہلے پہل شروع ہوا تھا بی بی عائشہ اونٹ پر سوار تھیں۔ محمل میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ محمل کے اطراف پردہ لگا ہوا تھا۔ اونٹ کی لگام کسی اور آدمی کے ہاتھ میں تھی۔ آدمی لگام تھامے آگے آگے چل رہا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے اونٹ۔ آرام کے بعد جب سفر دوبارہ شروع ہوا تو اس آدمی نے جس کے ہاتھ میں بی بی عائشہ کے اونٹ کی لگام تھی اس خیال سے کہ بی بی عائشہ محمل میں بیٹھی ہوئی ہیں اپنے سفر کو جاری رکھا۔

بی بی عائشہ مالا ڈھونڈنے میں رہ گئیں اور ان کا اونٹ منزل کی طرف رواں ہو گیا۔ بی بی عائشہ کو ان کی مالا مل جاتی ہے۔ سواری نظر نہیں آتی۔ اب بی بی عائشہ وہاں پر تنِ تنہا تھیں۔

حضرت عائشہ کے الفاظ میں کہ محمل میں ان کی غیر موجودگی کا مسلمانوں کو بہت

Marfat.com

جلد علم ہو جاتے گا اور کوئی نہ کوئی اُن کو لینے کے لیے وہاں آجاتے گا وہ ایک چادر بچھا کر وہیں پر لیٹ جاتی ہیں۔

مسلمانوں کی جماعت جو بنی مصطلق پر حملہ کرنے کی غرض سے گئی تھی اس میں ایک نوجوان آدمی بھی تھا۔ اس کا نام صفوان تھا۔ کسی وجہ سے وہ اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اپنا راستہ ناپتا جا رہا تھا۔ اسی راستے سے وہ واپس ہو رہا تھا جدھر سے مسلمان واپس ہوئے تھے۔ اونٹوں کے پاؤں کے نشان اس کی رہبری کر رہے تھے۔

صفوان اپنی دُھن میں جب اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا اُس کے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہی جب اُسنے اُم المومنین کو تنہا پایا۔ اپنے اونٹ کو بٹھا دیا۔ بی بی سے درخواست کی کہ آپ اونٹ پر سوار ہو جائیں۔ جب حضرت عائشہ اونٹ پر سوار ہو رہی تھیں اور سوار ہونے کے بعد اپنے کپڑوں کو درست کر رہی تھیں، صفوان اپنا رُخ دوسری طرف کیے ہوتے کھڑا تھا تاکہ بی بی عائشہ کا اونٹ پر سوار ہونا نہ دیکھ سکے۔

جب بی بی عائشہ اونٹ پر بیٹھ گئیں تو صفوان اونٹ کی نکیل لیے آگے آگے پیدل چل رہا تھا اور راونٹ اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔

دن کی روشنی میں حضرت عائشہ معہ اپنے اونٹ اور راونٹ کی نکیل تھامے ہوئے آدمی کے بقیہ قافلے میں شریک ہوگئیں۔

حضورؐ کی نوجوان بیوی کو ایک نوجوان آدمی کے ساتھ آتے دیکھ کر لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔ اس غیر متوقع واقعہ نے مدینہ کے در و دیوار ہلا دیئے۔

منافقوں نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ ان کی بن آئی۔ وہ آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے بی بی عائشہ سے جلنے والی عورتوں نے آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیں۔ یہ بات

Marfat.com

اس زور و شور سے آگے بڑھنے لگی کہ خود حضورؐ کو بھی حضرت عائشہ پر شک ہونے لگا۔ حتیٰ کہ حضورؐ نے حضرت عائشہ کو اُن کے باپ حضرت ابوبکرؓ کے گھر روانہ کر دیا۔

اپنے گھر کے دو نوجوانوں سے اس سلسلے میں حضورؐ نے مشورہ کیا۔ ایک تو حضرت علیؓ تھے اور دوسرے زید بن حارثہ۔

زید نے بی بی عائشہ کی طرف داری کی۔ عائشہ کی نیک نامی کا حوالہ دیتے ہوئے زید نے ان کو باآبرو اور باعصمت عورت ثابت کیا۔ زید نے کہا کہ ساری افواہیں سرے سے جھوٹ اور سراسر بے بنیاد ہیں۔ لیکن حضرت علیؓ نے کہا کہ عورتوں کی کوئی کمی نہیں۔ حضرت عائشہ کا نعم البدل مل سکتا ہے۔ اُن کی خاطر حضورؐ پریشان نہ ہوں۔

حضرت علیؓ نے کہا کہ حضورؐ بی بی عائشہ کی خادمہ سے اُن کا چال چلن دریافت کر لیں وہ سب کچھ سچ سچ بتلا دے گی۔

جب خادمہ سامنے لائی گئی تو حضرت علیؓ نے اُس کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ حضورؐ کے سامنے ہر بات سچ سچ بیان کر دے۔

خادمہ نے بڑے ہی معصومانہ انداز میں جواب دیا کہ میں تو عائشہ کی خوبیوں ہی کو جانتی ہوں۔ مجھے تو اُن میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ ان کی صرف ایک ہی غلطی کو میں جانتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ جب میں آٹا گوندھنے کے لیے جھکی تو حضرت عائشہ سے کہا تھوڑی دیر کے لیے آٹے کا خیال رکھنا۔ انہوں نے آٹے کا خیال نہیں رکھا اور سو گئیں اور بکری سارا آٹا کھا گئی۔"

حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو طلب کیا۔ یہ منظر بڑا ہی دلسوز تھا کہ ایک طرف بی بی عائشہ تھیں۔ دوسری طرف بی بی عائشہ کے ماں باپ یعنی حضرت ابوبکرؓ اور ان کی بیوی ایک طرف خود حضورؐ۔

Marfat.com

شمال میں مسلمانوں کے دائرہ عمل میں توسیع

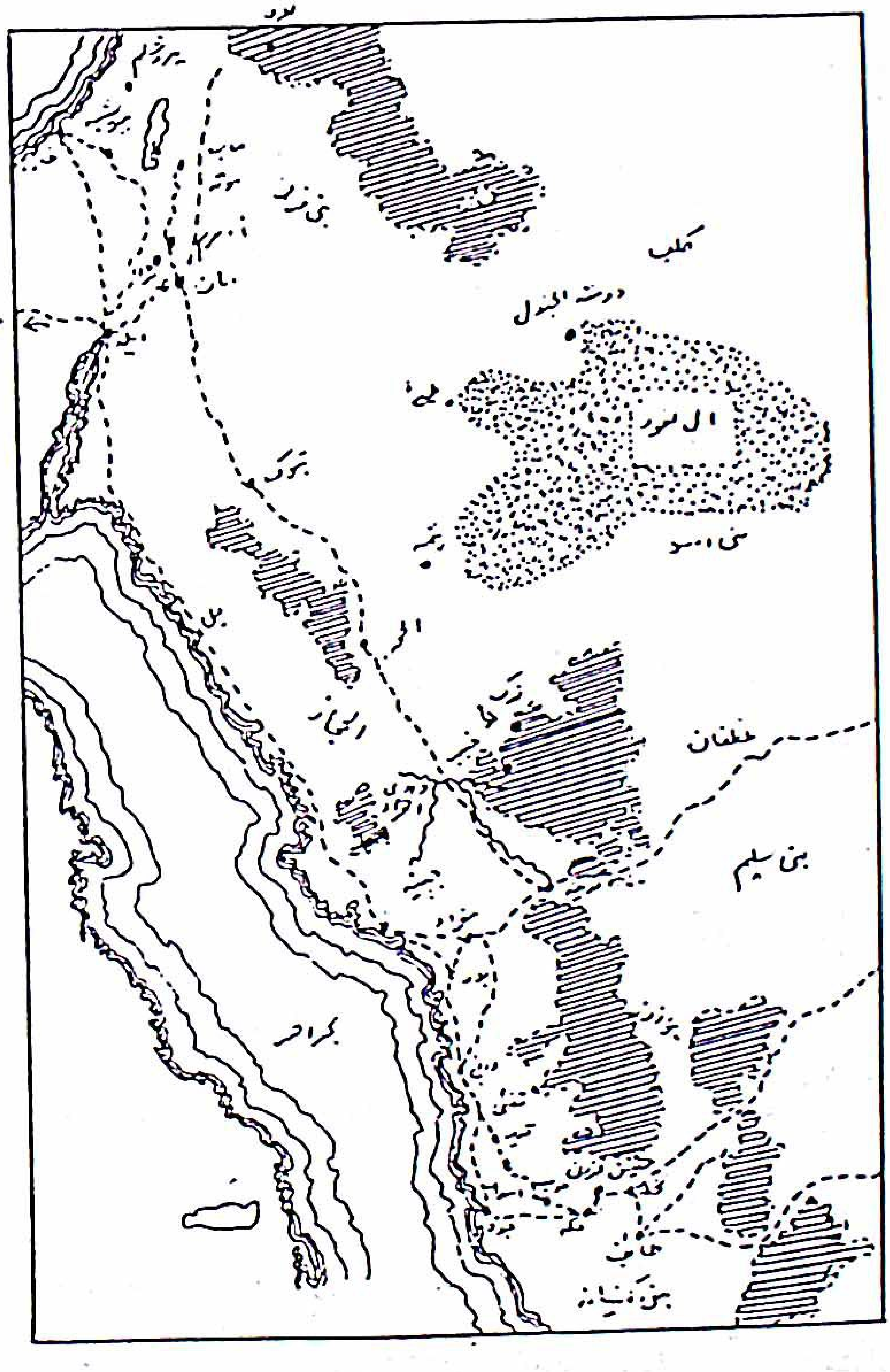

سب اس معاملے کی تحقیقات کر رہے تھے۔

حضورؐ نے بی بی عائشہ سے کہا کہ تم سے اگر واقعی کوئی غلطی سرزد ہو بھی گئی ہو تو میرے سامنے اُس کا اعتراف کر دو۔ اس لیے کہ اللہ گناہوں کو بخشنے کا وعدہ فرما چکا ہے۔

بی بی عائشہ زار و قطار رونے لگیں۔ حضورؐ سے عرض کیا کہ میں نے کوئی حرکت ایسی کی ہی نہیں ہے جس کا مجھے اعتراف کرنا چاہیئے۔ یہ کہہ کر وہ بستر پر گر گئیں۔ اس لمحہ حضورؐ پر وحی کا نزول ہوا۔ حضورؐ زمین پر لیٹ گئے۔ اپنے اوپر چادر اوڑھ لی۔ چمڑے کا تکیہ سرہانے رکھ لیا۔ اس دوران حضرت ابو بکرؓ اور ان کی اہلیہ انتہائی تشویش اور پریشانی کے عالم میں تھے۔ اُن کے پیروں تلے زمین نکلی جا رہی تھی۔ اس ڈر سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے کہ کہیں وحی بی بی عائشہ کو موردِ الزام نہ ٹھہرائے۔

حضورؐ اُٹھ بیٹھے۔ پسینہ مسلسل بہا جا رہا تھا۔ آپ پسینے کو پونچھتے جا رہے تھے اور بار بار چہرہ اقدس کو صاف کیے جا رہے تھے۔ نظریں اٹھائیں، فرمایا "عائشہ۔ اچھی خبر ہے اللہ تعالیٰ نے تم کو بے گناہ قرار دیا ہے۔"

اس کے بعد آپ نے اُن تین آدمیوں کو جنہوں نے افواہ کو پھیلایا تھا اَسی اَسی دُرّے لگانے کا حکم دیا۔ ان دُرّے کھانے والوں میں دربارِ نبوت کے شاعر حسانؓ ابن ثابت بھی شامل ہیں۔

قرآن کے سورہ نور کی گیارہویں آیت اور اس کے بعد کی آیتوں میں جن باتوں کا ذکر ہے وہ اسی بارے میں ہیں۔

ان آیتوں کے نزول کے بعد بی بی عائشہ اپنے میکے سے حضورؐ کے گھر خوشی خوشی لوٹ آئیں۔ اسی واقعے کے بعد سے زنا کے الزام کو ثابت کرنے کے لیے چار عینی گواہوں کی شہادت ضروری قرار دی گئی۔

پروفیسر سید نواب علی رضوی نے اپنی کتاب سیرت رسول اللہ میں لکھا ہے کہ :۔

Marfat.com

• اُدھر آنحضرت انتظار میں ایک ایسے مقام پر ٹھہر چکے تھے جہاں پانی نہ تھا۔ وضو کے لیے سخت دقت ہوتی۔ تب آیت تیمّم نازل ہوئی۔

کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہی گلوبند کے سلسلے میں دو قسم کے مختلف خیالات ظاہر ہوئے۔ ایک جلیل القدر صحابی حضرت اسید بن حضیر کہنے لگے کہ یہ تیمّم کی اجازت حضرت عائشہ کی برکت ہے مگر منافقین نے گلوبند کے باعث جو تاخیر ہوتی اس کو حضرت عائشہ کی عصمت پر زبان کھولنے کا ذریعہ بنایا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ آیت تیمّم کی شان نزول اور واقعہ حضرت عائشہ دونوں ایک ہی غزوہ مریسیع میں واقع ہوئے جیسا کہ ابن سعد نے بالتصریح ذکر حضرت عائشہ میں نقل کیا ہے۔"

۶۲۸ء میں اوائل میں حضورؐ نے خواب دیکھا کہ آپ بغیر کسی روک ٹوک اور مداخلت کے مکے کی زیارت اور عمرہ ادا فرما رہے ہیں۔ آپ نے عمرے کے ارادہ کا اعلان فرمایا۔ مسلمانوں کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔

آج کی طرح اس وقت بھی حج و زیارت کے دو طریقے تھے۔ سال کے کسی مخصوص دن ہی حج کی ادائیگی ہوتی ہے۔ عمرہ کسی وقت بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس دفعہ حضورؐ نے عمرہ ہی کا ارادہ فرمایا تھا۔ یہ ذی قعدہ کا مہینہ تھا۔ حج کے مہینے سے پہلے کا مہینہ ان مہینوں میں کشت و خون منع تھا۔ روایات کے پیش نظر قریش مسلمانوں کی مزاحمت نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کا تشدد استعمال کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

بہت سے مہاجرین اور انصار تیار ہو گئے۔ کئی ایک بدوی جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا حضورؐ کے ساتھ جانے سے ہچکچا رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اب مزید کسی لڑائی میں حصہ لیں۔

مکہ کے لوگوں کو اپنی نیک نیتی کا یقین دلانے کے لیے حضورؐ نے احرام بھی باندھ

Marfat.com

لیا تھا۔ قربانی کے لیے ستر اونٹ بھی اپنے ساتھ رکھ لیے تھے مسلمانوں کے پاس سوائے تلواروں کے کوئی اور ہتھیار نہیں تھے۔ ان سب باتوں سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ مسلمان صرف عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکہ آرہے ہیں۔ دنگا فساد کرنے کے لیے نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر سات سو مسلمان حضورؐ کے ساتھ تھے۔ دوسری روایت کے مطابق چودہ سو۔ یہ تعداد مکہ کے مخالفین کے مقابلے میں عشر عشیر بھی نہیں تھی۔

بعض مغربی مصنفین کا یہ کہنا ہے کہ آپ کا ارادہ اسی موقع پر مکہ کو اپنے قبضے میں لے لینے کا تھا۔ جب مغربی مصنفین ایسا کہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ بات پھر تازہ ہو جاتی ہے کہ مکے کے لوگوں کے لیے یہ دشوار ترین امر ہو گیا تھا کہ مدینہ کی عمارات پر حملہ کر کے ان پر قابض ہو جائیں۔

یہودیوں کی چھوٹی چھوٹی بستیوں پر مسلمانوں نے جو حملے کئے تھے ان میں بھی مسلمانوں کو ناکامیاں ہوتی رہی تھیں۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ یہودی قلعہ نما مضبوط گھروں میں رہا کرتے تھے۔ مسلمانوں کے تعلق سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہی مشکل ان کو بھی پیش آتی اگر وہ مکہ کے لوگوں سے لڑائی کرنے جاتے اور قریش اپنے آپ کو گھروں میں بند کر لیتے۔

ہم مسلسل یہ دیکھ رہے ہیں کہ سرکار دوعالم میں ظلم، زیادتی، بے رحمی اور سفاکی کے جذبات کبھی بھی ظاہر نہیں ہوئے۔ اپنی فتح کے لیے انسانی جانوں کی من مانی قربانی کبھی بھی آپ کا شیوہ نہیں رہا۔ جس امید کا دیا ان کے سینے میں جل رہا تھا وہ یہی تھی کہ کسی طرح قریش آپ کے ہم نوا ہو جائیں۔ ان کی ہمنوائی ہی وہ واحد بات تھی جو حضورؐ کے لیے فتح و شادمانی کا سارا سامان فراہم کر سکتی تھی۔

عمارات اور گھروں پر اچانک حملہ کرنا مسلمانوں کے شایان شان تھا بھی نہیں اس لیے کہ گھروں میں عورتیں اور بچے بھی رہتے تھے۔ اس وقت کے عربی شعار کے پیش نظر

Marfat.com

اس قسم کی گری ہوئی حرکت ناقابلِ تصور تھی۔

جب مسلمان اصفان پہنچے تو ان کو خبر ملی کہ قریش مسلمانوں سے ملنے کے لیے مکّہ سے باہر نکل چکے ہیں اور وہ اس ارادے سے نکلے ہیں کہ وہ نہ تو حضورؐ کو اور نہ ہی مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے دیں گے۔

اصفان سے ۸ میل دور قریش نے اپنے گھوڑ سواروں کو صف در صف مسلمانوں کو روکنے کے لیے کھڑا کر دیا۔

حضورؐ نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ مسلمان اس وقت اس حیثیت میں نہیں ہیں کہ قریش سے مقابلہ کر سکیں اور ساتھ ہی ساتھ حضورؐ اس آسانی سے مدینہ واپس بھی نہیں ہونا چاہتے تھے اس لیے آپ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھے جو حضورؐ کو اس مقام پر لے چلے جہاں قریش مسلمانوں کو روکنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔

ایک مقامی بدوی اس کام کے لیے تیار ہو گیا۔ پہاڑی علاقوں کی پگڈنڈیوں سے ہوتے مسلمان مکہ کے شمال مغربی حصے میں پہنچے۔ یہ ایک کھلا میدان تھا۔ اس مقام کا نام حدیبیہ تھا۔ حضورؐ نے مسلمانوں کو یہاں رُک جانے کا حکم دیا۔ یہاں پر اونٹوں کو پانی پلایا گیا۔

بنی خزاعہ کا سردار بدیل ابن ورقہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس نے دریافت کیا کہ حضورؐ کے ارادے کیا ہیں۔ کس نیت سے حضورؐ یہاں تشریف لائے ہیں۔ اُسے جواب دیا گیا کہ مسلمان لڑنے لڑانے کے لیے یہاں نہیں آئے ہیں۔ مسلمانوں کی آمد کا واحد مقصد کعبہ کی زیارت اور عمرہ کی ادائیگی ہے۔

اس قبیلے کے اکثر لوگوں سے حضورؐ کے دوستانہ مراسم تھے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو ابھی بُت پرست تھے۔ بدیل اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور سیدھے مکہ گئے۔ جو کچھ حضورؐ نے فرمایا تھا قریش کے سامنے اُسے دہرا دیا۔

قریش نے جواب دیا ”محمد لڑنا چاہتے ہوں یا نہ چاہتے ہوں، ہماری مرضی اور

اجازت کے بغیر وہ مکہ میں قدم نہیں رکھ سکتے۔"

قریش نے اپنے ایک آدمی حلیس کو صورت حال کے مشاہدہ کے لیے مسلمانوں کے ہاں روانہ کیا۔ حلیس نے دیکھا کہ مسلمان تو بہت ہی پُرامن طریقے سے ہیں۔ ستر اونٹ قربانی کے لیے تیار ہیں، احرام باندھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر حلیس سیدھے مکہ واپس ہوئے۔ قریش سے کہا کہ مسلمان واقعی عمرہ کی ادائیگی کے لیے آئے ہیں اور ان کے ارادے سچ مچ نیک معلوم ہوتے ہیں۔

یہ بات سن کر قریش نے حلیس سے کہا۔" بیٹھ جاؤ حلیس۔ تم تو سچ مچ بڑے ہی نکلے۔ نرے جاہل اور بدّو ہو۔ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔" قریش کا یہ طنز حلیس کو ناگوار گزرا۔ قریش اپنے تجارتی کارواں لے کر جب مکہ سے باہر نکلتے تھے تو ان کاروانوں کی حفاظت اور نگرانی کے لیے جو لوگ مامور کیے جاتے تھے ان لوگوں کی رہنمائی اور سرکردگی حلیس کیا کرتے تھے۔

حلیس نے بگڑ کر جواب دیا۔" ہم بنی کنعانہ کے لوگوں نے کیا آج ہی کے دن کے لیے تم لوگوں سے دوستی کا معاہدہ کیا تھا کہ ہم تمہارے اس طنز کو سنیں۔" حلیس نے اپنا غصہ جاری رکھا اور کہا کہ" جو آدمی خدا کے گھر کی عظمت کے پیش نظر اس کی تعظیم و تکریم کیلئے یہاں آیا ہو کیا تم اس کو ایسا کرنے سے باز رکھو گے؟"

قریش نے کہا،" بکواس بند کرو، ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ کچھ وقت لیں تاکہ گفت و شنید کر کے ایسی شرائط پیش کریں جس کو مسلمان قبول کریں۔"

قبیلہ ثقیف کے ایک آدمی کو قریش نے پھر حضورؐ کی خدمت میں روانہ کیا، یہ زمین پر بیٹھا ہوا حضورؐ کی طرف مخاطب ہوا اور کہا۔

" اے محمدؐ۔ آپ بھانت بھانت کے لوگوں کو جمع کر کے یہاں اس لیے لاتے ہیں کہ اپنے ہی شہر پر حملہ کریں۔ اپنے ہی لوگوں کو نیست و نابود کریں؟" قریش نے عہد کر رکھا ہے کہ

Marfat.com

وہ آپ سے لڑیں گے۔ انہوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔"

اگر آپ واقعی لڑائی پر ہی آمادہ ہیں تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ اپنے ساتھ لائے ہوئے اس مختصر سے مجمع کو کہیں کا نہ رکھیں گے۔"

اس کی اس تقریر کو سن کر حضرت ابوبکرؓ نے کہا "ہم کبھی محمدؐ کو اپنے سے جدا نہیں کریں گے۔ ان پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دیں گے۔"

اس چھوٹے سے مکالمہ میں ہم کو پھر وہی گونج سنائی دیتی ہے جو حضورؐ کی کوششوں کا ردِعمل تھی۔ حضورؐ جس انقلاب کو لانے کی کوشش کر رہے تھے اسی کوشش کی بازگشت اس مکالمہ کا حاصل ہے۔

قبیلہ ثقیف کے آدمی کے نزدیک افراد کی قبائل سے وفاداری فتح و شکست کا باعث تھی۔ بہ حیثیت مجموعی قبیلوں کی بقاء اور افرادِ قبیلہ کی انفرادی بقاء کی بنیاد خاندانی وفاداری تھی۔ حضورؐ کی جماعت مختلف قبیلوں کے افراد پر مشتمل تھی۔ قبیلہ ثقیف کا آدمی جس نہج پر سوچ رہا تھا اس کے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی جماعت جو مختلف قبائل کے افراد پر مشتمل تھی۔ وفاداری کے عنصر سے عاری تھی۔ ان کی وفاداری کا کوئی مرکز اور ملجا نہیں تھا۔ اس کے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی جماعت کے افراد میں فکری ہم آہنگی نہیں تھی۔ اُس کے خیال میں مسلمانوں کے اندازِ فکر میں اِنتشار تھا۔ اس لیے کہ سارے مسلمان ایک ہی قبیلے یا ایک ہی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کا کسی ایک قبیلے سے تعلق نہ رکھنا ہی جماعت کی تباہی و بربادی کا باعث بنے گا۔

حضورؐ نے جواب دیا کہ مسلمان لڑائی کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ کعبہ کی تعظیم و تکریم کے لیے آئے ہیں۔ خدا کے گھر کی عظمت کا تصوّر انہیں یہاں لے آیا ہے۔ یہ جواب سُن کر قریش کا قاصد مکہ واپس ہوا۔ قریش کے سربراہوں کے سامنے ملاقات کی روداد بیان کرتے

Marfat.com

ہوئے کہہ رہا تھا" میں شہنشاہ ایران خسرو کے دربار میں جا چکا ہوں مجھے روم کے شہنشاہ قیصر کے دربار میں حاضر ہونے کا اتفاق بھی ہو چکا ہے۔ حبشہ کے شہنشاہ نجاشی کی بارگاہ میں بھی باریاب ہو چکا ہوں۔ کسی جگہ میں نے محبت و عقیدت کا ایسا جذبہ نہیں دیکھا جو میں نے محمدؐ کے ماننے والوں میں دیکھا ہے۔ میرا یہ یقین ہے کہ یہ لوگ محمدؐ سے کبھی بھی روگرداں نہیں ہوں گے۔ چاہے کوئی سبب کیوں نہ ہو۔ حالات کیسے ہی خراب کیوں نہ ہوں مسلمان محمدؐ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ اب تمہاری مرضی ہے۔ جو چاہے فیصلہ کرو۔ فیصلہ کرنے سے پہلے میں نے جو کچھ کہا ہے اس کو پیشِ نظر رکھو۔"

تاریخ لکھنے والوں کو بڑی دقت اس وقت پیش آتی ہے جب کہ وہ بڑے لوگوں کی محبوبیت اور غیر معمولی خداداد صلاحیتوں کا احاطہ کرنا چاہتے ہیں۔

معجزانہ صلاحیتیں اور مقناطیسی کشش گوشت پوست کی دنیا سے خارج ہیں۔ سکندر اعظم، چنگیز خان اور نپولین کی فتوحات کا تجزیہ سیاسی، معاشی اور فوجی نقاطِ نظر سے تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی اس صفت یا خصوصیت کی نشاندہی کرنی مشکل ہو جاتی ہے جس کے سہارے ان کی انگلی کے ہلکے سے اشارے سے ہزاروں آدمی اپنی جان نچھاور کر دیتے تھے۔ بہت سے اس بات کے ہی مشتاق رہتے تھے کہ اُدھر سے اشارہ ہو اور اِدھر سے وہ اپنی جان نذر کریں۔

ثقیف کے آدمی نے مکہ والوں کے سامنے جو کچھ بھی بیان کیا اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں تھا۔ اگرچہ کہ آپ نے اس بات پر بار بار زور دیا کہ میں بھی اور آدمیوں کی طرح ایک آدمی ہوں۔ اللہ کے بندوں میں سے ہوں۔ اس کے باوجود آپ کے ماننے والوں نے اور آپ کی امت کے افراد نے آپ کی عزت و تکریم میں وہ غلو کیا کہ بندگی کے مقام سے لے جا کر آپ کو الوہیت کے مقام پر بٹھا دیا۔

جب کبھی آپ اپنے سر کے بال کاٹتے، لوگ ہاتھ بڑھا کر زمین پر گرتے ہوئے

Marfat.com

بالوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتے اور اسے بطور تبرک یا مذہبی یادگار اپنے ساتھ محفوظ رکھتے حضور کے ناخنوں کو اسی طریقے سے عزت و تکریم کے ساتھ بطور آثار مبارک محفوظ رکھنے لگے جس طریقے سے عیسائی اپنے مقدس پادریوں کی ہڈیوں کو اپنے کلیسا میں محفوظ رکھتے تھے۔

حضورؐ کے انتقال کے بعد بہت سے مسلمانوں نے جنہوں نے حضورؐ کے بال اپنے ہاں محفوظ کر رکھے تھے اپنے جانشینوں کو وصیت کی تھی کہ ان کے انتقال پر ان کی میّت کے ساتھ حضورؐ کے بال بھی دفن کیے جائیں تاکہ یہ ان کی بخشش کا سہارا ہوں۔

جب آپ نہاتے تھے تو بہت سے جانثاروں میں اس بات کے لیے کشمکش ہوتی تھی کہ اُس پانی کو حاصل کر کے پیا جائے۔

ابنِ اسحٰق کی روایت کے مطابق یہاں تک ہوتا تھا کہ حضورؐ جب کبھی تھوکتے تھے تو چند آشفتگان عشق محمدی اُسے بھی محفوظ کر لیتے تھے۔

مسلمانوں سے ہمیشہ درخواست کی جاتی تھی کہ مجمع عام میں حضورؐ کے بالکل قریب نہ رہیں جگہ چھوڑ کر اس طریقے سے کھڑے رہیں کہ حضورؐ آسانی سے سانس لے سکیں۔

ان ساری عظمتوں کے باوجود حضورؐ کبھی بھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہوئے کہ آپ ریشمی کپڑے پہنیں۔ ریشمی یا زریں عبا اوڑھیں۔ ہیرے جواہرات یا سونے چاندی سے مزین کپڑوں کا استعمال کریں۔ آپؐ کی بیویوں نے جب شکایت کی کہ اب تو روپے پیسے کی فراوانی ہے۔ آرام و آسائش میں تھوڑا سا اضافہ ہو سکتا ہے تو حضورؐ نے انہیں سختی سے جھڑک دیا۔

ثقیف کے سردار کے روانہ ہو جانے کے بعد حضورؐ نے حضرت عثمانؓ ابن عفانؓ کو قریش سے گفت و شنید کے لیے مکّہ روانہ کیا۔ حضرت عثمانؓ اس کام کے لیے ہی موزوں قرار دیے گئے۔ ان کا تعلق بنی امیہ سے تھا۔ ابو سفیان کے بہت ہی قریبی رشتہ دار

Marfat.com

تھے۔ مکہ میں خاندانی بنیادوں پر وفاداری کا جو مظاہرہ ہوا کرتا تھا اس کے پیش نظر حضرت عثمانؓ بہت ہی محفوظ سمجھے گئے۔ قریش نے وہ سب کچھ سنا جو حضرت عثمانؓ نے کہا۔ جواب میں قریش نے کہا کہ اگر حضرت عثمانؓ چاہیں تو کعبہ کا طواف کر سکتے ہیں۔ قریش نے فیصلہ کیا کہ حضرت عثمانؓ کو مکہ میں اس وقت تک روکا رکھا جائے جب تک قریش اپنے آیندہ لائحہ عمل پر غور نہ کر لیں۔

مسلمان مکہ سے صرف ۸ میل دور ٹھہرے ہوئے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے متعلق امید تو یہی تھی کہ وہ چند گھنٹوں میں گفت و شنید کر کے حدیبیہ واپس ہو جائیں گے۔ جب ان کے آنے میں دیر ہونے لگی اور نہ آنے کی وجہ بھی نہیں بتلائی جا رہی تھی تو مسلمانوں کو تشویش ہونے لگی۔ یہ افواہ اڑ گئی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ مسلمان یہ سوچنے لگے کہ ابوسفیان کی گہری قرابت کے باوجود حضرت عثمانؓ اگر واقعی قتل کر دیئے گئے ہیں تو ان لوگوں کے ارادے نیک نہیں معلوم ہوتے اور لڑائی سے گریز ناممکن ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مکہ والوں کے لیے یہ آخری موقع ایسا آیا تھا کہ اگر وہ چاہتے تو حضورؐ کو اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتے۔ حضورؐ نے عمرہ کا ارادہ کیا تھا بہت ہی تھوڑے مسلمانوں کے ساتھ حضورؐ مکہ سے صرف چند میل دور ٹھہرے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے پاس سوائے تلواروں کے کوئی اور ہتھیار نہیں تھے۔ اگر قریش کی قیادت کوئی ایسا آدمی کرتا ہوتا جو اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا تو وہ آسانی سے اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھاتا۔ چند گھنٹوں کے اندر ہی اس ساری جدوجہد کا اختتام کر دیتا۔ احد کے موقع پر بھی قریش نے اپنی نااہلیت اور قیادت کے فقدان کا ثبوت دیا تھا۔ فوری قدم اٹھانے کی تو ان میں صلاحیت ہی نہیں تھی۔

Marfat.com

حدیبیہ میں اب مسلمانوں کے جذبات بھڑک رہے تھے۔ ان کی تشویش اضطراب کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

حضورؐ مسلمانوں کے کمزور موقف کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی جنگ کو ناگزیر سمجھ رہے تھے۔ آپ نے سارے مسلمانوں کو اکٹھا۔ آپ ہر ایک سے دوبارہ بیعت لینا چاہتے تھے۔ ایک ببول کے درخت کو ٹیک لگا کر آپ کھڑے ہو گئے۔ ہر آدمی کو دعوت دی کہ وہ آگے بڑھے۔ حضورؐ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائے مسلمان ایک قطار کی صورت میں کھڑے ہو گئے۔ ہر آدمی آگے آتا اور حضورؐ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کرتا۔ یہ اسی طریقے کی بیعت تھی جیسی ہجرت سے سات سال قبل مدینہ کے لوگوں نے مکہ میں آپ کے ہاتھ پر کی تھی۔

صورتِ حال بڑی نازک تھی۔ ہر مسلمان اپنی جان کی قربانی کے لیے بے چین نظر آرہا تھا۔ ابن اسحٰق کے بیان کے مطابق ان تمام مسلمانوں میں ایک آدمی ایسا نکلا جو بیعت سے بچنے کے لیے ایک اونٹ کے پیچھے چھپ گیا۔ اس بیعت میں لفظ بہ لفظ کیا بیان کیا گیا اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ جو بیان ہم تک پہنچا ہے اس کی صحت مشتبہ ہے۔

یہ اپنی جگہ واقعہ ہے کہ اس موقع پر حضورؐ کا ارادہ جنگ کرنے کا تو بالکل تھا ہی نہیں۔ حضورؐ نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اگر کچھ مراعات دینی بھی پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ حضورؐ کے جانثار جنگ کے لیے بے قرار تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مصالحت پسندی اور امن پسندی میں آپ تمام مسلمانوں سے آگے تھے۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے مسلمانوں سے جس بات کی بیعت لی وہ یہی تھی کہ مسلمان آپ کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ ہر حکم من وعن بجا لائیں گے۔

حدیبیہ میں مسلمان جس فکر و تشویش کا شکار ہو گئے تھے اس کا اثر ان کے ذہنوں

Marfat.com

پر برسوں رہا۔ اس وقت جب کہ مسلمان ایک عظیم سلطنت کے مالک تھے جنگِ بدر میں لڑنے والوں اور حدیبیہ میں بیعت کرنے والوں کا ذکر بہت ہی عزت و احترام سے کیا کرتے تھے۔ چونکہ اسلام کی بقا اور عروج کے لیے یہ دونوں واقعات سنگِ میل کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔

مسلمانوں نے دیکھا کہ مکہ کی طرف سے ایک آدمی اونٹ پر بیٹھا ہوا مسلمانوں کی طرف آرہا ہے۔ آنے والا سہیل ابن عمرو تھا۔ سہیل مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے۔ لوگوں سے شائستگی اور اخلاق سے پیش آتے تھے۔ حضورؐ نے جب ان کو آتے دیکھا تو فرمانے لگے کہ مکہ والے امن چاہتے ہیں جبھی تو سہیل کو یہاں روانہ کیا ہے۔

لمبی چوڑی بحث کے بعد امن کے شرائط پر آمادگی ہوئی۔ طے پایا کہ ان ساری شرائط کو تحریر میں لاکر باقاعدہ ایک دستاویز کی صورت دی جائے۔ حضرت عمرؓ نے جو بڑی تیز طبیعت کے مالک تھے، حضرت ابو بکرؓ کو ایک طرف بلا کر غصہ سے کہا۔

"کیا محمدؐ خدا کے رسول نہیں ہیں؟ کیوں ہم تحقیر آمیز مصالحت کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے تحکمانہ لہجے میں حضرت عمرؓ سے کہا: "جو حضورؐ کہتے ہیں وہی کرو۔ چوں چرا کی ضرورت نہیں۔"

حضرت ابو بکرؓ میں تسلیم و رضا کی خو بہت زیادہ تھی۔ ہر حکم کے آگے وہ اپنا سر خم کر دیتے تھے۔ اس موقع پر بھی حضرت ابو بکرؓ نے کہا: "میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے پیغمبر اور رسول ہیں۔"

حضرت عمرؓ کو حضرت ابو بکرؓ کے اس جواب سے تشفی نہیں ہوئی۔ اب وہ حضورؐ کی خدمت میں گئے۔ وہی سوال دہرائے۔ آپ نے نرمی سے فرمایا کہ: "میں خدا کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہوں۔ میں اس کے حکم کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے اس کی اجازت کبھی نہیں دے گا کہ میرا شمار خسارہ اٹھانے والوں میں ہو۔"

حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو حکم دیا گیا کہ معاہدہ کو تحریری صورت دی جائے فرمایا کہ "محمد رسول اللہ اور سہیل ابن عمرو کے درمیان یہ طے پایا" تو سہیل نے فوری مداخلت کی اور کہا کہ اگر ہم نے آپ کو اللہ کا رسول مان لیا ہوتا تو پھر جھگڑا ہی کس بات کا تھا اگر میں مسلمان ہو گیا ہوتا اور آپ کو خدا کا رسول تسلیم کر لیتا تو آپ سے لڑائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ صرف اپنا اور اپنے والد کا نام معاہدہ میں لکھوائیں۔

حضورؐ بڑے ہی صبر و سکون کے ساتھ حضرت علیؓ کی طرف پلٹے اور فرمایا لکھو

"محمد ابنِ عبد اللہ اور سہیل ابن عمرو کے درمیان طے پایا"

(1) معاہدہ کی شرائط میں ایک شرط یہ تھی کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان دس سال تک جنگ نہ ہو گی۔ اس صلح کی مدت میں فریقین کے لوگ آزادانہ طور پر بلا کسی مزاحمت کے حمل و نقل جاری رکھ سکیں گے۔

(2) دوسری شرط یہ تھی کہ مکہ سے اگر کوئی شخص مدینہ چلا جائے تو مسلمان اس کو مکہ واپس کر دیں گے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی مسلمان محمدؐ سے خفا ہو کر مکہ کا رخ کرے تو اس کو مدینہ واپس ہونے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

(3) تیسری شرط یہ تھی کہ جو قبیلے مسلمانوں کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرنا چاہتے تھے انہیں اس بات کی آزادی دی جائے گی جو قریش سے معاہدہ کرنا چاہتے تھے انہیں اس کی آزادی دی جائے گی۔ ایسی صورت میں ان قبائل پر بھی معاہدہ کی پہلی شرط کا اطلاق کیا گیا۔

(4) چوتھی شرط یہ تھی کہ اس سال مسلمان مدینہ واپس ہو جائیں اگر وہ عمرہ کرنا چاہیں تو آئندہ سال ان کو اس کی آزادی ہو گی۔ مسلمان کعبہ کی زیارت کیلئے صرف تین دن تک مکہ میں رہیں گے۔ اس کے بعد واپس ہو جائیں گے۔ سوائے تلواروں کے کوئی اور ہتھیار اپنے ساتھ نہیں رکھیں گے۔

Marfat.com

یہ ساری شرائط مسلمانوں کو ناگوار گزر رہی تھیں۔ مایوسی اور قنوطیت ان پر طاری ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کو اس سال عمرہ کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ ان کو اپنے ارادہ میں بری طرح سے ناکامی ہوئی تھی۔ جب مسلمانوں نے اپنے ارادوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو اس شکستِ آرزو کو اللہ کی مرضی سے تعبیر کیا اور صبر کا دامن تھامے رکھا۔

دس سالہ امن کے معاہدے نے مکہ والوں کو یہ موقع دیا کہ وہ اپنی تجارت کو اور خاص کر کاروان کی روانگی کو باقاعدگی کے ساتھ بلا روک ٹوک جاری رکھیں۔ اپنی معاشی خوش حالی میں اضافہ کریں۔ حضورؐ کی عمر ۵۸ سال کی تھی۔ قریش یہ سمجھ رہے تھے کہ آپؐ مزید دس سال تک نہیں جئیں گے۔ خاص طور پر وہ شرط جس میں مکہ سے مدینہ بھاگ کر آنے والوں کو مکہ واپس کر دیا جائے گا اور مدینہ سے مکہ جانے والوں کو واپسی کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکے گا۔ مسلمانوں کے لیے بہت ہی کوفت کا باعث بن رہی تھی۔ وہ اس شرط میں اپنی ذلت محسوس کر رہے تھے۔ ان ساری شرائط کو مسلمان خود ہی قریش کی فتح کا نام دے رہے تھے۔

مسلمانوں کے زخم پر نمک اس طریقے سے چھڑکا گیا کہ جب دستاویز پر طرفین کے دستخط ہو رہے تھے، سہیل ابن عمرو کا نوجوان لڑکا ابو جندل پاؤں میں بیڑیاں پہنے لنگڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نوجوان لڑکے کی بڑی خواہش تھی کہ مسلمان ہو جائے لیکن اس کے خاندان والوں نے اس کے پیروں میں بیڑیاں پہنا دی تھیں تاکہ وہ مدینہ فرار نہ ہو سکے۔ جب سہیل نے اپنے بیٹے جندل کو وہاں آتے دیکھا تو غصہ میں اٹھ کر اسے طمانچے مارنے شروع کر دیئے۔

سہیل نے چلا کر حضورؐ سے کہا کہ ہم نے معاہدے پر رضامندی کا اظہار اس لڑکے کے آنے سے قبل کر دیا تھا۔ گو ہم نے دستخط نہیں کیے ہیں مگر شرائط پر رضامندی کا

Marfat.com

اظہار کر چکے ہیں۔ اس لیے ابوجندل کو مکہ واپس کر دیا جائے۔

حضورؐ نے سہیل سے اتفاق کیا۔ سہیل ابوجندل کو گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے کر چلنے لگے۔ ابوجندل نے مسلمانوں سے کہا کہ مسلمانو! کیا مجھے اُن بت پرستوں کے درمیان پھر سے واپس کیا جا رہا ہے جو مجھے بت پرست رہنے پر مجبور کر رہے ہیں؟

مسلمانوں کی نظریں نیچی ہو گئیں۔ محض اسلام قبول کر لینے کی پاداش میں ابوجندل پر ناقابلِ برداشت سختیاں کی جا رہی تھیں۔

ابوجندل کی چیخ و پکار اور مسلمانوں کی خاموشی کے درمیان حضورؐ نے ابوجندل سے کہا۔
" ابوجندل۔ صبر کرو۔ اللہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دے گا۔"

جب ابوجندل کو مکہ واپس لے جایا جا رہا تھا حضرت عمرؓ ابوجندل کے ساتھ ساتھ تھوڑی دور تک چلتے رہے۔ ابوجندل کے کان میں آہستہ سے کہا " یاد رکھو یہ بت پرست ہیں۔ ان بُت پرستوں میں سے ہر ایک کا خون میرے نزدیک کتّے کے خون کے برابر ہے"۔

حضرت عمرؓ نے اپنی تلوار کا قبضہ ابوجندل کی طرف ایسے کر رکھا تھا کہ اگر ابوجندل چاہتے تو آسانی سے عمر کی تلوار لے کر اپنے باپ کا سر قلم کر دیتے۔

بعد میں حضرت عمر کہتے تھے کہ میں اپنی تلوار کے قبضے کو ابوجندل کے قریب رکھ کر اُسے جوش دلانے والی باتیں کر رہا تھا تاکہ وہ جوش میں آ کر میری تلوار سے اپنے باپ کا خاتمہ کر دے۔

آگے ہم دیکھیں گے کہ کس طرح ابوجندل اس قید و بند سے نجات پاتے ہیں اور کس طرح ان کیلئے آزادی کا راستہ نکل آتا ہے۔

یادگار تاریخیں

مدینہ کا محاصرہ	مارچ۔ اپریل ۶۲۷ء
بنی قریظہ کی بیخ کنی	اپریل ۶۲۷ء
بنی لحیان پر حملہ	اکتوبر ۶۲۷ء
بنی غطفان کا حضورؐ کے اونٹوں کو چرانا	اکتوبر یا نومبر ۶۲۷ء
بنی مصطلق پر حملہ	دسمبر ۶۲۷ء یا جنوری ۶۲۸ء
صلح حدیبیہ	مارچ ۶۲۸ء

Marfat.com

خیبر اور موتہ

جیسے ہی سہیل ابن عمرو اپنے بیٹے ابو جندل کو اس کی مرضی کے خلاف مار پیٹ کر واپس لے گئے، حضورؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے ساتھ قربانی کے لیے لائے ہوئے اونٹوں کو ذبح کریں اور اپنے سر منڈھوا ڈالیں۔ اونٹوں کی قربانی اور سروں کو منڈھوانا عمرہ یا حج کے رسومات میں شامل ہیں جو صرف مکہ میں ادا ہونے چاہئیں۔ چونکہ مکہ مسلمانوں کی پہنچ سے اب باہر تھا اس لیے حدیبیہ ہی میں انہوں نے ان رسومات کی تکمیل کر ڈالی۔

اب مسلمانوں کی جماعت معہ اپنے مال و اسباب کے انتہائی مایوسی کے عالم میں مدینہ واپس ہوئی۔ ابھی مدینہ کے لیے آدھا سفر باقی تھا کہ حضورؐ پر سورہ فتح نازل ہوئی آغاز ہی خلاف توقع اعلان سے ہوتا ہے۔

"ہم نے یقیناً آپ کو فتح عظیم عنایت کی۔"

اس سورہ کی پہلی آیت میں خدائے تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

"(اے محمدؐ) ہم نے تم کو فتح دی۔ فتح بھی صاف و صریح۔"

دسویں آیت میں حدیبیہ میں حضورؐ نے درخت کے نیچے جو بیعت کی تھی اس کا ذکر ہے۔

جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں۔ خدا کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے۔ پھر جو عہد کو توڑے تو عہد توڑنے کا نقصان اسی کو ہے اور جو اُس بات کو جس کا اُس نے خدا سے عہد کیا ہے پورا کرے تو اُسے عنقریب اجر عظیم دے گا"

گیارہویں آیت میں اُن قبیلوں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اس موقع پر حضور کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

جو گنوار پیچھے رہ گئے کہ ہم کو ہمارے مال اور ہمارے اہل و عیال نے روک رکھا ہے، آپ ہمارے لئے خدا سے بخشش مانگیں، یہ لوگ اپنی زبان سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے"

بارہویں آیت میں حضور کے ساتھ قبیلوں کی پوشیدہ دشمنی اور مخالفت کا ذکر ہے۔

بات یہ ہے کہ تم لوگ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ پیغمبر اور مسلمان اپنے اہل و عیال میں کبھی لوٹ کر آنے کے نہیں اور یہی بات تمہارے دلوں کو اچھی معلوم ہوئی اور اسی وجہ سے تم نے برے برے خیال کئے اور آخر کار تم ہلاکت میں پڑ گئے"

اٹھارویں آیت میں بیعت کا ذکر ہے۔

اے پیغمبر۔ جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا اُن سے خوش ہوا۔ جو صدق و خلوص اُن کے دلوں میں تھا وہ اُس نے معلوم کر لیا تو اُن پر تسلی نازل ہوئی اور انہیں جلد فتح عنایت کی"

بعد میں بہت سے مفسرین اور شارحین نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ صلح حدیبیہ نے مسلمانوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچایا۔ اگر جنگی فتح ہو

Marfat.com

بھی جاتی تو مسلمانوں کو اتنا فائدہ نہیں پہنچتا تھا جتنا صلح حدیبیہ سے پہنچا۔

صلح حدیبیہ کے وقت عام مسلمان پست ہمتی اور مایوسی کا شکار اتنے زیادہ ہو گئے تھے کہ اس کے روشن پہلوؤں کی طرف اُن کا دھیان جا ہی نہیں رہا تھا۔

ایک دوسرے کے جان و مال کی حفاظت کے عہد و پیمان نے مسلمانوں اور مشرکین کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے مل سکیں۔ تبادلہ خیال کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اور بت پرست ایک دوسرے سے کافی بحث و مباحثہ کرنے لگے۔ مسلمانوں کو اپنے عقیدے کے پرچار کا موقع ملنے لگا۔

آیا حضورؐ بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے یا نہیں اس کے تعلّق سے کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ حضورؐ کے آگے صلح حدیبیہ کا روشن پہلو ضرور رہا ہوگا۔

بار بار ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ کو لڑائیاں قطعاً پسند نہیں تھیں۔ اپنے تجربات کی بناء پر آپ یہ ضرور محسوس کرتے تھے کہ آپ کو اللہ نے لوگوں کے مذہبی خیالات کے رُخ کو پلٹانے کا خاص ملکہ دیا تھا۔ اس فن میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ آپ کی اسی خصوصیت کی بناء پر آپ کو یقین تھا کہ آپ اپنی صلاحیت بہ حسن کمال استعمال میں لاکر لوگوں کے ذہنوں میں اپنی بات بٹھا سکتے ہیں تبلیغ جس بہتر طریقے سے امن کے زمانے میں کی جا سکتی ہے جنگ کے دوران نہیں ہو سکتی شاید اسی لئے آپ نے اُس موقع پر صلح کو ترجیح دی۔

جب یہ بات تھی تو ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضورؐ نے قریش کے خلاف جنگ کیوں کی؟۔ ان کے کاروانوں پر حملے کیوں کئے۔ کیا یہ مسلمانوں

کی غلطی نہیں تھی؟ اسلام کا پیغام بت پرستوں کے ذہنوں پر اتنا گہرا اثر چھوڑ رہا تھا کہ محض تبلیغ ہی کو اشاعت اسلام کا ذریعہ بنایا جاتا تو اسلام اور آسانی سے پھیلتا جاتا۔ اہل قبیلہ کی قبیلے سے وفاداریوں نے اسلام کی اشاعت میں بڑی رکاوٹیں پیدا کیں۔ لڑائیوں کی وجہ سے لوگوں میں بدلہ لینے کی خواہشات جنم لینے لگیں۔

حضورؐ جب مدینہ آ چکے تو ایک نوجوان ابوبصیر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مسلمان ہونے کے ارادے سے وہ مکہ سے فرار ہو کر یہاں آیا تھا۔ اس کے تعاقب میں مکہ کے دو اور آدمی نکلے۔ آتے ہوئے اپنے ساتھ ایک خط لے کر آئے۔ خط میں لکھا تھا کہ معاہدہ حدیبیہ کی رُو سے ابوبصیر کو مکہ واپس بھجوا دیا جائے۔ حضورؐ نے معاہدہ کے پیش نظر ابوبصیر کو اُن دونوں آدمیوں کے حوالے کر دیا۔ مدینہ سے سات میل دور جبکہ وہ جنوب کی سمت میں تھے ابوبصیر نے اُن دو آدمیوں میں سے ایک کو قتل کر دیا۔ دوسرا اپنی جان بچا کر فرار ہو گیا۔ ابوبصیر پھر مدینہ واپس پہنچ گیا۔ جیسے ہی حضورؐ نے اُسے دیکھا فرمایا "عجیب آدمی ہے۔ اگر ابوبصیر کے ساتھ چند اور اُس کے ساتھی ہوتے تو وہ جنگ بھی شروع کر دیتا"۔

ابوبصیر مدینہ کے مغربی رُخ وادی العیس چلے گئے۔ حضورؐ کے اس ارشاد کا مطلب مکہ کے باغی اور معتوب نوجوان یہ نکالنے لگے کہ حضورؐ کا منشاء شاید یہ ہو کہ ابوبصیر کے ساتھ کچھ اور نوجوان ہوتے تو بہتر تھا۔ اسلام قبول کرنے کے شائقین نوجوان ایک ایک کر کے مکہ سے کھسکنے لگے اور وادی العیس جا کر ابوبصیر کے ساتھ رہنے لگے یہ سارے نوجوان مل کر قریش کے کاروانوں کو روکنے لگے مکہ کے لوگوں نے حضورؐ کی توجہ ابوبصیر کے اس

اقدام پر منعطف کرائی۔ ساتھ ہی ساتھ حضورؐ سے درخواست کی گئی کہ آپ ابوبصیر اور اُن کے ساتھیوں کو مدینہ واپس بلوالیں تاکہ اُن کی شرارتوں سے قریش کے کاروان محفوظ رہیں۔ بہت ساری عورتیں بھی مکہ سے فرار ہو کر مدینہ پہنچ گئیں۔ جب ان کے رشتہ داروں نے صلح حدیبیہ کا حوالہ دیتے ہوئے ان عورتوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تو حضورؐ پر وحی آئی۔

"مومنو جب تمہارے پاس مومن عورتیں وطن چھوڑ کر آئیں تو اُن کی آزمائش کر لو۔ خدا تو ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ سو اگر تم کو معلوم ہو کہ مومن ہیں تو ان کو کفار کے پاس نہ بھیجو کہ نہ یہ ان کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ ان کو جائز اور جو کچھ انھوں نے ان پر خرچ کیا ہے وہ ان کو دے دو اور تم پر گناہ نہیں کہ اُن عورتوں کو دے کر اُن سے نکاح کر لو اور کافر عورتوں کی ناموس کو قبضے میں نہ رکھو یعنی کفار کو واپس دے دو اور جو کچھ تم نے اُن پر خرچ کیا ہے تم ان سے طلب کر لو۔ اور جو کچھ انھوں نے اپنی عورتوں پر خرچ کیا ہے وہ تم سے طلب کر لیں۔ یہ خدا کا حکم ہے جو تم میں فیصلہ کئے دیتا ہے اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے"۔ سورۃ الممتحنہ آیت نمبر ۱۰

ان آیتوں کے اُترنے کے بعد حضورؐ نے مکہ والوں کو مطلع کیا کہ معاہدۂ حدیبیہ کا اطلاق عورتوں پر نہیں ہوا کرے گا۔

حدیبیہ سے واپسی کے بعد صرف دس ہفتے حضورؐ کا قیام مدینہ میں رہا۔ ستمبر ۶۲۸ء میں حضورؐ نے خیبر پر حملہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

خیبر ایک شاداب مقام تھا مدینہ کے شمال میں ۸۰ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ یہاں یہودی رہا کرتے تھے۔ خیبر کے یہودی بھی مدینہ کے یہودیوں کی طرح ہر طرح سے عربیت کو اپنائے ہوئے تھے۔ اُن کے نام عربوں جیسے

Marfat.com

تھے۔ ان کے رسم و رواج عربوں کے سے تھے۔ ان کی زبان عربی تھی۔ شاید یہ لوگ بھی اصل میں عرب ہی تھے جو کئی صدیوں پہلے مستریوں کی آمد اور ان کی تبلیغ کی وجہ سے یہودیت قبول کر لیے ہوں۔

اس مہم میں مال غنیمت کی فراوانی کا تصور کرتے ہوئے بہت سے لوگ حضورؐ کی آواز پر لبیک کہنے لگے۔ آپ نے فرمایا میرے ساتھ اس مہم پر وہی چلے جو حدیبیہ کے موقع پر ساتھ تھا۔

واقدی کے بیان کے مطابق سارے مدینہ میں یہ منادی کروا دی تھی کہ وہ لوگ جن کا مقصد و مدعا صرف لوٹ کھسوٹ ہے اس جنگ میں قطعی ساتھ نہیں رہیں گے۔ جس طریقے سے بھی لوگوں کو اس مہم کے لیے چُنا گیا اس سے قطع نظر یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ خیبر پر حملہ کرنا حدیبیہ کی مایوسیوں کا بدلہ لینا تھا۔

چلتے چلتے یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مدینہ میں اس وقت بھی کئی یہودی مقیم تھے۔ واقدی کے بیان کے مطابق مدینہ کے یہودیوں کی ہمدردیاں خیبر کے یہودیوں کے ساتھ تھیں۔

مسلمانوں کی جماعت پہاڑیوں پر سے ہوتے ہوئے جب آگے بڑھ رہی تھی تو بلندی پر سے ان کو سرسبز و شاداب باغات اور ہرے بھرے کھجور کے درخت نظر آنے لگے۔ حضورؐ نے اپنی جماعت کو یہاں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ آپ نے اونچی آواز سے دُعا فرمائی۔

"اے اللہ۔ ہم تجھ سے اس مقام پر اس مقام کے رہنے والوں کی بھلائی چاہتے ہیں۔ جو چیزیں بظاہر ہماری نظر سے مستور ہیں ان کی بھی بھلائی چاہتے ہیں۔ جو برائیاں یہاں بھری پڑی ہیں ان سے تیری پناہ میں آتے ہیں" اس کے بعد آپ نے حکم دیا "اللہ کی رحمتوں اور عنایتوں کے ساتھ آگے بڑھو"

Marfat.com

خیبر کے لوگوں کا ذریعہ معاش مدینہ کے باسیوں کی طرح زراعت تھا۔ کھجوروں کے درخت پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ وہ اس وقت سارے حجاز میں بہترین سرسبز و شاداب نخلستان تھا۔ مدینہ والوں کی طرح ہر قبیلے کی اپنی علیحدہ بستی تھی ان کا اپنا قلعہ ہوا کرتا تھا۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو موقع فراہم کیا کہ ایک قلعہ کے بعد دوسرے قلعہ پر حملہ کرتے چلے جائیں۔ ان کی قلعہ بندیاں راتوں کے اِکا دُکا حملوں کو تو روک سکتی تھیں لیکن ایک باقاعدہ اور مسلسل حملے کا جواب دینا اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔

واقدی کی روایت کے مطابق بہت سے یہودی مسلمانوں سے مل بھی گئے تھے۔ ان ہی ساز باز کرنے والے یہودیوں میں سے ایک یہودی نے مخبری کی کہ ایک خاص قلعہ میں ایک ایسی کار آمد چیز موجود ہے جس کو استعمال کر کے قلعہ کی دیواریں گرائی جاسکتی ہیں۔ اس وقت کے نایاب ہتھیاروں میں سے یہ ایک ہتھیار تھا جس کو خم کر کے اس پر پتھر رکھ دیا جاتا تھا اور جب اس کے جھکاؤ کو تناؤ کی صورت دی جاتی تھی تو وہ پتھر اس زور و شور سے قلعہ کی دیوار پر پھینکتا کہ قلعہ کی دیواروں میں شگاف پڑ جاتے تھے۔

خیبر کے یہودی عام طور پر قبیلہ وارانہ جھگڑوں میں حصہ نہیں لیا کرتے تھے۔ یہ کسی کی بھی طرف داری نہیں کرتے تھے۔ غیر جانبدار رہتے تھے۔ ان کی حفاظت ان کے دوست اور حلیف قبائل کیا کرتے تھے۔ جن قبائیلوں سے ان کے دوستانہ تعلقات زیادہ تھے ان کے سردار بنی غطفان تھے۔ واضح رہے کہ یہی وہ یہودی تھے جنہوں نے غطفان کو اُکسا کر قریش کے ساتھ ملوا کر مدینہ کا محاصرہ کروایا تھا۔

اس موقع پر غطفان کا ایک سردار بعینہ ابن حسن یہودیوں کی پکار پر

Marfat.com

اپنے چند لوگوں کو یہودیوں کے قلعوں پر روانہ کیا۔ چند دن بعد یہ معلوم کر کے کہ خود ان کے اپنے گھر خطرے میں ہیں یہ لوگ خیبر چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔ واقدی کے بیان کے مطابق ان نبائلیوں نے خطرے کی گھنٹی یا تو غیب سے سُنی تھی یا زمین نے ان کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ خیبر کے یہودیوں نے جم کر مقابلہ کیا۔ مدینہ کے یہودیوں سے زیادہ مزاحمت ان یہودیوں نے کی۔ بہت سے یہودی اپنے اپنے قلعوں سے باہر نکل آئے مسلمانوں کو فرداً فرداً لڑنے کی دعوت دی۔ یہی وہ واحد موقع تھا جبکہ یہودیوں نے مسلمانوں کو للکارا تھا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کو کھانے پینے کے سامان کی قلت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک دن مسلمانوں نے بیس گدھوں کو کہیں سے پکڑ لیا۔ انہیں ذبح کیا۔ خوشی خوشی اُس گوشت کو دَم دینے لگے۔ حضوؐر کا اُدھر سے گزر ہوا۔ دریافت فرمایا کہ کیا ہو رہا ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ گدھے کا گوشت پک رہا ہے۔ حضوؐر نے فوراً حضرت بلال کو بلوایا۔ اُن سے اعلان کروایا گیا کہ گدھے کا گوشت حرام ہے۔ یہ سننا تھا کہ مسلمانوں نے اپنے سارے برتن خالی کر دیے۔ گوشت کو پھینک دیا۔ بھوکے پیاسے سو گئے۔ حضوؐر نے فرمایا کہ گھوڑے ذبح کئے جائیں۔ اس زمانے میں گھوڑے کم یاب بھی تھے اور گراں بھی۔ خصوصاً حالت جنگ میں گھوڑوں کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ اسی لئے بہت ہی کم لوگ اس بات کے لیے تیار ہوتے کہ اپنے گھوڑوں کو ذبح کریں بہت جلد ایک ایسا قلعہ مسلمانوں کے قبضے میں آیا جس میں ایک بڑی مقدار میں اجناس خوردنی محفوظ کئے گئے تھے۔ ہر مسلمان کے لیے جَو، کھجور، تیل اور

شہد کے راشن مقرر کئے گئے۔

بغیر لڑائی کے کوئی بھی قلعہ مسلمانوں کے قبضے میں نہیں آیا۔ ہر قلعہ پر حملہ کرنے اور اُسے اپنے قبضے میں لینے کے لیے اوسطاً تین دن کی مدت درکار ہوتی تھی۔ ایک بڑی مصیبت یہودیوں کے لیے یہ تھی کہ ہر قبیلہ اپنے قلعے میں بند تھا۔ وہ صرف اپنی ہی مدافعت کرسکتا تھا۔ دوسرے قلعے میں رہنے والوں کی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ مسلمانوں کی ساری جماعت بہ یک وقت ایک قلعے پر حملہ کرتی تھی۔ اس کو اپنے قبضے میں لینے کے بعد دوسرے قلعے پر حملہ کیا جاتا تھا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے قلعے فتح ہوتے گئے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ قلعہ کے بُرج پر سے ایک تیر پھینکا گیا۔ حضورؐ کے کپڑوں کو چھُوتے ہوئے یہ نکل گیا۔ جسم مبارک پر کوئی زخم وغیرہ نہیں لگا۔ آخرکار اب تین قلعے باقی رہ گئے تھے۔

یہ بہت ہی مضبوط قلعے تھے۔ جب چودہ دن تک ان کا محاصرہ کیا گیا تو قلعہ میں رہنے والوں نے ہتھیار ڈالنے کے شرائط مانگے۔ کنانہ ابن ابی الحقیق یہودی سردار تھا۔ یہ سلام ابن الحقیق کا پوتا تھا۔ سلام مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔

جب کنانہ کو جان کی سلامتی دے دی گئی تو وہ قلعہ سے باہر آیا۔ عرض کیا کہ یہودی اپنی جانوں کی سلامتی کے عوض سارا مال و اسباب مسلمانوں کے حوالے کرنے تیار ہیں۔ حضورؐ نے اس کی بات مان لی۔

ہتھیار، کپڑے اور اشیائے خورد و نوش بڑی مقدار میں مسلمانوں کے حوالے کیے گئے۔

کنانہ نے کہا کہ اس کے پاس روپیہ پیسہ، سونا چاندی کچھ بھی نہیں

Marfat.com

ہے۔ اس کے ایک رشتے کے بھائی نے مخبری کر دی کہ اس جگہ خزانے دفن کئے گئے ہیں۔ مخبر نے صحیح خبر دی تھی۔ واقعی خزانے ہاتھ آ گئے۔ کنانہ نے حضورؐ کے آگے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ اس جھوٹ کی پاداش میں حکم دیا گیا کہ کنانہ کے ساتھ سختی کی جائے۔ لوگوں نے سختی ایسی کی کہ اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس مقام پر جن عورتوں کو گرفتار کیا گیا تھا ان میں سے ایک صفیہ تھیں۔ یہ حیّ ابن اخطب کی بیٹی تھیں۔ حیّ کو بنی قریظہ نے مار ڈالا تھا۔ صفیہ کی شادی کنانہ سے ہوئی تھی۔ صفیہ کا باپ، بھائی اور ان کا شوہر یہ سب مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ صفیہ حضورؐ کی خدمت میں لائی گئیں۔ ان کے ساتھ ایک اور عورت بھی تھی صفیہ نے اسلام قبول کر لیا۔ اسی مقام پر ایک شامیا نے میں حضورؐ کا ان سے نکاح ہوا۔

کچھ دنوں بعد حضورؐ نے بی بی صفیہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ وجہ دریافت کی۔ صفیہ نے کہا کہ حضورؐ کی دیگر ازواج مطہرات اُن کا مذاق اُڑاتی ہیں۔ اُن کو یہودن کہا کرتی ہیں۔ یہ سُن کر آپ کو بہت ہی غصہ آیا۔ آپ نے صفیہؓ سے فرمایا "اگر وہ آئندہ تمہارے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئیں تو مجھ سے کہنا" آپ نے پھر کہا کہ ان سے کہو کہ ہارونؑ میرے باپ تھے اور موسیٰؑ میرے چچا۔

اس موقع پر بھی آپ نے ابراہیمی مذہب کی نہ صرف لاج رکھی بلکہ عزت و تکریم سے اس مذہب کا ذکر فرمایا۔

جب لڑائی ختم ہو گئی تو ایک زینب نامی یہودن نے حضورؐ کی دعوت کی۔ کھانے میں زہر ملا دیا۔ گوشت کا زہر آلود ٹکڑا جیسے ہی آپ نے منہ میں لیا اُسے فوراً تھوک دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس میں زہر ہے۔ زینب کو طلب کیا گیا۔ اُس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ اُس نے کہا کہ جو کچھ آپ نے میرے لوگوں کے ساتھ کیا ہے وہ آپ جانتے ہیں۔ میں نے اپنے

دل میں خیال کیا کہ اگر آپ کی حیثیت محض ایک حکمران یا سردار جیسی ہے تو ہم کو آپ سے جتنا جلدی ہو سکے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے۔ لیکن اگر آپ ایک پیغمبر ہیں تو آپ کو غیب سے معلوم ہی ہو جائے گا کہ میں آپ کے ساتھ کیا کرنے والی ہوں۔ ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق اُس عورت کی حاضر دماغی کے پیش نظر حضوؐر نے اُسے معاف کر دیا۔

مدینہ کا ایک اور آدمی جو حضوؐر کے ساتھ اس دعوت میں شریک تھا گوشت کا ایک ٹکڑا حلق سے نیچے اُتارتے ہی واصل بحق ہوا۔ تین سال بعد جب حضوؐر کا انتقال ہوا تو اُس سے قبل طبیعت کی خرابی کو آپ نے اسی دعوت کے اثر کا نتیجہ قرار دیا۔ آپ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ جو مسلمان غیر مسلموں کے ہاتھ سے شہید ہوتا ہے شہادت کے منصب جلیلہ پر فائز ہوتا ہے۔

جب حالات معمول پر آ گئے تو یہودی حضوؐر کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا کہ وہ اپنی کاشت کاری اور زراعت کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ جو بھی فصل ہو گی اس کا آدھا حصہ مسلمانوں کو پیش کریں گے۔ آپ نے ان کی اس درخواست کو منظور کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ مسلمانوں کو یہ حق حاصل رہے گا کہ کسی وقت بھی یہودیوں کو بے دخل کر سکیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس وقت حضوؐر کے ہاں اتنے مسلمان نہیں تھے جن کو وہ خیبر میں بسنے کے لیے چھوڑ جاتے۔

اسی دوران فدک کے یہودیوں نے اپنے نمائندے کو حضوؐر کی خدمت میں روانہ کیا۔ آپ نے ان کے لیے بھی وہی شرائط منظور فرمائے جن کو خیبر کے یہودی منظور کر چکے تھے۔ فدک کا معاہدہ حضوؐر کی مرضی اور مسلمانوں کے مفاد کے عین مطابق تھا۔ چونکہ فدک کے سلسلے میں کوئی لڑائی وغیرہ نہیں ہوئی تھی اس لیے

فدک کی آمدنی میں کسی کا کوئی حصّہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ساری آمدنی بیت المال کا حق ہوتی تھی۔ بیت المال پر حضورؐ کی نگرانی تھی اور جس طریقے سے آپ بہتر سمجھتے تھے بیت المال کی رقم مسلمانوں پر خرچ کرتے تھے۔

خیبر کی جنگ کے دوران بہت سے احکامات صادر ہوئے جو بعد میں چل کر مسلم قانون کی اساس بن گئے۔

جنگ میں مارے ہوئے مشرک لوگوں کی عورتوں کو حاصل کر کے ان کو لونڈیوں کی حیثیت سے رکھنا یا پھر ان سے شادی کر لینا ان باتوں کی اجازت تو پہلے ہی دے دی گئی تھی۔

خیبر کے موقع پر یہ حکم دیا گیا کہ دشمن کی کوئی عورت اگر حاملہ ہو تو اس کو اس وقت تک لونڈی نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ وہ زچگی سے فارغ نہ ہو جائے۔ ایک اور مسئلہ آ پڑا تھا جس پر توجہ کی سخت ضرورت تھی۔ جنگ کے موقع پر مسلمانوں کو جو چیز جس کے ہاتھ آ جاتی تھی وہ اُسے مال غنیمت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ سامان لے جا کر کسی مرکزی مقام پر جمع کروا دے اور بعد میں سارے مسلمان اُس سے مستفید ہوں۔ خیبر کے موقع پر مسلمانوں کو اس طرز عمل سے روکا گیا۔ شروع شروع میں چند لوگوں کو یہ بات ناگوار گزری۔ بعض لوگ جب کسی تگڑے جانور کو پکڑ لیتے تو اس پر خوب سواری کرتے اور جب جانور تھک کر مرنے کے قریب ہو جاتا تو اُسے لے جا کر بیت المال میں دے دیتے تھے۔ جب نئے کپڑوں اُن کے قبضے میں آتے تو خوب پہنتے اور جب وہ بوسیدہ ہو کر پھٹنے لگتے تو لے جا کر بیت المال کی نذر کر دیتے۔

خیبر سے مسلمانوں کو اتنا زرکثیر ملا کہ اس سے پہلے مسلمانوں کی آنکھوں نے کبھی بھی اتنی بڑی دولت کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ محض خدا کا فضل و کرم تھا۔ اس کے علاوہ خیبر والے اپنی کاشت کا آدھا حصہ مسلمانوں کو دینے بھی تیار ہو گئے تھے۔ کاشت کا حصول

مسلمانوں کی مستقل آمدنی کا ذریعہ بن گیا۔ مسلمانوں کے قبضے میں کپڑے ہتھیار اونٹ اور سب ہی کچھ آیا۔ خیبر میں جو کچھ بھی مسلمانوں کے ہاتھ لگا تھا وہ سب اُن لوگوں میں تقسیم کیا گیا جو حدیبیہ میں حضوؐر کے ساتھ تھے۔ خیبر میں صرف ایک مسلمان ایسا تھا جو حدیبیہ کے موقع پر نہیں تھا۔

خیبر کے مال غنیمت کو صرف حدیبیہ کے لوگوں میں تقسیم کرنے کا منشا شاید یہی تھا کہ مسلمانوں کو اس موقع پر جو خفت اور شرمندگی اٹھانی پڑی تھی اُس کا ازالہ کیا جائے۔ مال غنیمت کے ۱۸ سو حصے کیے گئے۔ ان اٹھارہ سو حصوں کو ۱۴ سو مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان چودہ سو میں سے دو سو گھڑ سوار تھے۔ ہر سوار کو تین حصے دیئے گئے۔ ایک اُن کا اپنا حصہ تھا اور دو حصے گھوڑے کے تھے۔ خیبر میں مسلمانوں کے ہمراہ دو سو سواروں کا رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ کس طرح سے مسلمانوں نے اپنے وسائل میں اضافہ کر لیا تھا۔ اُحد کے میدان میں مسلمانوں کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا۔

خیبر کی جنگ میں ۱۶ مسلمانوں کو شہادت کے جام پینے پڑے۔ خیبر کے بعد حضوؐر نے وادی القریٰ کا رُخ کیا۔ اس کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ بھی یہودیوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔

۶۱۵ء میں مکہ کے بہت سے مسلمانوں نے حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو شروع شروع میں مسلمان ہوئے تھے۔ ان مسلمانوں نے حبشہ میں بود و باش اختیار کر لی تھی تاکہ کافروں کے ظلم و ستم سے محفوظ رہ سکیں۔ حضوؐر نے اپنے ایک نمائندہ کو حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے دربار میں روانہ کیا اور بادشاہ سے درخواست کی کہ جو مسلمان مدینہ واپس ہونا چاہتے ہوں ان کی واپسی کے لیے سہولتیں فراہم کی جائیں۔ حضوؐر کے اس بلاوے کو ۱۶ مسلمانوں کی ایک جماعت نے قبول کر لیا۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ حبشہ کے دو جہازوں میں یہ لوگ بحر احمر پار کر کے حضوؐر کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جبکہ

Marfat.com

آپ خیبر کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ مہاجرین حبشہ میں تیرہ سال رہ چکے تھے۔ ۷ مسلمان حبشہ میں انتقال کر گئے۔ مزید ۳۴ مسلمان بعد میں عرب کو واپس ہوئے۔ بہت سوں کے ساتھ اُن کے بچے بھی تھے جو حبشہ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ سارے بچے عرب ماؤں کے بطن سے تھے۔ تاریخی مواد کوئی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ظاہر ہو کہ اُن مسلمانوں نے حبشی عورتوں سے شادیاں کی ہوں۔ جو لوگ حبشہ سے اس موقع پر واپس ہوئے اُن میں قابل ذکر حضرت علیؑ کے بھائی جعفر ابن ابی طالبؓ ہیں۔ اسی موقع پر ابوسفیان کی بیٹی بھی واپس ہوئیں۔ وہی ابوسفیان جو اشد ترین کافر تھا۔ ابوسفیان کی بیٹی اُمّ حبیبہؓ کے شوہر کا حبشہ میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اب بیوہ تھیں۔ واپس آنے پر حضورؐ نے اُن سے نکاح کر لیا۔

صلح حدیبیہ کے پورے ایک سال بعد فروری ۶۲۹ء میں حضورؐ نے معاہدہ کے مطابق عمرہ کا قصد کیا۔ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ آپ کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد ایک روایت کے مطابق بارہ سو اور دوسری روایت کے مطابق دو ہزار تھی۔ لگ بھگ وہی تعداد تھی جو حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ کے ساتھ تھی۔ بدوی قبیلے اور وہ لوگ جو ابھی ابھی مسلمان ہوئے تھے اس موقع پر شریک نہیں کئے گئے تاکہ اگر قریش کے ساتھ جنگ ہو تو کمزور عناصر مسلمانوں کے ساتھ نہ رہیں۔

حدیبیہ کے معاہدہ کے مطابق مکہ کے لوگ مکہ خالی کر کے شہر سے باہر نکل گئے۔ اطراف کی پہاڑیوں پر اپنے اپنے خیمے ڈال دئے تاکہ مسلمان آزادی کے ساتھ عمرہ کے مراسم ادا کر سکیں۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سے وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ مسلمان کس وقت کیا کر رہے ہیں۔ اشتعال انگیزی اور خوں ریزی کے امکان کو کم کرنے کے لیے شاید شہر خالی کر دیا گیا ہو۔

صبح صبح قریش اپنی پہاڑیوں پر اپنے خیموں میں بیٹھے ہوئے کیا دیکھتے ہیں کہ

Marfat.com

مکہ کے شمال کی طرف جدھر سے مدینہ کا راستہ آتا ہے سارا راستہ گرد و غبار سے اٹا ہوا ہے۔ گرد و غبار میں جب ذرا کمی ہوئی تو قریش نے دیکھا کہ مسلمانوں کا قافلہ ان کے سامنے ہے۔ حضورؐ خود رہبری فرما رہے ہیں۔ آپ اونٹ پر سوار تھے۔ آپ کے چاروں طرف آپ کے جاں نثار تھے۔ ابوبکرؓ، عمر بن خطابؓ، علیؓ ابن ابی طالب ساتھ ساتھ تھے۔ قربانی کے اونٹ بھی تھے جن کے گلوں میں ہار پڑے ہوئے تھے۔ حضورؐ کے پیچھے مقربان خاص تھے اور اُن کے پیچھے مسلمان قطار در قطار چلے آ رہے تھے۔

سات سال پہلے حضورؐ نے مکہ چھوڑ کر مدینہ کو ہجرت کی تھی۔ اس سارے عرصہ میں آپ کے چچا عباس مکہ ہی میں مقیم رہے۔ جنگِ بدر میں آپ کافروں کی طرف سے لڑ بھی چکے تھے۔ آپ کو مسلمانوں نے گرفتار بھی کر لیا تھا۔ حضورؐ نے اُن کی جان بخشی کی رقم خود اپنے پاس سے ادا کر کے ان کو آزادی دلائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جنگِ اُحد سے قبل عباس نے ایک خفیہ پیغام حضورؐ کی خدمت میں روانہ کیا تھا اور حضورؐ کو مخالفین کے عزائم سے آگاہ کر دیا تھا۔ عباس ایک تیر سے دو شکار کھیل رہے تھے۔ بعض روایات کے مطابق عباس مسلمان ہو چکے تھے اور مکہ میں محض اس لیے ٹھہرے تھے کہ اپنے بھتیجے کے مفاد کا تحفظ کر سکیں۔ عباس کے انتقال کے ۱۲۰ برس بعد اُن کی نسل کے لوگ اسلامی شہنشاہیت کے مہتم بالشان علم بردار بنے اور اس طریقے سے شہنشاہیت کی کہ عرب سلطنت نے ایک طرف اسپین اور مراکش پر حکمرانی کی تو دوسری طرف چین کی سرحدوں تک اسلامی جھنڈا لہرانے لگا۔ شروع شروع کے مسلمان مورخین جن کی کتابیں آج بھی ہمارے تاریخی علم کا ماخذ بنی ہوئی ہیں اُنہی عباسی شہنشاہوں کے دورِ حکومت میں اپنی زندگی گزارتے رہے ہیں۔ عباسی حکومت کے زیرِ سایہ اور عباسی حکمرانوں کے نمک خوار ہو کر عباسی شہنشاہوں کے جدِ امجد عباس کے خلاف کچھ لکھنا اُن لوگوں کے لیے جان جوکھوں میں ڈالنے والی بات تھی۔

Marfat.com

قرین قیاس یہی ہے کہ عباس بت پرست تھے۔ اس موقع پر انہوں نے محسوس کر لیا کہ حضورؐ کو فتح ہونے والی ہے۔ مکہ کے دوسرے عمائدین کی طرح اس موقع پر آپ نے مکہ چھوڑ کر پہاڑوں کا رُخ نہیں کیا۔ مکہ میں اپنے گھر میں ٹھہرے رہے۔ آپ کا استقبال کیا۔ انہوں نے حضورؐ کے لیے ایک نئی دلہن کا انتخاب کر رکھا تھا۔ میمونہ بیوہ تھیں اور عباس کی سالی ہوتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اسی موقع پر عباس نے اسلام قبول کر لیا ہو۔ یہیں سے آپ نے شاید خفیہ پیغامات وغیرہ روانہ کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہو۔

شہر میں داخل ہو کر حضورؐ سیدھے خانہ کعبہ تشریف لے گئے۔ حجر اسود کو بوسہ دیا۔ کعبہ کے سات طواف کئے۔ آپ مکہ میں تین دن تک ٹھہرے رہے۔ تیسرے دن کے اختتام پر قریش نے کہلا بھیجا کہ از روئے معاہدہ تیسرے دن واپس ہو جانی چاہیئے۔ حضورؐ نے بڑی ہی نرمی سے جواب روانہ کیا کہ کیا مضائقہ ہے اگر تم مجھے میمونہ سے نکاح ہو جانے تک اپنے شہر میں رک جانے کی اجازت دے دو۔ بہتر تو یہ ہے کہ تم سب اس نکاح کی تقریب میں شریک ہو۔

اس نرم روئی اور تلطف آمیز دعوت کے جواب میں قریش کے سربراہوں نے بیہودہ قسم کا جواب روانہ کیا۔ کہا کہ ہم کو آپ کا کھانا وغیرہ کچھ بھی نہیں چاہیئے۔ فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ۔

معاہدہ حدیبیہ میں صریحاً مسلمانوں کو صرف تین دن کے لیے ٹھہرنے کا لکھا ہوا تھا۔ حضورؐ نے معاہدہ کے پیشِ نظر مکہ سے رخصت ہونے کا اعلان فرمایا سارے مسلمان مکہ سے مدینہ کی طرف کوچ کر گئے۔

ایک سال پہلے صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمان خفت محسوس کر رہے تھے۔ اپنی ہار اور ہزیمت سے بری طرح متاثر تھے۔ اب وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ مکہ

Marfat.com

جاکر کعبے کی زیارت کرنے کا جو منصوبہ تیار کیا گیا تھا وہ عقل و دانش اور فہم و بصیرت کا ایک شاہکار تھا۔

شاید حدیبیہ کا واقعہ کچھ قبل از وقت ہو گیا تھا۔ اسی واسطے مسلمانوں نے فوجی لحاظ سے اپنے آپ کو کمزور پا کر اُس سے کسی طریقے سے نمٹ لیا۔ ان کے برخلاف مکہ کے سربراہوں کے پاس نہ تو اتحاد و اتفاق تھا اور نہ ہی کوئی منضبط اور مضبوط اقتدار اور نہ ہی کسی قسم کا عزم۔ ان کو مواقع تو بہت ملتے رہے لیکن ہر موقعہ کو اُن لوگوں نے اپنے انتشار اور پراگندگی کے نذر کر دیا۔

۶۲۹ء میں مسلمانوں کا عمرہ ادا کرنا ان کی آنے والی کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف لاشعوری طور پر پہلا قدم تھا۔

مکہ کے لوگوں کو یہ خیال ستانے لگا کہ حضورؐ نے ایک نئے مذہب کی ابتدا کی ہے۔ اُس نئے مذہب کے ماننے والے اگر کعبہ کی زیارت کریں تو اس سے کعبہ کی توہین ہو گی۔ قریش کعبے کو اپنا سمجھتے تھے۔ کعبہ ان کی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ وہ اپنی آمدنی کو خطرے میں پڑتا دیکھ رہے تھے۔

جیسے ہی حضورؐ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تھے فوراً حجرِ اسود کو بوسہ دیا تھا۔ اس کے سات طواف کئے تھے۔ آپ کا یہ عمل مکہ کے لوگوں پر یہ واضح کرنے کے لیے تھا کہ آپ کے نزدیک کعبے کی مذہبی عظمت میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوئی ہے۔ کعبے کی عظمت اور اس کا تقدس بہر حال اپنی جگہ قائم ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مکہ کو پھر سے رونق بخشنے کا خیال تو حضورؐ کے ذہن میں اسی وقت آ چکا تھا جب آپ نے یہودیوں سے تعلقات منقطع کر کے یروشلم کی بجائے مکہ کو اپنا قبلہ قرار دیا تھا۔ اس تبدیلیٔ قبلہ کا جواز یہ دیا گیا تھا کہ کعبہ کی تعمیر ابراہیم نے کی تھی۔ کعبے کے حدود میں ایک چشمہ ہے جو زمزم کہلاتا ہے۔ اس چشمے کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ جبرئیل نے اسے وجود میں لایا تھا۔ ہاجرہ کے پیاسے

Marfat.com

بچے اسمٰعیلؑ کی پیاس بجھانے کے لیے ریگستان کے عین بیچوں بیچ یہ چشمہ نمودار کیا گیا تھا۔ کعبہ کی تعمیر کے وقت حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنے والد محترم حضرت ابراہیمؑ کی مدد کی تھی۔

مکہ کے تعلق سے حضورؐ کے طرز عمل میں تبدیلی جہاں یہودیوں کے لیے اسلام نہ قبول کرنے کا باعث ہوئی وہیں مکہ کے لوگوں کے لیے تالیف قلوب کا باعث بنی۔ اسلامی تحریک کی اہمیت کو گھٹانے کی اور اسلامی انقلاب کو رد کرنے کی بار بار کوشش کی گئی۔ بدر، احد اور مدینہ کا محاصرہ انہی کوششوں کے عملی مظاہر تھے۔ جب ایک دفعہ حدیبیہ میں صلح ہو گئی تو مسلمانوں اور کافروں کے درمیان تعلقات میں ایک اور باب کا اضافہ ہوا۔ سنہ ۶۲۹ء میں حضورؐ نے جب عمرہ کرتے ہوئے کعبے کی توقیر و تعظیم کی تو آپ کے اس عمل سے قریش کے لوگوں پر کافی گہرا اور اچھا اثر پڑا۔ آہستہ آہستہ مکہ کے لوگوں اور مسلمانوں کے تعلقات استوار ہونے لگے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں نے اپنے دل میں حضورؐ کو جگہ دی ہوئی تھی۔ دل و جان سے وہ آپ پر فدا تھے۔ مسلمانوں کی دولت اور اثر درسوخ میں دن رات اضافہ ہو رہا تھا۔ نہ صرف مدینہ اب مسلمانوں کے قبضے میں تھا بلکہ خیبر، وادی القریٰ اور فدک بھی مسلمانوں کے قبضے میں آ چکے تھے۔ ان سارے مقامات کی دولت مسلمانوں کے ہاتھ لگی تھی۔ جتنے گھڑسواروں کو قریش جمع کر سکتے تھے اتنی ہی تعداد پر مشتمل گھڑسوار اب آپ کے ساتھ تھے۔ اس وقت بھی تھے جبکہ حضورؐ عمرہ کی غرض سے مکہ تشریف لے گئے تھے۔ اگر حضورؐ کو ایک با اقتدار اور مطلق العنان بادشاہ بننا ہی تھا تو کیا قریش کے واسطے یہ بات بہتر نہ ہوتی کہ حضورؐ کو مکہ آنے کی دعوت دیتے اور عرض کرتے کہ آپ اپنا دارالسلطنت مکہ بنا لیں، اثر و اقتدار قریش میں تقسیم کر دیں اور رشتہ داروں کی مدد سے حکومت کریں۔

قریش نے جن مصلحتوں کے تحت بھی اعتدال پسندی کے عنصر کو اپنا لیا تھا اُن کو صرف مالی اور سیاسی بنیادوں پر ہی نہیں دیکھا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ قریش کے

Marfat.com

ذہن میں مالی اور سیاسی پہلو رہے ہوں لیکن عام لوگ مادی فائدے کی اصطلاح میں بہت کم سوچا کرتے تھے۔ حضورؐ جس مذہب کی تبلیغ فرما رہے تھے وہ مذہب عربوں کے توہماتی مذہبوں کے مقابلے میں بہت ہی ارفع و اعلیٰ تھا۔

عرب کسی کی سیادت کو بہ مشکل تسلیم کرتے تھے۔ جب کسی میں عظمت و بلندی کے جوہر دیکھتے تو دل و جان سے اس پر فدا ہونے لگتے اور اس میں وہ غلو اختیار کرتے کہ عزت کے ڈانڈے عبادت سے مل جایا کرتے تھے۔ جب انھوں نے ذات قدسیؐ کو دیکھا جو عزت و عظمت کے ہر طریقے سے مستحق تھے تو کافی غور و فکر کرنے کے بعد بھی نتیجہ نکالا کہ ذاتؐ اقدسؐ واقعتہً عزت و احترام کی مستحق ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طریقے سے لوگوں کے دلوں کو موہ لینے کا حضورؐ کو ملکہ حاصل تھا۔ کس طریقے سے رائے عامہ تبدیل ہو رہی تھی اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اسی زمانے میں خالد ابن ولیدؓ، عمرو بن العاصؓ، عثمان ابن طلحہؓ مدینہ آکر مسلمان ہوئے۔ قریش کو جنگ اُحد میں جو فتح حاصل ہوئی تھی اس فتح کا باعث خالد ابن ولید اور عمرو بن العاص تھے۔ خالد حضورؐ کی نئی بیوی میمونہؓ کے رشتے کے بھائی بھی تھے۔ میمونہؓ نہ تو جوان تھیں اور نہ ہی حسین اس کے باوجود حضورؐ کا میمونہؓ سے نکاح کرنا روٹھے ہوئے لوگوں کو منانے کا ایک سبب بن گیا۔ خالد ابن ولید اور عمرو بن العاص آگے چل کر مسلمانوں کے عظیم الشان فاتح بنے۔

عثمان ابن طلحہ میں وہ خوبیاں تو نہیں تھیں جو خالد اور عمرا بن العاص میں تھیں مگر ان کی اہمیت اس لیے تھی کہ اُن کے پاس خانہ کعبہ کی کنجیاں رہا کرتی تھیں وہ کعبہ کے کلید بردار تھے۔ ان تینوں عظیم رہنماؤں کا اسلام قبول کر لینا مکہ والوں کو اسلام کے تعلق سے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔

ستمبر ۶۲۹ء میں جبکہ حضورؐ کو عمرہ کئے ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے بیرونی دنیا سے

Marfat.com

پہلی بار مسلمانوں کا آمنا سامنا ہوا اور جھگڑے کی ابتدا ہوئی حضورؐ نے بنی غسان کے ایک شہزادے کے نام اپنا خط روانہ کیا تھا۔ یہ شہزادہ شام میں بصرہ کا گورنر تھا۔ یہ واضح نہیں ہے کہ اس گورنر کو حضورؐ کا خط ملا بھی تھا یا نہیں۔ اگر جواب دیا بھی تھا تو اس جواب کا متن کیا تھا۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کا نمائندہ جب راستہ میں تھا تو اس کو مقامی قبائلیوں نے قتل کر دیا ہو یا بعض روایتوں کے مطابق بنی غسان کے لوگوں نے ہی اُسے ختم کر دیا ہو۔

بنی غسان کی بادشاہت ختم ہو جانے کے بعد اس خاندان کے مختلف شہزادوں کو مختلف مقامات پر گورنری اور سرداری کے فرائض سونپے گئے تھے۔ حضورؐ کے نمائندے کا قتل غالباً اُسی مقام پر ہوا ہو گا جو جگہ اب اردن کے نام سے موسوم ہے۔

ایک سفیر یا پیغام رساں کا قتل جو صرف ایک خط لئے ہوئے تھا ایک مکروہ اور قابل مذمت فعل سمجھا گیا۔ اس کو اس جرم کا مزہ چکھانا ضروری سمجھا گیا تین ہزار آدمیوں پر مشتمل ایک فوج تیار کی۔ یہ عین ممکن ہے کہ حضورؐ نے ان قبائلیوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے یہ فوج تیار کی ہو اور روانہ کرنے کا ارادہ کیا ہو جنہوں نے حضورؐ کے نمائندے کو قتل کرنے کی جسارت کی تھی۔ فوج کی یہ تعداد قبائلیوں کے انتباہ کے لیے بالکل کافی تھی۔ حضورؐ کے منہ بولے بیٹے زید ابن حارثہؓ اس فوج کے کمانڈر بنائے گئے۔ جعفرؓ ابن ابی طالب کو زید کا نائب بنایا گیا۔ جعفرؓ کو ہدایت کی گئی کہ زیدؓ کے شہید ہونے کی صورت میں فوج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لیں۔ ایک انصاری عبد اللہ ابن رواحہؓ کو جعفرؓ کا نائب بنایا گیا۔ یہ فوج مدینہ سے روانہ ہوئی۔ پہلے دن کے سفر میں حضرت خود بھی فوج کے ہمراہ رہے۔ پھر اس جماعت کو خدا حافظ کہا۔ بعض روایات کے مطابق اس موقع پر جذبات کی شدت کی وجہ سے سب کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

عرب میں یہ بات قطعی ناممکن ہے کہ تین ہزار آدمیوں پر مشتمل ایک فوج رواں

Marfat.com

دواں ہو اور فوج کی نقل و حرکت کو راز میں رکھا جا سکے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ عرب کی سادہ معاشرت میں نہ تو کوئی باقاعدہ فوج ہوتی تھی اور نہ ہی ان کی فوجی لحاظ سے تقسیم۔ ہر عرب اپنی حفاظت آپ کر لیا کرتا تھا۔ جب حضورؐ نے اس حملے کا حکم دیا تو ظاہر ہے کہ یہ حکم ہر مسلمان تک پہنچا ہو گا۔ ہر آدمی جو جنگ پر جانے کے لیے تیار ہوا ہو گا اپنی سواری کا بندوبست آپ ہی کر لیا ہو گا۔ خورد و نوش کا انتظام بھی خود ہی کر لیا ہو گا۔ کوئی ایسی تنظیم نہیں تھی جو فوج کے لیے نقل و حمل کا انتظام کرتی۔ راشن وغیرہ مہیا کرتی۔ ہر آدمی کو پانی کے لیے اپنی مشک آپ اٹھانی پڑتی تھی۔ کھانے پینے اور لباس وغیرہ کے علاوہ اپنے ہتھیار کا بھی آپ ہی انتظام کرنا پڑتا تھا۔

ان ساری تیاریوں کے لیے کم از کم دو تین ہفتے تو ضرور لگے ہوں گے۔ اس عرصے میں ساری امت جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہی ہو گی۔ اسی دوران جنگ کے نقشے مرتب کیے ہوں گے۔ مختلف قیاسات سے کام لیا ہو گا۔ مختلف افواہیں جنم لی ہوں گی۔ ان دو تین ہفتوں کا زمانہ ایسا گزرا ہو گا جس میں مختلف مسافروں، تجارت پیشہ لوگوں اور بدوی قبیلوں کے ذریعہ مسلمانوں کے اس حملے کی تیاریوں کا علم یقیناً شام کے بنی غسان اور ان کے حکمرانوں کو ہو گیا ہو گا۔

یہ ممکن ہے کہ بنی غسان کے لوگوں نے مقامی قبائیلیوں کی مدد اور تعاون سے اس حملے کو روکنے کی سخت کوشش بھی کی ہو۔ یہ سارا اجتماع اور جمگھٹ ہمسایہ شہر کرک یعنی موجودہ ماب میں ہوا۔

اس مہم کا نتیجہ مسلمانوں کی سخت ترین شکست کی صورت میں نمودار ہوا۔ ابنِ اسحٰق کے بیان کے مطابق اس جنگ میں دشمن کے دو لاکھ آدمیوں نے حصہ لیا۔ ایک لاکھ تو یونانی سپاہی تھے اور بقیہ ایک لاکھ کی فوج مقامی باشندوں پر مشتمل تھی۔

دشمنوں کی فوج کی یہ تعداد بڑی مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ ایسی جگہ جہاں پانی

Marfat.com

کی تاب ہو چند آدمیوں کا ایک جگہ جمع ہو جانا ایک مصیبت کا باعث ہو جاتا ہے چہ جائیکہ دو لاکھ آدمی وہاں جمع ہوں جہاں پانی کے علاوہ ضروریات زندگی کا بھی فقدان ہو۔

ہو سکتا ہے کہ اس موقع پر صرف چار یا پانچ ہزار افراد نے مقامی قبائیلیوں کی مدد سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا ہو۔

جب مسلمان معان پہنچے تو اُن کے علم میں یہ بات آئی کہ مخالف فوجیں ان کے استقبال کے لیے کرک میں ان کا انتظار کر رہی ہیں۔ مسلمانوں نے دو دن کے لیے اپنا سفر ملتوی کر دیا۔ آئیندہ لائحہ عمل پر غور کرنے لگے۔ مسلمانوں کی اکثریت اس بات پر مائل تھی کہ معان کے مقام پر سفر کو قطعی طور پر روک دیا جائے۔ کسی نمائندے کو حضور کی خدمت میں روانہ کر کے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا جائے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں جو بھی حکم صادر ہو اس پر عمل کیا جائے۔ جواب آنے تک مزید کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔

یہاں سے مدینہ کا راستہ چھ سو میل کے لگ بھگ تھا۔ کسی بھی اونٹ سوار کا یہاں سے مدینہ جانا اور پھر واپس آنا۔ اس آمد و رفت کے لیے کم از کم ایک مہینے سے کچھ زیادہ کا عرصہ درکار تھا۔ مسلمان کئی ہفتوں تک معان کے قرب و جوار ہی میں رہے۔ اگر وہ معان اور تیمہ کے درمیان رہنے والے قافلوں کو ہی اپنے اثر میں لے لیتے اور اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد اُن سے لے لیتے تو دشمنوں کے حملے کو آسانی سے روک سکتے تھے۔ جس علاقہ میں مسلمان اُس وقت تھے بیزنطینی فوجوں کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہاں کے ریگستانی حصوں میں داخل ہونے کی جرأت کر سکیں۔ معان کے جنوبی حصے میں اگر یہ جنگ ہو جاتی تو مسلمانوں کو یقیناً فتح حاصل ہو سکتی تھی۔

ایک انصاری عبداللہؓ ابن رواحہؓ وہ واحد آدمی نکلے جنھوں نے رائے عامہ سے

Marfat.com

انحراف کیا اور آگے بڑھنے کی حامی بھری۔ یہ بہت ہی جلد باز اور جذباتی قسم کے آدمی تھے۔ حضورؐ کے فدائیوں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تم اب اس بات سے گھبرا رہے ہو جس کی تلاش میں یہاں تک آئے ہو۔ تمہارے جذبۂ شہادت نے تمھیں اس مقام پر لایا ہے۔ ہم دشمنوں سے مقابلہ اپنی طاقت یا اپنی تعداد کے بل بوتے پر نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارے سامنے صرف دو ہی باتیں ہیں۔ فتح عظیم یا شہادت کبریٰ۔ یہ دونوں عمل عظمت و تقدس میں ہم پلہ ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر سے جذبات کو بھڑکایا کہ تمام مسلمان دشمن سے مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے دشمنوں سے مسلمانوں کا پہلا سابقہ ماب کی مشرقی پہاڑیوں کے ڈھلوان پر ہوا۔ دشمن کے اچانک حملے کی وجہ سے مسلمان چند میل پیچھے ہٹ گئے۔ موتہ میں پڑاؤ ڈالا۔

ماب کا علاقہ پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ زمین ناہموار تھی۔ آدمیوں کے چلنے پھرنے میں تکلیف ہو رہی تھی اس لئے مسلمان موتہ میں منتقل ہو گئے۔ یہ ایک کھلا میدان تھا۔ اس کھلے میدان میں مسلمانوں کی اتنی بڑی فوج کو گھومنے پھرنے کے لئے کافی آسانی تھی۔

اس زمانے میں عربوں کی لڑائیوں میں طریقہ تھا کہ بہادرانہ طریقے سے دو فریق انفرادی طور پر ایک دوسرے کو مقابلے کی دعوت دیتے تھے اور دونوں اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے تھے۔

کمانڈر کا سب سے بڑا اور اہم فرض ہوتا تھا کہ جنگ میں سب سے نمایاں حصہ لے۔ خود لڑنے کے لئے آگے بڑھے یا کسی اور کو آگے بڑھنے کا حکم دے۔ جنگ کا علم تھامے رکھے۔ اپنے آپ کو ساری فوج کے لئے ایک مثال بنائے۔ فکر و نظر اور علم و عمل کے ایسے جوہر دکھائے جو ساری فوج کے لئے اتباع کا باعث ہو۔ ان ہی اصولوں کے پیش نظر زیدؓ ابن حارثہ حضورؐ کے عطا کردہ علم کو اپنے ہاتھ میں

Marfat.com

لیے ہوئے دشمنوں کی صفوں کے مدمقابل ہو گئے آخر دشمنوں کے نیزوں کا شکار ہو کر زمین پر گر پڑے۔ جعفر ابن ابی طالبؓ نے زمین پر گرے ہوئے سفید علم کو فوراً اٹھا لیا۔ اُسے اُونچا کرتے ہوئے کہا "جنت اے مسلمانو جنت" جعفرؓ بہت ہی بہادری اور جوش سے لڑتے رہے۔ دشمن ان کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ روایات میں ہے کہ جب جعفرؓ کے دونوں ہاتھ کٹ گئے تو آپ نے علم کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اُسے گرنے نہ دیا۔ آپ زخموں سے چُور چُور ہو ہی گئے تھے کہ ایک بیزنطینی نے آخر کار آپ کو شہید کر ڈالا۔

اب عبداللہؓ ابن رواحہ انصاریؓ کی باری آئی۔ ایک روایت کے مطابق ایک لمحے کے لیے عبداللہ آگے بڑھنے سے ہچکچائے۔ ابن اسحٰق نے ان کے چند اشعار نقل کیے ہیں۔

کہتے تھے "اے میری روح اس مقابلہ کا سامنا کر۔ جنگ کر اور عزت کی جگہ حاصل کر۔"

انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں میں ایک انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اپنے گھوڑے سے نیچے اُترے۔ اُن کے ایک عزیز نے ان کو کھانے کے لئے کچھ دیا اور کہا کہ اپنی توانائی برقرار رکھنے کے لیے آپ کچھ کھا لیں۔ اُنھوں نے تھوڑا سا کھایا اور بقیہ پھینک ڈالا۔ اپنے آپ سے سوال کیا "عبداللہ کیا ابھی تم زندہ ہو" یہ کہہ کر دشمنوں کی صفوں میں گھس گئے۔ زخموں سے نڈھال ہو کر گر پڑے۔

اب مسلمانوں میں افراتفری مچ گئی۔ پیچھے ہٹنے لگے۔ نئے نئے مسلمان ہونے والے خالد ابن ولیدؓ دشمنوں سے بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ایمانی اعتبار سے خالد زید ابن حارثہ یا جعفر ابن ابی طالب سے کم ہوں لیکن جنگی اعتبار سے ان کا تجربہ سب سے بڑھا ہوا تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ میدان مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے انھوں نے بقیہ مسلمانوں کو میدان چھوڑ دینے کے لئے کہا۔

موتہ کی جنگ کا یہ حشر ہوا۔ دلچسپ بات جو ابن اسحٰق نے بیان کی ہے وہ یہ

Marfat.com

کہ ساری جنگ میں صرف آٹھ مسلمان شہید ہوئے۔ بعض مورخین کے بیان کے مطابق زیادہ سے زیادہ چودہ مسلمانوں کی شہادت ہوئی۔ تین ہزار آدمیوں میں سے کم سے کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ چودہ مسلمانوں کی شہادت قابل تعجب ہے۔

کیا سارے کے سارے مسلمان بیزنطینی فوجوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے؟

کیا مورخین نے واقعات کے بیان میں ملمع سازی اس لئے کی کہ مسلمانوں کی شکست پر پردہ ڈالا جائے اور صرف تین بہادروں کی شہادت کو عوام میں داستانوں کی صورت میں پیش کیا جائے۔

یہاں یہ نکتہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ اس لیے کہ چند سال بعد مسلمانوں نے ایک بار نہیں دو بار نہیں بلکہ کئی بار اور بار بار بیزنطینی فوجوں کو شکست پر شکست دی۔ وہی بیزنطینی فوجیں جن کا فوجی نظم ونسق اپنی مثال آپ ہوا کرتا تھا۔

مسلمانوں کو موتہ میں جو ہزیمت اور ذلت اٹھانی پڑی اس کا ثبوت اس واقعے سے بھی ملتا ہے کہ جب مسلمانوں کی یہ شکست خوردہ فوج مدینہ واپس ہوئی تو مدینہ کے لوگوں نے ان پر دھول جھونکنی شروع کی۔ ان پر مٹی پھینکی گئی۔ ان کو بھگوڑوں سے خطاب کیا گیا لوگ کہہ رہے تھے "خدا کی راہ سے تم لوٹ آئے۔ بھگوڑے کہیں کے" اگر موتہ واقعی بہادری اور شجاعت کی داستانوں سے رنگین ہوتا تو مدینہ واپس آنے پر ان کا استقبال دھول اور طعنوں سے نہ ہوا ہوتا۔

حضورؐ نے اپنی فوجوں کی لاج رکھنے کے لئے مسلمانوں سے کہا کہ "نہیں یہ مفرور نہیں ہیں۔ اللہ چاہے تو یہ کرار ثابت ہوں گے"

حضورؐ کے ان کریمانہ الفاظ نے مسلمانوں کے دلوں کو فتح کر لیا۔

حضورؐ جعفر ابن ابی طالبؓ کے مکان تشریف لے گئے۔ جعفر کے بچوں کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ پُرنم آنکھوں سے انھیں چوما۔ پھر آپ اپنے منہ بولے بیٹے زیدؓ کے مکان گئے۔

زید کی بیٹی روتی ہوئی آکر حضورؐ سے لپٹ گئی۔ حضورؐ خود بھی رونے لگے۔

پُرسہ دینے کے دوسرے دن اعلان فرمایا کہ آپ نے موتہ کے شہیدوں کو جنت کے باغات میں لطف اندوز ہوتے دیکھا ہے۔ آپ نے خاص طور پر جعفر ابن ابی طالبؓ کا ذکر کیا۔ فرمایا کہ وہ حضورؐ کی خدمت میں ایک فرشتہ کا روپ دھارے حاضر ہوئے تھے۔ جعفر کے دونوں بازو جو پَروں کی صورت میں تھے شہادت کے خون میں رنگے ہوئے تھے۔ اس کے بعد سے مسلمانوں نے جعفر کو جعفرؓ طیار کے نام سے یاد کرنا شروع کیا۔

حضورؐ یہ فرماتے تھے کہ آپ ابراہیمی مذہب کی احیاء کے لئے اس دنیا میں تشریف لائے ہیں۔ مذہب ابراہیمی کو اس کے اصلی رنگ و روپ میں پیش کر رہے ہیں۔ آپ نے یہودیوں سے توقعات وابستہ کر رکھی تھیں کہ وہ آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔ اسی لئے آپ نے یہودیوں ہی کے قبلہ کو اپنا قبلہ قرار دیا تھا۔ آپ نے توریت کے کئی قصص سے استفادہ کیا۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ کو اپنایا۔ یہ تینوں عبادات یہودیت میں تھیں۔ آپ پر جو الہامات اور وحی نازل ہوا کرتی تھی اس کا طرز وہی ہوا کرتا تھا جو توریت کے ابواب کا تھا۔ آپ نے غذا کے معاملے میں جو اصول وضع کئے تھے وہ کم و بیش وہی تھے جو یہودیوں کے تھے۔ مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد حضورؐ نے اپنے قواعد و ضوابط میں تبدیلیاں کیں۔ قبلے کو تبدیل کر دیا۔ ہفتہ کی بجائے جمعہ کو مسلمانوں کا اہم دن قرار دیا۔ مسلمانوں اور یہودیوں میں جو خلیج پیدا ہوئی تھی وہ دین یا مذہب کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔ یہودیوں نے حضورؐ کو مسیحا ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے سوا بقیہ اکثر باتوں میں دونوں مذاہب میں مماثلت تھی۔

خلیج پیدا ہونے کی بڑی وجہ مدینہ کے یہودیوں کا حضورؐ سے تمسخر اور اسلام اور صاحب اسلام کا مذاق اور ان کی تعلیمات کو لغویات کا نام دینا۔ اور اس

Marfat.com

سے بڑی وجہ ہو بھی کیا ہو سکتی تھی۔

حضورؐ نے مدینہ کے یہودیوں کا پوری طرح سے خاتمہ کر دیا۔ ان یہودیوں کی وجہ سے تبلیغ خطرے میں گھری ہوئی تھی۔

جب حجاز پر اقتدار اور تصرف حاصل ہو گیا تو پھر آپ نے کبھی بھی یہودیوں سے باز پرس نہیں کی۔ وہ بڑے آرام و اطمینان سے وہاں رہنے لگے۔ اس وقت تک حجاز میں بلا کھٹکے رہے جب تک کہ حضرت عمرؓ نے حضورؐ کے انتقال کے بعد انھیں وہاں سے باہر نہیں نکال دیا۔

یہاں یہ بات دلچسپ ترین ہے کہ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ یہودی اسلام کی بقا کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہے تو ان میں اور یہودیوں میں نصرانیت کے خلاف گٹھ جوڑ پھر سے ہو گیا۔ یہ ارتباط اس وقت تک رہا جب تک کہ بیسویں صدی میں یہودیت اپنے عروج پر نہ آ گئی۔

ان دونوں مذاہب کے درمیان اتنے لمبے عرصے تک جو دوستی چلی آئی وہ سیاسی اسباب کا نتیجہ تھی یا ان دونوں مذاہب کے درمیان مشترکہ عقائد کا نتیجہ تھی اس کے تعلق سے صرف قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔

ابتدائی زمانے میں اسلام اور مسیحیت کے درمیان جو تار رشتہ رہا وہ اس رشتے کے بالکل برعکس تھا جو اسلام اور یہودیت کے درمیان تھا۔ حجاز میں کوئی ایسی قابلِ ذکر عیسائی آبادی نہیں تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوتی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ شام سفر کے دوران حضورؐ عیسائی پادریوں سے مل چکے تھے۔ اُن ملاقاتوں کا خوشگوار اثر پڑا تھا۔ آخر زمانے میں مدینہ میں جو وحی نازل ہوئی تھی اس میں فرمایا گیا ہے "یقیناً مسلمانوں کے بدترین دشمن بت پرست اور یہودی ہیں۔ جو لوگ ایمان والوں کے سب سے زیادہ قریب ہیں وہ وہی ہیں جو کہا

Marfat.com

کرتے ہیں ہم عیسائی ہیں۔ اس لیے کہ ان میں اہل علم و بصیرت بھی ہیں۔ وہ متکبر اور مغرور نہیں ہیں"

حضورؐ کی زندگی میں اسلام اور عیسائیت کے درمیان کبھی بھی کوئی رقابت پیدا نہیں ہوئی۔ موتہ کا واقعہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ حضورؐ نے عیسائیت پر جو اعتراض کئے ہیں ان کی بنیاد عقائد پر تھی نہ کہ سیاست پر عقائد پر جو اعتراضات تھے وہ غلط فہمی کی بناء پر تھے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں شام جو عیسائیت کا گہوارہ تھا رقابتوں اور سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ من گھڑت قصے اور کہانیوں کی ابتدا اسی مقام سے ہوتی تھی۔ فرقہ بندیوں کا یہ گڑھ تھا۔ فتنہ طرازیوں کا اڈہ تھا۔

بازنطینیوں کا سرکاری اور درباری مذہب یونانی چرچ تھا۔ یہ لوگ بال کی کھال نکالنے میں استاد تھے۔ لاحاصل بحث و مباحثے میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتے تھے۔ اُن کی ان خرافات کی وجہ سے ان کے علماء و مشائخ کے ذہنی تعیش کا تو سامان ہو جاتا تھا لیکن عام لوگوں میں سخت پھوٹ پڑ جاتی تھی نئے نئے فرقے پیدا ہو جاتے تھے۔ نئی نئی بدعتیں جنم لیتی تھیں۔ شہروں کی آبادی یونانیوں پر مشتمل تھی۔ سمندر کے ساحلوں پر بھی ان ہی کی اکثریت تھی۔
ثقافت، تہذیب اور نسلی اعتبار سے یونانی اس موقف میں تھے کہ دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکیں۔

دیہی آبادی سادہ لوحوں پر مشتمل تھی۔ مذہبی عقائد کے لحاظ سے یہ لوگ صرف بنیادی اصولوں پر یقین رکھتے تھے۔ مذہب کی موٹی موٹی باتیں اُن کے ذہن میں رہتی تھیں۔ مذہب کے معاملے میں یونانیوں کی حد سے زیادہ باریکیاں اور

Marfat.com

بازنطینی عقائد ان سادہ لوحوں کی سمجھ سے باہر تھے۔ اسی لئے یونانی لوگوں کی مذہبی باتوں پر دیہاتی لوگ توجہ دیتے ہی نہیں تھے۔ اور نہ ان کی باتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ اُن کے لئے کوئی خاص پہاڑی وعظ کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔

شام کے دیہات اور قبیلوں کی آبادی کی عیسائیت میں رنگین کہانیاں من گھڑت قصے، توہمات، جادوگری، سب کچھ خلط ملط ہو گئے تھے۔

قرآن میں کئی جگہ جہاں عیسائیوں کی توہم پرستی کا ذکر آیا ہے وہ شاید شام کے عیسائی بدعتیوں کی طرف اشارہ ہے۔ ان عیسائی بدعتیوں کی دماغی ساخت اور ان کا ذہنی پس منظر وہی تھا جو اس وقت کے عرب بت پرستوں کا تھا۔ یونانیوں کی علمیت کا ان پر سایہ تک نہیں پڑا تھا۔ شام اور مصر کے بدعتی عیسائیوں نے بہت سی مذہبی کتابوں کی اختراع کی۔ بہت سے افسانوں اور داستانوں کو وضع کیا۔ ان تمام قصوں اور کہانیوں کی بنیاد توہمات اور جادوگری پر رکھی۔ قرآن میں کئی جگہ ان وضع کردہ مذہبی کتابوں کے قصص کی طرف اشارہ ہے۔ شاید حضورؐ کی معلومات کا ذریعہ عیسائیت کے تعلق سے یہی موضوع کتابیں رہی ہوں اس سلسلے میں جو سب سے واضح مثال ہے وہ یہ بیان کہ یروشلم کے ایک گرجا گھر یا عبادت خانہ میں مریم پڑی ہوئیں اور فرشتے اُن کی خورد ونوش کا انتظام کرتے رہے اور ان کو اپنے ہاتھوں سے کھلاتے رہے۔ یہ روایت ایک انتہائی مشکوک، غیر معتبر اور غیر مذہبی نام نہاد الہامی کتاب میں پائی جاتی ہے۔ ان اناجیل میں بھی یہ موجود ہے جو مصر میں تیار کی گئی تھیں۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے عہد طفولیت میں گہوارہ میں بات کی۔

جھولے میں پڑے ہوئے عیسیٰ کا بات کرنا ایک نام نہاد غیر معتبر انجیل میں پایا جاتا ہے۔ ایک اور مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ وہ یہ کہ عیسیٰ نے مٹی کی چڑیاں اور پرند بنائے۔ ان میں سانس پھونکی۔ چڑیوں میں رُوح آگئی۔ وہ اصلی چڑیوں میں تبدیل ہو کر وہاں سے اُڑ گئیں

Marfat.com

یہ واقعہ بھی ایک من گھڑت عیسائی مذہبی کتاب میں پایا جاتا ہے۔ ان سارے اختراعی کتابوں کو ابتدائی لوگ انجیل سے موسوم کرتے تھے۔

قرآن نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ عیسیٰ کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی بلکہ آپ کی جگہ آپ سے مشابہ کوئی اور شخص صلیب پر چڑھا یا گیا۔ یہ بات عیسائیوں کی بہت ہی پرانی گمراہی، بدعت اور ضلالت کا نتیجہ تھی اور اس بات کو خود گمراہ عیسائیوں نے اختراع کیا تھا۔

۱۲۰ء میں ایک پادری جس کا نام   تھا اس بات کی تلقین کرنے لگا کہ جس آدمی کو صلیب پر چڑھا یا گیا وہ عیسیٰ نہیں تھے بلکہ

تھا۔ بعد میں چل کر عیسائیوں میں ایک ایسا فرقہ نکل آیا جس کا عقیدہ وہی تھا جو بے سل لائیڈز کا تھا۔ عیسائیوں میں ایک فرقہ ایسا بھی ہے جو عیسیٰ کے مصلوب ہونے سے انکار کرتا ہے۔

ان ساری غلط فہمیوں میں جو بات شد و مد سے بحث و مباحثے کا مرکز بنی وہ تثلیث کا مسئلہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے عیسائیوں کی تثلیث سے مراد مریم، عیسیٰ اور خدا کو لیا ہے۔ ایک بار ہم پھر یہ دیکھتے ہیں کہ عیسائیوں میں ایک فرقہ ایسا بھی رہا ہے جو مریم کی عظمت اور تقدس میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ مریم کی عبادت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ باہر والوں کو اس تقدس اور تقدیس کے پردے میں شاید کچھ کا کچھ نظر آئے۔

اسی طریقے سے ہم دیکھتے ہیں کہ حضورؐ نے خدا کے بیٹے کی ترکیب پر اعتراض فرمایا ہے۔ آپ نے پوچھا ہے کہ خدا کس طریقے سے بچہ جن سکتا ہے؟

خدا اور بیٹے کی ترکیب یا ان الفاظ کا استعمال معنوی اعتبار سے نہیں بلکہ فنی اعتبار سے ہے۔ یہ اظہار کا مخصوص طریقہ ہے۔ یہاں اس امر کو ثابت کرنا تھا کہ عیسیٰ ایک پاکیزہ روح کے حامل تھے۔ سراپا عظمت و تقدس اُن کی روح بن گئی تھی۔

قرآن کے سورہ نساء کی ۱۷۱ ویں آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"اے اہلِ کتاب اپنے دین کی بات میں حد سے نہ بڑھو۔ خدا کے بارے میں حق

کے سوا کچھ نہ کہو۔ مسیح یعنی مریم کے بیٹے عیسیٰ نہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے بلکہ خدا کے رسول اور اس کا کلمۂ بشارت تھے جو اس نے مریم کی طرف بھیجا تھا اور اس کی طرف سے ایک روح۔ خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں۔ اس اعتقاد سے باز آؤ کہ یہی تمھارے حق میں بہتر ہے۔ خدا ہی معبود واحد ہے۔ اس سے پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو"

پھر اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

"مسیح اس بات سے عار نہیں رکھتے کہ خدا کے بندے ہوں"

حضورؐ عیسیٰ کو بن باپ کے مانتے ہیں اور مریم کو دوشیزہ تصور کرتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ اس وقت کے عیسائی فرقہ بندیوں، دقیق اصطلاحوں، رنگین داستانوں اور جعلی انجیلوں کی اختراعات سے حضورؐ عیسائیت کو اس کے اپنے اصلی رنگ و روپ میں نہیں دیکھ سکے۔ چونکہ حضورؐ کو شام ہی میں عیسائیت سے سابقہ پڑا تھا اس لیے ساتویں صدی عیسوی میں عیسائیت کا وہاں جو حشر ہو رہا تھا صرف وہی حضورؐ کے پیش نظر تھا۔

جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے ہر شور و غوغا میں ایسے لوگ بھی نکل آتے ہیں جو اپنے عقائد اور اصولوں کی صحیح طریقے سے پیروی کرتے رہتے ہیں۔ شارع کی شریعت پر خاموشی سے پابند رہتے ہیں۔ متنازعہ فیہ مسائل میں حصہ لیے بغیر نکتہ گری اور فرقہ پرستی سے بچے رہتے ہیں۔ شاید یہی وہ لوگ ہوں اور اسی قسم کے وہ مسیحی علماء و راہب ہوں جن سے ملنے کے بعد حضورؐ نے عیسائیت کے تعلق سے اچھا اثر لیا ہو۔ اسی اچھے تاثر کا شاید یہ اثر ہو کہ آپ نے ان کو اچھے الفاظ سے یاد کیا اور ان کی تعریف کی۔ آپ نے یہاں تک کہہ دیا کہ محبت و ہمدردی میں عیسائی مسلمانوں سے زیادہ قریب ہیں اس لئے کہ وہ متکبر، مغرور اور خود پسند نہیں ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ پہلے پہل جس وقت مکہ سے مسلمان حبشہ کو ہجرت کر رہے تھے حبشہ کا بادشاہ عیسائی تھا۔ اس کی حکومت عیسائی تھی۔ حضورؐ نے

Marfat.com

ہجرت کرنے والوں کو خاص طور پر یہ فرمایا کہ حبشہ کی حکومت عیسائی حکومت ہے جو انصاف رساں اور عدل پسند ہے۔ جب حبشہ کے شہنشاہ کے دربار میں مسلمانوں کو طلب کیا گیا اور مسلمانوں نے اسلام کے خط و خال اس کے آگے پیش کئے تو اس نے اسلام کو بھی مسیحیت سے تعبیر کیا۔

کتنی افسوس ناک بات ہے کہ ابتداء میں تو عیسائی اور مسلمان ایک دوسرے کے اتنے قریب رہے لیکن گزشتہ کئی صدیوں سے ایک دوسرے کے رقیب بنے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

یادگار تاریخیں

مدینہ کو ہجرت	۶۲۲ء
جنگِ بدر	۶۲۴ء
جنگِ اُحد	۲۳، مارچ ۶۲۵ء
مدینہ کا محاصرہ	مارچ/اپریل ۶۲۷ء
صلح حدیبیہ	مارچ ۶۲۸ء
فتح خیبر	ستمبر ۶۲۸ء
عمرہ کی ادائیگی	جنوری ۶۲۹ء
جنگِ موتہ	ستمبر ۶۲۹ء

Marfat.com

مکہ پر قبضہ

بہت سے مورخین کا اس روایت سے اتفاق ہے کہ حدیبیہ سے واپسی کے بعد مارچ ۶۲۸ء میں حضورؐ نے اپنے نمائندوں کو مختلف بادشاہوں اور شہزادوں کے دربار میں روانہ کیا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ اسلام قبول کرلیں۔ جن بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی ان میں بیزنطینی شہنشاہ، ایران کا بادشاہ، مصر کا حکمران حبشہ کا شہنشاہ اور کئی دوسرے شہزادے جو عرب کے قریبی علاقوں پر حکمرانی کرتے تھے شامل تھے۔

اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ بیزنطینی سلطنت ۶۰۲ء سے ۶۲۸ء عیسوی تک ایرانیوں سے برسرپیکار رہی۔ ۶۱۰ء میں ایرانیوں نے انطاکیہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۶۱۴ء میں یروشلم ان کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ ۶۱۶ء میں مصر اور ترکی پر یہ قابض ہو چکے تھے۔ شام کا پورا ملک، فلسطین، مصر، اور ترکی ۶۲۸ء تک ایرانیوں کے قبضے میں رہے۔ فروری ۶۲۸ء میں خسرو پرویز کا قتل ہوا۔ اس کے قتل کے بعد ایرانی شہنشاہیت کو زوال آیا۔

ابن سعد نے طبقات کبیر میں لکھا ہے کہ مئی ۶۲۸ء میں خیبر کی مہم سے پہلے اور حدیبیہ کی صلح کے فوری بعد حضورؐ نے اپنے نمائندوں کو مختلف بادشاہوں کے

درباروں میں روانہ کیا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو خسرو پرویز کے قتل کے فوری تین ماہ بعد ہی ان وفود کی روانگی عمل میں آئی تھی۔ اس وقت ساری ایرانی سلطنت میں ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ایک روایت کے مطابق بازنطینی شہنشاہ کو حضورؐ کا خط یروشلم میں ملا۔ بازنطینی شہنشاہ ہرقل یروشلم میں تھا۔ وہ صلیب کو اپنی صحیح جگہ نصب کرنے کے لیے مارچ ۶۳۰ء میں وہاں گیا تھا۔ ہرقل کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ اس نے ابوسفیان کو جو اس وقت شام میں تھا اپنے دربار میں طلب کیا تاکہ اسلام کے تعلق سے معلومات حاصل کرے اور ساتھ ہی ذات اقدس کے تعلق سے واقفیت حاصل کرے۔ اس روایت میں صداقت کا شائبہ ہے اس لیے کہ ۶۳۰ء میں ابوسفیان مکہ میں تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ ایک طریقے سے اپنی سرگرمیوں کے حدود کو آہستہ آہستہ وسیع کرتے جا رہے تھے آپ نے ابتداء تو مدینہ کی مخالفتوں کو دبانے سے کی۔ پھر مقامی قبیلوں جیسے جہینہ اور خزاعہ سے دوستانہ تعلقات قائم کیے۔ پھر تیمہ، ایلہ اور دومہ سے دوستی کی۔ مدبرانہ چابکدستی کو استعمال کرتے ہوئے فوجی طاقت اور قوت کا بھی مظاہرہ کیا۔ آپ نے ہتھیار سے زیادہ ماہیت قلب کے لیے حسن گفتار اور حسن کردار کے حسین حربے استعمال کیے اور انہی کو پسند بھی فرمایا۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ۵۸۱ء میں بنی غسان اپنی بادشاہت کھو بیٹھے۔ یہ خاندان بیزنطینی سلطنت کے تخت و تاج کا مالک ہوا کرتا تھا۔ بادشاہت کھو دینے کے بعد ان کے قبیلوں کے سرداروں کو مشرقی اور جنوبی شام کے مختلف علاقوں پر بہ حیثیت گورنر حکومت کرنے کے مواقع ملے۔ یہ عین ممکن ہے کہ دومہ قبیلے کو اپنی طرف کرنے کے بعد حضورؐ نے ان ہی کی وساطت سے شام کے بنی

Marfat.com

غسان کے گورنروں کو اسلام کی دعوت دی ہو۔

شروع شروع میں حضورؐ نے غسانی حکمرانوں کو اپنی طرف کرنے کے لیے صرف سیاسی اتحاد ہی پر زور دیا تھا۔ ان کو اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے بنی غسان کے ایک سے زیادہ گورنروں کے نام اپنے دعوت نامے روانہ فرمائے تھے۔ ان ہی گورنروں میں سے کسی ایک گورنر کے پاس گئے ہوئے قاصد کا قتل موتہ کی جنگ کا باعث ہوا۔

اس بات کا قوی امکان ہے کہ حضورؐ نے حبشہ کے نجاشی سے کئی بار خط و کتابت کی۔ حدیبیہ کے فوری بعد آپ نے نجاشی کو خط لکھا تھا کہ حبشہ میں رہنے والے مسلمانوں کو مدینہ واپس کر دیا جائے اور ان ہی کے ساتھ ام حبیبہ کو بھی روانہ کیا جائے جن سے حضورؐ نکاح کے خواہاں تھے۔

ابن سعد نے طبقات کبیر میں جس خط و کتابت کا ذکر کیا ہے شاید وہ اسی خط کی طرف اشارہ ہو۔ یہ بات بعد از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ حضورؐ نے نجاشی کو اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور کیا ہو۔ اس بادشاہ سے اس قسم کا مطالبہ جو مسلمانوں کے ساتھ انتہائی دوستانہ سلوک کر چکا تھا اور جو اسلام کو عیسائیت کی ایک شاخ سمجھ بیٹھا تھا، خلاف توقع معلوم ہوتی ہے۔

شاہ ایران کے پاس بھی قاصد روانہ کیے جانے کی روایت مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ یہ ہم کو معلوم ہے کہ حضورؐ نے یمن کے ایرانی گورنر کے نام خط روانہ کیا تھا اور بحرین کے ایرانی گورنر کے پاس بھی خط بھیجا تھا۔ ان گورنروں کے نام جو خطوط روانہ کیے گیے تھے ان خطوط کو یار لوگوں نے غلطی سے شاہ ایران کے نام منسوب کر دیا۔ مشکل سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اس بات کا ذکر ہے کہ حضورؐ نے مصر کے حاکم کے ہاں اپنا قاصد روانہ فرمایا تھا۔ اس حاکم نے اپنے جواب کے ساتھ سواری کے لیے ایک سفید خچر اور دو باندیوں کو حضورؐ کی

Marfat.com

خدمت میں تحفتہً روانہ کیا ان ہی دو لونڈیوں میں سے ایک لونڈی ماریہ کو حضورؐ نے اپنے نکاح میں لے لیا۔ ان بی بی کے بطن سے ابراہیمؑ پیدا ہوئے حضورؐ نے دوسری لونڈی اپنے دربار کے شاعر حسان ابن ثابت رضؓ کے حوالے کر دی حسان ایک بھونڈے آدمی تھے ان کی شاعری ہزل سے عبارت ہوا کرتی تھی۔ بی بی عائشہ پر تہمت باندھنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ حضورؐ کے غصے اور غضب کا نشانہ بھی بن چکے تھے کچھ عرصے بعد حضورؐ نے شاید انہیں معاف کر دیا ہو تحفہ کے طور پر مصری لونڈی انہیں عطا کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں لونڈیوں کی آمد جنوری یا فروری ۶۲۷ء میں ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ایرانی مصر پر قابض تھے۔ عرب اس مصری حاکم کو المقوقس کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ شاید یہ کسی یونانی لفظ کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ بہرحال اس واقعہ کا اقرار یا انکار دونوں آسان نہیں۔

صاحبان علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ حضورؐ نے کوئی پیشن گوئی ایسی کی تھی جس میں یہ کہا گیا ہو کہ عرب بہت سے ملکوں کو فتح کریں گے۔ اپنی شہنشائیت کو وسیع کریں گے وغیرہ یا آپ کے ذہن کی دور بین میں یہ نظر آیا ہو کہ سارا عرب اسلام قبول کر چکا ہے اس سوال کا جواب قرآن میں تو کہیں نہیں ہے۔ اگر کہیں ہے بھی تو اس کے معنی اور مفہوم واضح نہیں ہیں۔

سورہ النحل کی ۸۴ ویں آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

"اور جس دن ہم ہر امت میں سے گواہ یعنی پیغمبر کھڑا کریں گے تو نہ تو کفار کو بولنے کی اجازت ملے گی اور نہ ان کے عذر قبول کیے جائیں گے۔"

حدیبیہ کے معاہدہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ فریقین کو اس بات کا اختیار ہوگا کہ مقامی قبائل میں سے جس سے چاہیں دوستی کا معاہدہ کر لیں۔

Marfat.com

ان میں سے جو شخص کسی کا طرف دار ہونا چاہے اس کی آزادی ہوگی۔ معاہدہ کی اس دفعہ پر بھی دس سال کی شرط لاگو تھی۔ معاہدہ کی اس شرط کو سامنے رکھ کر قریش نے بنی کنانہ سے دوستی کا معاہدہ کیا اور حضور نے بنی خزاعہ سے کچھ اس طریقے کی بات ہوئی کہ موتہ سے شکست خوردہ فوج مدینہ آنے سے قبل خزاعہ کے چند لوگ مکہ کے باہر الوطیر کے مقام پر اپنے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ بنی کنانہ کی ایک جماعت جو بنی بکر کے نام سے موسوم تھی موقع پا کر بنی خزاعہ کے لوگوں پر حملہ آور ہوئی۔ کسی پرانی دشمنی کے بدلے میں ایک آدمی کو جان سے بھی مار ڈالا۔ یہ جھگڑا اور آگے بڑھا ابن اسحٰق کے بیان کے مطابق قریش کے چند لوگوں نے بنی کنانہ کی خفیہ مدد کی۔ ابن اسحٰق کا یہ بیان بڑا ہی مشکوک ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حدیبیہ کے معاہدہ کو توڑنے کی پہل قریش نے کی۔

خزاعہ کے سردار بدیل ابن ورقہ جو حدیبیہ کے موقع پر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے بنی کنانہ اور قریش کی اس ملی بھگت کو دیکھ کر فوراً حضورؐ کے پاس گئے۔ حضورؐ کی توجہ معاہدہ حدیبیہ کی اس دفعہ پر مبذول کرائی جس میں دس سال تک امن وامان کا ذکر تھا۔ نہ صرف قریش اور مسلمانوں کے درمیان بلکہ بنی کنانہ اور بنی خزاعہ کے درمیان بھی۔ بدیل نے قریش کو معاہدہ توڑنے کا ذمہ دار قرار دیا۔

معاہدہ حدیبیہ نے اور مسلمانوں کے عمرے نے مکہ کی رائے عامہ کو حضورؐ کی مرضی کے مطابق کافی ہموار کر دیا تھا۔ مکہ کے لوگ ذہنی طور پر آپ کی طرف کھنچ رہے تھے یہ عین ممکن ہے کہ حضورؐ نے خود بھی دس سال تک انتظار کرنا لاحاصل سمجھا۔ مکہ کی طرف دس سال کے بعد کوچ کرنا کونسی عقلمندی تھی جبکہ مکہ ایک پکے ہوئے پھل کی طرح آپ کی آغوش میں گرنے کے لیے بے چین تھا۔ حضورؐ نے موقع سے فائدہ اٹھانا مناسب سمجھا۔ بنی کنانہ نے جو صورت حال پیدا کر دی تھی اس سے استفادہ

Marfat.com

کرتے ہوئے معاہدہ حدیبیہ کی تنسیخ کو ضروری سمجھا۔ اپنی شکایت کو حضورؐ کے گوش گزار کر کے بدیل اپنے گھر مکہ واپس ہو رہے تھے۔

عسفان کے مقام پر بدیل کی ملاقات ابوسفیان سے ہوئی۔ بدیل نے ابوسفیان کے کان کھول دیئے انہوں نے کہا کہ مسلمان اب ہر مخالفت کا سختی سے جواب دیں گے۔ ابوسفیان بڑا گھبرایا۔

دوڑا دوڑا مدینہ گیا تاکہ حضورؐ سے معاہدہ کی بحالی کی درخواست کرے۔ ابوسفیان کا سراسیمگی کی حالت میں مدینہ جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ مکہ والے اس واقعہ سے کتنے پریشان ہو گئے تھے۔

جنگ بدر سے مدینہ کے محاصرہ تک ہر جگہ ابوسفیان مسلمانوں کے خلاف کافروں کی رہنمائی اور سرکردگی کرتا رہا۔ اس کے باوجود اس کا نام مسلمانوں کے ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹتا رہا۔ معاہدہ حدیبیہ کی گفت و شنید کے موقع پر کہ ابوسفیان کا ذکر کہیں نہیں آیا ہے عبدالشمس اور بنی مخزوم کے انتہا پسندوں نے صف اول میں جگہ لینی شروع کر دی تھی۔

ابوسفیان کی بیٹی حضرت اُمِّ حبیبہؓ اب حضورؐ کی بیوی تھیں رشتہ میں ابوسفیان حضورؐ کا خسر ہوتا تھا۔

ابوسفیان نے اس نے خیال سے سمجھ داری کا تقاضہ یہی ہے کہ سب سے پہلے اپنی بیٹی اُمِّ حبیبہؓ سے ربط قائم کیا جائے اور اُمِّ حبیبہؓ کو اس بات پر راضی کیا جائے کہ وہ اپنے شوہر اور اپنے باپ کے درمیان مصالحت کی فضا سازگار کریں۔

ابوسفیان کو بی بی اُمِّ حبیبہؓ سے جو توقعات وابستہ تھیں ان پر پانی پھرتا نظر آیا۔ جیسے ہی ابوسفیان اپنی بیٹی اُمِّ حبیبہؓ کے کمرے میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ وہاں پر بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ جائے بی بی اُمِّ حبیبہؓ نے فوراً قالین کو اٹھا لیا اور لپیٹ کر اسے

ایک کونے میں رکھ دیا۔

باپ نے بیٹی سے کہا "میری بچی، میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تمہارا یہ قالین میرے شایان شان نہیں ہے یا میں تمہارے قالین کے شایان شان نہیں ہوں۔

بیٹی نے اپنے باپ کو ترشی سے جواب دیا " بابا۔ یہ وہ قالین ہے جس پر رسول اللہ تشریف فرما ہوتے ہیں۔ تم اس قالین پر نہیں بیٹھ سکتے اس لیے کہ تم بے دین ہو اور بے دین ناپاک ہوتا ہے۔"

باپ نے اپنی بیٹی سے کہا کہ " بیٹی مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔ خدا کی قسم میرا گھر چھوڑ دینے کے بعد تم میں اخلاق کی کمی ہو گئی ہے۔"

یہ کہہ کر ابوسفیان اپنی بیٹی کے گھر سے نکل گیا۔

یہ واقعہ ہمارے ذہن پر عجیب و غریب اثر کرتا ہے کہا یہ جاتا ہے کہ حضورؐ نے مختلف خاندانوں کی لڑکیوں سے شادیاں محض اس لیے کیں کہ ان خاندان والوں سے حضورؐ کے تعلقات استوار ہوں۔ آپ نے خاص طور سے حبشہ کے شہنشاہ کو لکھ کر ام حبیبہؓ کو مدینہ بلوایا۔ اگر آپ کا مقصد صرف ایک عورت کا حصول ہی تھا تو ایک سے بڑھ کر ایک حسین و جمیل اور خوبصورت سے خوبصورت تر لڑکی عرب ہی میں آپ کو مل سکتی تھی سینکڑوں خوبصورت لڑکیاں وہیں موجود تھیں۔ ان ساری پری پیکروں کو چھوڑ کر خاص طور سے ام حبیبہؓ کو جو بیوہ بھی تھیں حبشہ سے بلوا کر حضورؐ کا شادی کرنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حضورؐ شاید ام حبیبہؓ کے توسط سے ابوسفیان سے اپنے تعلقات بہتر بنانا چاہتے تھے۔ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح ابوسفیان کے رد یہ میں آہستہ آہستہ تبدیلی آ رہی تھی۔

حضورؐ بہت جلد ابوسفیان کو استعمال کرنے والے ہیں۔ کیا اس وقت حضورؐ نے یہ مناسب سمجھا کہ ابوسفیان کو پہلے دو ایک چرکے دیے جائیں تاکہ اس کے

Marfat.com

ہوش ٹھکانے آئیں؟ کیا حضور کی ہدایت پر ام حبیبہ اپنے باپ کے ساتھ تلخ روی سے پیش آئیں؟

ام حبیبہ کے رویے کو دیکھ کر ابوسفیان نے فیصلہ کیا کہ حضور کی خدمت میں خود کیوں نہ پہنچ جائے، راستہ میں کھڑے ہو کر اس نے حضورؐ کو سلام کیا۔ حضورؐ نے ابوسفیان کو نظرانداز کر دیا۔ بغیر بات کیے آپ آگے بڑھ گئے۔ ابوسفیان نے حضرت ابوبکرؓ کی منت سماجت کی کہ وہ اس کے اور حضورؐ کے تعلقات کو بہتر بنائیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے صاف طور پر انکار کر دیا۔ عمرؓ ابن الخطاب سے بھی ابوسفیان نے یہی درخواست کی حضرت عمرؓ نے بھی اسے دھتکارا۔ اب ابوسفیان حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ المدد کے نعرے لگائے، حضرت علیؓ اپنے گھر میں اپنی بیوی سیدہ فاطمہؓ کے ساتھ تھے، سیدہ فاطمہؓ حضورؐ کی صاحبزادی ہیں، حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمہؓ کے کم سن صاحبزادہ حضرت حسنؓ فرش پر رینگ رہے تھے۔

ابوسفیان نے بڑی ہی رقت کے ساتھ حضرت علیؓ سے درخواست کی کہ آپ اس کی سفارش حضورؐ سے کریں۔ کسی بھی طریقہ سے صرف ایک بار حضورؐ سے ملا دیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ حضورؐ جب ایک بار کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر کوئی بھی سفارش اور کسی کی بھی سفارش کارگر نہیں ہوتی۔

ابوسفیان کو جب اپنی ہر کوشش میں ناکامی ہوئی تو قریش کا یہ مغرور سرغنہ اپنے اونٹ پر سوار ہو کر ملول دل کے ساتھ ہاتھ ملتے ہوئے مکہ کی طرف چل پڑا۔

تمام راویوں نے متفقہ طور پر اس واقعہ کا ہونا تسلیم کیا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ابوسفیان کا مدینہ آنا اس بات کے لیے ہو کہ حضورؐ سے کسی قسم کا کوئی خفیہ معاہدہ کیا جائے۔ مکہ کے گلی کوچوں میں خون کی ہولی کھیلنے جانے کا اسے اندیشہ تھا اس لیے وہ دوڑتا ہوا مکہ روانہ ہو گیا تاکہ اپنے بھائی بندوں سے کہے کہ

Marfat.com

مسلمانوں کی مزاحمت کرنا بے کار ہے خاموشی سے اپنا شہر ان کے حوالے کر دو۔

یہ قیاس اس لیے بھی جڑ پکڑتا ہے کہ ابوسفیان کے روانہ ہو جانے کے فوری بعد حضورؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ مکہ پر چڑھائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ دس ہزار مسلمانوں نے حضورؐ کی اس آواز پر لبیک کہا۔ دو سال پہلے حدیبیہ کے موقع پر صرف ایک ہزار چار سو مسلمان حضورؐ کے ساتھ تھے اور اس موقع پر دس ہزار۔

اسلامی انقلاب کے حدود کی وسعت اور لوگوں کا بے اختیار حضورؐ کے پیغام کو قبول کرنا اسلامی تاریخ کے ہر پڑھنے والے کو مرحبا اور آفریں کہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

یکم جنوری ۶۳۰ء کو مسلمان مدینہ سے روانہ ہوئے، رمضان کا مہینہ تھا۔ روزوں کا زمانہ تھا مسلم فوج کا ہر فرد روزہ رکھا ہوا تھا، صبح صادق سے غروب آفتاب تک نہ کھانا نہ پانی - روزہ کی حالت میں مسلم فوج رواں دواں تھی۔

واقعہ تو یہ ہے کہ جو لوگ جہاد میں حصہ لیتے ہیں ان کے لیے رمضان کے روزے معاف ہیں، رمضان کے روزوں کی تلافی بعد میں روزہ رکھ کر کی جا سکتی ہے جب مسلمانوں کی جماعت مکہ سے ۵۰ میل دور پہنچ گئی تو حضور نے اور تمام مسلمانوں نے معافی روزہ کی اجازت سے استفادہ کیا۔ مدینہ سے مسلمانوں کے روانہ ہو جانے کے بعد بنی سلیم کے سات سو لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ وہ قبیلہ تھا جو ابھی تک مسلمانوں کے خلاف مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔

حضورؐ کے چچا عباسؓ مکہ میں بت پرستوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ مکہ کے تعلق سے وقتاً فوقتاً حضورؐ کو مختلف قسم کی معلومات فراہم کرتے تھے۔ عباس نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ مقابلے کی نوبت اب آئے گی نہیں اپنے افراد خاندان کو لے کر حضورؐ کے استقبال کے لیے پہل کی اور مکہ سے باہر نکل گئے۔

مکہ کے شمال میں جحفہ کے مقام پر عباس نے مسلمانوں کو خوش آمدید کہا۔ یہ مقام

Marfat.com

مکہ سے ستر میل کے فاصلے پر تھا۔

عباسؓ کے اپنے بیان کے مطابق وہ بڑے ہی پریشان تھے کہ اگر مسلمانوں نے قوت وطاقت کے بل بوتے پر مکہ کو اپنے قبضے میں لے لیا تو قریش کی کیا گت بنے گی۔ اسی ڈر سے انہوں نے اپنی جان کی سلامتی اسی میں سمجھی کہ آگے جا کر مسلمانوں کا استقبال کیا جائے استقبال کرنے کے بعد یہ مسلمانوں کے آگے آگے اسی امید میں چل رہے تھے کہ کوئی ایسا پیامی انہیں مل جائے جو مکہ جا کر قریش کو سمجھائے کہ مسلمانوں کی مزاحمت نہ کریں مسلمانوں سے امن کے خواستگار ہوں۔ جیسے ہی اندھیرا ہوا عباس کی مڈبھیڑ ابوسفیان سے ہوگئی مسلم مورخین کے بیان کے مطابق عباس نے ابوسفیان سے کہا کہ مسلمانوں کا ایک عظیم لشکر مکہ کی طرف اپنی پوری قوت وطاقت کے ساتھ آرہا ہے۔ اگر تم حضورؐ کے ہاتھ آگئے تو تمہارا سر تن سے جدا کر دیا جائے گا۔ تمہارے لیے بہتری اسی میں ہے کہ چپکے سے میرے خچر پر میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں تم کو حضورؐ کی خدمت میں لے چلوں گا۔ تمہاری جان کی امان کی درخواست کروں گا۔

ابوسفیان کے تعلق سے مورخین نے بھر وہی معاندانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ ابوسفیان نے پہلے ہی سے حضورؐ سے اگر کوئی معاہدہ کر لیا تھا تو یہ بھی تو ممکن ہے کہ خود ابوسفیان ہی نے عباس کو حضورؐ کے استقبال کے لیے مکہ سے باہر روانہ کیا ہو۔ تاریخی واقعات اور حقائق کو مسخ کرنا، ان میں توڑ جوڑ کرنا، ممکنات اور ناممکنات کی تشریح و تاویل کرنا بعید بھی تو نہیں ہوسکتا۔

حضورؐ کے انتقال کے ۲۹ سال بعد ابوسفیان کی اولاد خلافت پر متمکن ہوئی۔ ۸۹ سال تک اس خاندان نے فرمانروی کی۔ اتنے عرصہ تک حکومت کرنے کے بعد عباسیوں نے خلافت ان سے چھین لی۔ عباسیوں کے عہد ہی میں بہت ساری اسلامی تاریخیں لکھی گئیں۔ شاید یہی وجہ ہو کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں عظمت کو نمایاں

Marfat.com

کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ ابوسفیان کو گرانے کے لیے اور لوگوں کی نظر میں اسے ذلیل کرنے کے لیے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ہر اچھی بات کو عباس سے منسوب کر دیا ہو۔ اگر ابوسفیان کی کوششوں سے مکہ حضورؐ کے قریب آیا بھی ہو تو اس کو بھی عباس سے منسوب کر دیا گیا ہو۔

ان ہی معتبر روایات کے پیش نظر ہم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ ابوسفیان خچر پر عباس کے پیچھے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ خچر سفید رنگ کا تھا اور حضورؐ کی ملکیت تھا۔ عباس اور ابوسفیان دونوں مسلمانوں کے خیموں میں جاتے ہیں مسلمان ان کو دیکھ کر لڑنے کی دعوت دیتے ہیں جن لوگوں نے حضورؐ کے خچر کو پہچان لیا تھا اور عباس کو دیکھ چکے تھے یہ جاننے کی فکر میں نہیں تھے کہ ان کے پیچھے کون بیٹھا ہوا ہے۔

اپنے پرانے دشمن کے تنزل اور عبرت انگیز زوال کو دیکھتے ہوئے حضورؐ نے عباس سے فرمایا "اب تو انہیں یہاں سے لے جاؤ۔ کل علی الصبح لے آنا"۔ دوسرے دن ابوسفیان پھر سے حضورؐ کی خدمت میں لائے گئے۔

حضورؐ نے ابوسفیان سے فرمایا "کیا اب بھی تمہارے لیے وقت نہیں آیا کہ تم خدا کی واحدنیت کا اقرار کر لو۔"

بڈھے نے جواب دیا "اگر کوئی اور خدا ہوتا تو کیا وہ میری مدد کے لیے نہیں آتا" حضورؐ نے ابوسفیان سے فرمایا "کیا اب بھی تم کو میری رسالت پر شبہ ہے؟"

ابوسفیان نے جواب دیا "شک تو اس بارے میں مجھے اب بھی ہے۔"

بعد میں چل کر عباس کہتے ہیں کہ اس موقع پر میں نے مداخلت کی اور ابوسفیان سے کہا کہ کلمہ پڑھ لو۔ نہیں تو تم مارے جاؤ گے۔

بعض روایات میں یہ جملے عباس سے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ سے منسوب ہیں۔ بحث تو ایسی چھڑی تھی جس کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ چاہے عباس نے ڈانٹ پلائی ہو یا عمرؓ نے بہرحال ابوسفیان کو کلمہ پڑھتے ہی بنی۔ اس کے سوا ابوسفیان کے ہاں

Marfat.com

کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

واقعات کی ترتیب میں پھر ایک بار ایسی تنظیم پیدا کی جا رہی ہے جس کے پیش نظر عباس کی رفعت میں اور اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بنی اُمیہؓ کے ابوسفیان کو گھٹیا قرار دیا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ عباس ہی کی اولاد نے بنی اُمیہؓ سے خلافت چھین لی تھی۔

ابوسفیان کے کلمہ پڑھ لینے کے بعد مکہ پر قبضہ کرنے کے طریقۂ کار پر غور کیا گیا۔ یہ طے پایا کہ مسلمانوں کی فوج کے آگے آگے ابوسفیان رہے، ہتھیار ڈالنے کے شرائط مکہ والوں کے سامنے پیش کرے۔ اگر مسلمانوں کی مزاحمت نہ کی جائے تو حضورؐ نے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ جو شخص بھی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسے امان ملے گی۔

جو لوگ اپنے اپنے گھروں میں رہ کر اپنے گھروں کے دروازوں کو مقفل کر لیں ان کو بھی امان رہے گی۔

ان سب کو جو خانہ کعبہ میں جمع ہو جائیں امان رہے گی۔

ابوسفیان کی اجازت دی گئی کہ وہ مکہ واپس جائے اور عوام کے سامنے شرائط کا اعلان کرے۔ جب وہ مکہ واپس ہونے کے لیے کھڑا ہوا تو حضورؐ نے عباس سے آہستہ سے کہا کہ ابوسفیان کو باتوں باتوں میں اس پہاڑی کے اوپر لے جاؤ جہاں سے وہ مسلمانوں کی فوجوں کی تعداد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے تاکہ اس کی آنکھیں کھلیں۔ پہاڑی کے نیچے مسلمانوں کی فوجیں قطار در قطار گزرنے والی تھیں۔ جب ابوسفیان پہاڑی پر چلا گیا تو مسلم فوجیں اپنے علم کو لیے ہوئے ابوسفیان کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ سامنے مختلف قبیلے تھے۔ پیچھے حضورؐ تھے۔ آپ کے چاروں طرف مہاجرین اور انصار تھے۔ حضورؐ کے قریب رہنے والے زرہ بکتر اور تیر و کمان سے مسلح تھے۔

اس منظر کو دیکھ کر ابوسفیان نے عباس سے کہا "خدا کی قسم" تمہارا بھتیجہ تو اب صاحب اقتدار بن گیا ہے۔ قوت و طاقت کا سرچشمہ ہے۔"

Marfat.com

ابوسفیان مسلمانوں کی فوج کے آگے تھا مکہ میں سب سے پہلے یہی داخل ہوا۔ لوگوں کو جمع کرتے ہوئے بلند آواز سے کہہ رہا تھا "اے قریش۔ محمدؐ تو بڑی ہی قوت اور طاقت کے ساتھ یہاں آئے ہیں اب ان کا مقابلہ کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ۔"

ابوسفیان کی بیوی ہند عتبہ ابن ربیعہ کی بیٹی تھی۔ اس نے احد میں حمزہؓ کا کلیجہ چبایا تھا۔ ابوسفیان کے اس اعلان کو سن کر بھرے مجمع میں اس عورت نے چیختے چلاتے اور غصے سے کانپتے ہوئے کہنا شروع کر دیا کہ اس موٹے اور بڈھے فرتوت کی باتوں میں آپ لوگ نہ آئیں۔ آپ لوگوں کو بچانے کا اس نے خوب ڈھنگ اختیار کیا ہے۔

ابوسفیان کو دنیا بھر کی تفکرات تو تھیں ہی۔ اس کی بیوی بھی اب اس کی زندگی کو اجیرن بنانے پر تلی ہوئی تھی۔

ابوسفیان نے لوگوں سے کہا "اس عورت کے مکروفریب میں آپ لوگ نہ آئیں۔ وہ قوت و طاقت یہاں تک آ پہنچی ہے جس کی مزاحمت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جو بھی میرے گھر میں آ جائے گا اسے امان ملے گی۔ جو اپنے گھروں کے دروازوں کو بند کر لے گا اسے امان رہے گی۔ جو خانہ کعبہ میں چلا جائے گا۔ اس کو بھی امان رہے گی۔" اب لوگ منتشر ہونے لگے۔ کچھ لوگ خانہ کعبہ میں چلے گیے۔ کچھ اپنے گھروں میں چلے گئے۔

مکہ کے باہر ذوطوٰی پر جب حضورؐ پہنچے تو اپنے اونٹ کی لگام کو ایک طرف کر کے سجدے میں گر پڑے اور خدائے لاشریک کا شکر ادا کرنے لگے کہ اس نے آپ کو مخالف پر فتح عطا فرمائی۔ آپؐ نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ زبیر بن العوّام کو بائیں بازو کی فوج کی قیادت دی اس جماعت کو شمالی مشرقی رخ سے مکہ میں داخل ہونا تھا۔

سعدؓ ابن عبادہ کے تعلق ایک جماعت کی گئی، جیسے ہی یہ اپنی سواری پر سوار ہوئے

Marfat.com

رجزیہ اشعار پڑھنے لگے جن کا مطلب تھا کہ یہ دن جنگ کا دن ہے آج کوئی نرمی نہیں برتی جائے گی۔ حضرت عمرؓ نے جیسے ہی یہ اشعار سنے حضورؐ کی خدمت میں اس کی اطلاع کر دی حضورؐ نے فوراً قیادت سعدؓ سے لے کر حضرت علیؓ کے حوالے کر دی۔ حضورؐ مہاجرین اور انصار کو ساتھ لیے مکہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چوتھی جماعت کی قیادت خالد ابن ولیدؓ کے تفویض کی گئی۔ آپ کو جنوب مغرب کی طرف سے مکہ میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا اس جماعت کو چند انتہا پسندوں سے سامنا کرنا پڑا۔ ابو جہل کا بیٹا عکرمہ چند ساتھیوں کے ساتھ مزاحمت پر اتر آیا۔ اس مخالفت پر آسانی سے قابو پا لیا گیا۔ ۱۲ کے قریب لوگ اس مزاحمت میں کام آئے۔

حضورؐ نے سختی سے یہ حکم دے رکھا تھا کہ سوائے مدافعت کے کسی اور مقصد کے لیے طاقت کا استعمال نہ کیا جائے۔

ایک مختصر سی فہرست بھی تیار کی گئی تھی جس میں ان لوگوں کے نام تھے جو واجب القتل قرار دیے گئے تھے ان میں وہ دو آدمی بھی تھے جو مدینہ جا کر مسلمان ہو گئے تھے۔ اور بعد میں مکہ واپس ہو کر مرتد ہو گئے۔ واجب القتل لوگوں میں عبداللہ ابن ابی سرح کا بھی نام تھا مدینہ میں رہ کر وہ قریش کے لیے جاسوسی کرتا تھا۔ حضورؐ کی وحی کو لکھ لیتا تھا جب مکہ واپس ہوا تو ان آیات کا مضحکہ اڑایا۔

حضورؐ یوں بھی اسلام سے منحرف اور برگشتہ ہونے والوں کے لیے سخت سے سخت سزا تجویز فرماتے تھے، مرتدوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی جاتی تھی۔ اس مقررہ اصول کے باوجود رحمت عالم نے عبداللہ ابن ابی سرح کو معاف فرما دیا جب اس نے اپنے آپ کو حضورؐ کے حوالے کر دیا۔ اس فہرست میں دو پیشہ ور لڑکیاں بھی تھیں جو طنز اور مذاق کے ساتھ اسلام اور شارع اسلام کا ذکر لوگوں میں کرتی تھیں۔ حضورؐ کی طبیعت پر طنز گرا ہوا مذاق اور چھچھورا پن ہمیشہ گراں گزرتا تھا۔

Marfat.com

ایک اور آدمی جس کو امان کی فہرست سے خارج کر دیا گیا تھا وہ تھا جو اسلام کے ابتدائی دنوں میں حضورؐ کے ساتھ بے ہودگی و بدتمیزی سے پیش آتا تھا اس کا نام حارث تھا اس نے حضورؐ کی صاحبزادی بی بی زینبؓ پر سختی کی تھی۔

سہیل ابن عمر دبھی امان پانے والوں میں نہ تھا۔ یہی وہ شخص تھا جو صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ کے نام کے ساتھ رسول اللہ کے الفاظ کو دیکھنا گوارا نہ کیا تھا۔

ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کو فوراً قتل کر دینے کا حکم نافذ ہوا تھا۔ اسلام کی حالت میں یہ اپنے باپ کے نقش قدم پر تھا۔ ابوجہل جنگ بدر میں مارا گیا تھا۔

مکے کے شمال مغربی حصے میں حضورؐ کا خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ یہاں سے آپ صاف طور پر اپنی فوجوں کی نقل و حرکت ملاحظہ کر سکتے تھے۔

سورج ابھی سوا نیزے پر بھی نہیں گیا تھا کہ پورے مکہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ خاموشی کی فضا میں حضورؐ اونٹ پر سوار ہوئے۔ شہر میں تشریف لے گئے۔ خانہ کعبہ پر حاضری دی۔ اپنے اونٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی کعبہ کے سات طواف کیے۔ طواف کے دوران جب بھی آپ حجر اسود کے سامنے سے گزرتے تھے اپنی چھڑی سے حجر اسود کو چھو کر اسے بوسہ دیتے تھے۔ حرم میں آپ نے نماز ظہر ادا فرمائی۔

کہا جاتا ہے کہ اس وقت خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے۔ حضورؐ نے حکم دیا۔ کہ ان سارے بتوں کو گرا کر انہیں پاش پاش کر دیا جائے۔ آپ نے عثمان ابن طلحہ کو بلوایا۔ یہ بنی عبدالدار سے تعلق رکھتے تھے۔ خانہ کعبہ کی کنجی انہیں کے پاس رہا کرتی تھی۔ یہ خاندانی کلید بردار تھے۔ عثمان ابن طلحہؓ خالد ابن ولید اور ابن العاص تینوں ایک ہی وقت مسلمان ہوئے تھے۔

عثمان ابن طلحہ کعبہ کی کنجی لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کعبے کا دروازہ کھولا۔ حضورؐ چوکھنڈی میں داخل ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ کعبے کے اندر کی دیواروں

Marfat.com

پر مختلف تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ ان رنگ برنگ تصویروں میں حضرت عیلیٰؑ اور بی بی مریم کی بھی تصاویر تھیں۔ ایک قدیم روایت کے مطابق حضورؐ نے حکم دیا کہ سوائے حضرت عیلیٰ اور بی بی مریم کی تصویروں کے باقی تمام تصاویر کو مٹا دیا جائے۔

حضورؐ باہر تشریف لائے، مجمع کو خطاب کیا۔ ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا۔

"کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنے وعدوں کو پورا کیا۔ اپنے بندے کی مدد کی۔ ان لوگوں کو نیچا کیا جو مخالفت میں پیش پیش تھے۔"

آپ نے خون اور نسل کی بنیاد پر تفوق اور امتیاز کو ختم فرمایا۔ کعبہ کی تولیت اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمات جن خاندانوں میں چلی آرہی تھیں۔ ان ہی خاندانوں کو ان خدمات کے لیے بحال رکھا، اے قریش۔ حضورؐ نے فرمایا۔ خدا نے بے دینوں کے غرور اور تکبر کو خاک میں ملا دیا۔ آدمی آدم کی اولاد ہے۔ آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا تھا۔

اس کے بعد آپ نے سورہ الحجرات کی ۱۳ویں آیت کی تلاوت فرمائی۔

"اے لوگوں ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ تمہاری قوم اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک خدا سب کچھ جاننے والا ہے۔"

اس کے بعد آپ نے لوگوں کی طرف دیکھا۔ فرمایا کہ اے قریش۔ کہو اب تمہارا کیا خیال ہے کہ اب میں تمہارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں؟

ان میں سے بعض نے کہا کہ آپ ہمارے نیک سیرت اور نیک فطرت بھائی ہیں حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ جاؤ اب تم سب آزاد ہو۔

مکہ کے سارے لوگ حضورؐ کی وفاداری اور اطاعت کی قسم کھانے کے لیے جمع

ہوئے لوگ ایک قطار میں کھڑے ہو گئے ایک ایک کر کے ہر ایک حضورؐ کے سامنے آتا اور عہد کرتا کہ وہ خدائی قانون کی اطاعت کرے گا آپ کے ہر حکم کو بجا لائے گا۔

جب تمام مرد حلف اٹھا چکے تو عورتوں کی باری آئی، عتبہ کی بیٹی ہند یعنی ابوسفیان کی بیوی اپنے چہرہ پر نقاب ڈالے ہوئے اس کوشش میں لگ رہی کہ وہ نہ پہچانی جائے حضورؐ نے عورتوں سے خطاب فرمایا۔ آپ نے خاص طور پر عورتوں سے کہا کہ وہ وعدہ کریں کہ آئندہ سے وہ خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کریں گی۔ (اسلام نے خاص طور پر واحدنیت کا درس دیا ہے اور خدا کے واحد اور لاشریک ہونے پر مسلسل زور دیا ہے۔ مکہ کے بے دین بدنام اس لیے نہیں تھے کہ وہ بت پرست تھے بلکہ اس لیے تھے کہ وہ خدا کی ذات سے کسی اور کو بھی وابستہ کر دیتے تھے۔ ان کے ہاں ایک بہت بڑے خدا کا تصور تو تھا ہی بہت سے چھوٹے موٹے خداؤں کو بھی اپنے بڑے خدا کا شریک اور مددگار بنا دیا کرتے تھے۔)

ہند نے مجمع میں سے پکارا کہ آپ نے مردوں سے تو ایسا عہد نہیں لیا تھا یہ بدقماش عورت جس کی زندگی واقعی اب خطرے میں تھی اس موقع پر بھی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی۔ بحث کے دوران حضورؐ نے ہند کی آواز پہچان لی۔ سوال فرمایا، کیا تو عتبہ کی بیٹی ہند ہے، اس نے کہا ”جی ہاں میں ہند ہوں۔ میری التجا ہے کہ آپ میرے ماضی کو بھول جائیں میری خطاؤں کو معاف فرما دیں۔“

رحمت عالم نے فرمایا ”آج کا دن تو وہ دن ہے جس میں ماضی کو بھولنا ہی پڑے گا“ پھر آپ نے فرمایا ”جا۔ خدا نے تجھے معاف کر دیا“ حضورؐ نے اپنے خطاب کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ عورتوں کو اپنے کمسن بچوں کی جان نہیں لینی چاہیئے۔ کمسن لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کی جو رسم تھی۔ غالباً یہ اشارہ اسی طرف ہے۔

”ہم نے اپنے بچوں کو پال پوس کر چھوٹے سے بڑا کیا۔ جب وہ بڑے ہو گئے تو

Marfat.com

آپ نے بدر میں انہیں جان سے مار ڈالا' اُن نے پھر ان الفاظ سے حضورؐ کے بیان میں مداخلت کی۔

حضورؐ نے عورتوں سے فرمایا کہ اس بات کا عہد کریں کہ وہ آپ کے احکام کی تعمیل کریں گی۔ آپ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس بات کا عہد لیں۔ آپ نے کسی بھی بیعت میں یا کسی بھی عہد کے وقت کسی بھی عورت کے ہاتھ کو چھوا نہیں۔ صرف آپ کی ازواج اور آپ کی صاحبزادیاں اس شرف سے مشرف رہیں۔

ہند کا گستاخانہ طرزِ زندگی اور طرزِ گفتگو اور اسی قسم کے کئی واقعات یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی کی عربی معاشرت میں عورتیں کتنا بھرپور حصہ لیتی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ حضورؐ نے عورتوں کی بے لگام آزادی پر چند بندشیں ضرور عاید کیں ہیں۔

کئی ایک مسلم روایات ایسی ہیں جن میں عورتوں کا مردوں سے آزادانہ اختلاط بیان کیا گیا ہے بلا کسی شرم و حیا کے عورتیں مردوں کی محفلوں میں لطف اندوز ہوتی تھیں۔ جہاں کہیں عورتوں کی بے لگام آزادی اور بے راہروی کا ذکر آیا ہے وہاں صاف طور پر بتلا دیا گیا ہے کہ یہ واقعات اس وقت کے ہیں جبکہ عورتوں کے لیے پردہ کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے ان سب باتوں کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ نے عورتوں پر جو پابندیاں عاید فرمائیں ان کی نوعیت سخت نہیں ہے بلکہ ان پابندیوں میں عورتوں کے لیے آسانیاں فراہم کی گئی ہیں کم و بیش یہ پابندیاں اسی نوعیت کی ہیں جیسی ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں انگلستان کی عورتوں پر تھیں۔

مثال کے طور پر حضورؐ کے انتقال کے بعد حضورؐ کی چہیتی بیوی بی بی عائشہؓ نے ایک جنگ میں حصہ لیا تھا۔ میدان جنگ میں اپنے اونٹ پر سوار تھیں۔

ایک نکتہ ایسا ہے جو تجسس کا باعث بننے کے باوجود معترضین کے لیے زیادہ قابل

Marfat.com

توجہ نہیں رہا کہ وہ حضورؐ کا جنت کے متعلق بیان ہے

آپ نے فرمایا کہ ہر مسلمان جب وہ دائمی اور سدا بہار گلشن میں قدم رکھیگا تو اس کا استقبال کالے آنکھوں والی دو نوجوان اور خوبصورت حسین و جمیل لڑکیاں کریں گی۔ اگر مسلمان سب کے سب جنت میں داخل ہو جائیں تو ان کی بے چاری بیویوں کا کیا حشر ہوگا جب کہ ان عورتوں سے بھی جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی صراحت کہیں نہیں ملتی۔

عورتوں کے تعلق سے اسلام نے جو رویہ اختیار کیا اور جو رویہ مغربی دنیا نے اختیار کر رکھا ہے اس میں بنیادی طور پر عورتوں اور مردوں کو جنس کی بنیادوں پر اتنا تقسیم نہیں کیا گیا ہے جتنا ان دونوں کے درمیان بنیادی اختلافات وجہ تنزلی بنے

مرد اور عورت بالکلیہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہی بنیادی اختلاف، ان دونوں کو اس بات کی طرف راغب کرتا ہے کہ وہ ایک جوڑے کی صورت میں زندگی کی تشکیل کریں۔ یقیناً یہ بات مضحکہ خیز ہوگی اگر کہا جائے کہ عورت مرد کے برابر نہیں محض اس لیے کہ پارلیمنٹ میں عورتوں کی تعداد کم ہے یا فوج میں بڑے عہدوں پر عورتیں کم فائز کی جاتی ہیں یا مردوں کو محض اس وجہ سے عورتوں کے برابر نہ قرار دیا جائے کہ وہ بچوں کی دیکھ بھال بہتر طریقے سے نہیں کر سکتے یا ان کو کپڑے سینا برابر نہیں آتا۔

قصہ مختصر یہ کہ اسلام نے زندگی کی تشکیل میں مردوں اور عورتوں کے درمیان نظریاتی حد فاصل کھینچی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام نے ان دونوں کے درمیان ایک فرق محسوس کیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ عورتیں اپنی جسمانی اور طبعی کمزوریوں کے باعث ہمیشہ مردوں کا آلۂ کار بنی رہیں۔ مرد نے عورت کا استحصال خوب کیا ہے۔ مغربی دنیا نے مسلم معاشرت میں عورت کے مقام کو سمجھنے میں غلطی کی ہے اور اس کے مقام کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔

پر امن طریقے سے مکہ کا حصول حضورؐ کی فاتحانہ روش کی معراج تھی اس پر عظمت فتح

Marfat.com

نے ہمارے لیے یہ موقع فراہم کیا کہ ہم حضور کے لائحہ عمل اور طریقہ کار کا مختصر طور پر جائزہ لیں
سب سے پہلی بات یہ ہے کہ حضورؐ کو ہر مقام پر صرف کامیابیوں ہی سے سابقہ نہیں
پڑا بلکہ آپ کی ناکامیاں ہمیشہ آپ کی کامیابیوں کے ہم رکاب رہیں۔

احد کی شکست نے بدر کی کامیابی کی جگہ لی۔ حدیبیہ کی صلح جو بظاہر ایک فوجی شکست
معلوم ہوتی ہے خیبر کی فتح کا باعث بنی۔ موتہ کی جنگ شکست کا عنوان بنی۔ اس کے
برعکس حضورؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے یکے بعد دیگرے
فتوحات کا رخ اپنی طرف موڑ لیا۔ صرف قریش یا بنی غطفان پر ہی فتح نہ پائی بلکہ بیزنطینی
اور ایرانی فوجوں کے مقابلے میں کامیاب ہوئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضورؐ کی بالآخر فتح آپ کی فوجی کامیابیوں کی رہین
منت نہیں تھی بلکہ اس فتح میں آپ کی عظیم شخصیت پنہاں تھی۔ اس زمانے میں قیادت کے
لیے ہم مرد آہن کو تلاش کرتے ہیں، مرد آہن اور قیادت لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں۔

حضورؐ فطری طور پر بہت ہی نرم مزاج تھے۔ آپ کو جو نعمت خداداد ملی تھی۔ وہ یہ
تھی کہ آپ لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے تھے۔ عقیدت و محبت سے لوگوں کے دل حضورؐ
کی طرف جھک جاتے تھے۔

ہم نے شاید ہی یہ پڑھا ہو کہ حضورؐ نے کبھی بھی جابرانہ اور حاکمانہ طریقہ اختیار کر کے
کسی کو کچھ کرنے کا حکم دیا ہو۔ اپنا حکم نہ ماننے پر کسی کو کبھی کوئی سزا دی ہو۔

اکثر و بیشتر آپ اپنے اصحاب سے مشورہ کرتے تھے۔ اگر کسی مسئلہ میں وحی کا
نزول نہ ہوتا تو آپ اپنے قریبی صحابہ کے مشورہ کو قبول فرماتے تھے۔ یہی وہ واحد طریقہ
تھا جس کے ذریعہ سے عربوں کی وفاداریوں کو مستقل اور پائندہ طریقے سے حاصل کیا جا سکتا
تھا۔ عرب کے عمر رسیدہ اور تجربہ کار لوگ جابرانہ حکم ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے
تھے۔ ہاں اگر ان سے مدد کی درخواست کی جاتی تو وہ ہر قسم کی مدد دینے میں خوشی
محسوس کرتے تھے۔ یہ خصوصیت جو آج بھی مرکزی عرب کے لوگوں کا خاصہ ہے۔

Marfat.com

شام اور عراق کے لوگوں پر بھی اثر انداز ہوئی۔ اگر ان سے جذباتی طور پر کسی قسم کی درخواست کی جائے تو آج بھی یہ لوگ اس درخواست پر غور کرنے اور اس کا عملی طور پر خیر مقدم کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

گولڈ زی ہر نے شراب کے امتناع کا ذکر کرتے ہوئے عربوں کی نبض شناسی کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ عربوں نے شراب کی لذت سے اس لیے گریز نہیں کیا کہ انہیں اس کی وجہ سے قید و بند کا ڈر تھا۔ انہوں نے شراب نہ پینے میں اپنی بہتری سمجھی۔ رضا کارانہ طور پر شراب سے اجتناب کیا۔ جب کبھی ان کو سزا کا ڈر یا خوف دلایا گیا۔ انہوں نے اس کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ دوسری اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ مسلم مورخین نے حضورؐ کے انتقال کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد حضورؐ کے حالات قلمبند کیے جس زمانے میں ان لوگوں نے یہ حالات لکھے وہ زمانہ عیش و عشرت اور خوش حالی کا زمانہ تھا۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو عربی النسل نہیں تھے۔ عربوں کی اولاد نہیں تھے جن لوگوں کی تاریخیں ہم تک پہنچتی ہیں ان میں اکثر یا تو ایرانی تھے یا یونانی، مصری تھے یا اسپین کے۔ ان کا مادری تعلق تو اپنی جائے پیدائش سے تھا لیکن تعلیم اور معاشرت میں وہ ضرور عربی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس وقت جبکہ یہ "عرب" مورخین علم و فضل کے دریا بہا رہے تھے "عرب قبیلے جو اسلام کی جان تھے" جو اسلام کی اصل تھے جو اسلام کے لیے ایک خام پیداوار کی حیثیت رکھتے تھے۔ بغداد کی مسلم شہنشاہیت کے عتاب کا شکار تھے۔ چور اور ڈاکوؤں کا لقب انہیں دیا جا چکا تھا۔ ہر ایک طرف سے یہ دھتکارے جا رہے تھے۔ بعد میں مغربی مصنفین اور مورخین نے جو کچھ بھی اخذ کیا اور اپنی کتابوں میں پیش کیا۔ وہ وہی تھا جو "عرب" مورخین کے قلم سے نکل چکا تھا۔ اب اگر کوئی مغربی مورخ کو نشانہ ملامت بنائے تو اس کی اپنی مرضی۔

اس کتاب کی ترتیب کے پیچھے جو جذبہ کار فرما رہا وہ یہ تھا کہ میں اپنے ذاتی تجربات کا نچوڑ آپ کے سامنے پیش کردوں۔ میں برہا برس ان لوگوں کے ساتھ رہ

Marfat.com

چکا ہوں جو شکستہ حال ہیں، بوسیدہ اور پھٹے ہوئے خیموں میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے جس بات کا میں نے پتہ چلایا وہ یہ کہ باوجود پریشان حالی کے ان پر روحانی اور مذہبی پیغام جلد اثر کرتا ہے۔ جب میں پڑھتا ہوں کہ حضورؐ کی مخاطبت اور تبلیغ کے وقت قبیلوں کے لوگ اشکبار ہو جایا کرتے تھے کہ ان کی داڑھیاں تر ہو جاتی تھیں تو اس میں نہ مجھے مبالغہ آرائی نظر آتی ہے اور نہ ہی شاعرانہ تعلی۔

میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں کہ یہ لوگ کس طریقہ سے دوسروں کے دیکھے اور کہے سے متاثر ہوتے ہیں اور آپ بیتی تو دور کی بات ہے پر بیتی پر ان کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

جب ایک بار ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ قبیلوں کے لوگ مذہب کے معاملے میں بڑے ہی جذباتی اور حساس واقع ہوئے ہیں تو یہ بات خود بخود سمجھ میں آنے لگتی ہے کہ حضورؐ کی فتح مندیاں اور کامیابیاں آپ کی اسی تبلیغ کا نتیجہ تھیں۔ جن میں روحانیت سے اپیل کی گئی تھی، جس میں دوسروں کے واقعات کو سبق آمیز طریقے سے پیش کیا گیا تھا۔

یہ کامیابیاں اس وجہ سے نہیں تھیں کہ حضورؐ لوگوں کو لالچ دے کر یا ڈرا دھمکا کر اسلام کی طرف راغب کرتے تھے۔ اس قسم کا الزام لگانے والے کہتے ہیں کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ساتویں صدی کے عرب غافل تھے، اخلاقی اقدار کو پامال کرتے تھے لاقانونیت کا شکار تھے تو اس بات کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کی وفاداری اور شرافت کو حاصل کرنے کے لیے حضورؐ نے یا تو رشوت ستانی کا بازار گرم کیا ہوگا یا عوام الناس کا بے بہا خون بہایا ہوگا۔ اس قسم کی خرافات کا بکنا ہرزہ سرائی نہیں تو اور پھر کیا ہے۔

”عرب“ مورخین نے اپنے پیغمبر کے تعلق سے جو شگوفے چھوڑے ہیں ان میں اس ذات اقدس کو اونٹوں کی چوری کے الزام میں تک ملوث کیا ہے۔ انہیں

Marfat.com

سے استفادہ کرتے ہوئے پروفیسر مارگولیث نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ میری نظر میں اس قسم کی باتیں سراسر بکواس ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ کی تعلیمات میں دنیا اور دین دونوں شامل ہیں۔ دین کی نعمتوں کے ساتھ جنت کی مسرت اور شادمانی بھی رکھی گئی۔ شاید اسی کو پیش نظر رکھ کر اسلام کے موجودہ محافظ یہ کہتے ہیں کہ عملی طور پر دین اور دنیا کا امتزاج بہتر ہے بہ نسبت انجیل کی تعلیم کے جو خودی کی فنا پر مشتمل ہے۔

کیا یہ سوچنا غلط ہو گا کہ حضورؐ نے بعض اوقات اپنے مذہب کے قبول کرنے والوں کے جذبہ قربانی کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔

آپ نے ترک دنیا اور رہبانیت کی مخالفت کی۔ اعتدال پسندی کا مشورہ دیا اس کے باوجود اس وقت سے لے کر آج تک بے شمار اور ان گنت مسلمانوں نے اپنی خوشی سے دنیا کی ہر لذت کو ٹھکراتے ہوئے عسرت اور فلاکت کی زندگی کو ترجیح دی۔

حضورؐ کے روحانی پیغام کے تعلق سے جو بھی انداز فکر اختیار کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضورؐ نے سیاست، حکمت عملی اور معاملہ فہمی کے عناصر کو اپنے روحانی پیغام سے وابستہ کیے رکھا۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ جنگوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ آخری حربے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ مخالفین سے گفت و شنید کے خواہاں رہتے تھے۔ بحث و مباحثہ اور بات چیت کے ذریعہ لوگوں کو اپنے پیغام سے واقف کرواتے تھے۔

یہ آپ کے سیاسی تدبر ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے مکہ کے لوگوں کو اپنی طرف کرنے کے لیے عمرے کا ارادہ کیا۔ بہ نفس نفیس خود مکہ تشریف لے گئے۔

حضورؐ کی بہت سی خصوصیات جن میں سخاوت، شائستگی، بہادری اور قول و فعل کا تطابق شامل ہیں۔ صرف آپ ہی کی ذات سے وابستہ نہیں تھیں۔ بلکہ یہ خصوصیات

Marfat.com

عرب معاشرے کا جزو تھیں، عربوں کی یہ قومی صفات تھیں۔ انہیں مشترکہ اقدار کی حامل حضورؐ کی ذات گرامی بھی تھی۔

زید بن حارثہؓ کی بیٹی کا روتے ہوئے آکر حضورؐ کی گود میں بیٹھ جانا، اپنے باپ کی موت پر آنسو بہانا، حضورؐ کا اس کے غم میں شریک ہونا، خود حضور کی آنکھوں میں آنسو آ جانا ایک واقعہ سہی لیکن اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ سارے عرب بچوں سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔ بچوں سے محبت اور پیار ان کی قومی خصوصیت ہے۔

حضورؐ میں بلا کی کشش اور جاذبیت تھی۔ آپ کی بذلہ سنجی، آپ کی شگفتہ مزاجی آپ کا شائستہ مذاق، افراد خاندان سے محبت، اپنے اصحاب سے حسن اخلاق، صحابہ کی باتوں سے لطف اندوزی، ہر ایک سے برادرانہ اور مساویانہ سلوک، لطف و محبت سے اپنے قریبی لوگوں کو اپنے دیے ہوئے نام سے پکارنا، مخلصین سے مشورہ۔ حضورؐ کے اوصاف حسنہ تھے۔ ساتھ ہی اسی قسم کی خصوصیات مرکزی علاقوں میں رہنے والے عربوں کی زندگی کا خاصہ تھیں۔

عربوں کا روایاتی سماجی ڈھانچہ کچھ اس طریقے سے ڈھالا گیا تھا کہ اس میں بزرگ خاندان کی بڑی ہی عزت و توقیر ہوا کرتی تھی۔ اس نظام میں سب سے پیاری بات یہ تھی کہ بزرگ خاندان کسی امیر مالدار یا اونچے گھرانے سے نہیں چنا جاتا تھا۔ صرف خونی رشتہ ہی اس کی عظمت اور بزرگی کے لیے کافی ہو جاتا تھا۔ اس روایت نے ایک ایسے نظام کو جنم دیا تھا۔ جس میں عزت اور اقتدار اور سماجی مساوات کا آپس میں گٹھ جوڑ ہو گیا تھا۔ یہ طریقہ انسانیت کو نکھارتا تھا۔ اور انسانی عظمت کو اجاگر کرتا تھا۔ اس شخصی عنان حکومت میں قبیلے کے افراد شطرنج کے مہرے بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور قدم قدم پر سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہیں، انسانی مساوات اور اس کی تشکیل لاکھ درجے بہتر تھی۔

سراپا لطف و کرم ہونے کے باوجود ہم حضورؐ کو غیض غضب سے بھرپور بھی دیکھتے ہیں۔

Marfat.com

بنی قریظہ کے سات سو آدمیوں کا صفحہ ہستی سے مٹ جانا اس کی ایک مثال ہے۔ عرب شہزادوں کی داستانوں میں شاید اس قسم کی مثال مل جائے لیکن قبیلہ وارانہ جنگوں میں اتنے سارے لوگوں کا ایک ساتھ ختم کیا جانا اپنی مثال آپ ہے۔

ڈاکٹر منٹگمری واٹ کے اس بیان سے مجھے اختلاف ہے کہ قبیلہ وارانہ جنگوں میں جائز و ناجائز کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قبیلہ وارانہ جنگوں میں قتل عام نہیں ہوا کرتے تھے وارداتیں ہوا تو کرتی تھیں لیکن ان کی نوعیت جداگانہ ہوا کرتی تھی۔ لوگ مرتے بھی تھے۔ اور مارے بھی جاتے تھے تعداد کے لحاظ سے ایسے واقعات اگر ہوئے بھی ہوں تو ایک محدود پیمانے پر۔ چونکہ قبیلوں کی جنگیں ہمیشہ ہوا ہی کرتی تھیں۔ اس لیے قتل کرنے والے کو اس وقت تک بخشا نہیں جاتا تھا جب تک کہ مقتول کا بدلہ نہ لے لیا جائے۔

میں صدق صد یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ قبیلہ وارانہ جنگیں بھی اصول پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔ ایک قبیلے والوں کا دوسرے قبیلے والوں کو سرے سے نیست و نابود کر دینے کا طریقہ تو ان کے پاس تھا ہی نہیں۔ اسلام کے ظہور سے صدیوں سال قبل سے لے کر آج ہمارے اپنے زمانے تک جو قتل عام ہوئے ہیں اگر ان کی بنیادی وجہ تلاش کی جائے تو سیاسی اقتدار کا حصول اس کا پس منظر ہوگا یا پھر مذہب کے نام پہ انسانیت کا خون بہتا نظر آئے گا۔ قبیلہ واری جنگوں میں قتل عام کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

بنی قریظہ کے قتل عام کا جواز بظاہر تو کوئی نظر نہیں آتا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ لڑائی کی بہ نسبت تدبر کو اہمیت دیتے تھے۔ آپ نے مکہ کی فتح کے وقت جس رحم و کرم اور فیاضی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ تاریخ کا سنہری باب ہے اور اپنی مثال آپ ہے۔ اپنے کٹر سے کٹر دشمن کو بھی آپ ہمیشہ معاف کرتے رہے۔ اس وقت بھی آپ نے معاف کیا جبکہ دشمن نہ صرف آپ کے نرغے میں تھا بلکہ آپ کے بس میں تھا۔ دشمن کی دشمنی کو نظر انداز کر دینا اور اسے معاف کر دینا ہمیشہ سے آپ کا شیوہ رہا۔ حضورؐ کے طریقہ کار کو مختصر طور پر

Marfat.com

یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے کوشش کی کہ تمام لوگوں کو تمام چیزیں دی جائیں ۔ جو جس کا اہل ہے اس سے ویسا ہی سلوک ہو۔ جو لوگ آپ کے روحانی پیغام کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ ان کو اسلام کی نعمت سے نوازا۔ جن کو دنیا عزیز تھی ۔ ان کو انعامات واکرامات سے خوش کیا۔ اس پر بھی وہ صحیح راستے پر نہ آئے تو ڈرا دھمکا کر انہیں اپنے راستے پر لائے۔ جو باغی اور غدار تھے ان کے ساتھ سختی کی گئی۔ مگر عام طور سے یوں ہوا کہ باغیوں اور غداروں کو بھی معاف کر دیا۔

Marfat.com

یادگار تاریخیں

حضورؐ کی پیدائش	۵۷۰ء
بعثت	۶۱۰ء
مدینہ کو ہجرت	۶۲۲ء
جنگ بدر	۶۲۴ء
جنگ احد	۶۲۵ء
جنگ خندق	۶۲۷ء
صلح حدیبیہ	۶۲۸ء
عمرہ کی ادائیگی	۶۲۹ء
مکہ پر قبضہ	۶۳۰ء

Marfat.com

یومِ حنین

مکہ پر قبضہ کرنے سے بہت ہی پہلے اگرچہ ایک ایسی فہرست تیار کر لی جا چکی تھی۔ جس میں ان لوگوں کے نام تھے جو قتل کیے جانے کے قابل تھے لیکن رحمت عالم نے سوائے چار کے باقی سب کو معاف کر دیا۔

عکرمہ ابوجہل کا بیٹا تھا حضورؐ سے دشمنی اسے ورثے میں ملی تھی فتح کے بعد یمن بھاگ گیا عکرمہ کی بیوی نے درخواست کی کہ اس کے شوہر کو معاف کر دیا جائے۔ حضورؐ نے عکرمہ کو بھی معاف فرما دیا۔ عکرمہ کی یہ بہادر عورت اپنے شوہر کو اپنے ساتھ مکہ واپس لائی۔ تین سال بعد اسی عکرمہ نے مسلم فوجوں کی قیادت کی۔

اُمیہ ابن خلف بدر کی جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اسی کا بیٹا صفوان مکہ سے فرار ہو گیا جدہ میں روپوشی اختیار کی۔ موقع کی تلاش میں تھا کہ اسے کوئی جہاز مل جائے اور وہ سمندر پار کسی جگہ چلے جائے۔ اس کا ایک جگری دوست حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور صفوان کے لیے سفارش کی۔ حضورؐ نے اسے بھی معاف کر دیا۔ صفوان جہاز میں سوار ہونے ہی والا تھا کہ اس کے دوست نے اس کی جان کی سلامتی کی خوش خبری سنائی

مکہ کی فتح کے بعد حضورؐ کے اس لطف و کرم نے مکہ کے تمام لوگوں کو آپ کا گرویدہ بنا دیا۔ اب عزت و احترام کے ساتھ لوگوں کی نظریں حضورؐ کی طرف اٹھنے لگیں۔

مکہ جیسے ہی فتح ہوا بتوں کی خرابی آ گئی۔ ہر طرف بت شکنی ہونے لگی۔

Marfat.com

جہاں بھی کوئی بت نظر آتا توڑ دیا جاتا تھا۔ مکہ کے بہت سے خاندان ایسے تھے جن کے اپنے مخصوص خدا ہوتے تھے۔ ان خداؤں کے بارے میں ان کے اپنے مخصوص عقیدے اور نظریات ہوا کرتے تھے۔ ان کے اپنے ذاتی خدا ان کے گھروں کی زینت تھے۔ گھر کی آرائش و زیبائش میں مختلف بت استعمال ہوتے تھے۔

ان تمام بتوں کو پاش پاش کرنے کا حکم دیا گیا تو اس کی بڑی حد تک تعمیل ہوئی۔ مسلمانوں کے خوف و ڈر کی وجہ سے بہت سے بت توڑ دیے گئے۔ ان کے توڑے جانے کی دوسری وجہ یہ بھی کہ انہوں نے عملی طور پر اپنے بتوں کو بالکل بے کار اور ناکارہ پایا۔ ان پر اتنی بڑی مصیبت آئی۔ سارا مکہ مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے باوجود ان کے پتھر کے صنم اپنی جگہ بیٹھے خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ دوسروں کو بچانا تو کجا اپنی آپ بھی حفاظت نہ کر سکے۔ بتوں کی یہ بے حسی اور عمل کے فقدان نے مکہ والوں کو اور زیادہ بتوں کا دشمن بنا دیا اور وہ اپنے ہاتھوں سے بتوں کو توڑنے لگے۔

آس پاس کے قبیلوں میں بھی مسلمان مبلغ بھجوائے گئے۔ تاکہ ان لوگوں کو بھی ترغیب دی جائے کہ وہ بتوں سے باز آجائیں۔ اپنے بت خانوں کو ٹھکانے لگا دیں۔ ان ہی روانہ کردہ جماعتوں میں سے ایک جماعت کی قیادت خالد ابن ولیدؓ نے کی، خالد ایک کامیاب جنرل تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ سخت مزاج، تشدد پسند اور دشمنوں کے خون کے پیاسے تھے۔ ان کو مکہ کے جنوب مغرب میں بنی کنانہ کی ایک شاخ بنی جزیمہ کو راہ راست پر لانے کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔

اس واقعہ سے بہت برسوں پہلے کی بات ہے کہ بنی جزیمہ کے کچھ لوگوں نے خالد کے چچا کو قتل کر دیا تھا جبکہ وہ تجارت کے سلسلے میں یمن سے واپس ہو رہے تھے۔ غالباً حضورؐ اس سانحے سے لاعلم تھے۔ اس بات سے بھی حضورؐ ناواقف تھے کہ خالد کے دل میں اپنے چچا کے قتل کا بدلہ لینے کی آگ سلگی ہوئی تھی۔ خالد صرف موقع کی تلاش میں

Marfat.com

تھے۔ وہ وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ کہ کب موقع ملے اور کب وہ اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کریں۔ حضورؐ نے روانگی سے قبل خالد کو یہ تاکید کر دی تھی کہ جہاں تک ہو سکے خون خرابے سے احتراز کیا جائے۔

جب خالد بنی خزیمہ کے ہاں پہنچے تو انہوں نے قبیلے سے درخواست کی کہ اب حضورؐ کی مخالفت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ ہر ایک نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم لوگ بھی ہتھیار ڈال دو۔ مقابلے کی جرأت نہ کرو۔ جب انہوں نے خالد کے حکم کی تعمیل کر دی اور اپنے اپنے ہتھیار ڈال دیے تو خالد نے ان میں سے چند آدمیوں کو پکڑ کر ان کے ہاتھوں کو ان کے گلے کے پیچھے باندھ دیے۔ دوسروں کو حکم دیا کہ وہ ان بندھے ہوئے لوگوں کا سر قلم کر دیں۔ اس طریقے سے خالد نے اپنے چچا کے قتل کا بدلہ لے کر اپنی تسلی اور تشفی کا سامان کر لیا۔

حضورؐ کو جب خالد کی ان حرکتوں کی اطلاع ملی تو آپ کو سخت ناگوار گزرا۔ حرم کعبہ میں کھڑے ہو کر حضورؐ نے اپنے دونوں ہاتھ اونچے کیے۔ اپنے سر کو بلند کر کے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا "اے میرے اللہ میں بے گناہ ہوں۔ خالد نے جو کچھ بھی کیا ہے اس کی ذمہ دار مجھ پر نہیں۔ حضرت علیؓ کو ایک بھاری رقم دے کر فوراً بنی جزیمہ کے پاس روانہ کیا گیا تاکہ مقتولین کے ورثاء کو قصاص کی رقم دی جائے۔ جن کے قرابت دار مارے گئے تھے یا جن کی املاک کو نقصان پہنچایا گیا تھا ان میں کے ہر ایک فرد کو مقتول کا معاوضہ دیا گیا۔ نخلہ کے مقام پر العزیٰ بت کا عبادت خانہ تھا۔ اس کو مسمار کرنے کے فرائض بھی خالد کے ذمے کیے گئے۔ بنی سلیم کو اطلاع ملی کہ مسلمان بت خانے کی تباہی کے لیے آ رہے تھے تو ان مجاوروں نے اپنے بت العزیٰ کے گلے میں ایک تلوار لگا دی اور بت سے کہا کہ اپنی حفاظت آپ کر لے۔ ساتھ ساتھ بت خانے کی مدافعت کرے اور خالد کا خاتمہ کر دے۔ بت کے ذمے یہ فرائض سونپ کر سارے مجاوران کرام اونچی پہاڑی پر چلے

Marfat.com

گئے تاکہ اپنے بت اور خالد کی لڑائی کا نظارہ کر سکیں۔

العزیٰ بت ہی تو تھا۔ بتوں نے کس کا مقابلہ کیا ہے جو خالد کا کرتے۔ خالد آتے ہیں اور العزیٰ بت کو پاش پاش کر دیتے ہیں۔

جب ہوازن نے یہ سنا کہ مسلمانوں نے مکہ کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے تو ان میں سے کچھ لوگوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں سے لڑنا چاہیئے۔ بنی نصر کا سردار مالک ابن عوف مسلمانوں کی مزاحمت کی تحریک میں بہت آگے آگے تھے۔ ثقیف کے لوگوں نے جن میں بہت سے طائف کے لوگ شریک تھے۔ مسلمانوں کے خلاف لڑنے پر رضامندی ظاہر کی۔ جو لوگ اس مقصد کے لیے اکٹھے ہوئے ان میں ایک درید ابن صمّہ بھی شامل تھا۔ جب یہ نوجوان تھا مسلمانوں کے خلاف ایک لڑائی میں حصہ لیا تھا۔

ہوازن کے سردار مالک ابن عوف نے تجویز پیش کی۔ کہ سارے قبیلے جب جنگ کے لیے تیار ہوں۔ تو ان کو چاہیے کہ اپنے بیوی بچوں اور مویشیوں کو اپنے ساتھ رکھیں اس کا منشا یہ تھا کہ چونکہ عورتیں مردوں کو بہادری سے لڑنے کے لیے اکساتی ہیں اور جوش دلاتی ہیں اس لیے عورتوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مردوں کی ہمتیں بلند رہیں گی۔ عرب خانہ بدوشوں سے لے کر اس صدی کی ابتدا تک اہم مواقعوں پر اسی اصول پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اگر سپاہیوں کو یہ احساس رہے کہ ان کی شکست کی وجہ سے ان کے بیوی بچے، مال جائداد اور سارا اثاثہ دشمن کی نذر ہو جائے گا۔ تو وہ میدان جنگ میں دل کھول کر اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں۔

درید ابن صمہ اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ اسے گھاس پھوس کے بستر پر لٹا کر مجلس مشاورت میں لایا جاتا ہے۔ مالک ابن عوف کی پیش کردہ تجویز کی وہ مخالفت کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہوازن کے قبیلوں کے لوگوں کی تعداد مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت ہی کم اور نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر گھمسان کی لڑائی ہونے کا امکان ہے تو بہتر یہ ہے کہ مسلمانوں

Marfat.com

سے مقابلہ گھوڑوں پر بیٹھ کر کیا جائے۔ یہ لڑائی اس صورت میں بہتر طریقے سے لڑی جائے گی جبکہ عورتوں اور بچوں کو کسی پہاڑی مقام پر بھجوا دیا جائے۔ جہاں وہ محفوظ حالت میں رہ سکیں۔ مالک ابن عوف ایک نوجوان آدمی تھا۔ بپھر کر کہتا ہے "تو بڑھاپے سے تمہاری عقل سٹھا گئی ہے۔ تم مخبوط الحواس معلوم ہوتے ہو۔ میں تمہاری بات ماننے والا نہیں ہے" ہوازن کے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میرا اتباع کرو، ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔

مسلمان سراغ رساں کو ان لوگوں کے درمیان بھجوا دیتے ہیں۔ وہ کئی دن تک ان کے ساتھ رہتا ہے۔ تمام حالات سے حضورؐ کو آگاہ کرتا رہتا ہے۔ مکہ سے آئی ہوئی مسلمانوں کی ایک عظیم فوج حضورؐ کے ساتھ تھی۔ آپ نے خیال کیا کہ کیوں نہ ان قبیلوں کو بھی ان کی سرکشی کا مزہ چکھایا جائے۔

اگر مالک ابن عوف میں تھوڑی بہت بھی عقل ہوتی تو اس نے حضورؐ کے مدینہ واپس جانے کا انتظار کیا ہوتا۔ مدینہ جانے کے بعد ساری فوج بکھر گئی ہوتی۔ آپ کے لیے یہ مشکل ہو جاتا کہ پھر سے اتنی بڑی فوج کو جنگ کے لیے فوراً تیار کریں۔

ان حالات میں حضورؐ نے ہوازن سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ غالباً جنوری کے اواخر یا جنوری یا فروری ۶۳۰ء کے اوائل میں مسلمان مکہ کو چھوڑ کر مشرق کی طرف روانہ ہوئے۔ مکہ میں مسلمانوں کا قیام تقریباً دو ہفتے رہا کہا جاتا ہے کہ اس وقت حضورؐ کے ساتھ دس ہزار مسلمان تو وہ تھے جو مدینہ سے مکہ آئے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ دو ہزار مسلمان وہ تھے جو مکہ کی فتح کے بعد مسلمان ہوئے تھے ان بارہ ہزار مسلمانوں کے مقابلے میں ہوازن کے صرف چار ہزار آدمی میدان میں آئے۔

دوسرے یا تیسرے دن صبح صبح مسلمانوں کی فوجیں اس مقام پر پہنچیں جو حنین کے نام سے موسوم تھی۔ اس وادی کے اطراف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ ان پہاڑیوں کی دوسری طرف گہرے غار تھے یا پھر چند ایک چھوٹی چھوٹی وادیاں۔

Marfat.com

ہوازن کے لوگ رات میں اس مقام پر جا کر قریب کی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گئے مسلمانوں کی فوجیں جب وادی میں پہنچ رہی تھیں چھپے ہوئے دشمنوں نے ان پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ مسلمان اس بات سے لاعلم تھے کہ دشمن پہاڑیوں کے پیچھے چھپے بیٹھے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ تو علم تھا کہ دشمن ان کے قریب ہے لیکن انہوں نے یہ زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ کسی بدری جاسوس کو اطراف میں روانہ کر کے دشمن کے صحیح محل وقوع کا پتہ چلاتے۔ مسلمانوں نے کسی پیش رو دستے کو بھی وہاں نہیں بھجوایا تھا۔ جو فوجیں سامنے تھیں اس اچانک حملے سے ان میں ابتری پھیل گئی۔ وہ وادی کے اسی راستے پر جان بچانے کے لیے بھاگتی رہیں۔ جدھر سے ہو کر وہ ابھی آئی تھیں۔ جو فوجیں ان کے پیچھے آ رہی تھیں۔ وہ بھی سراسیمہ ہو گئیں۔ حضورؐ اور حضورؐ کے منفر بین خاص بیچ راستے میں پھنس گئے۔ ایک طرف سے مسلسل فوجیں آ رہی تھیں دوسری طرف سے فوجیں دہشت زدہ ہو کر سراسیمگی کی حالت میں واپس دوڑ رہی تھیں۔ حضورؐ کسی طرح وادی کے ڈھلوان حصے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اونچے مقام پر آپ کھڑے ہو گئے جہاں سے فوجوں کی نقل و حرکت کو ملاحظہ کر سکیں آپ کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ اور حضرت زید ابن حارثہؓ کے بیٹے اسامہ تھے۔ حضورؐ نے فوجوں کو مخاطب کر کے فرمایا" لوگو۔ تم کہاں جا رہے ہو۔ میرے اطراف جمع ہو جاؤ۔ اے مدینے کے لوگو۔ خدا کا پیغمبر تو یہاں کھڑا ہوا ہے۔ اے انصار۔ اے بیعت رضوان میں حصہ لینے والو"

بوڑھا ابوسفیان جو حضورؐ کی مصاحبت میں تھا۔ حضورؐ کی اس پریشانی کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوا جا رہا تھا۔ اُس نے سرگوشی کرتے ہوئے اپنے ایک ہم مشرب سے کہا "مسلمانوں کے فرار کو سوائے سمندر کے اب کوئی اور نہیں روک سکتا۔" ہوازن کا پلہ بھاری تھا۔ مسلمانوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ مسلمان بے تحاشہ

Marfat.com

اپنی جان بچانے کے لیے جو طرف بھاگ رہے تھے۔ ایک آدمی اونٹ پر بیٹھا ہوا کالے جھنڈے کو اپنے ایک ہاتھ میں تھامے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں نیزہ اٹھائے ہوئے مسلمانوں میں خوف و ہراس پھیلا رہا تھا۔ حضرت علیؓ ابن ابی طالب نے جب یہ دیکھا تو فوراً اس کا تعاقب کیا۔ اس کے اونٹ کو لنگڑا کر دیا۔ جیسے ہی لنگڑا اونٹ گرا ساتھ ہی سوار زمین پر گر پڑا۔ قبل اس کے کہ وہ زمین پر سے اٹھے مدینہ کے کسی مسلمان نے جھپٹ کر اسے قتل کر دیا۔ مسلمانوں کی آدھی فوج کے قدم متزلزل ہو گئے۔ ہوا کا رخ دیکھ کر وہ اپنی وفاداریوں کو فاتح جماعت سے وابستہ کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ مکہ کے دو ہزار مسلمان حضورؐ کے ساتھ تھے۔ ان کے شہر پر صرف دو ہفتے قبل ہی مسلمانوں کا قبضہ ہوا تھا۔ ان کے دل کے زخم ابھی ہرے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں دہشت اور پریشانی پھیلانے میں کافی حصہ لیا۔

ایک آدمی جس کا باپ احد کی جنگ میں مارا گیا تھا۔ اس موقع کی تلاش میں تھا کہ جب بھی اسے حضورؐ مل جائیں وہ قتل کر دے۔ اُس نے اژدھام میں آگے بڑھنے کی کافی کوشش کی مگر اپنے مقصد میں ناکام رہا۔

حضورؐ فوجی لباس میں اپنے سفید خچر پر سوار تھے۔ حضورؐ کے چچا عباسؓ خود ان کے اپنے بیان کے مطابق حضورؐ کے بازو کھڑے ہوئے تھے۔ حضورؐ نے عباس سے فرمایا کہ اونچی آواز سے پکارو "اے انصار" اے بیعت رضوان کے شریک"، عباس نے للکارنا شروع کر دیا۔ ان کا آواز دینا کام آیا۔ آوازیں آنے لگیں "ہم یہاں ہیں ہم یہاں ہیں"۔ ہر طرف سے یہی آواز آ رہی تھی۔ افراتفری ایسی مچی رہی کہ کئی اونٹ اور کئی گھوڑے اپنے سواروں کو لیے سرپٹ دوڑ رہے تھے اس لیے کہ اب وہ اپنے سواروں کے بس میں نہ تھے۔ آہستہ آہستہ لوگ حضورؐ کے اطراف جمع ہونے لگے۔ حضورؐ ان کو دیکھ کر فرمانے جا رہے تھے "تم میرے لیے جمع ہو اے انصار۔ تم میرے لیے جمع ہو اے بنی خزرج"
شاید آپ نے خیال کیا ہو کہ خزرج کا نام لینے سے لوگوں کے جذبات میں تلاطم

Marfat.com

پیدا ہو اور وہ آپ کے اور زیادہ وفادار ہو جائیں۔

جو لوگ حضورؐ کے اطراف جمع ہو گئے تھے لڑتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ بدویوں کے انبوہ کثیر کو چیرتے پھاڑتے وہ آگے ہی بڑھ رہے تھے۔ مسلمان بدوی جو اپنی جانوں کو بچانے کے لیے آہستہ آہستہ پیچھے پیچھے چل رہے تھے ان کو جوش اور غیرت دلائی جائے رہی تھی کہ وہ اپنی آپ مدافعت کریں اور لڑیں۔

جہاں تک ہو سکتا تھا۔ حضورؐ لڑائیوں سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ آپ نازک سے نازک موقع پر بھی ٹھنڈے طریقے سے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ اپنے سفید خچر پر سوار ہو گئے۔ صورت حال کا جائزہ لیا۔ آپ نے فرمایا "صورت حال تو نازک ہے"۔ حضورؐ کو آپ کے جانثار گھیرے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے ایک عورت اُمّ سلیم بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے شوہر کے اونٹ کی نکیل کو تھامے ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھرا بھی تھا۔ شوہر نے اپنی بیوی سے دریافت کیا کہ اس چھرے سے تم کیا کرنے والی ہو۔ بیوی نے جواب دیا اگر کوئی مشرک اور کافر میرے قریب آئے تو میں کی انتڑیاں باہر نکال دوں گی۔ یہ عجیب معاملہ بھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس عورت کے شوہر طلحہؓ نے اس دن بیس کافروں کو قتل کیا تھا۔ شوہر کو خوب بیوی ملی تھی اور بیوی کو خوب شوہر ملا تھا۔

افراتفری اور انتشار پر اب قابو پا لیا گیا تھا۔ پریشان اور دہشت زدہ مسلمان اب حضورؐ کے قریب آ رہے تھے۔ مسلمانوں کی عددی برتری اب رنگ لا رہی تھی۔ کافروں کے مقابلے میں مسلمان زیادہ تھے۔ پہلے تو ہوازن نے مقابلہ کرنا ختم کر دیا۔ ان کو دھکیل کر مسلمانوں نے پیچھے کر دیا پھر ان پر ایسے ٹوٹ پڑے کہ سارے کے سارے کافر منتشر ہو کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

ایک تو عددی اعتبار سے مسلمان اکثریت میں تھے۔ دوسرے ہتھیار اور لڑتے

کا سامان ان کے پاس زیادہ تھا۔ ان دونوں باتوں میں امتیاز رکھنے کے باوجود ثقیف اور ہوازن نے مسلمانوں کو کافی پریشان کیا۔ ثقیف کے ستر آدمی مارے گئے۔ یہ سارے کے سارے اپنے علم کی حفاظت کے لیے اس کے اردگرد کھڑے ہوئے تھے۔ ان ہی میں ان کا سردار عثمان ابن عبداللہ بھی تھا۔ یہ بھی مارا گیا۔

ایک موقع جو وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا وہ تھا جبکہ بنی سلیم کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ مارتے مارتے ہوازن کو میدان سے بھگا دیں۔ صرف تین ہفتے قبل بنی سلیم نے اسلام قبول کیا تھا جبکہ حضورؐ مکہ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ بنی سلیم والوں نے اسلام کو دل سے قبول کیا تھا یا نہیں اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ تو ایک حقیقت تھی کہ قبیلہ وارانہ لڑائیوں میں یہ بہت ہی آزمودہ اور تجربہ کار تھے۔

قرآن کے سورۂ توبہ کی ۲۵ ویں آیت میں حنین کے دن کا ذکر ہے۔ فرمایا گیا ہے "کہ خدا نے بہت سے موقعوں پر تم کو مدد دی ہے اور حنین کے دن جبکہ تم کو اپنی جماعت کی کثرت پر غرّہ تھا تو وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی۔ زمین باوجود اتنی فراخی کے تم پر تنگ ہوگئی۔ پھر تم پیٹھ پھیر کر پھر گئے" ۲۶ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

"پھر خدا نے اپنے پیغمبر پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی۔ تمہاری مدد کو فرشتوں کے لشکر جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے آسمان سے اتارے۔ کافروں کو عذاب دیا اور کفر کرنے والوں کی یہی سزا ہے۔"

یاد ہوگا کہ حضورؐ نے اپنی شیرخواری کا زمانہ حلیمہ دائی کے ہاں گزارا تھا۔ یہ بنی سعد سے تعلق رکھتی تھیں۔ بنی سعد ہوازن کی ایک شاخ تھی۔ مسلمانوں کی جماعت نے بنی سعد کے کچھ لوگوں کو گرفتار کیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں ایک بوڑھی عورت بھی تھی۔ جس کا نام شیما تھا۔ یہ حضورؐ کی دودھ شریک بہن تھی۔ اس عورت نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ حضورؐ کی رضاعی بہن ہے۔ مسلمانوں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ اس

Marfat.com

کا مذاق اڑاتے ہوئے اس کو حضورؐ کی خدمت میں لائے۔ اس نے حضورؐ سے بھی یہی بات کہی۔ حضورؐ نے ثبوت مانگا۔ بوڑھی نے جھٹ سے اپنے کندھے کی چادر ہٹا کر ایک چھوٹے سے زخم کا نشان دکھایا۔ حضورؐ سے کہا کہ جب آپ چھوٹے تھے وہ آپ کو اپنے کندھے پر اٹھائے کہیں لے جارہی تھی۔ حضورؐ نے اس کے کندھے پر اپنی دانتوں کے نشان چھوڑ دیے جو عمر بھر رہا۔

حضورؐ اخلاق کریمانہ کے مظہر تھے۔ اخلاق حسنہ کے پیکر تھے۔ یہ سنتے ہی چادر زمین پر بچھا دی۔ عورت سے فرمایا کہ چادر پر تشریف رکھے۔ آپ نے اپنی رضاعی بہن سے خواہش کی کہ وہ آپ کے بچپن کے واقعات سنائے۔ آپ نے اس کی دل جوئی کی۔ انعام اکرام سے نوازا۔ اس کو ایک آرام دہ گھر عطا فرمایا۔ ریگستان کے خیمے میں رہنے والی بدوی عورت کو شہر کی زندگی کیا پسند آسکتی ہے۔ اس لئے اس گھر پر اپنے خیمے کو ترجیح دی جہاں اس کی زندگی کے باقی دن اس کے اپنے لوگوں میں اس کی مرضی کے مطابق گزر سکتے تھے حضورؐ نے اس کی خواہش کا احترام کیا۔ جانے سے قبل اسے مزید عطیات اور تحفوں سے نوازا۔

ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق آپ نے اس عورت کو ایک غلام اور ایک لونڈی سے بھی سرفراز کیا تھا۔ ان دونوں نے آپس میں شادی کرلی اور ان کی اولاد ابن اسحٰق کے زمانہ میں بھی پائی جاتی تھی۔

ثقیف کے چند لوگ حنین سے طائف واپس ہوئے تھے۔ طائف سے ان کو ایک خاص نسبت تھی۔ یہ لوگ جرأت و ہمت، بلند حوصلگی اور استقلال کی صفات خاص سے متصف تھے۔ ان کے سربراہ اس موقع پر یمن گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ ہتھیار اور جنگ کا دیگر سامان خرید کر واپس ہونے والے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہاں پر ان جنگی ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت بھی وہ حاصل کر رہے تھے۔ یمن پر ایرانیوں کا قبضہ ۵۷۰ء سے رہا تھا۔ وہاں پر ان کی باقاعدہ فوج متعین تھی۔ ہتھیاروں کا

Marfat.com

ذخیرہ وہاں رہتا تھا یمن سے ایرانی اثر و اقتدار کا خاتمہ ۶۰۲ء سے ۶۲۸ء کے دوران ہوا جبکہ بیز نطینوں سے ان کی لڑائیاں ہوئیں۔ اس اقتدار کے چھن جانے کے باوجود بھی کافی مقدار میں ان کے ہتھیار وہاں تھے۔ ثقیف کے سربراہوں کا منشا شاید یہ رہا ہو کہ ایرانیوں کے چھوڑے ہوئے ہتھیاروں کے ذخیروں کو خرید کر اپنی مدافعت کے کام میں لایا جائے۔

619ء میں حضورؐ طائف تشریف لے گئے تھے۔ آپ کو امید تھی کہ وہاں کے لوگ آپ کا خیر مقدم کریں گے۔ آپ امن و امان سے طائف میں رہ سکیں گے۔ طائف کے لوگوں نے خیر مقدم تو کیا انتہائی بدسلوکی کی۔ اس سلوک سے دل برداشتہ ہونے کے بعد آپ کو مدینہ ہجرت کا خیال آیا۔

طائف کے لوگوں نے حنین میں ہوازن کا ساتھ دیا تھا اس لیے حضورؐ نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ آپ طائف والوں کی خبر لیں گے۔ آپ طائف کی طرف روانہ ہوئے شہر کا محاصرہ کیا۔ آپ نے دیکھا کہ شہر کے دروازے اور دیواریں بڑی مضبوط ہیں مسلم فوج کے پاس صرف تیر و کمان، تلواریں اور نیزے ہیں۔ ان ہتھیاروں سے شہر کو فتح نہیں کیا جا سکتا۔

چونکہ طائف پر قبضہ کرنے کے علاوہ بھی آپ کی اور بہت سے کام کرنے تھے اس لیے پندرہ یا بیس دن تک محاصرہ جاری رکھنے کے بعد آپ نے محاصرہ اٹھوا دیا۔ طائف اصل میں باغات اور کشید گی شراب کے لیے بہت مشہور تھا۔ پہاڑوں کے درمیان ہونے کی وجہ سے گرما میں کافی ٹھنڈک رہتی تھی۔ اس آب و ہوا کے باعث وہاں پر پھلوں کی کاشت کی جاتی تھی۔

محاصرہ اٹھانے سے قبل حضورؐ نے حکم دیا کہ سارے باغات تباہ کر دیے جائیں بارہ مسلمانوں کی اس موقع پر شہادت ہوئی۔ طائف کی اونچی دیواروں پر سے بہتر

Marfat.com

پھینک پھینک کر مسلمان کو شہید کیا گیا۔ اتنے مختصر سے آدمیوں کی شہادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں پر لڑائی زیادہ نہیں ہوئی۔

طائف سے اپنی فوجیں ہٹا لینے کے بعد حضورؐ نے جعرانہ پر فوجوں کو رکوایا۔ یہ مقام وہ تھا جہاں سے مکہ کو راستہ جاتا تھا۔ یہاں پر ہوازن کا جمع کیا ہوا ایک بہت بڑا خزانہ مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ حنین کی شکست کے نتیجے میں مسلمانوں نے دشمنوں کی عورتوں اور بچوں کو ان کے جانوروں اور دیگر مال واسباب کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ جعرانہ میں عورتوں اور بچوں کو نظر بند کر دیا گیا۔

ہوازن کی طرف سے حلیمہ دائی کے خاندان والے یعنی بنی سعد نے مسلمانوں سے گفت وشنید کرنے میں پہل کی۔ یہ لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسول۔ جس خاندان کی عورت نے آپ کے ایام شیر خواری میں آپ کو دودھ پلایا تھا اور چھوٹے سے بڑا کیا تھا، اسی خاندان کی عورتوں کو آپ نے آج بند کر رکھا ہے۔ آج ہم کو ان نظر بندوں پر رحم آرہا ہے۔ ان کی حالت پر افسوس ہو رہا ہے۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ "تم کو زیادہ عزیز کون ہیں" تمہارے بیوی بچے یا تمہارے مویشی اور تمہارا مال واسباب؟ ان لوگوں نے جواب دیا۔

"ہم کو ہمارے بیوی بچے زیادہ عزیز ہیں۔"

حضورؐ نے فرمایا کہ جہاں تک آپ کا اپنا اور آپ کے قریب ترین رشتہ داروں کا تعلق ہے عورتوں اور بچوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ آپ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ نماز ظہر تک انتظار کریں تاکہ عام مسلمانوں کی منظوری بھی حاصل کی جا سکے۔ آپ نے فرمایا کہ جب مسلمان جمع ہو جائیں تو یہ لوگ اٹھ کر کھڑے ہو جائیں اور مجھ سے کہیں کہ آپ مسلمانوں سے ان کی عورتوں اور بچوں کی رہائی کے لیے سفارش کریں۔ ہوازن کے نمائندوں نے بڑی ہی ہوشیاری سے حضورؐ کی ہدایت پر عمل کیا۔ مہاجرین اور انصار

Marfat.com

نے ان لوگوں کی اپیل پر فوراً کہا کہ وہ اپنے اپنے مال غنیمت اور عورتوں اور بچوں کے حق کو حضورؐ کی مرضی پر چھوڑتے ہیں۔ وہ قبیلے جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور اسلام کی روح کو ابھی سمجھ نہیں پائے تھے مہاجرین اور انصار کی اس پیش کش کو قبول کرنے میں اور ان کا ساتھ دینے میں تامل کر رہے تھے۔ فزارہ اور بنی تمیم نے صاف طور پر انکار کر دیا۔ بنی سلیم کے سردار نے بھی اپنے حق سے دستبرداری سے انکار کر دیا۔ اس کے قبیلے والوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور کہا کہ جو کچھ ہمارا حصہ ہے وہ اصل میں رسول اللہ کا حق ہے۔" اس مرحلے پر حضورؐ نے مداخلت فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص بھی اس بات پر مصر ہے کہ قیدیوں پر اس کا حق ہے وہ اپنے حصے کے قیدی کو آزاد کردے اس کا معاوضہ اس کو فی قیدی چھ اونٹوں کی صورت میں دیا جائے گا۔ آئندہ مال غنیمت میں سے یہ حصہ ادا ہو گا۔ حضورؐ کے اس وعدہ کے پیش نظر تمام لوگوں نے عورتوں اور بچوں کی رہائی پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

یہ واقعہ بتلاتا ہے کہ حضورؐ کس مدبرانہ طریقے سے جمہوریت کو کام میں لاتے ہوئے مسائل کو حل کرتے تھے۔ ایک طرف آپ نے نمائندوں سے فرمایا کہ وہ تمام مسلمانوں سے عورتوں اور بچوں کی رہائی کی درخواست کریں۔ دوسری طرف اعتدال پسندی اور انسانی ہمدردی کو کام میں لاتے ہوئے آپ نے مسلمانوں پر اپنا اثر ڈالا۔ گو آپ مسلمانوں کے نزدیک فوق البشر تھے اور آپ کا ہر حکم مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل ہوا کرتا تھا اس کے باوجود آپ نے مسلمانوں کو اس بارے میں حکم نہیں دیا۔ اپنی مرضی کو ان پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔

حضورؐ نے ہوازن کے نمائندوں کے ذریعہ ان کے سردار مالک ابن عوف کے نام ایک پیغام روانہ فرمایا۔ حنین میں شکست پا جانے کے بعد اس نے طائف جا کر ثقیف کے لوگوں کے درمیان پناہ لی تھی۔ حضورؐ نے اپنے پیغام میں فرمایا کہ اگر وہ حضورؐ کی

Marfat.com

خدمت میں واپس ہو جائے اور اسلام قبول کرلے تو اسے سو اونٹ بطور انعام دیے جائیں گے۔ جیسے ہی مالک ابن عوف کو یہ پیغام ملا وہ دوڑتا ہوا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور مسلمان ہو گیا۔ جن کے ہاں پناہ لی تھی، ان کو کہا تک نہیں کہ وہ حضورؐ کی خدمت میں جا رہا ہے۔ بہرحال مسلمان ہو جانے کے بعد وہ اپنی شکست کے ایک مہینے کے اندر ہی کافی مالدار ہو گیا۔

حضورؐ نے اس لطف و کرم اور عنایت کا عملی طور پر شکر گزار ہونے کے لیے اسنے ہوازن کے چند قبیلوں کو جمع کیا۔ یہ قبیلے مسلمان ہو گئے تھے۔ ان سب کی مدد سے اس نے بنی ثقیف کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ وہی بنی ثقیف جن کے ہاں اس نے پناہ لے رکھی تھی۔

حضورؐ نے ہوازن کے بچوں اور عورتوں کو رہا کرنے کے مسائل میں مصروف رہے دوسری طرف عام مسلمان مال غنیمت کی تقسیم کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ حضورؐ جب اپنے کام سے فارغ ہو کر مسلمانوں کے درمیان تشریف لے گئے تو لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ حضورؐ۔ مویشیوں کو آپ ہمارے درمیان تقسیم فرما دیں۔ ان لوگوں نے حضورؐ کو اپنے درمیان اس طرح سے لے لیا تھا کہ ہجوم کے باعث حضورؐ کی شال، کندھے سے نیچے گر کر آپ کے پیروں میں آنے کی وجہ سے پھٹ گئی۔ آپ ایک درخت کو سہارا دے کر کھڑے ہو گئے۔ فرمایا کہ میری شال میرے حوالے کر دو۔

آپ رونے بھی جا رہے تھے اور ہنستے بھی جا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ "خدا کی قسم اگر میرے پاس اتنی بھیڑیں اور بکریاں بھی جمع ہو جائیں، جتنے ساحل کے کنارے درخت ہوا کرتے ہیں تو بھی میں ان سب کو تمہارے درمیان تقسیم کر دوں۔"

عجیب اتفاق ہے کہ ۱۹۲۹ء میں دو مواقع میرے لیے بھی ایسے آئے جبکہ پکڑے ہوئے بھیڑوں اور بکریوں کے گلوں کو بدویوں کے درمیان مجھے تقسیم کرنا تھا۔ ابن اسحق

Marfat.com

نے چودہ سو سال قبل ہونے والے واقعہ کی جو تصویر کھینچی ہے۔ وہی تصویر میرے ذہن کے پردہ پر پھر سے ابھر آئی۔ جس حقیقت بیانی کے ساتھ انہوں نے اس واقعہ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ میرے لیے ایک جواہر پارہ ثابت ہوئی۔ مرکزی عرب کے لوگوں کی یہ خصوصیت ہے کہ مویشیوں یا مال غنیمت کی تقسیم کے وقت حریص اور لالچی بن جاتے ہیں، مال کی تقسیم کرنے والے کا وہی حشر کرتے ہیں جیسے آج سے چودہ سو سال قبل حضورؐ کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ایک طرف تو وہ ان موقعوں پر نیم باغی سے ہو جاتے اور عجیب ہڑبونگ مچاتے ہیں اور دوسری طرف اپنے محبوب قائد کی عظمت و عزت کا ہر طریقے سے خیال رکھتے ہیں۔

جب حضورؐ نے اونٹوں کی تقسیم شروع کی تو سب سے زیادہ حصہ ان لوگوں کو دیا جو حضورؐ کے سخت ترین دشمن رہ چکے تھے۔ ابوسفیان کو سو اونٹ دیے گئے۔ اس کے بیٹے معاویہ کو سو اونٹ دیے گئے۔ سہیل ابن عمرو اور صفوان ابن اُمیہ جیسے واجب القتل کو بھی سو اونٹ عطا کیے گئے۔ یہ سب اب مسلمان ہو چکے تھے۔ بنی غطفان اور بنی تمیم کے سردار جن کا اسلام ابھی مشکوک تھا۔ ان کو بھی سو سو اونٹ دیے گئے۔ بنی سلیم کے سردار عباس ابن مرداس کو دس اونٹ دیے گئے۔ بنی سلیم نے حنین میں بہادری کے کافی جوہر دکھائے تھے۔ عباس ابن مرداس ایک شاعر تھا۔ دوسروں کے سو اونٹ اور اس کو دس اونٹ دیے جانے پر اس نے اپنی سبکی محسوس کی، جل بھن کر چند طنزیہ اشعار لکھے۔ جس میں مال غنیمت کی تقسیم کا مذاق اڑایا۔ جب حضورؐ کے علم میں یہ اشعار لائے گئے تو آپ نے فرمایا کہ کچھ اور تحفے تحائف دے کر اس آدمی کا منہ بند کیا جائے۔ عباس ابن مرداس کو طلب کیا گیا۔ اسے اتنے اونٹوں سے نوازا گیا کہ وہ چلا اٹھا کہ اب بس۔

ان تفصیلات سے مرکزی عرب کے رہنے والوں کی ذہنی خصوصیات کا پتہ

Marfat.com

چلتا ہے۔ عباس ابن مرداس کو حرص و ہوا نے اتنا غضب ناک نہیں کیا تھا جتنا حسد نے۔ دوسرے قبائل کو زیادہ اونٹ دے گئے اور اس کے قبیلے کو کم۔ اس میں اس نے اپنی اور اپنے قبیلے کی ذلت محسوس کی، اس کی مرضی کے مطابق اونٹ دیے گئے تاکہ اس کا سر اونچا رہ سکے۔ حضورؐ اپنی فتح مندیوں اور کامرانیوں کے عروج پر تھے۔ عباس ابن مرداس کے رویے سے نہ ہی غضبناک ہوئے اور نہ ہی کسی جابرانہ رویہ کو اختیار کیا۔ آپ نے ہر ایک کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ جب بھی کسی شخص نے حضور کی سخاوت اور فیاضی پر اعتراض کیا تو آپ نے کبھی غصہ کا اظہار کیا۔ اور نہ اس سے بد دل ہوئے۔ اگر کوئی شخص آپ کی فیاضی اور سخاوت کو کھل کر دل سے قبول نہ کرتا تو آپ اس کو اتنا نوازتے کہ لینے والے کو تنگیٔ داماں کی شکایت رہ جاتی۔

جس طریقے سے مال غنیمت کو تقسیم کیا گیا ظاہر ہے کہ ہر شخص تو اس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا۔ مدینہ کے انصار ان لوگوں میں سے تھے جن کو اس موقع پر سخت ناامیدی ہوئی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ حنین میں انہی لوگوں نے حضورؐ کے اطراف جمع ہونے میں پیش قدمی کی تھی اس کی وجہ سے حنین میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ اب جبکہ مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو ان کے حصے میں کچھ بھی نہیں آیا۔ سارے اونٹ حضورؐ کے دشمنوں کی ہمدردیاں اور وفاداریاں حاصل کرنے میں تقسیم کر دیے گئے۔

بنی خزرج کے سردار سعد ابن عبادہؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے انصار نے جن جذبات و خیالات کا اظہار کیا تھا ان کی ترجمانی کی، حضورؐ نے سعدؓ سے سوال کیا کہ "اس مسئلہ پر تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟" سعدؓ نے روکھے پن سے جواب دیا "میں بھی وہی محسوس کرتا ہوں جو میرے لوگ محسوس کر رہے ہیں۔"

حضورؐ نے سعد سے فرمایا کہ سارے انصار کو اکٹھا کیا جائے۔ جب سعد نے ابن عبادہ نے سارے انصار کو جمع کیا تو ان سے مخاطب ہوئے اور فرمایا "اے انصار

Marfat.com

آج تمہارے متعلق میں کیا سن رہا ہوں؟" کیا تمہارے دلوں میں میرے تعلق سے میل آگیا ہے۔ کیا میں تمہارے پاس اس وقت نہیں آیا جبکہ تم غلطیوں پر غلطیاں کر رہے تھے کیا خدا تم کو راہ راست پر نہیں لایا؟ تم غریب تھے۔ خدا نے تم کو امیر کیا۔ تمہارے دل سخت تھے۔ خدا نے انہیں نرم کیا۔ کیوں جواب نہیں دیتے اے انصار؟

انصار نے جواب دیا کہ "ہم کیسے آپ کو جواب دے سکتے ہیں؟ رحم وکرم اور سخاوت فیاضی تو صرف خدا اور اس کے رسول ہی کا حق ہے"۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ آپؐ ہمارے پاس اس وقت آئے جبکہ لوگ آپ کو جھٹلا رہے تھے اور آپ کی باتوں پر ہم نے یقین کیا۔ لوگوں نے آپ کو تباہ کیا۔ ہم نے آپ کی مدد کی۔ آپ پریشان حال تھے۔ ہم نے آپ کو اپنے دلوں میں جگہ دی۔ آپؐ غریب اور نادار تھے۔ ہم نے آپ کے آرام وآسائش کا خیال رکھا۔ اگر تم نے یہ سب کچھ بھی کہا ہوتا تو اس میں مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حقیقت بیانی ہوتی۔

کیا تمہارے ذہن اس بات سے پراگندہ ہیں کہ میں نے زندگی کی چند اچھی چیزیں ان لوگوں میں تقسیم کر دی ہیں جو ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں تاکہ ان کی تالیف قلب ہو۔ ساتھ ہی ساتھ تم کو اس بات کے لیے چھوڑ رہا ہوں کہ تم اپنی نظریں اپنے اللہ پر لگائے رکھو۔ کیا تم اس بات پر مطمئن نہیں ہو۔ کہ دوسرے لوگ یہاں سے جاتے وقت اپنے ساتھ بھیڑ بکریاں لے جائیں اور تم یہاں سے جاتے وقت اللہ کے رسول کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔

اگر تمام لوگ ایک سمت کا رخ اختیار کریں اور انصار دوسری سمت پر چلیں تو میں انصار کے ساتھ چلوں گا۔ انصار پہ خدا کی رحمتیں اور مہربانیاں ہو۔ ان کے بچوں پر بچوں کے بچوں پر اور ان کے بچوں پر اللہ مہربان رہے۔ حضور کی اس جادو بیانی سے مدینہ کے لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اتنا روئے اتنا روئے کہ ان کی

Marfat.com

داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔

حضورؐ جعرانہ سے مکہ تشریف لے گئے۔ عمرہ ادا فرمایا۔ پھر آپ مدینہ واپس ہوئے۔ مدینہ اب حضورؐ کا گھر بن چکا تھا۔ آپؐ نے اپنے ایک نمائندہ کو مکہ کا گورنر مقرر کیا۔ اس کے فرائض میں تھا کہ لوگوں کو اسلام سکھائے، قرآن پڑھائے۔

جو مال غنیمت تقسیم نہیں کیا گیا تھا۔ مدینہ لے جایا گیا۔ فاتحانہ شان سے آپ ۱۶ مارچ ۶۳۰ء کو مدینہ میں تشریف لائے۔

Marfat.com

یادگار تاریخیں

صلح حدیبیہ :-	مارچ ۶۲۸ء
مسلمانوں کا عمرہ :-	فروری ۶۲۹ء
موتہ کی جنگ :-	ستمبر ۶۲۹ء
مکہ پر قبضہ :-	جنوری ۶۳۰ء
حنین کی جنگ :-	یکم فروری ۶۳۰ء
طائف کا محاصرہ :-	فروری، مارچ ۶۳۰ء
حضورؐ کی مدینہ کو واپسی :-	۱۶/مارچ ۶۳۰ء

Marfat.com

ہجرتِ مدینہ

قارئین کو یاد ہو گا کہ مصر کے حاکم نے ایک عیسائی غلام لڑکی کو حضورؐ کی خدمت میں بطور تحفہ روانہ کیا تھا۔ اس لڑکی کا نام ماریہ تھا۔ حضورؐ نے ماریہ سے نکاح کر لیا تھا۔ ماریہؓ کے بطن سے ایک لڑکا تولد ہوا جس کا نام ابراہیم رکھا گیا اس لڑکے کا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام پر تھا حضورؐ کے نزدیک ابراہیم علیہ السلام کا دین اسلام کے لیے ایک نمونہ تھا۔ مارچ ۶۳۰ء میں جب مدینہ واپس ہوئے ابراہیمؓ نے ایک سال کی عمر میں وفات پائی۔ حضورؐ اپنے صاحبزادہ ابراہیم سے بہت پیار کرتے تھے۔ ابراہیم کی وفات سے حضورؐ کو سخت صدمہ ہوا۔

حضرت ابراہیم کی وفات نے حضورؐ اور بی بی ماریہ کو پہلے سے اور بھی زیادہ قریب کر دیا حضورؐ کی اس چاہت نے آپ کی تنک مزاج بیوی حضرت حفصہؓ کو رقابت کی آگ میں جھونک دیا۔ بی بی حفصہؓ عمر ابن الخطاب کی بیٹی تھیں۔ بی بی عائشہؓ بھی بی بی حفصہؓ کو اکساتی رہتی تھیں اور بی بی حفصہؓ کے جذبہ رقابت کی آگ پر اور تیل چھڑک رہی تھیں۔ ان رقابتوں کی وجہ سے حضورؐ کی گھریلو زندگی اجیرن بن گئی تھی۔ بہر حال ان گھریلو جھگڑوں پر بہت جلد قابو پا لیا گیا۔

مکہ سے واپسی کے بعد حضورؐ سات مہینے تک مدینہ میں رہے۔ ستمبر یا اکتوبر ۶۳۰ء میں حضورؐ نے مسلمانوں کو بازنطینی سرحدوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ حجاز کا موسم ان دنوں بہت ہی گرم تھا۔ پانی اور چارے کی کمی تھی۔ اتنی بڑی فوج کی نقل و حرکت بھی دشوار معلوم ہو رہی

Marfat.com

تھی۔ شاید موتہ کی شکست بھی بیزنطینی سرحدوں پر جانے سے مسلمانوں کو روک رہی تھی۔

یہ واضح نہیں ہے کہ ان ناموافق حالات اور غیر موزوں موسم میں حضورؐ اس مہم کی روانگی پر کیوں اصرار فرما رہے تھے جبکہ اگر دو مہینے اور انتظار کر لیا جاتا تو حالات مسلمانوں کے لیے اور ساز گار ہو جاتے۔ یہ صحیح ہے کہ شمال کی طرف سے آئے ہوئے ایک تاجر نے حضورؐ کو یہ اطلاع دی کہ بازنطینی فوجیں ایک بڑی تعداد میں تبوک کے مقام پر جمع ہوئی ہیں۔ صرف اسی اطلاع کو کافی سمجھ کر فوجوں کا روانہ کرنا کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں معلوم ہوتی۔ تبوک کا جغرافیہ محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ بازنطینی فوجی مراکز سے دو سو میل دور تھا اور بازنطینی فوجوں کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ گرما کے موسم میں تبوک تک پہنچیں۔ گرما تو گرما تھا سادہ دنوں میں بھی ان کا ریگستانی علاقوں کو پار کر کے یہاں تک آنا بہت ہی مشکل تھا اگر وہ گرما میں تبوک تک آنے کا ارادہ کرتے بھی تو ان کے لیے ان ہی مشکلات کا سامنا ہوتا جو اس موسم میں مسلمانوں کے سامنے تھیں یعنی پانی اور چارہ کی قلت وغیرہ۔

اس تکلیف دہ موسم میں عام عربوں کا اس مہم پر روانہ ہونے سے کترانا اس وجہ سے نہیں تھا کہ ان کو تکالیف اور مصائب گوارا نہیں تھے بلکہ اس لیے کہ ان کو اپنے جانور بہت زیادہ عزیز تھے۔ اونٹ اور گھوڑے ان کا بیش بہا سرمایہ ہوا کرتے تھے۔ اگر اس موسم میں وہ اپنے جانوروں کو ساتھ لے کر جنگ کے لیے روانہ ہوتے تو ان کو خطرہ تھا کہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے ان کے مویشی راستوں ہی میں ختم ہو جائیں گے۔

مدینہ کے باشندوں کی گزر بسر اکثر و بیشتر کھجوروں کی کاشت پر ہوا کرتی تھی۔ اکتوبر کا مہینا یوں بھی ان کے لیے پکی ہوئی فصل کو اکٹھا کرنے کا ہوتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضورؐ اور حضورؐ کے قریبی صحابہ چونکہ تجارت پیشہ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اس لیے مدینہ کے باشندوں کی زرعی مصروفیات کا احاطہ نہ کر سکے تعجب کی بات یہ ہے کہ حضورؐ اس موقع پر مصر رہے کہ مہم پر بہر حال روانہ ہونا چاہئے۔ اس تجویز پر اکثر لوگوں نے احتجاج کیا۔

حضورؐ کے تعلقات مسلمانوں سے ایسے تھے کہ جو بھی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا اسے کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ ہمیشہ آپ نے جمہوری طریقہ اختیار کیا۔ آپ ہر ایک کے مشورے کو غور سے سنا کرتے تھے۔

اس موقع پر بہت سے لوگوں نے بہانہ کیا کہ ان کی سواری کے اونٹ سفر کے قابل نہیں ہیں حضورؐ نے مالدار مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ان لوگوں کو اونٹ فراہم کریں جن کے پاس سواری کے اونٹ نہیں ہیں اگر اونٹ نہ دے سکتے ہوں تو رقمی امداد دیں۔ حضرت عثمان ابن عفان نے اس اپیل کا بڑی ہی دریا دلی سے جواب دیا۔ ابن ہشام کے بیان کے مطابق حضورؐ نے حضرت عثمان کی فیاضی کو دیکھ کر فرمایا "اے خدا میں عثمان سے خوش ہوں۔ تو بھی خوش ہو" یہ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ ابن ابی نے اس موقع پر بھی ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی جتانی شروع کر دی جو موسم کی ناموافقت کو بہانہ بنا کر حضورؐ کی مہم میں شریک ہونے سے تامل کر رہے تھے

حضورؐ نے حکم دیا کہ فوجوں کو وداع کرنے کے لیے مدینہ کے شمال میں باقاعدہ ایک شامیانہ ڈالا جائے۔ عام طور سے شام جانے والے قافلے روانگی سے قبل اسی مقام پر جمع ہوا کرتے تھے۔ ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق عبداللہ ابن ابی نے اپنا خیمہ حضورؐ کے خیمے کے قریب ایک پہاڑی کے نشیب میں ڈالا۔ ایسا کرنے سے اس کا مقصد کیا تھا۔ واضح نہیں ہے لوگوں نے دیکھا کہ عبداللہ ابن ابی کا خیمہ حضورؐ کے خیمہ سے بڑا تھا۔ ادھر حضورؐ مہم کے لیے روانہ ہوئے ادھر عبداللہ ابن ابی مدینہ واپس لوٹ گیا۔

اس مہم کی روانگی میں جن مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا ذکر قرآن کے سورہ توبہ میں ہے۔ ۳۸ ویں آیت اس طرح شروع ہوتی ہے کہ "مومنو۔ تمہیں کیا ہوا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو تم کاہلی کے سبب سے زمین پر گرے جاتے ہو۔ گھروں سے نکلنا نہیں چاہتے۔ کیا تم آخرت کی نعمتوں کو چھوڑ کر

Marfat.com

دنیا کی زندگی پر خوش ہو بیٹھے ہو۔ دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابلے میں بہت ہی کم ہیں۔" اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور لوگ پیدا کر دے گا اور تم اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکو گے۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔"

لوگ مہم پر روانہ ہو گئے۔ راستہ میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ حضرت علیؓ ابن ابی طالب حضورؐ کے ساتھ چلنے پر مصر تھے۔ حضورؐ نے انہیں اپنے ساتھ چلنے سے منع کر دیا۔ حضرت علیؓ کو مدینہ ہی میں ٹھہرا دیا گیا۔ حضرت علیؓ چونکہ مسلمانوں کے مانے ہوئے بہادر اور شجیع تھے اس لیے ان کا اس جنگ میں شریک نہ ہونا مسلمانوں کے لیے تعجب کا باعث بنا۔

مدینہ کے شمال میں ۸۰ میل دور الحجر کے قدیم اور افتادہ آثار پر سے مسلمانوں کا گزر ہوا۔ پٹرا کی طرح یہاں بھی قدیم زمانے میں لوگ دروں اور غاروں میں رہا کرتے تھے۔ ان گھروں کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ گرما میں یہ اندر سے ٹھنڈے رہتے تھے اور سرما میں خنک اور گرم اس نوعیت کی یادگاریں پٹرا اور الحجر میں آج بھی نظر آتی ہیں کئی ایک کہانیاں اسلام سے قبل بیان کی جاتی تھیں جن میں الحجر کے پہاڑوں، غاروں، دروں اور گھروں کا ذکر تھا۔ ان میں ثمود قبیلے کے لوگ رہا کرتے تھے۔ یقیناً ان کہانیوں میں صداقت ہوگی۔ ۷۱۵ قبل مسیح میں ایسریا کے بادشاہ کے فرمانوں میں اس قبیلے کا ذکر ملتا ہے قرآن کے بیان کے مطابق خدا نے اپنے ایک پیغمبر حضرت صالح کو ثمود کی ہدایت کے لیے روانہ کیا تھا۔ ثمود کے کمزور اور غریب لوگوں نے صالحؑ کی بات مان لی۔ خدا کی طرف رجوع ہو گئے۔ لیکن قبیلہ کے امیر اور مغرور لوگوں نے صالحؑ کا مذاق اڑایا۔ خدا کے پیغمبر کو دق کرنے لگے۔ ایذا رسانی سے پیش آتے رہے۔ صالحؑ نے ان کو خدا کے عذاب سے ڈرایا۔ اس کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بالآخر زلزلے، کڑک اور بجلی نے ان لوگوں کو سطح زمین سے ہمیشہ کے لیے مفقود کر دیا۔

Marfat.com

واقعہ تو یہ ہے کہ الحجر کے آثار آتش فشاں کے لاوے کے اندر دبے پڑے ہیں۔ عربوں کا یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بستی کی بستی آتش فشاں لاوے کے نیچے دب کر تباہ و برباد ہوگئی۔

حضورؐ اپنی تبلیغ کے ابتدائی زمانے میں صالح پیغمبر کا ذکر سن چکے تھے۔ آپ اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ کس طرح خدا کے اس پیغمبر کو اس قبیلے کے ہاتھوں تمسخر، مذاق اور اذیت کی منزلوں سے گزرنا پڑا تھا۔ صالح پیغمبر پر جو کچھ بھی بیت چکی تھی۔ انہی منزلوں سے حضورؐ کو بھی قریش کے مالدار اور امیرترین لوگوں کے ہاتھوں گزرنا پڑ رہا تھا۔ مکہ میں قرآن کی جن آیتوں کا نزول ہوا۔ ان میں کئی مقامات پر اس واقعہ کو دہرایا گیا ہے۔ حضورؐ جب اپنے مشن میں کامیاب ہوگئے اور قوت و طاقت کا مظہر بن گئے تو آپ نے صالحؑ پیغمبر سے تقابل کا خیال اپنے ذہن سے نکال دیا۔

قرآن کے سورہ (۷) کی ۷۴ ویں آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔

"اور یاد کرو تو کرو جب اس نے تم کو قوم عاد کے بعد سردار بنایا اور زمین پر آباد کیا کہ نرم نرم زمین سے محل تعمیر کرتے رہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر گھر بناتے رہو۔ پس خدا کی نعمتوں کو یاد کرو۔ زمین میں فساد نہ کرتے پھرو۔"

اس کے بعد کی آیت میں ہے۔

"ان کی قوم میں سردار لوگ جو غرور رکھتے تھے، غریب لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لے آئے تھے کہنے لگے بھلا تم یقین کرتے ہو کہ صالح اپنے پروردگار کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہاں جو چیز وہ دے کر بھیجے گئے ہیں۔ ہم اس پر بلاشبہ ایمان رکھتے ہیں۔ مغرور سردار کہنے لگے کہ جس چیز پر تم ایمان لائے ہو ہم تو اس کو نہیں مانتے۔"

وہی الفاظ صالح پیغمبر سے منسوب کئے گئے ہیں جو الفاظ حضورؐ خود ادا کر

Marfat.com

فرمایا کرتے تھے۔ حضورؐ تبوک کی مہم کے دوران خاص طور پر ثمود کے آثار کو دیکھ کر بہت ہی متاثر ہوئے اس لیے کہ ان لوگوں کا ذکر اور ان کا حشر حضورؐ اکثر و بیشتر لوگوں کے سامنے بیان فرمایا کرتے تھے۔

اس مقام پر لوگ جب کنویں سے پانی نکالنے لگے تو اس پانی کو پینے سے مسلمانوں کو منع فرمایا۔ نہ صرف پینے سے بلکہ اس پانی سے وضو اور طہارت کی بھی ممانعت کر دی۔ آپ کو یقین تھا کہ وہاں بدروحیں گھومتی پھرتی ہیں اس لیے آپ نے لوگوں کو ہدایت کر دی تھی کہ اپنے خیموں سے باہر اکیلے نہ نکلا کریں۔ دوسرے دن صبح میں لوگوں نے شکایت کی کہ ان کے پاس پانی نہیں ہے۔ پانی نہ ہونے کے باوجود بھی مسلمانوں کو کنویں سے پانی نہ نکالنے کا حکم دیا گیا۔ مسلمانوں کی اس بے چینی کے پیش نظر حضورؐ نے دعا فرمائی اتنا پانی آسمان سے برسا کہ لوگوں کی ساری ضروریات کی تکمیل ہو گئی۔

قرآن نے ہود کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہودؑ قبیلہ عاد کی ہدایت و رہبری کے لیے روانہ کئے گئے تھے۔ ان کے اصل محل وقوع کی بابت قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لوگ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ وہ جنوبی عرب میں رہا کرتے تھے۔

حضورؐ سے قبل جن موحدین کا ذکر آیا ہے ان میں ایک پیغمبر شعیبؑ بھی ہیں۔ ان کی تبلیغ کا مرکز مدائن تھا۔ یہ حجاز کے شمال اور اردن کے جنوب میں تھا۔ عمان کی ایک مغربی وادی میں اب بھی لوگ شعیبؑ کا مقبرہ دکھلاتے ہیں۔

اور بھی کئی ایک موحدین کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ سوڈوم کے لوگوں کی ہدایت اور رہبری کے لیے خدا کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ لوگوں نے ان کا انکار کیا تعلیم دینے والوں کو اپنی بستی سے باہر نکال پھینکا۔ رسولوں کے انکار اور ان کی توہین کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر خدا کا عذاب نازل ہوا۔ زلزلے اور آسمانی بلاؤں نے ان کو صفحۂ ہستی سے غائب کر دیا۔ ان کا بھی وہی حشر ہوا جو ثمود کا ہوا تھا۔

ان پیاروں پیغمبروں کے پیغام کو اگر کسی نے قبول کیا تو وہ غریبوں ناداروں اور مسکینوں ہی نے قبول کیا۔ انکار کیا تو سرمایہ داروں اور امیروں نے کیا۔ بالکل یہی رویہ قریش کا حضور کے ساتھ بھی رہا۔ زمانہ قدیم کے عرب پیغمبروں کی تعلیم جن پر قدامت کی کہر چھائی ہوئی تھی وحدانیت پر ہی مبنی تھی۔

سفر کی اس منزل پر حضورؐ کی سواری کا اونٹ گھاس چرتے چرتے بہت آگے نکل گیا۔ اس کی تلاش میں کافی وقت ضائع ہوا۔ کسی نے طنزاً کہا کہ "محمدؐ تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپؐ پیغمبر ہیں۔ آپؐ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ کیا آپؐ یہ نہیں جانتے کہ آپ کا اونٹ کدھر اور کس رخ گیا۔

حضورؐ اپنے اعتماد کے آدمیوں کو مختلف خیموں میں روانہ کر دیتے تھے۔ وہ عام لوگوں کے خیالات اور آپس کی گفتگو کی تفصیلات حضورؐ کے گوش گزار کریں۔ لوگوں نے اس مہم پر جانے سے پہلے جو شش و پنج کا رویہ اختیار کیا تھا وہ دوران سفر بھی جاری رہا۔ ان سب باتوں کے باوجود عام مسلمانوں کو حضورؐ سے جو محبت تھی اس میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ حضورؐ کی وہ مسلسل کامیابیاں تھیں جن سے آپ دوچار ہوتے جا رہے تھے۔ اسلام کی ترقی، کامیابی اور عروج کا منبع آپ کی ذات گرامی تھی۔ جب تک مسلمانوں کی تعداد بہ حیثیت مجموعی دو ہزار سے کم تھی اس وقت تک مکہ کا آدمی ہو یا مدینہ کا شہری ہو یا دیہاتی، چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب ہر ایک کی حضورؐ سے آشنائی تھی۔ ہر ایک حضور کے ذاتی اثر میں تھا۔

جب مسلمانوں کی تعداد دس ہزار سے تجاوز کر گئی تو ذاتی اور شخصی تعلقات کی نوعیت میں تبدیلی آ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے لوگوں نے اسلام محض اس لیے قبول کر لیا تھا کہ ان کے نزدیک اسلام کا قبول کرنا دنیا کی آسان ترین بات تھی۔ ماحول ایسا بن چکا تھا جس میں بت پرست رہنا ان کے لیے خطرناک ترین

بات تھی. آس پاس کے سارے قبیلے مسلمان ہو چکے تھے اور ڈنکے کی چوٹ اپنی قبولیت اسلام کا اعلان کرتے رہتے تھے۔

بدوی قبیلوں کی معاشرتی زندگی کا خاصہ یہ رہا ہے کہ ان میں آپس میں اتحاد و اتفاق پایا جاتا تھا۔ ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب رہا کرتے تھے۔ ان کا طرز زندگی رہن سہن، ان کا انداز فکر مسائل سے نمٹنے کا طریقہ۔ ان سب میں اشتراک پایا جاتا تھا۔ جب ان قبیلوں میں سے ایک قبیلے کا سردار حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اپنے آپ کو مطمئن کر کے اسلام قبول کر لیتا تو اس کی وجہ سے نہ صرف اس کا سارا قبیلہ اسلام قبول کر لیتا بلکہ اس کے قبیلے سے دوستی رکھنے والے قبیلے بھی مسلمان ہو جایا کرتے تھے۔

اب جو لوگ مسلمان ہو رہے تھے ان کی بنیاد سیاست پر تھی نہ کہ ایمان اور عقیدے پر۔ جو قبیلے ایک کے بعد ایک مسلمان ہوتے جا رہے تھے ان میں سے بہت سے ایسے تھے جنہوں نے اس وقت تک نہ کبھی حضورؐ کو دیکھا تھا اور نہ ہی آپ کی تعلیمات اور ایمان اور عقیدے کا ... ان کے ذہنوں میں واضح خاکہ تھا۔ تبوک کے مقام پر مسلمان رک گئے ایلہ کے گورنر یوحنا بن روبہ نے تبوک آ کر عزت و احترام سے حضورؐ کا استقبال کیا۔ ایک معاہدے کی تشکیل عمل میں آئی۔ ایلہ کے باشندے عیسائی تھے۔ ان کا گورنر بھی ان ہی میں سے کوئی ایک رہا ہوگا۔ وہ کوئی بازنطینی افسر نہیں تھا گورنر نے اس شرط پر مسلمانوں کو جزیہ ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی کہ مسلمان ایلہ کے لوگوں کی حفاظت کا ذمہ لیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایلہ کے لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ تھے۔ حضورؐ نے ان سے وعدہ فرمایا کہ مسلمان ان کے جہازوں اور تجارتی کاروانوں کی حفاظت اپنے ذمے لے گیں

یہ معاہدہ آگے چل کر مسلمانوں کے لیے ایک نمونہ بن گیا۔ جہاں بھی مسلمان گئے اور جس ملک کو بھی انہوں نے فتح کیا غیر مسلموں سے اسی قسم کا معاہدہ کیا۔ یہودیوں اور عیسائیوں پر کوئی دباؤ اس قسم کا نہیں ڈالا گیا کہ جبراً وہ اپنے مذہب کو ترک کر کے اسلام

Marfat.com

قبول کرلیں۔ جب تک وہ جزیہ ادا کرتے رہیں۔ ان کے جان و مال کے حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں کے سر ہا کرتی تھی۔ ایلہ کے مشرقی حصوں میں رہنے والے عسائیوں نے بھی اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ مسلمانوں کو جزیہ ادا کرکے اپنی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں کو سونپ دیں۔ جربا اور اذرح جو ایلہ سے اسی میل دور تھے ان ہی علاقوں میں شامل تھے۔

اذرح کسی زمانے میں رومی فوج کا ایک مرکز بھی رہ چکا تھا۔ یہاں پر جو فوجی چھاؤنیاں تھیں ان کے آثار آج بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس علاقے پر بازنطینیوں کی بالادستی تھی۔ حضورؐ نے خالد ابن ولید کو طلب فرمایا۔ فوج کے ایک دستے کے ساتھ دومتہ الجندل روانہ کیا۔ دومہ کا حکمران ایک عیسائی عرب تھا۔ اس کا نام اکیدر ابن عبدالملک تھا۔ کندہ نامی قدیم خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ یہ حکمران اپنے بھائی کے ساتھ شکار پر گیا ہوا تھا۔ خالد نے حکمران کو گرفتار کرلیا۔ اس کے بھائی کو قتل کردیا۔

خالد ابن ولید کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ انہوں نے کسی بھی مشن کو اس وقت تک پورا نہیں کیا۔ جب تک کہ مہم کے دوران کسی نہ کسی کا قتل نہ کردیا۔ حکمران کو گرفتار کرلیا جا چکا تھا۔ وہ ریشم و کمخواب کا ایک قیمتی جبہ پہنے ہوا تھا۔ اس کے جبہ پر اصلی سونے کا کام کیا ہوا تھا۔ خالد نے حکمران کے جبے کو پیچھے سے ایسا کھینچا کہ وہ پھٹ کر تارہ تار ہوگیا۔ خالد نے اپنی واپسی سے قبل ہی اس جبہ کو حضور کی خدمت میں روانہ کردیا۔ سیدھے سادے عربوں کے لیے ایسا مرصع جبہ انتہائی تعجب اور حیرت کا باعث بنا۔ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ لوگ حیرت سے اسے بار بار چھوتے تھے اور حیرت سے تکتے تھے۔ ان کے اس تاثر کو دیکھ کر حضورؐ نے ان سے سوال کیا "کیا تم کو یہ کپڑا پسند ہے؟ پھر فرمایا" اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے جنت میں سعد ابن معاذ جو کپڑا ... اپنی ناک اور منہ صاف کرنے کے لیے استعمال کررہے ہیں وہ اس

کپڑے سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔ واضح رہے کہ مدینہ کے محاصرہ کے وقت سعد ابن معاذ کو گہرا زخم لگا تھا۔ جس کے اثر سے بعد میں وہ انتقال کر گئے تھے۔

اکیدر کو بطور جنگی قیدی حضورؐ کی خدمت میں لایا گیا۔ حضورؐ نے اکیدر سے بات چیت کی۔ فریقین کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ مسلمانوں کو وہ محصول ادا کرنے پر رضامند ہو گیا۔ اپنی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں کو سونپ دی۔ حضور نے اس کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا۔ نہ اس پر کوئی دباؤ ڈالا گیا اور نہ ہی اس پر سختی کی گئی۔ اکیدر کا درباری لباس اور اس کا مسیحی مذہب اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ شاید قسطنطنیہ گیا ہوا تھا۔ بزنطینی اتنے کمزور تھے اور اتنی دور رہتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اس حکمران کی نہ حمایت کر سکتے تھے اور نہ ہی اس کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر سکتے تھے۔ خالد اپنے قیدیوں کے ساتھ نرمی برتنا تو جانتے ہی نہیں تھے۔ حضورؐ کے انتقال کے بعد خالد دومہ گئے، اکیدر کو قتل کر ڈالا۔ وہاں کے حکمرانوں کو معزول کیا۔ انہیں وہاں سے مار بھگایا۔

تبوک میں مسلمان صرف دس دن رہے۔ یہاں سے پھر وہ مدینہ واپس ہو گئے۔ مدینہ میں ابتدائی قیام کے دوران مسلمان بہت ہی اتحاد و اتفاق سے رہا کرتے تھے۔ ان کے معاملات میں حضور بذات خود دلچسپی لیتے تھے۔ سربراہوں سے مل کر ان کے آپس کے تنازعات کو حل کر دیتے تھے۔ اسی طریقۂ کار کی مثال ہم کو تبوک میں بھی ملتی ہے اگرچہ کہ یہ اختلاف ایک مختلف نوعیت کا تھا اور بڑے پیمانہ پر تھا۔

حضورؐ کے ساتھ مختلف مہمات پر جو دستے رہا کرتے تھے ان کی حیثیت نہ صرف حضورؐ کے محافظین کی ہوتی تھی۔ بلکہ ان کے ذریعہ حضورؐ کی اہمیت اور حضورؐ کا مقام بھی دوسروں کو بتلانا مقصود ہوتا۔ عظمت و شان کا یہ مظاہرہ مقامی سرداروں اور قبیلوں کے رہنماؤں پر اثر ڈالنے کے لیے کافی سے زیادہ تھا۔ جب وہ حضور کو جھرمٹ میں دیکھتے

Marfat.com

تو قریب آنے کی کوشش کرتے تھے اور حضورؐ کے ارشادات کو غور سے سننا چاہتے تھے۔ حضورؐ کی قربت اور ارشادات وہ موثر ترین حربے تھے جن کی بدولت لوگ اسلامی عقاید کو تیزی سے قبول کرنے لگے تھے۔ اسی طرح حضورؐ کی ذات گرامی عوام میں مقبول سے مقبول تر ہوتی گئی۔

تمام فوجی مہموں کے لیے اسلام میں "غزوہ" یا "سریہ" کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ جس جنگ میں حضورؐ نے بذات خود شرکت فرمائی اسے غزوہ کا نام دیا گیا۔ جس جنگ میں آپ نے شرکت نہیں کی اسے سریہ کہا جاتا ہے۔

۱۹۲۰ء میں اسی قسم کی صورت حال سے مجھے بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔ میں اس بات کا شاہد ہوں کہ اس قسم کے حملے عرب میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ اس قسم کے حملے عرب میں بہت عام ہیں۔ خود ابن سعود اپنی رہنمائی میں مختلف قبیلوں سے ہزاروں افراد کو جمع کر کے وقتاً فوقتاً حملے کیا کرتے تھے۔ بدوی عموماً چھوٹے پیمانے پر حملہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے تاکہ اگر کامیابی ہو تو فریق متقابل کا سارا مال صرف ان ہی کے قبیلے کے ہاتھ آئے۔ یہ قبیلے بڑی ہی بے رخی بے دلی کے ساتھ ابن سعود کی مہمات میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اس لیے کہ ابن سعود کی مہمات سیاست پر مبنی تھیں اور سیاسی لڑائیوں میں مال غنیمت ایک ضمنی بات ہو کر رہ جاتی ہے۔ قبیلے کے لوگوں کو سیاست سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف لوٹ مار کی خاطر ان مہمات میں حصہ لینا چاہتے تھے۔ چونکہ انفرادی طور پر قبیلے کے لوگوں کو ابن سعود کی مہمات میں حصہ لینے سے کم فائدے کی امید رہا کرتی تھی۔ اس لیے وہ بادل نخواستہ ابن سعود کا ساتھ دیا کرتے تھے۔

تبوک کے موقع پر ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ کے ساتھ کچھ ایسے بھی مسلمان تھے جنہوں نے خلوص دل سے نہ اسلام قبول کیا تھا اور نہ ہی ان کے ایمان پر بھروسہ

کیا جا سکتا تھا۔ یہ لوگ محض مال غنیمت کی خاطر حضورؐ کے ساتھ ہو گئے تھے۔ منافقین اس موقع پر حضورؐ کی ہمراہی سے جو کتراتے رہے تھے وہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ ان کے خیال میں حضورؐ کی موجودگی سے ان کو دھاندلی کرنے کا موقع نہیں ملے گا اور مال غنیمت ان کے ہاتھ بہت ہی کم آئے گا۔

حضورؐ کے تبوک روانہ ہونے سے قبل مدینہ کے مسلمانوں کی ایک جماعت حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ عرض کیا کہ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ بیماروں، حاجت مندوں اور پناہ گزینوں کو سردیوں کی راتوں میں ٹھہرانے کے لیے مسجد استعمال میں لائی جائے گی۔ حضورؐ سے درخواست کی گئی کہ آپ مسجد کا افتتاح فرمائیں اور وہاں نماز ادا فرمائیں۔

حضورؐ نے جواب دیا کہ اب تبوک جانے کی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ وہاں سے واپسی پر انشاء اللہ مسجد کا افتتاح کیا جائے گا۔ یہاں تک تو اس واقعہ میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

جب تبوک سے واپسی ہو رہی تھی تو حضورؐ نے مدینہ سے ۵ میل دور ابھی فوجوں کو رک جانے کا حکم دیا۔ یہاں سے آپ نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو حکم دے کر روانہ کیا کہ وہ اس مسجد کو سرے سے منہدم کر دیں۔ اس کا نشان تک باقی نہ رکھیں۔ اس کی باقیات کو نذر آتش کر دیں۔ حضورؐ کے متبعین نے وہی کیا جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ مسجد جلا دی گئی۔ جو لوگ مسجد میں مقیم تھے بھاگ گئے۔

مسجد کو مسمار کر دیے جانے کی توجیہہ یہ دی جاتی ہے کہ نئی مسجد مسلمانوں کی پہلی مسجد قبا کے نزدیک اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ قبا میں مسلمانوں کا جو اجتماع ہوا کرتا تھا وہ بٹ جائے۔ ان میں تفرقہ پڑ جائے۔

ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس مسجد کو تعمیر کرنے والے ابو عامر کے ماننے والے تھے۔ ابو عامر ایک راہب تھا۔ وحدانیت کو تسلیم کرنے کے باوجود حضورؐ کی رسالت

Marfat.com

کا قائل نہیں تھا قسطنطنیہ ہجرت کر گیا تھا وہاں سے اس نے ایک پیغام روانہ کیا کہ وہ بیزنطینوں کی ایک بہت بڑی فوج لے کر مدینہ پر قبضہ کرنے آ رہا ہے۔ اس نے اپنے ماننے والوں کو ہدایت کی تھی کہ اس کے لیے ایک نئی مسجد بنائی جائے۔

غالباً ابو عامر کی شرارت ہی کی وجہ سے مدینہ میں یہ افواہ گرم ہوئی تھی کہ مدینہ کے شمال میں بیزنطینی فوجیں جمع ہو رہی ہیں۔ جس نوعیت سے یہ روایت ہم تک پہنچی ہے بڑی ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ بیزنطینی سلطنت انتہائی کمزور ہو چکی تھی۔ ایران سے مسلسل ۲۶ سال تک برسرپیکار رہنے کے سبب بیزنطینوں میں ایک انتشاری کیفیت تھی۔ اپنی ساری عظمت سے یہ لوگ ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ انحطاط، پستی اور قومی تنزل کا یہ حال تھا کہ مدینہ سے ۵۰۰ میل دور رہنے کے باوجود ایلہ، جربا اور اذرح کے لوگ مسلمانوں کی پناہ کے طالب تھے۔ اپنی جان و مال کی حفاظت تک وہ نہیں کر سکتے تھے۔ مسلمانوں کا آسرا ڈھونڈ رہے تھے۔ اس وقت بھی جبکہ رومی شہنشاہیت کا سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا رومیوں کو حجاز پر قبضہ کرنے میں کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔ اگر ابو عامر اور بیزنطینی مدینہ پہنچنے کی کوشش کرتے بھی تو برسوں کی نہیں تو کم از کم مہینوں کی تیاری اس کے لیے انہیں درکار ہوتی۔ اس تیاری کا کہیں نام و نشان بھی ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔

ہو سکتا ہے کہ قدیم زمانے کے مسلم مورخین اور تبصرہ نگاروں پر بھی مسجد ضرار کی مسماری کا وہی پردہ حائل ہو جو آج ہمارے سامنے ہے۔ اس مسجد کو مسمار کیے جانے کا منشا کیا تھا وہ ابھی تک معمہ بنا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مسجد کی تعمیر کرنے والوں کی پشت پر وہ لوگ تھے جن کو غیر ملکی بڑی طاقتوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس لیے آج کی بیسویں صدی کی ذہنیت کے پیش نظر اس مسجد کو مسمار کیا جانا حق بجانب نظر آتا ہے۔ مسجد ضرار کا تعلق ابو عامر سے بتایا جاتا ہے۔ اس کے معماروں کے تعلق سے بھی

شبہ ہے کہ وہ ابو عامر کے حالی موالیوں میں سے تھے ۔ یہ لوگ غالباً موحد تھے مگر انکے ساتھ حضورؐ کی رسالت کے منکر تھے ۔ ایک طرف رسالت کا انکار اور دوسری طرف اسی رسول کو عبادت کے لیے اپنی مسجد میں مدعو کرنا یقیناً اس مسجد کی تباہی کا باعث بنا ہوگا

قرآن کے سورہ توبہ میں جہاں تبوک پر جانے کے لیے مسلمانوں کے رد و قدح کا ذکر ہے وہیں اس مسجد کا بھی ذکر آیا ہے ۔

۱۰۶ ویں آیت میں ارشاد ہوا ہے ۔

"مشرکوں کو زیب نہیں دیتا کہ خدا کی مسجدوں کو آباد کریں جبکہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہیں ۔ ان لوگوں کے سبب اعمال بے کار ہیں ۔ یہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے ۔"

اسی سورہ کی ۱۰۷ ویں آیت میں پھر بیان ہوتا ہے ۔

"تم اس مسجد میں کبھی جا کر کھڑے بھی نہ ہونا ۔ البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے ۔ اس قابل ہے کہ اس میں جایا اور نماز پڑھایا کرو ۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور خدا پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے ۔"

اس وقت مسلمان دوسری جگہوں پر کئی ایک مسجدوں کی تعمیر میں مصروف تھے ۔ کوئی وجہ ایسی ضرور ہوگی جس کی بنا پر اس مسجد کی تعمیر پر اتنے شدومد سے خدا اور اس کے رسول کی طرف سے ناپسندیدگی کا اظہار ہوا ۔

حضورؐ جب مدینہ کو واپس ہوئے تو تین مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے اقرار کیا کہ وہ حضورؐ کے ساتھ تبوک کی مہم پر نہیں گئے تھے ۔ انہوں نے بظاہر حضورؐ کو اس دھوکے میں رکھا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ جنگ میں شریک ہو رہے ہیں ۔ حضورؐ روانہ ہو گئے وہ تینوں مدینہ میں چھپ گئے ۔ حضور کے واپس آنے کے بعد ان تینوں نے خفت اور ندامت محسوس کر کے اپنے دل کی آواز پر لبیک کہا اور حضور کے آستانہ

Marfat.com

پر حاضر ہوکر حقیقت حال کا اظہار کر دیا۔

حضورؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ سزا کے طور پر ان تینوں سے بات چیت بند کر دی جائے۔ حضورؐ کے اس فرمان کا اثر یہ ہوا کہ نہ صرف عام مسلمان بلکہ ان کے افراد خاندان نے بھی ان سے بات کرنی ترک کر دی۔

بات چیت بند کروانے کے چالیس دن بعد حضورؐ نے ان تینوں کو حکم دیا کہ وہ بغیر طلاق دیے ہوئے اپنی بیویوں کو ان کے میکے روانہ کر دیں اس سزا کے پچاسویں دن حضورؐ نے مسجد میں نماز فجر کے بعد مسلمانوں سے خطاب کیا۔ فرمایا کہ خدا نے ان تینوں کے گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔ ان تینوں کے دوست احباب دوڑتے ہوئے اپنے معتوب دوستوں کے ہاں گئے۔ دوسرے انہیں کہا "کعب ابن مالک خوش خبری ہے" "بلال ابن امیہ خوش خبری ہے"

کعب ابن مالک کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھی۔ یہ ایک معروف شاعر تھے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ اس خوش خبری کے ملنے پر میں حضورؐ کی تلاش میں نکلا۔ لوگ راستے میں مجھ سے ملتے رہے۔ خدا کے معاف کر دینے پر مجھے مبارک باد پیش کرتے رہے۔ جب میں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا تو حضورؐ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا "آج کا دن تمہاری زندگی کا بہترین دن ہے" "یہ خوش خبری تم کو مبارک ہو۔" میں نے عرض کیا کہ یہ مبارک باد حضورؐ کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے۔ حضورؐ نے فرمایا "یقیناً خدا کی طرف سے ہے" جب بھی حضورؐ دوسروں کو کوئی خوش خبری سنایا کرتے تھے تو آپ کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکتا رہتا تھا۔

حضور کے روبرو میں باادب بیٹھ گیا۔ نیازمندانہ عرض کیا کہ میں اپنی جائیداد خدا اور خدا کے رسول کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اس واقعہ کو اتنی تفصیل سے بیان کرنے کا منشا محض حضورؐ اور مسلمانوں کا آپس کا تعلق اور ان کے درمیان ہونے والے

نازونیاز کو ظاہر کرتا ہے۔ حضورؐ کا جو اثر مسلمانوں پر تھا وہ بھی اس واقعہ سے آشکار ہے۔ مسلمانوں کا ایمان اور عقیدہ جو اپنے رسول کے تعلق سے تھا وہ بھی نمایاں ہے

سورہ توبہ میں جہاں تبوک کے موقع پر مختلف بدگمانیوں کا شکار ہونے والوں کا ذکر ہے وہیں اس سزا کا بھی ذکر ہے جو ان تین مسلمانوں کو دی گئی تھی۔

۱۱۷ ویں اور ۱۱۸ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ "ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر ہوگئیں اور انہوں نے جان لیا کہ خدا کے ہاتھ سے خود اس کے سوا کوئی پناہ نہیں۔ پھر خدا نے ان پر مہربانی کی۔ تاکہ توبہ کریں۔ بے شک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔"

اے اہل ایمان خدا سے ڈرتے رہو اور راستبازوں کے ساتھ رہو۔'

مدینہ واپس ہوجانے کے بعد ڈسمبر ۶۳۰ء میں حضورؐ کی خدمت میں طائف کا ایک نمائندہ کسی ایک معاہدے کی تشکیل کے سلسلے میں آیا۔ حضورؐ سے بات چیت کرنے کے بعد یہ نمائندہ خود مسلمان ہوگیا۔ یہ جب طائف واپس پہنچا تو اپنے گھر کی کھڑکی میں سے جھانک کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔

لوگوں نے حملہ کرکے اسے جان سے مار ڈالا۔ مدینہ روانہ ہونے سے قبل وہ طائف کا ایک مقبول ترین باشندہ تھا۔ اسی لیے وہ بطور نمائندہ روانہ کیا گیا تھا۔

طائف میں ثقیف قبیلے کے لوگوں کی اکثریت تھی۔ چند ماہ بعد ان لوگوں نے محسوس کیا کہ اب دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے والے اسلام کی مخالفت کرنا بے سود ہے۔ اسلام کی مخالفت اب ان کے بس کی بات نہیں رہی۔ ان کے آس پاس اور جو قبیلے رہتے تھے انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ طائف کے لوگوں کی چرتی ہوئی بکریاں خدا کا نام لے کر اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ طائف کے رہنے والوں کے

Marfat.com

کارروانوں کو مال غنیمت سمجھنے لگے تھے۔ ان سب باتوں کے پیش نظر ان لوگوں نے اپنا دوسرا وفد حضورؐ کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس وفد کے چھ ارکان تھے۔ ہر رکن ایک قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔

حضورؐ نے ان کے لیے ایک خیمہ مسجد کے قریب ڈلوایا۔ انہوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ وہ اپنا سر نیاز جھکانے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ حلقہ بگوش اسلام ہونا چاہتے ہیں۔ شرط صرف یہ پیش کی کہ معاہدہ تحریری صورت میں ہو۔ ان کی جان و مال اور مویشیوں کی حفاظت اور سلامتی کی ضمانت دی جائے۔

ایک نیا الجھاؤ درمیان میں آیا۔ وفد کے اراکین نے حضورؐ سے کہا کہ وہ اسلام تو قبول کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے نسوانی خدا لات کو تین سال تک ان کو اپنے قبضے میں رکھنے کی اجازت دی جائے۔ حضورؐ نے ان کی درخواست کو فوراً مسترد کر دیا۔ اب انہوں نے حضورؐ سے میعاد کے تعلق سے سودا بازی شروع کر دی۔

تین سال کو گھٹا کر انہوں نے دو سال کہا۔ دو سال سے ایک سال پر اتر آئے۔ ایک سال سے چھ مہینے پر اور اترتے اترتے ایک مہینہ پر حضورؐ قطعاً اس بات پر راضی نہیں ہوئے۔ آپ نے ابوسفیان کو ان کے ساتھ روانہ کیا تاکہ وہ جا کر اپنی موجودگی میں لات کو مسمار کروا دیں۔ حضورؐ نے ابوسفیان کو ان کے ساتھ روانہ کر کے انتہائی دانشمندی کا ثبوت دیا۔ وہی ابوسفیان جو چند ماہ پہلے بتوں کا رکھوالا تھا۔ اب بت شکن کے لیے چنا گیا۔

اس وفد نے حضورؐ سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ ان کو نماز سے مستثنیٰ رکھا جائے ان کے نزدیک نماز میں رکوع اور سجدہ ناشائستہ اور گری ہوئی حرکات تھیں۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ مذہب میں کوئی شخص اچھا اس وقت تک بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ نماز کو نہ اپنائے۔ نمائندوں کو حضورؐ کی یہ بات قبول کرتے ہی بنی۔

Marfat.com

حضورؐ نے طائف کے نمائندوں میں سے ایک کو چنا۔ اس کے ذمہ یہ کام لگایا گیا۔ کہ وہ طائف کے لوگوں کو نماز پڑھنا سکھائے۔ آپ نے رازدارانہ طریقے سے اپنے چنے ہوئے آدمی کو فرمایا کہ "نمازوں کو مختصر رکھا کرو۔ جب تم نمازیوں کا جائزہ لو تو اپنے ذہن میں کمزور اور ضعیف لوگوں کو رکھا کرو۔ نماز پڑھنے والوں میں بوڑھے، جوان، بیمار اور کمزور سب ہی شریک ہوتے ہیں نمازوں کو طویل کر کے ان کو زحمت اور تکلیف نہ دو"

انسان کے فطری تقاضے ہمیشہ آپ کے پیش نظر ہوتے تھے۔ انسانی کمزوریوں اور مجبوریوں پر آپ کی نظر رہتی تھی۔ ان ہی کو روشنی میں جب بھی آپ کچھ طلب کرتے تو اعتدال پسندی اس طلب کا محور بنی رہتی تھی۔ رہبانیت اور خود کو تھکانے کے آپ ہمیشہ مخالف رہے۔ اپنی اپنی پسند کی عاید کردہ زحمتوں کو آپ نے کبھی پسند نہیں فرمایا۔ حضورؐ کے انتقال کے بعد آپ کی امت نے ان ہی باتوں کو جزو زندگی بنانے کی کوشش کی جس کو آپ نے کبھی بھی قبول نہیں کیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "خدا نے ہم کو تباہ و برباد کر لینے کا تو کہیں حکم نہیں دیا ہے"۔ اس کے باوجود دن کی ۵ نمازیں اور رمضان کا پورا مہینہ روزہ رکھنا کچھ کم مجاہدہ نہیں ہے۔ یہ دونوں عبادات زندگی میں کچھ کم نظم و ترتیب پیدا نہیں کرتیں۔

طائف کا یہ وفد مدینہ سے واپس ہوتے ہوئے عجیب گھبراہٹ اور پریشانی کی حالت میں تھا۔ ان میں سے ہر ایک اس خیال سے ہراساں تھا کہ نہ معلوم طائف جانے پر ان کا حشر کیا ہو۔

ابوسفیان کو لات کی تاراجی کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔ اس کام کو کرنے سے قطعی انھوں نے انکار کر دیا۔ طائف سے باہر ان کا مکان تھا۔ وہاں جا کر فروکش ہو گئے۔ طائف ہی کے رہنے والے ایک اور مسلمان صاحب المغیرہ ابن شیبہ نے اپنی درانتی سے لات کو توڑ دیا۔ لات کے گلے میں سونے اور جواہرات کی مالا تھی۔ اسے اتار لیا گیا۔ جس پوشیدہ خزانے پر اسے براجمان کیا گیا تھا وہ خزانہ بھی زمین سے نکال لیا گیا۔

Marfat.com

لات کا بت جس وقت پاش پاش کیا جا رہا تھا ۔ طائف کی ساری کی ساری عورتیں وہاں جمع ہو گئی تھیں ۔ پریشان حال ، کھلے بال ، سوچے ہوئے گالوں کے ساتھ نوحہ خوانی میں مصروف تھیں ان کی نظر میں جو دیوی پورے طائف والوں کی محافظ سمجھی جاتی تھی اب اسی مقام کے نا ہنجار اور بزدل مردوں کی موجودگی میں خاک کا تودہ بنی جا رہی تھی ۔

مکہ فتح ہو جانے کے بعد پہلے حج کے موقع پر حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو مکہ روانہ فرمایا تاکہ وہ اپنی نگرانی اور قافلہ سالاری میں لوگوں کو حج کروائیں ۔ حضرت ابوبکرؓ پہلے امیر حج تھے جنہوں نے اسلامی مکہ میں مسلمانوں کو حج کروایا ۔ جب حضرت ابوبکرؓ مکہ جانے کی غرض سے مدینہ سے روانہ ہو چکے تو حضورؐ پر وحی نازل ہوئی ۔ حضورؐ نے وحی لکھوا کر حضرت علیؓ کے ذریعہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاں روانہ کی ۔ حج کی ساری رسومات ادا کی گئیں ، اس موقع پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں نے بھی حج ادا کیا ۔

حج کے دوران منیٰ میں جب حاجیوں کا اجتماع ہوا تو حضرت علیؓ نے ان آیات کی تلاوت کی جو حضورؐ پر نازل ہوئی تھیں اور جن کو حضورؐ نے حضرت علیؓ کے ہاتھ حضرت ابوبکرؓ کے ہاں روانہ کیا تھا ۔ اس پیغام میں مختصراً یہ تھا کہ بت پرستوں کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے اس مدت کے اختتام پر مسلمان ان پر جنگ کا اعلان کر دیں گے ۔

اس مدت کے اختتام پر مشرکوں کی جان و مال کی ذمہ داری نہیں رہے گی ، بت پرست اب جہاں کہیں بھی ملیں گے ان کے ساتھ سختی سے پیش آیا جائے گا ۔

صرف وہی بت پرست اس اعلان سے مستثنیٰ رہیں گے جن کو معاہدہ کے ذریعہ جان و مال کی سلامتی بخشی گئی ہے ۔ یہ جان و مال کی سلامتی صرف اتنے ہی عرصہ تک کے لیے رہے گی ۔ جس کا معاہدہ میں ذکر کیا گیا ہے ۔ ایک اور نئی بات کا اضافہ اس طرح سے ہوا کہ آئندہ سے صرف مسلمان ہی حج کے فرائض ادا کریں گے ۔ خانہ کعبہ میں جہاں ایک سال پہلے تک ان کے آبائی بت بڑے ہی احترام اور عزو شان کے ساتھ

Marfat.com

جلوہ افروز تھے۔

برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔

یہ سارے احکامات قرآن پاک کے سورہ توبہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس سورہ کا آخری حصہ تبوک کی مہم کے سلسلے میں ہے۔ اس سورہ کی آیات واقعاتی تسلسل کے اعتبار سے ترتیب میں نہیں ہیں۔

سورہ توبہ کی پہلی آیت میں ارشاد ہوا ہے۔

" خدا اور اس کے رسول کی طرف سے مشرکوں سے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا بیزاری اور جنگ کی تیاری ہے"۔

ان احکامات کے انطباق کا حکم صرف مشرکوں کے لیے تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے نہیں تھا۔ ان سے تشدد برتنے کے لیے نہیں کہا گیا۔

فروری ۶۳۱ء میں عبداللہ ابن ابی کا انتقال ہوا۔ بستر مرگ سے اس نے حضورؐ کی خدمت میں پیغام روانہ کیا۔ حضورؐ سے التجا کی کہ حضورؐ اس کی نماز جنازہ میں شریک ہوں۔ قبر پر فاتحہ پڑھیں۔ عبداللہ ابن ابی کی ایک ایک بات حضرت عمرؓ کے ذہن میں عود کر آئی۔ حضرت عمرؓ نے حضورؐ سے شکایت آمیزانہ لہجے میں درخواست کی کہ عبداللہ ابن ابی کے جنازے میں شرکت نہ کی جائے۔ رحمتہ اللعالمین نے مرنے والے کی آخری خواہش کا پاس رکھا۔ عبداللہ ابن ابی کا کردار کشمکش و تذبذب میں گھرا ہوا کردار تھا۔ وہ غالباً حضورؐ سے حسد کرتا تھا۔ حضورؐ کے مدینہ میں تشریف لانے کی وجہ سے اس کی سرداری ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے ایمانی جذبے نے کبھی بھی اسلام کی خاطر تلوار نہیں اٹھائی۔ وہ شروع ہی سے لڑائیوں سے کتراتا تھا گھبراتا تھا۔ اسلام کی آمد سے قبل بھی جبکہ بنی اوس اور بنی خزرج میں لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو غیر جانب دار رکھا تھا۔ مؤرخین میں گھناونے طریقے سے عبداللہ ابن ابی کے کردار کو پیش کرتے ہیں اس کے

پیش نظر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر وہ واقعی ویسا ہی برا تھا جیسا اسے بتایا جاتا ہے کہ حضورؐ کے لیے یہ بہت ہی آسان بات تھی کہ اسے قتل کر دیتے جیسا کہ اس سے کم درجے کے مخالفین کے ساتھ ہوا ہے۔

روایات تو یہاں تک ہیں کہ اس کے بیٹے نے اپنے باپ کو قتل کر دینے کی خود حضورؐ کو پیش کش کی تھی مگر حضورؐ نے اس کی درخواست کو رد کر دیا تھا' حضورؐ کا اس کے بیٹے کی درخواست کو رد کر دینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اتنا برا نہیں تھا جتنا مسلم مورخین اسے برا ٹھیراتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی منافقت کے باوجود مقامی لوگوں میں اتنا مقبول اور بااثر تھا ہو کہ حضورؐ اس کا قتل کیا جانا پسند نہ کرتے ہوں گے۔

Marfat.com

یادگار تاریخیں

مدینہ کو ہجرت	۶۲۲ء
غزوہ بدر	۶۲۴ء
غزوہ احد	۶۲۵ء
جنگ خندق	۶۲۷ء
صلح حدیبیہ	۶۲۸ء
فتح مکہ	۶۳۰ء
حضورؐ کے صاحبزادہ ابراہیمؓ کا انتقال	مارچ ۶۳۰ء
غزوہ تبوک	ستمبر، اکتوبر ۶۳۰ء
مسلمانوں کا پہلا حج اور بقیہ بت پرستوں کو انتباہ	فروری ۶۳۱ء

بُت پرستوں کو انتباہ

عربوں کے پاس قدیم زمانے سے قمری مہینوں کا استعمال چلا آرہا ہے۔ ان پڑھ لوگوں کیلئے قمری مہینے آسان ہوتے تھے۔ سرزمین عرب کی راتوں میں چاند مختلف صورتوں میں ہمیشہ دکھائی دیتا ہے۔ بارہ قمری مہینے ایک شمسی سال سے گیارہ دن چھوٹے ہوتے ہیں۔ شمسی سال میں ۳۶۵ دن ہوتے ہیں۔ ایک قمری مہینہ جو کبھی گرما میں آتا ہے وہ آہستہ آہستہ موسم بہار میں آئے گا اور پھر یہی مہینہ سردیوں کے زمانے میں آئے گا۔ حضورؐ کے سگڑ دادا قصی نے اپنے زمانے میں ایک نئے مہینے کی اختراع کر کے قمری سال کو شمسی سال کے برابر کرنا چاہا تھا۔ ہر تیسرا سال ۱۳ قمری مہینوں پر مشتمل سال قرار دیا جاتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کعبہ کی زیارت کو آنے والے ہمیشہ ایک مقررہ تاریخ پر ہی مکہ آئیں بدقسمتی سے قصی کا یہ تجربہ ناکام رہا۔ ایسا کرنے کے باوجود بھی دونوں سالوں میں مطابقت نہ ہونے پائی۔ قصی نے مہینہ کا اضافہ کر کے اپنی جگہ دانش مندی اور جرأت کا ثبوت دیا تھا۔

۶۳۱ء میں حضورؐ پر وحی نازل ہوئی۔ ہر تیسرے سال کے تیرہ مہینے مقرر کرنے پر امتناع عاید کیا گیا۔ ایسا سال سال کبیہ کہلاتا تھا۔ قرآن کے سورہ توبہ کی ۳۷ ویں آیت میں ارشاد ہے

"امن کے کسی مہینے کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کر دیتا ہے اس سے کافر گمراہی میں پڑے رہتے ہیں۔ ایک سال تو اس کو حلال سمجھتے ہیں اور دوسرے سال حرام تاکہ ادب کے مہینوں کو، جو خدا نے مقرر کیے ہیں، گنتی پوری کر لیں اور جو خدا نے منع کیا ہے

Marfat.com

اس کو جائز کرلیں۔ ان کے برے اعمال ان کو بھلے دکھائی دیتے ہیں۔ خدا کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اس وقت سے لے کر آج تک مسلمان صرف قمری مہینوں ہی کو پیش نظر رکھ کر رمضان کے روزے رکھتے ہیں اور حج کرتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے اس امتناع کی غرض و غایت کیا تھی وہ آج تک ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

جو لوگ حج کرکے واپس ہو رہے تھے ان کے ذریعے سے یہ خبر عام ہوئی کہ حضورؐ نے تمام بت پرستوں اور مشرکوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ جو لوگ ابھی تک مسلمان نہیں تھے اب چوکنے ہو گئے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت سے ایسے قبیلے تھے جو اس بات کے لیے تیار تھے کہ جیسے ہی حضورؐ کسی مشرک قبیلے پر حملہ کا حکم دیں وہ تعمیل کے لیے فوراً آگے بڑھیں اگرچہ حکم کی تعمیل پر کمربستہ ہونے والے بذات خود بادل ناخواستہ اسلام کے حلقہ بگوش ہونے والوں میں تھے۔ یہ لوگ دوسروں پر حملہ کرنے میں اس لیے خوشی محسوس کرتے تھے کہ ان حملوں سے ان کو مال غنیمت ہاتھ آتا تھا۔ اس سے ہٹ کر بھی اب عربوں کے لیے بت پرستی میں کوئی خاص کشش باقی نہیں رہی تھی۔ ان میں بت پرستی کا شوق اور وہ پرانا ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں نے سارے بڑے بڑے بتوں لات، العزیٰ وغیرہ وغیرہ کو توڑ کر ان کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ بعض بتوں کو تو پاش پاش کر ڈالا تھا۔ اس مار پیٹ کے باوجود ان کے بتوں نے نہ تو اپنی آپ مدافعت کی۔ اور نہ ہی اپنے ماننے والوں کو محفوظ رکھا۔ اور نہ ہی مسلمانوں کا کچھ بگاڑا۔

اب بت پرست محسوس کر رہے تھے کہ اب تک جن کو وہ اپنا محافظ، خیر خواہ اور والی سمجھ بیٹھے تھے وہ تو واقعی پتھر کے بت نکلے۔ ان شاہدات اور تجربات کی روشنی میں انہوں

نے بہتری اسی میں سمجھی کہ حضورؐ سے امن کی درخواست کی جائے۔

۶۳۱ء کا سال عام وفود کہلاتا ہے۔ عرب کے کونے کونے سے مختلف جماعتوں اور قبیلوں کے نمائندے حاضر ہوتے ہی اس لیے تھے کہ اسلام قبول کریں۔ سلامتی کی درخواست کریں۔ ہم اس نتیجہ پر سوچتے ہیں کہ خوف اور لالچ کی بنیادوں پر مذہب کا تبدیل کرنا یا تبدیل کروانا ایک بے معنی سی بات ہے تاریخ ہمارے اس خیال سے اختلاف کرتی ہے اس لیے جو آدمی محض خوف اور ڈر کی بناء پر اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے۔ اس میں اخلاص اور صداقت کی کمی ہوتی ہے۔ وہ خود تو یہ غلطی کر لیتا ہے لیکن اس کا خمیازہ اس کی اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اولاد اپنے ماں باپ ہی کے مذہب پر پلتی اور بڑی ہوتی ہے اور اسی مذہب پر قائم رہتی ہے۔ ماں باپ کا نیا مذہب اولاد کا دائمی مذہب ہو جاتا ہے۔ تیسری اور چوتھی نسل میں تو یہ بات اتنی پرانی ہو جاتی ہے کہ خاندان والوں کو اس کا علم ہی نہیں رہتا کہ ان کے جدِ اعلیٰ یا مورث اعلیٰ نے لالچ یا ڈر کی وجہ سے اپنا آبائی مذہب تبدیل کر دیا تھا ان کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا تھا یا وہ مجبور ہو گئے تھے ان کی آنے والی نسلیں بڑے ہی ایماندارانہ طریقے سے خلوص دل کے ساتھ اپنے وراثتی مذہب کی لاج رکھتے ہوئے مذہب کے اصولوں کی پابندی کرتی ہیں۔ یہی مثال ان عربوں پر بھی صادق آتی ہے جن کو حضورؐ نے منافقین سے مخاطب کیا تھا اور ان کے اس عیب کی مذمت کی تھی۔ منافقین یقیناً موقع پرست تھے اور ساتھ ہی ساتھ مناسب موقع کے متلاشی بھی۔

جیسے ہی حضورؐ کا انتقال ہوا بہت سارے عرب قبیلوں نے بغاوت کر دی۔ ان ان کی بغاوت کو سختی سے کچلنا پڑا۔ ان ہی منافقین اور شرپسند، موقع پرستوں کی دوسری، تیسری اور چوتھی نسلیں اسلام کے مبلغین اور فاتحین میں شمار کی گئیں۔ انہی نسلوں کے لوگ تھے جنہوں نے اپنی، صداقت، جرأت، جوش، جذبہ اور قوت ایمان سے مہذب دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا اور اسلامی علم کو ہر طرف لہراتے پھر رہے تھے۔

حضورؐ نے مسلمان بننے کے لیے صرف ایک ہی تو شرط رکھی تھی۔ جس کسی نے ایک دفعہ

Marfat.com

لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ کہہ دیا وہ مسلمانوں کے زمرے میں شامل کر لیا گیا۔

ہر وہ شخص جس نے اس کلمہ کو اپنی زبان سے ادا کر دیا بلا کسی حیلہ وحجت کے مسلمانوں کی برادری میں شامل کر لیا گیا۔

کلمہ پڑھ لینے کے بعد کسی سے ردوقدح نہیں کی جاتی تھی۔ سوالات کی بوچھاڑ کبھی کسی پر نہیں کی گئی۔ کلمہ گو کے ماضی کو ٹٹولا نہیں گیا۔ کلمہ پڑھ لینا اپنی کی ہوئی ہر چھوٹی بڑی خطا پر توبہ کر لینے کے مترادف قرار دیا گیا۔

حضورؐ کے قریبی جانثار اور رفقاء ہمیشہ اس بات کے شاکی رہے کہ جن لوگوں میں وہ خلوص کا فقدان دیکھ رہے تھے ان کو بھی حضورؐ نے کلمہ پڑھوا کر ایک دوسرے کے برابر کر دیا۔ جن لوگوں میں خلوص کا فقدان تھا اور اس کے باوجود انہوں نے کلمہ پڑھ لیا تھا اب ان لوگوں کی ہمسری کا دعویٰ کر رہے تھے جو سراپا اسلامی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔

اگر کسی مسلمان کے ہاتھ میں تلوار ہوتی اور وہ کسی فرار ہونے والے مشرک کا پیچھا کر رہا ہوتا اور قریب تھا کہ وہ مشرک کا سر اس کے تن سے جدا کر دے۔ فرار میں ناکام ہونے والا ہانپتا کانپتا مشرک فوراً کہہ دے کہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ

تو مسلمان پر یہ لازم ہو جاتا تھا کہ وہ اپنی تلوار پھینک دے اور فراری کلمہ گو کو اپنے سینے سے لگا کر مسلم برادری میں شامل کرلے۔ کلمہ طیبہ کا پڑھ لینا ان کے لیے اپنی جان بچانے کا آسان ترین طریقہ تھا۔ گو کلمہ پڑھ کر مسلم برادری میں آ ملنے والے نومسلم سے سوالات تو نہیں کیے جاتے تھے لیکن ایک بار اسلام قبول کر لینے کے بعد اسلام سے پھر جانے والے کو فوراً ہلاک کر دیا جاتا تھا۔

جو لوگ زبردستی، مجبوری، حرص اور لالچ یا دکھاوے کی خاطر مسلمان ہوئے تھے اب ایک نئی آفت میں پھنس گئے تھے۔ مرتد کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ اسلام سے پھر جانے کی صورت

Marfat.com

ہیں ان کو اپنی موت کا خدشہ لگا رہتا تھا۔

بنی تمیم ایک بڑا قبیلہ تھا۔ جب اس قبیلے کے نمائندے مرکزی نجد سے مدینہ آئے تو ان کے تعلق سے جو روایات ہم تک پہنچتی ہیں بڑی ہی دلچسپ ہیں۔

اس قبیلے کے دو ایک سردار پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر یہ حضورؐ کے ساتھ تھے۔ حنین میں بھی یہ موجود تھے اس موقع پر بنی تمیم کے بہت سے سرداروں کو یہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ بدویوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ ہمیشہ مساوات کے قائل رہے ہیں۔ دل کی بات زبان پر لانے میں خوف محسوس نہیں کرتے۔ ہمارے اپنے زمانے میں خود میں نے اپنے کانوں سے بدویوں کی مخاطبت کو سنا ہے۔ جن اہم اور ذمہ دار شخصیتوں کو آپ اور ہم یور اکسلنسی یا حضور والا سے مخاطب کرتے ہیں ان لوگوں کو یہ بدوی، " Mohammad "، یا او آدمی سے مخاطب کرتے ہیں۔

ریگستانی صحرا کو سمندر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ سمندر کی پر آشوب اور طوفانی ہواؤں میں جس طرح جہاز کے کپتان کو چیخ کر اور چلا کر بات کرنی پڑتی ہے۔ اسی طریقہ سے عرب کے بدویوں کو بھی اپنی گفتگو کے لیے بلند آواز کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

بنی تمیم کے بہت سارے لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے مسجد نبوی گئے۔ اس وقت مسجد نبوی اینٹ اور گارے کی بنی ہوئی ایک کشادہ عمارت تھی۔ اس پر کھجور کے پتوں کا سائبان تھا۔ کھجور کے درختوں کی لکڑی کے ستون تھے۔ حضورؐ کو مسجد میں موجود نہ پایا۔ حضورؐ کے در دولت پر گئے۔ حضورؐ کا کاشانۂ مبارک مسجد نبوی کے بالکل متصل تھا۔ گھر کے سامنے کھڑے ہو کر ہلڑ مچانا شروع کر دی۔ آوازیں دینے لگے کہ محمدؐ باہر آؤ۔ محمدؐ باہر آؤ۔ ہم سے بات کرو۔ ان لوگوں کا اس بدتمیزی سے چیخنا، چلانا اور شور مچانا اور حضورؐ کو گھر سے باہر نکلنے کے لیے بے چینی کا مظاہرہ کرنا اور جلدی کرنا۔ یہ ساری باتیں حضورؐ کی طبیعت پر گراں گزری۔ حضورؐ کیلئے یہ ایک بالکل ایک نیا تجربہ تھا۔ حضور کی خدمت میں مسلمان جب بھی حاضر ہوتے تھے ادب

Marfat.com

اور عجز و نیاز کی تصویر بنے رہتے تھے۔

ان بدویوں کے گستاخانہ اور بدتمیزانہ شور و غوغا کے باوجود بھی آپ باہر تشریف لائے گرم جوشی سے بدلیوں کا استقبال کیا۔

انہوں نے دعوت دی کہ شاعری اور خطابت میں ان لوگوں کا مقابلہ کریں۔ حضورؐ نے ان کی اس دعوت کو قبول فرمایا۔ اگرچہ کی حضورؐ بذات خود شاعری کو ناپسند فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ اپنے باپ دادا کے کارناموں پر ہمیشہ فخر کرتے رہنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اس وقت کی شاعری کا بڑا حصہ فخر و مباہات پر ہی مشتمل ہوا کرتا تھا۔ فخر و مباہات اور تعریفوں کے ڈانڈے اکثر و بیشتر شرک اور بت پرستی سے جا ملتے ہیں۔

عرب اپنے آباؤ اجداد کی جو تعظیم و تکریم کرتے تھے وہ مذہبی بنیادوں پر نہیں کرتے تھے۔ جذباتی لگاؤ اور ان کی خود سے نسبت ان کو اپنے آباؤ اجداد کی تعریف و توصیف پر ابھارتی تھی۔ بالکل اسی طریقے سے جیسے موجودہ یورپ کے وطن پرست اپنے ملکوں کی تاریخ پر اترایا کرتے ہیں۔

حضورؐ نے غالباً یہی سمجھتے ہوئے آباؤ اجداد کے کارناموں کی مدح سرائی سے منع فرمایا تھا کہ ایسا کرنا مذہب کا ایک رقیب پیدا کرنا ہے۔ اس خطابت اور شاعری کے مقابلے کا افتتاح بنی تمیم نے اپنی تقریر سے کیا۔ انہوں نے اپنے قبیلے کی دولت اور طاقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان دونوں چیزوں کی ان کے ہاں اس قدر بہتات ہے کہ ان ہی کے بل بوتے پر وہ دنیا کے بادشاہوں، شاہزادوں اور حکمرانوں سے اقتدار کی تقسیم کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور حکومتوں میں حصہ دار بن سکتے ہیں۔

حضورؐ نے انصار میں سے کسی کو حکم دیا کہ اس تقریر کا جواب دیا جائے۔ انصاری نے پہلے تو حمد و ثنا پڑھی۔ انہوں نے کہا کہ خدا نے اپنے فضل و کرم سے حضورؐ کو رسالت سے نوازا۔ آپ کو صاحب قرآن بنایا۔

اس کل کائنات میں جس اکثریت نے سب سے پہلے حضورؐ کی آواز پر لبیک کہا وہ مدینہ کے باسیوں پر مشتمل تھی اور انہوں نے اپنے آپ کو حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا اور اللہ کی راہ میں وہ لڑنے کے لیے تیار ہوئے۔ تقریریں ختم ہوئیں۔ اب شاعری کی باری آئی۔ حضورؐ نے حسان ابن ثابت کو حکم دیا کہ بنی تمیم کے شعراء کو جواب دیں۔ دونوں فریق کے شعراء اپنی اپنی شاعری سناتے رہے۔ بنی تمیم کے شعراء اپنے اشعار پڑھتے پڑھتے اتنے تھک گئے کہ ان کا ترنم جواب دینے لگا۔ گلے بیٹھ جانے لگے۔ اپنے شعراء کی یہ حالت دیکھ کر بنی تمیم کے اقرع ابن حابس اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہا کہ میرے باپ کی قسم ہے۔ اس آدمی نے پہلے ہی سے چند آدمیوں کو تیار کر رکھا ہے۔ اس آدمی کے خطیب اور شاعر ہمارے خطیبوں اور شاعروں سے ہزار درجے بہتر ہیں۔ ان کی آواز میں نغمگی ہے۔ جتنے لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ حضورؐ نے ان سب کو تحفے دیے۔

آج بھی نجد کے قبیلہ واری لوگوں میں وہی غرور و پندار، وہی شیخی، وہی شاعری سے لگاؤ پایا جاتا ہے جیسے ساتویں صدی کے قبیلوں میں پایا جاتا تھا۔ نجد کے لوگوں کی ساری ہیرا پھیری کا مقصد شاید یہی تھا کہ وہ خاموشی سے اپنے آپ کو اسلام کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بلا کسی حیلہ و حجت کے اسلام قبول کر لینا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھ رہے تھے خصوصاً ایسے آدمی کی اطاعت کا عہد کرنا جو معمولی تجارت پیشہ لوگوں میں سے ایک تھا ان کے لیے کسرِ شان تھا۔ اسلیے انہوں نے پہلے خطابت کا مقابلہ کروایا اور مسلم خطابت کا توازن کیا۔ اپنے شاعروں کی شاعری اور حسان بن ثابت کی شاعری کے مضمون، قافیہ اور ردیف پر نظر ڈالی۔ پھر جاکر بڑی ہی تمکنت اور افتخار کے ساتھ اسلام قبول کرنا اپنے شایانِ شان سمجھا۔

قبیلوں کے سردار جب ملاقات کے لیے آتے ہیں تو جاتے وقت ان کو تحفے تحائف دینا عربوں کی ہزاروں سال پرانی رسم رہی ہے۔ آج بھی ابن سعود اس پرانی روایت کو اپنائے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

بنی تمیم کی آمد ان معنوں میں کامیاب رہی کہ وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ ان بدویوں کے گنوار پن کا تاثر بڑا دیر پا رہا۔ اگر ابن اسحٰق اور طبری کی روایات درست ہیں تو ان کے بیان کے مطابق سورہ الحجرات کی ایک سے پانچ تک کی آیتیں ان ہی بدویوں کے گنوار پن کے پیش نظر نازل ہوئی تھیں۔

"مومنو۔ خدا اور اس کے رسول سے پہلے نہ بول اٹھا کرو۔ خدا سے ڈرتے رہو۔ بے شک خدا سنتا جانتا ہے۔ اے ایمان والو اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو۔ جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے بولتے ہو اسی طرح ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو جو لوگ پیغمبر خدا کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں۔ خدا نے ان کے دل تقویٰ کے لیے آزمائے ہیں۔ ان کے لیے بخشش اور اجر عظیم ہے۔ جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے آواز دیتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں۔ اگر وہ صبر کیے رہتے یہاں تک کہ تم خود نکل کر ان کے پاس آتے تو یہ ان کے لیے بہتر تھا۔ خدا تو بخشنے والا مہربان ہے۔"

ایک کے بعد دوسرا وفد آنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مدینہ ایک بڑی سلطنت کا پایہ تخت بن چکا ہے دو آدمی حضورؐ کو قتل کرنے کے ارادے سے آئے عین وقت پر وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ ایک اور آدمی آیا۔ اس نے حضورؐ سے درخواست کی کہ آپ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں کہ آپ واقعی اللہ کے پیغمبر اور رسول ہیں تاکہ وہ اس بات کا گواہ رہے۔ حضورؐ نے اس کو خوش کر دیا۔ اس کی بات سن لی۔ وہ واپس ہوا۔ اپنے سارے قبیلے کو مسلمان کر دیا۔

بنی حنیفہ کا ایک وفد آیا۔ اس وفد کے ساتھ مسلمہ بھی تھا۔ اس نے آگے چل کر بنوت کا دعویٰ کیا۔

ایک روایت کے مطابق وہ نجد گیا اور اپنے قبیلے کے ساتھ مل گیا وہاں سے حضورؐ کی خدمت میں ایک خط لکھا۔ خط کا متن ہے۔

Marfat.com

"اللہ کے رسول مسلمہ کی طرف سے اللہ کے رسول محمدؐ کی خدمت میں۔
کیوں نہ ہم زمین کو دو حصوں میں بانٹ دیں۔ آدھی زمین میرے لیے اور آدھی زمین آپ کے لیے۔"

حضورؐ نے مسلمہ کے خط کا جواب لکھوایا اور بھجوایا۔ متن یہ ہے۔

"اللہ کے رسول محمدؐ کی طرف سے مسلمہ کذاب کے واسطے۔
ساری زمین خدا کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے زمین عطا کرتا ہے

جیسے ہی حضورؐ کا انتقال ہوا بنی حنیفہ مسلمہ کی قیادت میں مرتد ہو گئے ان کی سرکوبی کے لیے مسلمانوں کو طاقت کا استعمال کرنا پڑا۔ مسلمہ کے تعلق سے بہت ہی کم معلومات ہم تک پہنچی ہیں۔ جتنا بھی مواد ملتا ہے اس کو حقارت اور نفرت کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

بنی طے کے سردار زید الخیل کی آمد بھی ایک خوشگوار واقعہ تھی۔ زید کو گھوڑوں کا زید بھی کہا جاتا تھا۔ یہ گھڑ سواری میں آپ اپنی نظیر تھا۔ زید اور اس کی جماعت نے حضورؐ سے طول طویل بات چیت کی۔ آخر کار سب مسلمان ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے جانے کے بعد حضورؐ نے فرمایا "جب کبھی میں کسی ایسے عرب سے ملتا ہوں جو اپنی شہرت کے بام برج پر رہتا ہے اور لوگ اس کی تعریف میں قصیدے لکھا کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر میں اس شخص میں کچھ نہ کچھ کمی محسوس کرتا ہوں۔ قصیدوں اور تعریفوں میں مجھے مبالغہ آرائی صاف نظر آجاتی ہے۔ مگر گھوڑوں کا زید وہ واحد آدمی ہے جس میں خوبیاں ہی خوبیاں مجھے نظر آتی ہیں۔ جو تعریفیں میں اس کے تعلق سے سن چکا ہوں۔ وہ اس سے زیادہ کا مستحق ہے۔"

زید کی جماعت کا ایک آدمی ابھی شش و پنج ہی میں پڑا ہوا تھا۔ حضورؐ سے ملنے کے بعد اس نے کہا کہ "میں یہاں ایک ایسے آدمی کو دیکھ رہا ہوں جو تمام لوگوں پر اپنی فوقیت جتانا چاہتا ہے لیکن مجھ پر سوائے میری اپنی ذات کے کوئی حکومت نہیں کر سکتا۔"
صحرا کے انتشار پسندوں اور منتشر دماغوں کی یہی تو آرزو ہوا کرتی ہے۔ اس قسم

Marfat.com

کے لوگ بٹر بونگ قسم کی آزادی میں لطف اندوز ہونے کے دل سے خواہاں رہتے ہیں۔

مدینہ میں اسلام قبول کرنے کے بعد زید الخیل واپس ہوئے۔ واپس ہونے کے فوراً بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اس بہادر سپوت کو اس بات کا موقع نہیں ملا کہ تین سال بعد ہونے والی اسلامی فتوحات میں حصہ لے کر اپنی بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھاتا۔ قبیلہ طے کے لوگوں نے آگے چل کر بہت نمایاں خدمات انجام دیں۔

حضورؐ ناموں کو بڑی اہمیت دیا کرتے تھے۔ شگون اور نام میں ایک ربط محسوس کرتے تھے۔ اکثر آپ نام تبدیل کر دیتے تھے تاکہ ہر چیز اور ہر شخص اسم با مسمیٰ رہے اس موقع پر آپ نے زید الخیل کو تبدیل کر کے زید الخیر سے زید کو مخاطب کیا۔ گھوڑوں کے زید کو حضورؐ نے نیکیوں کا زید بنا دیا۔ ایک اور موقع پر جبکہ آپ بدر تشریف لے جا رہے تھے ایک وادی سے آپ کا گزر ہوا تنگ وادی سے یہ موسوم تھی۔ یہ نام کوئی اچھا شگون تو نہیں دے رہا تھا آپ نے حکم دیا کہ تنگ وادی کا نام بدل کر آسان وادی رکھا جائے۔

اسلامی عرب میں ناموں کی تبدیلی کا طریقہ اب بھی مروج ہے۔ بہت سے مقامات نام بدل کر طیبہ یا طیب رکھے گے اس لیے کہ بعض پرانے نام ناپسندیدہ تھے۔

ایک مرتبہ اردن کے بادشاہ عبداللہ (شاہ حسین کے دادا) کے ساتھ میں بھی تھا۔ وہ کسی دیہات یا قبضے کے معائنہ کی غرض سے گئے تھے۔ ایک مقام پر انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ اس جگہ کا نام کیا ہے۔ لوگوں نے جواب دیا وادی یابس یعنی خشک وادی۔ بادشاہ سلامت نے فوری حکم دیا کہ اس کا نام بدل دیا جائے اور اسے وادی ریان یعنی سرسبز شاداب وادی کہا جائے۔ طے کے سردار حاتم کا ذکر ہم کر چکے ہیں اس کی مہمان نوازی اور سخاوت فیاضی تو ضرب المثل تھی۔ حاتم اور سخاوت دونوں الفاظ ہم معنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ ہم اب جس زمانے کے حالات قلم بند کر رہے ہیں اس وقت حاتم کا انتقال ہو چکا تھا۔ حاتم کا لڑکا عدی عیسائی تھا۔ مسلمانوں سے گریز کی خاطر شام چلا گیا تھا۔ اپنی بہن کے کہنے پر مدینہ حاضر ہوا۔ مسجد نبوی

Marfat.com

میں حضورؐ سے ملاقات کی۔ حضورؐ نے عدی کو اپنے گھر پر مدعو کیا۔ حضورؐ اور عدی جب مسجد نبوی سے کاشانہ نبوی جا رہے تھے راستے میں ایک بڑھیا حضورؐ کے پیچھے پڑ گئی۔ حضورؐ بڑی ہی خاموشی اور صبر کے ساتھ بوڑھی عورت کی باتیں سنتے رہے۔ وہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بیان میں مسلسل طوالت کرتی جا رہی تھی۔ حضورؐ بغیر کسی روک یا مداخلت کے ٹھنڈے دل سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ جب اس نے اپنے دل کی تمام بات حضورؐ سے کہہ ڈالی تو اس سے اجازت لے کر آگے بڑھے اور عدی کو لے کر اپنے گھر آئے۔ اپنے مہمان کو بیٹھنے کے لیے گدا پیش کیا۔ خود سادا زمین پر بیٹھ گئے۔

حضورؐ کی اس کسر نفسی اور اخلاق کریمانہ کا عدی پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ حضورؐ کے سامنے وہ فوراً مسلمان ہو گئے۔

ایک اور بڑے ٹھاٹ باٹ کا وفد آیا۔ یہ قبیلہ کندا کا روانہ کردہ تھا۔ یہ لوگ عرب کے قدیم حکمران اور شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت تک اسلام کا فروغ صرف حجاز ہی میں ہوا تھا پھر پڑوس کے نجد میں یمن یا حضرموت جیسے دور دراز علاقوں تک ابھی اسلام نہیں گیا تھا۔ پہاڑوں کی وجہ سے آمد و رفت میں دشواریاں تھیں۔

غالباً اپریل ۶۳۱ء میں زبید سے ایک وفد آیا۔ یہ لوگ بحر احمر کے ساحلوں پر رہا کرتے تھے۔ ان کے فوری بعد بنی بجیلہ والے آگئے یہ قبیلہ یمن کے اندرونی علاقوں میں رہا کرتا تھا۔

تبوک کی مہم کے بعد ابی کلال اور المیار کے دوسرے شہزادوں نے ایک پیام رساں کے ذریعہ حضورؐ کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا۔ حضورؐ نے اس خط کا تفصیلی جواب دیا۔ اس خط میں زکوٰۃ اور ان معاملات وغیرہ کا ذکر کیا جو مسلمان کو اپنی جائیداد یا مویشیوں وغیرہ پر دینے پڑتے ہیں۔ ان کو بت پرستوں کے خلاف لڑنے کے لیے بھی کہا گیا تھا۔ بت پرست قبیلوں سے لڑنا ان کے لیے زکوٰۃ ادا کرنے سے بھی زیادہ تردد کا باعث بنا۔

حضورؐ کی دانشمندی کہیے یا یمنیوں کی جھگڑالو طبیعت، جو سربراہ مدینہ آکر اسلام

قبول کرکے اپنے گھر لوٹے انہوں نے اپنے ہمسایہ بت پرست قبیلوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔
اس طریقے سے یمن کا ایک بڑا حصہ مسلمان ہو گیا۔

بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ حضورؐ نے کبھی بھی یمن میں اپنی فوجیں روانہ نہیں کی تھیں اس کے باوجود یمن یمنیوں ہی کی کوششوں سے مسلمان ملک بن گیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یمن اور نجران میں عرصہ دراز سے یہودی اور نصرانی رہتے آئے ہیں۔ حضورؐ نے الحمریوں کے شہزادوں کو جو خط روانہ کیا تھا اس میں یہ صراحت فرمائی تھی کہ اگر ایک یہودی یا نصرانی اسلام قبول کرلے تو اس کے حقوق اور ذمہ داریاں وہی ہونگے جو ایک مسلمان کے ہوا کرتے ہیں ان میں سے جو لوگ اپنے مذہب کی رو سے روزہ رکھتے ہیں اور ان کو ان کے اس فرض کی ادائیگی سے روکا نہیں جائیگا۔ ان کو محصول تو ادا کرنا ہی پڑے گا۔ ہر بالغ کے لیے ایک دینار مقرر کیا گیا تھا۔ رقم کے معاوضے میں متبادل چیزیں بھی ادا کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ جو لوگ بھی اس محصول کو اللہ اور اس کے رسول کی خدمت میں پیش کریں گے ان کے جان و مال کی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول ذمے رہے گی۔ جو لوگ اس محصول کو ادا نہیں کریں گے وہ خدا اور رسول کے دشمن سمجھے جائیںگے"۔

حضورؐ نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو معاذ ابن جبل کی قیادت میں الحمریوں کے شہزادوں کے پاس روانہ کیا تھا تاکہ وہ وہاں سے محصول وصول کرکے مدینہ لے آئیں۔ آپ نے یمنیوں کو متنبہ بھی کیا کہ آنے والی جماعت کو خالی ہاتھ واپس نہ کیا جائے۔ معاذ ابن جبل کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ یمن والوں کے ساتھ نرمی اور تلطف سے پیش آئیں۔ جو لوگ ابھی ابھی اسلام میں داخل ہوئے ہیں ان کے ساتھ کسی بھی قسم کی کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔

یمن کے مسلمانوں سے صرف مالی استفادہ کرنا ہی حضورؐ کا منشا نہیں تھا۔ عرب میں محصول کا ادا کیا جانا اور وصول کرنا ایک سیاسی فعل تھا۔ حکمراں یا با اقتدار لوگ اپنے ماتحتوں اور محکوموں سے ہمیشہ سے ٹیکس وصول کرتے آتے تھے۔ محصول یا زکواۃ کا وصول کرنا اب محض اس لیے تھا کہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا رسمی اظہار کریں۔ اللہ اور اس کے

Marfat.com

رسول کی بالادستی تسلیم کریں۔

مدینہ میں اتنے زیادہ وفود کا آجانا مغربی مصنفین کو یہ کہنے پر اکساتا ہے کہ حضورؐ نے جو غیر معمولی مقام حاصل کر لیا تھا اور قوت و اقتدار کا جو مظہر بن چکے تھے اس کی وجہ سے یہ وفود سر نیاز جھکانے کے لیے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے یقیناً یہ ہوا کہ حضورؐ کی شہرت اور نیک نامی عرب کی سرحدوں سے آگے بھی پہنچ چکی تھی۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ بہت سارے قبیلوں نے حضورؐ کے انتقال کے فوری بعد ارتداد کا فتنہ اٹھایا تھا۔

یہ دونوں باتیں اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں ذات گرامی کی عزت زیادہ تھی بہ نسبت آپ کے مذہب کے۔ عملی طور پر وفود روانہ کرنے کا طریقہ عرب کے بدوی قبیلوں میں بہت ہی قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا۔ سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ بنیادی طور پر بدویوں کی وفاداری اپنے قبیلے کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔

حکمران عام لوگوں کی سطح سے اونچا ہوا کرتا تھا۔ اوروں کی مدد سے دوسروں پر اپنا تسلط قائم کرتا تھا۔ ان میں اکثر و بیشتر ظالم، جاہل بے رحم اور سنگدل ہو گئے تھے۔ ان کا واحد مقصد اقتدار اور حکومت کی تلاش ہوتا تھا۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا مطیع، مغلوب یا فرمانبردار ہو کر رہنا پسند نہیں کرتا تھا اس کا نتیجہ ہمیشہ آپس کی لڑائیوں کی صورت ظاہر ہوتا تھا۔

قبیلے کا حکمران ایک مستقل خطرہ سمجھا جاتا تھا۔ قبیلے کے سربراہ بڑے ہی تدبر اور دور اندیشی سے اپنے قبیلے کے لوگوں کو حکمران کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھتے تھے۔ اس حفاظت کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ سربراہان قبیلہ جب کسی کو حکمران بنتا دیکھتے تو وفد کی صورت میں اس کے پاس جاتے تھے۔ حکمران کا فرض ہوتا تھا کہ آنے والے وفد کا خندہ پیشانی سے استقبال کرے تاکہ اس قبیلے کے آدمیوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکے۔ سربراہان قبیلہ کو مطمئن کرنے کے معنی یہ ہوتے تھے کہ پورے قبیلے کی وفاداریاں اس کو حاصل ہو جاتی تھیں اور قبیلے والوں کو حکمران کی سرپرستی حاصل ہو جاتی تھی:

Marfat.com

اگر حکمران سربراہوں کا خندہ پیشانی سے استقبال نہ کرتا تو اس کو ڈر لگا رہتا تھا کہ وہ لوگ کہیں اس کے حریف یا رقیب سے مل کر اس کی قوت اور اس کے اقتدار میں اضافہ نہ کر دیں۔

اسی لیے یہ دستور تھا کہ آنے والے وفد کا گرمجوشی سے استقبال کیا جائے۔ ان کی ضیافت کی جائے۔ کئی دن تک ان کی مہمان نوازی کی جائے۔ واپس جانے لگیں تو تحفے تحائف پیش کیے جائیں۔ ان کو بہترین پوشاک پہنائیں۔ جب مہمان واپس جانے لگیں تو ان کا لباس اتنا دیدہ زیب، مرصع اور جاذب نظر ہو کہ خوشی میں ان کو اپنے آپ پر سلیماں کا دھوکہ ہو۔ یہ ظاہری ٹیپ ٹاپ حکمران کی شہرت، فیاضی اور سخاوت کو عملی طریقے سے لوگوں کے سامنے پیش کرتی تھی۔

اقوام متحدہ سے انفرادی طور پر امریکنوں، انگریزوں اور فرانسیسی حکومتوں کا آج جو ربط قائم ہے اور اس کی تہہ میں جو جذبہ کارفرما نظر آتا ہے وہی صورت اور وہی تعلق اس وقت حکمران اور قبیلوں میں پایا جاتا تھا۔

وفاداری بشرط استواری کے وہ قائل تھے۔ نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ اقوام متحدہ ایک سیاسی تنظیم ہونے کے باعث لوگوں کی قومی وفاداری کی حس کو اپنی طرف جیسے متوجہ کرتی ہے اسی طریقے سے حکمران اور قبائل میں ایک سیاسی ربط اور جذباتی وفاداری کا میلان پایا جاتا تھا۔

قبیلے کے سربراہوں کو حکمرانوں کی خدمت میں حاضری کا موقع ملنا نہ صرف غنیمت بلکہ فائدہ مند سمجھا جاتا تھا اور ان کے لیے یہ سنہری موقع ہوا کرتا تھا۔ ان مواقع پر ان کو جو تحفے ملتے تھے ان میں روپیہ پیسہ، گھوڑے، اونٹ، ہتھیار اور دیدہ زیب ملبوسات شامل رہتے تھے۔ ان تحائف کو لیے ہوئے جب وہ اپنے گھر لوٹتے تھے تو عام لوگوں کی نظروں میں ان کی وقعت اور بڑھ جاتی تھی۔

ہر سربراہ کو اس کی شخصیت، اہمیت اور منصب کے پیش نظر تحفے دیے جاتے تھے۔ یہ دیکھا جاتا تھا کہ قبیلے پر اس کا کس حد تک اثر ہے۔ جس سربراہ کو گھٹیا قسم کا تحفہ دیا جاتا تھا وہ اس میں اپنی تذلیل سمجھتا تھا۔ ہم حنین میں دیکھ چکے ہیں کہ جب حضورؐ نے بنی سلیم کے سردار

Marfat.com

عباس ابن مرداس کو دس اونٹ انعام کے طور پر دیے اور دوسرے قبیلوں کے سرداروں کو سو سو تو اس میں اس نے اپنی ہتک محسوس کی اور حضورؐ سے شکوہ شکایت کرنے لگا۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضورؐ نے مکہ میں نبوت کے ابتدائی دنوں میں جس سیدھے سادے عقیدے کی تلقین کی تھی وہ عقیدہ اب قانون کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ عقبہ کی پہلی بیعت کے موقع پر جو لوگ مسلمان ہو رہے تھے ان سے کہا گیا تھا کہ وہ صرف ایک خدا کی عبادت کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں نہ کسی روح کو اس کا شریک بنائیں نہ کسی جسم کو اس کی جگہ دیں۔ ان سے کہا گیا تھا کہ چوری نہ کریں۔ شیر خوار بچوں کو نہ ماریں۔ پڑوسیوں کی عیب جوئی نہ کریں۔ لوگوں کی غیبت نہ کریں۔ حضورؐ کے ہر حکم کی تعمیل کریں۔ جن لوگوں نے اپنے عہد کو پورا کیا ان کو جنت کی بشارت دی گئی۔

اب یمن میں جو لوگ مسلمان ہوئے تھے ان کے لیے تفصیلی ہدایات کی ضرورت محسوس کی گئی ان کو نماز پڑھنا سکھانا تھا۔ عمرے اور حج کی تفصیلات بتلانی تھی۔ قبیلہ وارانہ جھگڑوں کی اب قدیم روایات کے تحت نہیں چکایا جا سکتا تھا ان کے جھگڑوں کے فیصلے اسلامی قانون کے تحت کیے جاتے تھے۔ جو لوگ اپنے قبیلوں کی رسومات کو باقی رکھنا چاہتے تھے ان کو تلوار دکھائی گئی۔ نماز سے پہلے وضو کرنا ضروری ٹھہرایا گیا۔ وضو میں پہلے دونوں ہاتھوں کو پہنچوں تک صاف کیا جاتا ہے پھر کلی کرنی پڑتی ہے۔ ناک کو صاف کرنا پڑتا ہے۔ پھر چہرہ دھویا جاتا ہے۔ دونوں ہاتھ کہنیوں تک صاف کیے جاتے ہیں۔ پھر سر کا مسح ہوتا ہے۔ آخر میں دونوں پیر ٹخنوں تک دھوئے جاتے ہیں۔

پانی کی غیر موجودگی میں تیمم کی اجازت ہے۔

زکوٰۃ اور جزیہ کی ادائیگی کے لیے بھی اصول وضع کیے گئے زرعی اور غیر زرعی زمینات کے لیے علیحدہ علیحدہ ٹیکس مقرر کیے گئے۔ اونٹوں، بھیڑوں اور بکریوں کے ٹیکس مختلف رکھے گئے۔

اب اسلام ایک حکومت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ روزمرہ زندگی میں جس بات سے بھی انسان کو سابقہ پڑتا ہے ان سب کو اسلام نے اسلامی قانون کے احاطے میں لے لیا۔

۶۳۲ء میں جب حج کا زمانہ آیا تو فیصلہ فرمایا کہ مسلمان حضورؐ کی سرکردگی میں حج کے مناسک

Marfat.com

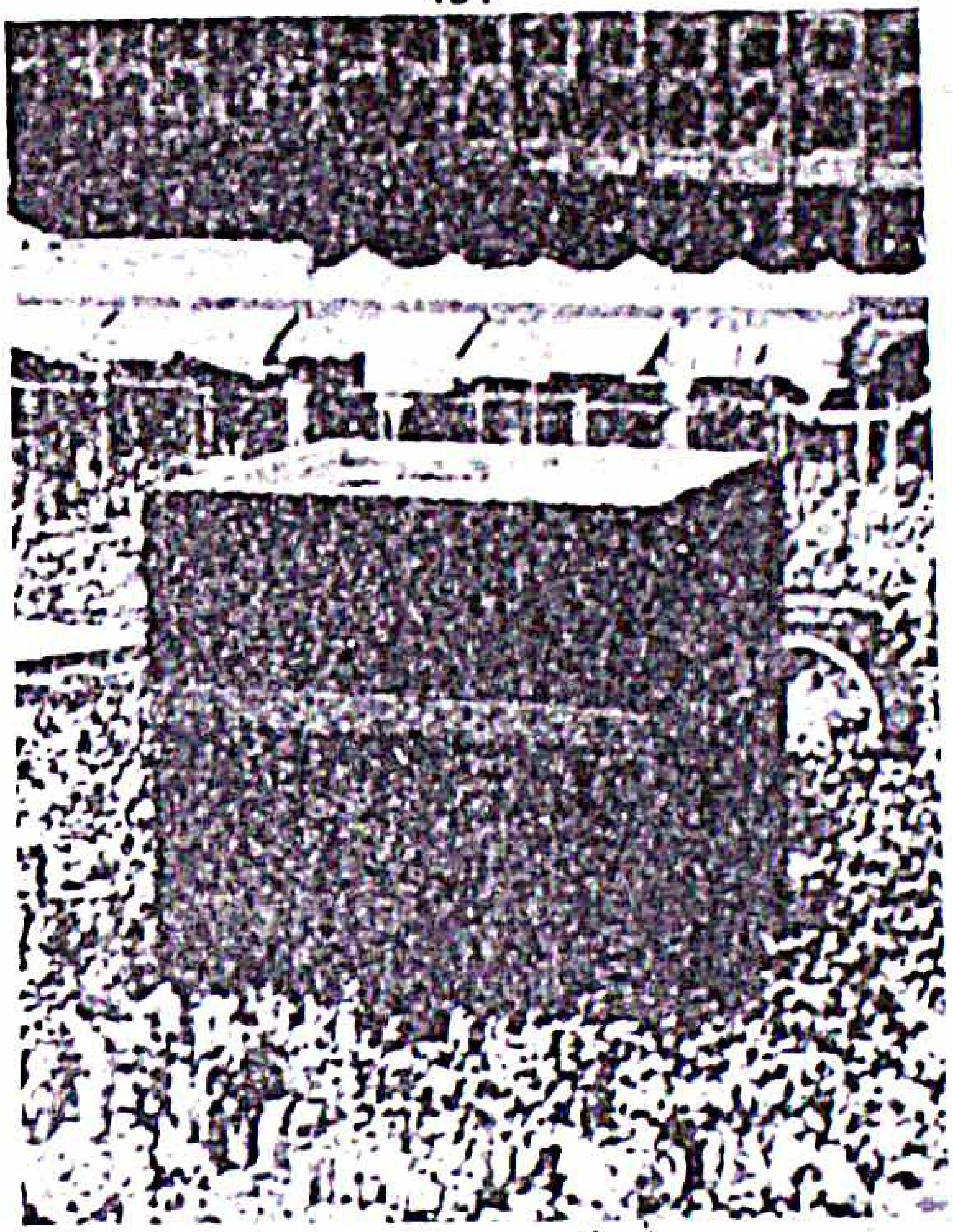

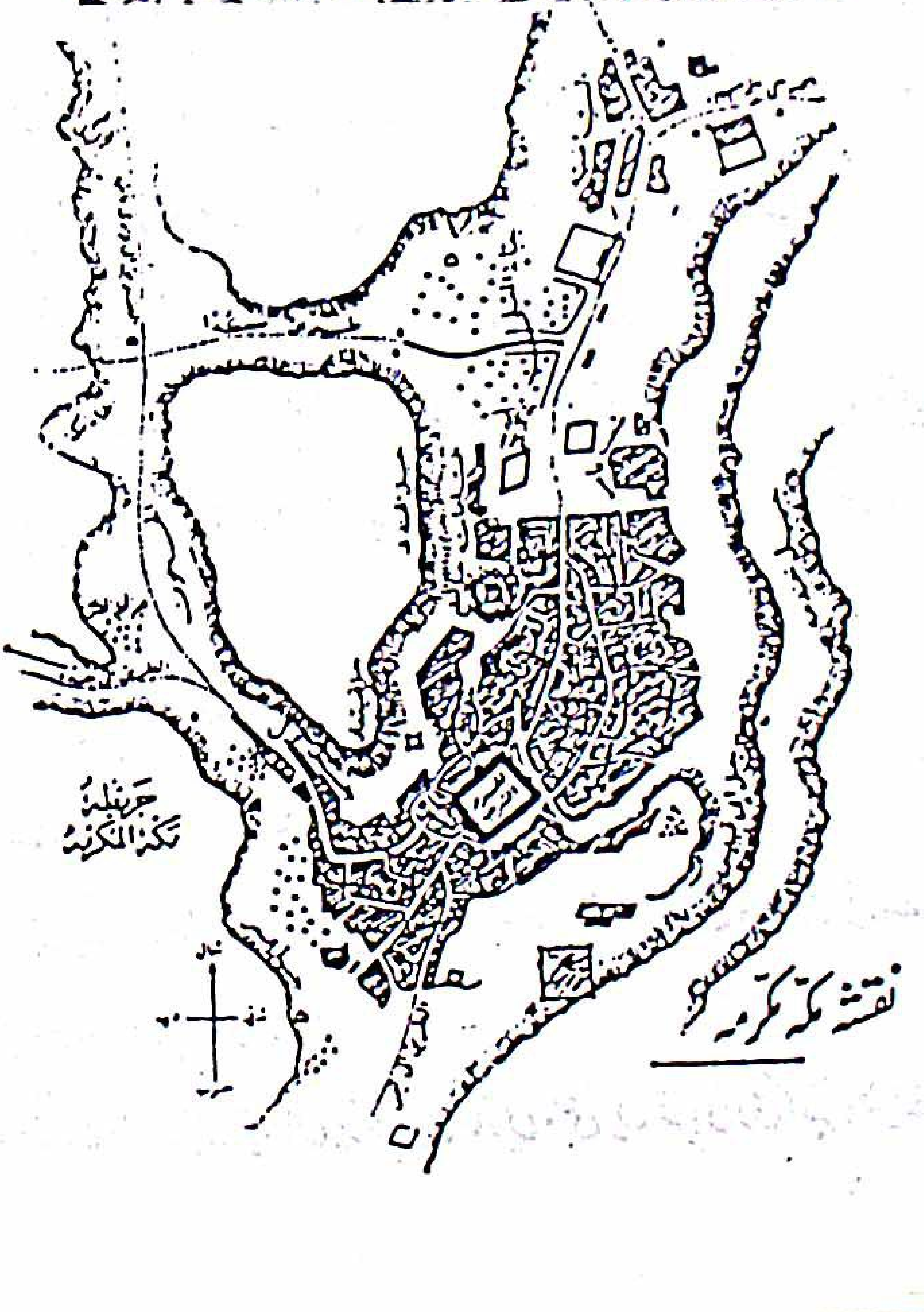

نقشہ مکہ مکرمہ

Marfat.com

ادا کریں۔ ۲۰ فروری ۶۳۲ء کو حضورؐ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ عاشقوں کے جھرمٹ میں آپ آگے بڑھ رہے تھے شمع نبوت کے چاروں طرف جدھر دیکھو پروانے ہی پروانے نظر آتے تھے۔ لوگ پیدل بھی تھے۔ اونٹوں پر بھی سوار تھے جس طرف نظر اٹھائیں لوگوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آرہا تھا۔

حضورؐ کا یہ آخری حج تھا۔ ۹ مارچ ۶۳۲ء کو یہ حج ادا ہوا۔ یہ حج اپنی نوعیت میں ایک امتیازی شان لیے ہوا تھا۔ حضورؐ نے جو کچھ بھی اس تاریخی موقع پر کہا اس کا اعادہ ہمیشہ ہوتا رہیگا۔ اس کی اتباع ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ مورخین نے حضورؐ کے اس خطبہ کو محفوظ کیا ہے۔ آپ نے اپنی عمر کے آخری زمانے میں ہزاروں مسلمانوں کی موجودگی میں حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیا تھا۔ اس میں سود کی حرمت، خانگی جائیداد پر انفرادی ملکیت کا حق، قبیلے اور خون کی بنیادوں پر ایک دوسرے کا خون نہ بہانا، نسال کبیہ کی منسوخی، قمری مہینوں کا استعمال، عورتوں سے تلطف اور مہربانی کا سلوک، مردوں کو یہ ہدایت کہ بیویاں اللہ کی امانت ہیں اور ان سے سلوک کا حساب و کتاب اللہ کو دینا ہوگا، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو بھائی سمجھنا، نسلی غرور کی خدمت کے تعلق سے ارشاد فرمایا۔ اپنے خطبے کے اختتام پر حضورؐ نے سامعین سے سوال کیا۔

"کیا میں نے تم کو وہ سب باتیں نہیں کہدیں جن پر تمکو عمل پیرا ہونا چاہیئے؟ کیا میں نے اپنے فرض کو پورا نہیں کردیا؟ لوگوں نے بہ آواز بلند جواب دیا" ہاں۔ خدا کی قسم آپ نے اپنے فرض کو پورا کردیا ہے"

حضورؐ نے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف کیں اور فرمایا۔

"اے خدا تو گواہ رہنا"

حج میں جتنے مناسک اور رسومات ادا ہوئے حضورؐ نے ان کی ادائیگی کے وقت ہر چھوٹے بڑے عمل کی وضاحت فرمائی۔

حضورؐ نے مزدلفہ میں شیطان پر کنکریاں ماریں۔ منیٰ میں قربانی دی کعبہ کا طواف کیا۔ حج

Marfat.com

کے لیے خاص لباس چنا اور اسے پہننا یہ لباس احرام کہلاتا ہے۔

حج کے اختتام پر آپ نے لوگوں کو واپسی کی اجازت دی۔ مدینہ کو واپس ہونے کے لیے آپ نے سفر شروع کیا۔ اس کے بعد آپ نے مکہ کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔

اس حج کو اسلامی تاریخ میں حجۃ الوداع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حجۃ الوداع کے بعد مئی ۶۳۲ء میں حضورؐ نے شام کی مہم کے لیے لوگوں کو جمع کیا۔ اس مہم کی خاص اور دلچسپ بات یہ رہی کہ اس مہم پر روانہ ہونے والی فوج کی قیادت کے لیے آپ نے اسامہ بن زید کو منتخب کیا۔ اسامہ کی عمر اس وقت ۲۰ سال تھی۔ ان کو جنگی قیادت کا تجربہ بھی نہیں تھا۔ اسامہ کے والد بزرگوار زید ابن حارثہ موتہ کی جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔

جوان بیٹے کے لیے یہ بات بالکل زیب دیتی تھی کہ اپنے باپ کی شکست اور شہادت کا بدلہ پورے طریقے سے اپنے دشمنوں سے لے۔ ذاتی انتقام کا جذبہ پھر عود کرتا نظر آ رہا ہے

عرب کی روایات کے تحت ایک نوجوان لڑکے کا قیادت کے لیے انتخاب کوئی اچنبھے کی بات تو نہیں تھی۔ اس کے باوجود یہ انتخاب لوگوں میں چہ میگوئیوں کا باعث بنا۔

جو لوگ اپنے آپ کو تجربہ کار اور جنگی ماہر سمجھ بیٹھے تھے وہ مشتعل ہو ہو کر اس انتخاب پر تنقید کر رہے تھے۔ ان کے خیال میں ان عمر رسیدہ اور تجربہ کار لوگوں کی موجودگی میں ایک ایسے لڑکے کو سرداری کے لیے چنا گیا تھا۔ جس کے ابھی داڑھی مونچھ بھی نہیں نکلے تھے۔

عرب مورخین اس مہم کے بارے میں خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس مہم کا نتیجہ کیا نکلا ہم کو اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ ابن اسحٰق نے مختصراً بیان کیا ہے کہ وہ فوجیں کسی بندرگاہ سے چند آدمیوں کو گرفتار کر کے انہیں قیدی بنا کر لائی تھیں۔

حضورؐ کی صاحبزادی سیدہ فاطمہؓ کی شادی حضرت علیؓ ابن ابی طالب سے ہوئی تھی۔ حضرت فاطمہؓ کے بطن سے دو صاحبزادے تولد ہوئے۔ ایک کا نام حسنؓ تھا اور دوسرے کا حسینؓ۔ چونکہ حضورؐ کی اولاد میں یہی دو لڑکے تھے اس لیے حضورؐ ان کو بہت

Marfat.com

بہت عزیز رکھتے تھے۔ اپنے آپ کو ان دونوں کے لیے بالکل وقف کر چکے تھے۔ حضورؐ کو ان کے ساتھ کھیلنے سے زیادہ کسی اور بات میں خوشی نہیں ہوتی تھی۔ نماز کے دوران حضورؐ جب سجدہ میں جاتے تھے تو یہ دونوں صاحبزادے حضورؐ کی گردن پر بیٹھ جاتے تھے یا آپ کی پشت پر سوار ہو جاتے تھے اور نماز کے دوران آپ نے اپنی پشت پر بیٹھ جانے سے کبھی بھی بے صبری کا اظہار نہیں کیا۔ حسنؓ اور حسینؓ کو ان کے دل بھرنے تک اپنی پیٹھ پر بیٹھنے دیتے تھے۔ اپنے سجدوں کو طویل کرتے جاتے تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں بچے گر نہ جائیں آپ سجدہ ہی میں پڑے رہتے تھے۔ اگرچہ کہ آپ کی اولاد میں لڑکے نہیں تھے لیکن آپ کا گھر اکثر و بیشتر خاندان کے دوسرے رشتہ داروں اور رشتے کے بھائیوں سے بھرا پڑا رہتا تھا۔ آپ بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ بچوں سے کھیلنے میں آپ کو لطف آتا تھا۔

حضورؐ کی زندگی کے آخری دو سال خصوصاً مکہ کی فتح کے بعد اور حنین میں ہوازن کی شکست کے بعد بے انتہا مصروفیت کے ہو گئے تھے۔ مختلف وفود کی مسلسل آمد، ہر وفد سے تفصیلی بات چیت، اسلام کی وضاحت، مذہب کی توضیح، قانونی اور ریاستی مسائل کے بارے میں مختلف فیصلے آپ کے روزانہ کے مشاغل تھے۔

بہت سے جزوی مسائل ہیں جن میں قانون اور نظم و نسق دونوں شامل ہیں۔ فیصلے دینے پڑتے تھے۔ یہ فیصلے احادیث اور مسلم روایات کا حصہ بن گئے۔ لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واجب التعمیل قرار دیے گیے۔ یہ وہ فیصلے ہیں جن میں تبدیلی یا ترمیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان میں سے بہت سے ایسے فیصلے ہیں جن کے تعلق سے حضورؐ پر وحی نہیں نازل ہوئی تھی۔ اگر وحی نازل ہوتی تو وہ قرآن میں محفوظ رہتی۔ اس کے باوجود حضورؐ کے ذاتی فیصلوں کو احادیث میں شامل کر کے مسلمانوں کے لیے ایک قانون کی شکل میں پیش کیا گیا۔

عورتوں، بچوں اور غلاموں سے گزر کر حضورؐ کی مہربانیاں جانوروں پر تک تھیں۔

Marfat.com

آپ نے گھوڑوں اور گدھوں کے سروں پر مارنے کی ممانعت کی ہے۔ ان جانوروں کے بال جو ان کی خوبصورتی کی علامت ہیں کاٹنے سے منع فرمایا اور ساتھ ہی ان کی دموں کو کاٹنے سے روکا آپ ہمیشہ خندہ پیشانی سے اپنے مہمانوں کا استقبال کرتے تھے۔ شگفتگی اور مزاح کا پہلو بھی آپ کی زندگی میں ہمیں ملتا ہے۔ اپنے قریبی صحابہ سے آپ نے قولاً اور عملاً مذاق بھی کیا ہے۔ اکثر و بیشتر آپ مسکراتے تھے۔ قہقہہ لگا کر آپ کبھی نہیں ہنسے۔ قہقہہ لگا کر نہ ہنسنے کی عادت عربوں کی ایک قومی خصوصیت ہے۔ پورا منہ کھول کر زوردار قہقہہ لگانا جلیا کر یوروپین لوگوں کی عادت ہے آج بھی عربوں کے نزدیک ایک گری ہوئی بات سمجھی جاتی ہے۔ جون کا مہینہ تھا اور عیسوی سنہ ۶۳۲ء۔ ایک رات حضورؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام سے فرمایا کہ خدا نے مجھے قبرستان جاکر مردوں کے لیے دعا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اپنے آزاد کردہ غلام کو لیے ہوئے جنت البقیع تشریف لے گئے۔ قبروں کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ اہل قبور کو مخاطب کر کے کہا۔

"اے قبر میں سونے والو تم پر سلامتی ہو۔ تم بڑے مزے میں ہو"۔

تم موجودہ زندہ لوگوں سے بہتر ہو۔ رنجش اور نفاق رات کی تاریکیوں کے پردوں کی طرح یکے بعد دیگرے اپنی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔ جو گزر چکے ہیں وہ آنے والوں سے بہتر ہیں"۔

آپ جب فاتحہ اور دعا سے فارغ ہو چکے تو اپنے خادم کو لیے ہوئے گھر واپس تشریف لائے۔ دوسرے دن صبح میں آپ نے اپنے سر میں شدت کا درد محسوس کیا آپ نے کوشش کی۔ کہ اپنی ہر بیوی کے پاس جاکر ان سب سے ملاقات کریں۔ جب آپ بی بی میمونہؓ کے کمرے میں تھے آپ پر غشی طاری ہو گئی۔ آپ کی تمام بیویاں اطراف جمع ہو گئیں۔ آپ نے ان سب سے اجازت مانگی کہ علالت کے دوران آپ کو بی بی عائشہؓ کے کمرے میں ٹھہرنے دیا جائے۔ تمام بیویاں الگ الگ اپنے اپنے کمروں میں رہا کرتی تھیں۔ بیویوں نے آپ کو اجازت دے دی کہ علالت کے دوران آپ بی بی عائشہؓ کے کمرے میں رہ سکتے ہیں۔

جن لوگوں کو اسامہ کے ساتھ شام کی سرحدوں پر روانہ کیا جا رہا تھا وہ اب بہت لیت و لال سے کام لے رہے تھے۔ اپنی تیاریوں میں سستی دکھا رہے تھے۔ حضورؐ میں اس وقت تک اتنی طاقت تھی کہ اسامہ کو جنگ کا علم عطا کر سکیں یہ رسم قبیلی کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ اس رسمی تقریب کے بعد حضورؐ نے ایک رومال کو اپنے سر کے اطراف سختی سے کس لیا تاکہ سر کے درد میں کچھ افاقہ ہو اب آپ نماز کے لیے مسجد جانے کی فکر میں تھے۔

حضورؐ کی علالت کے پیش نظر اسامہ کے لشکر کی روانگی میں اب تاخیر ہو رہی تھی حضورؐ کو سخت بخار چڑھ چکا تھا۔ سارا بدن حرارت سے جل رہا تھا۔ اس تیز بخار کی حرارت کو دور کرنے کے لیے آپ نے اپنی بیویوں سے کہا کہ پانی کا ٹب لایا جائے۔ پانی کے ٹب میں آپ بیٹھ گئے۔ آپ کی ازواج مطہرات نے آپ پر ٹھنڈا پانی ڈالنا شروع کیا۔ یہاں تک ڈالا کہ حضورؐ بس بس کہہ کر انہیں مزید پانی ڈالنے سے روک دیا۔

حضورؐ نے علالت کے باعث امامت کے قابل اپنے آپ کو نہ پاکر حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا کہ وہ آپ کی جگہ لیں اور لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ ایک موقع پر جبکہ ابوبکرؓ مسجد میں نہیں تھے تو عمرؓ بن خطاب خود سے کھڑے ہو گئے اور امامت کے فرائض انجام دینا ہی چاہتے تھے کہ حضورؐ نے ان کی آواز کو پہچان کر اپنے بستر پر ہی سے زور سے آواز دی ”نہیں نہیں صرف ابوبکرؓ“

بی بی عائشہ کے کمرے کا دروازہ بالکل مسجد نبوی میں کھلتا تھا اور حضورؐ چلمن کے ذریعہ نمازیوں کو دیکھ سکتے تھے۔

حضرت عمرؓ کی پیش قدمی سے غالباً حضورؐ کو ڈر ہوا کہ کہیں آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ میں رقابت نہ ہو جائے۔ اس لیے آپ یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نائب ہیں۔

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ اے مہاجرین۔ انصار کے ساتھ لطف و کرم اور مہربانی سے پیش آؤ۔ دوسرے لوگوں میں تو اضافہ ہوگا مگر انصار اپنی اکثریت میں تو اضافہ

Marfat.com

نہیں کر سکتے۔ انصار ہمیشہ سے میرے لیے سہارا ہیں۔ میرے سکون کا باعث ہیں۔ انصار میں جو لوگ اچھے ہیں ان سے بہتر سلوک کیا جائے۔ جن میں خامیاں ہیں ان کی نظر انداز کر کے درگذر کیا جائے۔

حضورؐ کی چند بیویاں جمع ہو کر اور اپنے ساتھ اور عورتوں کو بھی شریک کر کے حضورؐ کو مجبور کرنے لگیں کہ آپ دوا پئیں۔ حضورؐ کے چچا عباسؓ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بھی عورتوں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ عورتیں اپنے مقصد میں کامیاب ہوئیں اور انہوں نے حضورؐ کو دوا پلا کر چھوڑیں۔

حضورؐ نے دوا پینے کے بعد ان عورتوں سے سوال کیا کہ دوا پلانے پر وہ اتنی زیادہ مصر کیوں تھیں۔ عورتوں نے جواب دیا کہ انہیں ڈر تھا کہ حضورؐ کو کہیں نہ ہو گئی ہو۔ حضورؐ نے فرمایا کہ خدا آپ کو کبھی ایسی بیماری نہیں دے گا۔

ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق حضورؐ نے ان ساری عورتوں کو حکم دیا کہ حفظ ما تقدم کے طور پر وہ خود بھی کچھ نہ کچھ دوا تیار کر کے کھالیں موجودہ علم کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ حضورؐ کو نمونیہ ہو گیا تھا۔ اسی نمونیہ کے اثر سے آپ کا انتقال ہوا۔ جب آپ آدھی رات کو قبرستان تشریف لے گئے تھے تو وہاں غالباً آپ پر سردی کا حملہ ہوا تھا۔ دوسرے دن صبح کو آپ کے سر میں شدت کا درد محسوس ہوا اس کے بعد آپ کو بخار چڑھ گیا۔ یہ بخار تیز تر ہوتا گیا۔ اپنی علالت کے دسویں دن جبکہ شدت کا بخار تھا آپ کو کپکپی شروع ہوئی۔ سارا جسم درد سے کھنچنے لگا۔ آپ پر نیم بے ہوشی طاری ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو جبکہ فجر کی نماز ادا ہو رہی تھی اور حضرت ابو بکرؓ امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے بی بی عائشہ کے کمرے کا دروازہ کھلتا ہے۔ حضورؐ مسکراتے ہوئے صحن مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہیں کہ نماز جاری رکھی جائے۔ آپ زمین پر بیٹھ جاتے ہیں جب نماز ختم ہو چکی تو حضرت ابو بکرؓ حضورؐ کے پاس آئے۔ خوشی خوشی سے کہا کہ اے اللہ کے

Marfat.com

رسول۔ آج آپ بہتر نظر آتے ہیں۔ اللہ کا فضل وکرم آپ کے شامل حال ہے۔ مزاج اقدس خاصا بہتر نظر آتا ہے۔ ہماری یہی خواہش ہے۔ ہماری یہی تمنا ہے۔

یہ خیال کرتے ہوئے کہ حضورؐ صحت یاب ہو رہے ہیں حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ سے اجازت چاہی کہ وہ اپنے افراد خاندان سے ملنے کے لیے اپنے گھر جانا چاہتے ہیں مدینہ کے دوسرے سرے پر ایک بستی تھی حضرت ابوبکرؓ کے اہل وعیال وہاں رہا کرتے تھے۔

حضورؐ گھر کے اندر تشریف لائے۔ بی بی عائشہ کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔ اپنے دانتوں کو کئی بار اچھی طرح سے صاف کیا۔ پھر لیٹ گئے۔

دن جیسے جیسے بڑھ رہا تھا۔ ویسے ویسے گرمی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا آپ لیٹے ہی رہے۔ اچانک بی بی عائشہؓ نے محسوس کیا کہ حضورؐ کا سر بھاری ہوتا جا رہا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔

"میرے اللہ مجھے معاف کر دے۔"

آپ کی آنکھیں ایک طرف لگ گئیں۔ بی بی عائشہ نے حضورؐ کے یہ آخری الفاظ سنے "اے اطمینان پانے والی روح۔ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ تو اس سے راضی۔ وہ تجھ سے راضی۔ تو میرے ممتاز بندوں میں داخل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔" (سورۂ فجر)

مسلمان کا رسول۔ پیغمبر عرب۔ اب اپنے خدا سے ملنے کے لیے رخصت ہو گیا۔ آفتاب رسالت غروب ہو گیا۔

بی بی عائشہ نے حضورؐ کا سر مبارک اپنے سینے سے سرکایا اور آہستہ سے نیچے رکھ دیا۔ اپنے سہاگ کے لٹنے کا ماتم شروع کر دیا۔ سراپا اضطراب بن گئیں۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے بال بچوں سے ملنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہ دن تمام باہر ہی رہے۔ قریبی لوگوں میں حضرت عمرؓ وہاں موجود تھے۔ جب ان کو حضورؐ کے انتقال کی خبر سنائی گئی تو انہیں یقین نہ آیا۔ غضب ناک ہو کر کہنے لگے کہ "حضورؐ کو مردہ کہنے والے بے ایمان ہیں" حالت اضطراب میں انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم وہ مرے نہیں ہیں۔ وہ اسی طریقے سے خدا کے پاس گئے ہیں۔ جیسے

Marfat.com

موسیٰ اپنے خدا سے ملنے گئے تھے ۔ چالیس دن تک وہ اپنے لوگوں سے چھپے رہے ۔ وہ اس وقت اپنے لوگوں میں پھر سے پہنچے جبکہ لوگ ان کو مردہ سمجھ بیٹھے تھے ۔ خدا کی قسم ۔ رسول اللہ اس طریقے سے واپس آئیں گے جس طرح موسیٰ واپس آئے تھے ۔ واپس آکر آپ ان لوگوں کے ہاتھ پیر کاٹ دیں گے جو آپ کو مردہ کہہ رہے ہیں۔"

اسی اثناء میں حضرت ابو بکرؓ کو بھی حضورؐ کی وفات کی اطلاع مل گئی ۔ وہ جلدی جلدی مسجد نبوی پہنچے ۔ حضرت ابو بکرؓ چپکے سے ۔ مجمع کی نظر بچاتے ہوئے ۔ دروازہ کھول کر بی بی عائشہ کے کمرے میں داخل ہوئے اسی کمرے میں حضورؐ کی نعش مبارک رکھی ہوئی تھی ۔ نعش پر یمنی زرکاری کی چادر اڑھائی گئی تھی ۔ چادر کے قریب ایک کونے کو آہستہ سے سرکا کر حضرت ابو بکرؓ نے حضورؐ کے چہرہ مبارک کو بوسہ دیا اور کہا "میرے آقا ۔ آپ مجھے میرے ماں باپ سے زیادہ عزیز ہیں ، مولیٰ کی مرضی کے مطابق آج آپ نے بھی موت کا مزہ چکھ لیا "چادر کو پھر برابر سے اپنی جگہ پر رکھ کر حضرت ابو بکرؓ مسجد کے صحن میں گئے ۔ یہاں لوگ کا اژدہام تھا ۔ شدت غم سے بہک کر اب بھی حضرت عمرؓ لوگوں سے الجھ رہے تھے ۔ اپنی مخاطبت جاری رکھے ہوئے تھے ۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ نے کہا عمرؓ ہوش میں آؤ ۔ عمرؓ نرم ہو جاؤ ۔ عمرؓ خاموش رہو ۔

حضرت عمرؓ پر جذبات کا جو عالم طاری تھا اس کی وجہ سے وہ حضرت ابو بکرؓ کے کہنے کو سن نہ سکے ۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ چند قدم آگے بڑھ گئے ۔ لوگوں کو اپنے قریب بلایا ۔ لوگ حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر حضرت ابو بکرؓ کے اطراف جمع ہو گئے ۔

حضرت ابو بکرؓ نے آہستہ سے کہا کہ لوگو تم میں سے جو محمدؐ کو پوجتا تھا یا محمدؐ کی عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ محمدؐ اب وفات پا چکے ہیں ۔ جو خدا کو پوجتا ہے اور خدا کی عبادت کرتا ہے وہ کان کھول کر سن لے کہ خدا زندہ ہے ۔ دائم و قائم ہے ۔ اس کو فنا نہیں ۔

اس کے بعد آپ نے قرآن کے سورہ آل عمران کی ۱۴۴ ویں آیت تلاوت فرمائی ۔

Marfat.com

"اور محمدؐ تو صرف خدا کے پیغمبر ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو گزرے ہیں بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو الٹا پھر جائیگا۔ یعنی مرتد ہو جائے گا تو خدا کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ خدا شکر گزاروں کو بڑا ثواب دے گا۔"

یادگار تاریخیں

حضور کی پیدائش	۵۷۰ء
بعثت	۶۱۰ء
تبلیغ کی ابتدار	۶۱۳ء
ہجرت حبشہ	۶۱۵ء
مقاطعہ بنی ہاشم	۶۱۷ء سے ۶۲۰ء
خدیجہؓ کی وفات	۶۱۹ء
بیعت عقبہ اول	۶۲۱ء
بیعت عقبہ دوم	۶۲۲ء
ہجرت مدینہ	۶۲۲ء
غزوہ بدر	۶۲۴ء
غزوہ احد	۶۲۵ء
غزوہ خندق	۶۲۷ء

Marfat.com

خسرو پرویز کا قتل	۶۲۸ء
صلح حدیبیہ	۶۲۸ء
غزوہ خیبر	۶۲۸ء
عمرہ کی ادائیگی	۶۲۹ء
جنگ موتہ	۶۲۹ء
فتح مکہ	جنوری ۶۳۰ء
غزوہ حنین	جنوری ۶۳۰ء
مدینہ کی واپسی	مارچ ۶۳۰ء
سال وفود	۶۳۱ء
حجۃ الوداع	۶۳۲ء
حضورؐ کا وصال	جون ۶۳۲ء

فتوحات

جیسے ہی حضورؐ کے انتقال کی خبر عام ہوئی مدینہ کے لوگ جمع ہوئے تاکہ بنی خزرج کے سعد ابن عبادہؓ کو حضورؐ کا جانشین بنائیں۔

مہاجرین اور انصار کی آپس کی رقابتیں جو حضورؐ کی ذات گرامی کی وجہ سے دبی ہوئی تھیں فوراً ابھر کر سامنے آئیں۔ ضعیف اور کمزور ابوبکرؓ نے عوام کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کہا کہ جانشینی کے لیے صرف قریش کا آدمی ہی قابل قبول ہوگا۔ چند بدوی جو وقتی طور پر وہاں موجود تھے ان کی مدد سے اور مکّے والوں کے تعاون سے حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بن گئے۔ مسلمانوں پر سے بڑا نازک وقت گزر گیا۔ وہ وقت ایسا تھا جس میں اسلامی برادری میں اس مسئلہ پر بڑی طرح خلفشار پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔

خلافت کے فتنہ کو دبایا ہی گیا تھا کہ خبریں آنے لگیں کہ عرب کے بہت سے قبیلے ارتداد کی طرف مائل ہیں۔ زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر رہے ہیں حضورؐ کے انتقال کے بعد بارہ مہینے مختلف قسم کی لڑائی جھگڑوں کی نذر ہوئے۔ ان بارہ مہینوں میں اتنا خون بہا ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں ہونے والی تمام لڑائیوں میں بھی اتنا خون نہیں بہا ہوگا۔ مسلمانوں کے کمانڈر انچیف خالد ابن ولیدؓ تھے۔

حضورؐ کے انتقال کے ایک سال بعد عرب کے تمام قبیلوں پر قابو پا لیا گیا

Marfat.com

یہ قابو وعظ و نصیحت یا تلقین و تدبر کی بنیادوں پر نہیں تھا بلکہ فوجی بل بوتے پر تھا۔

حضورؐ کے انتقال کے بعد ہر طرف بغاوت کا جو دور دورہ رہا ہے اس زمانے کو اسلامی تاریخ فتنہ ارتداد سے موسوم کرتی ہے۔ ہزاروں سال سے عربوں نے ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے اپنا وقت کاٹا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی لڑائیاں بے مقصد ہوا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود لڑائیاں ان کی زندگی کا جزو تھیں۔ ان کا قومی شعار تھیں۔ ان کی رسم و راہ تھیں۔

مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے سے منع کیا گیا جن کی فطرت اور قماش میں لڑائی جھگڑے بسے ہوئے ہوں ان کو کس طریقہ سے پُرامن رہنے کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے؟ حضورؐ نے لوگوں کو موتہ کی جنگ پر بھجوا کر اسی منطق کو ثابت کیا تھا۔ ۶۳۳ء اور ۶۳۴ء کے موسم سرما میں مسلمانوں کے تین دستے مدینہ سے روانہ ہوتے ہیں۔ فلسطین اور شام پر حملہ کرتے ہیں اسی اثناء میں مشرقی عرب کے قبیلے EUPHRATES کی طرف پیشقدمی کرتے ہیں اور حیرا پر قبضہ کر لیتے ہیں۔

۲۶ر اگست ۶۳۶ء کو مسلمانوں کے ہاتھوں بازنطینیوں کو یرموک کے میدان میں شکست فاش ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے قبضے میں سارا شام آجاتا ہے۔

فروری ۶۳۷ء میں مسلم فوجوں نے قادسیہ کے مقام پر ایرانی فوجوں کو تباہ و تاراج کر دیا۔ قادسیہ حیرا کے جنوب میں تھا۔ تمام عراق مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔

ایران کے دارالسلطنت پر مسلمان قابض ہو گئے یہ دارالسلطنت اس مقام پر تھا جہاں اب بغداد واقع ہے۔

حضورؐ کے انتقال کے ۲۰ سال بعد عربوں کی فتوحات

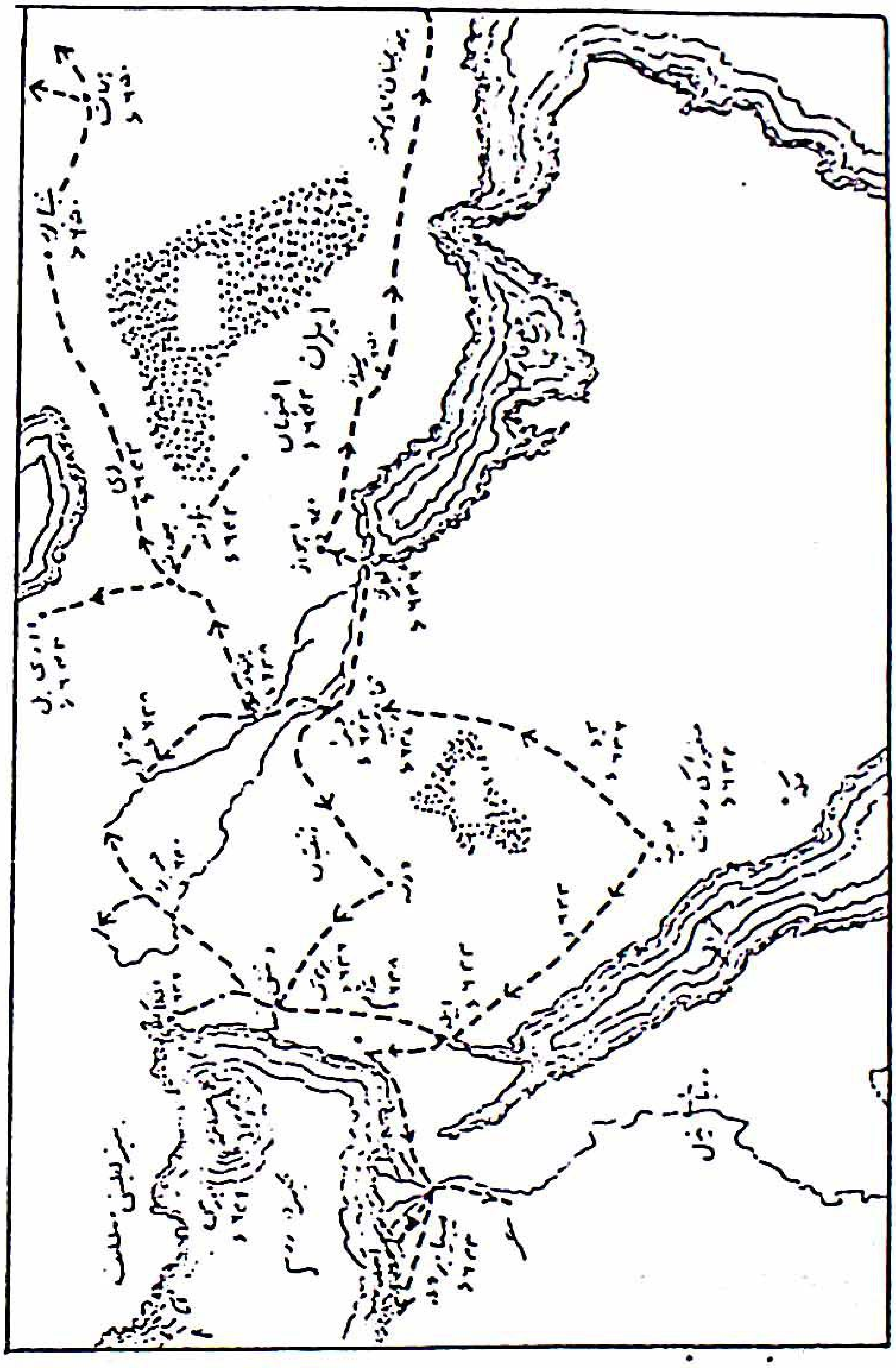

Marfat.com

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ نے کس محنت اور تدبر کے ساتھ قبیلہ وارانہ وفاداری کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ افراد کی اپنے قبیلے سے وفاداری اسلام کی وحدت کے منافی تھی اور نقصان دہ بھی۔ حضورؐ کے انتقال کے ایک سال بعد جب ارتداد کے فتنے کو کچل دیا گیا تو سارا عرب مسلمان ہوگیا۔ اب اسلامی وفاداری کو کسی اور وفاداری کی رقابت کا خطرہ نہیں رہا۔ ہر قبیلہ مسلمان ہو چکا تھا۔ قبیلے کا ہر چھوٹا بڑا اسلام کے زمرہ میں داخل ہو چکا تھا۔ اس ہمہ گیر وفاداری کے پیش نظر اسلام نے قبیلوں کو اب خطرے کی نظر سے دیکھنا ترک کر دیا تھا قبیلوں کو اسلام میں جذب کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اب ایک آدمی اچھا مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنے قبیلے کا وفادار رہ سکتا تھا۔ یہ اسی طریقے سے تھا جیسے آج کل ایک انگریز، فرانسیسی یا امریکن ایک اچھا شہری اور اپنے ملک کا وفادار رہتے ہوئے بھی اپنے عیسائی مذہب کا پابند رہ سکتا ہے۔

قریش کے اندرونی جھگڑے بہت ہی گہرے تھے۔ انتہائی خطرناک تھے ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ کی زندگی میں کس طرح عبدالشمس کی اولاد آپ کی اور اسلام کی سخت ترین دشمن رہ چکی تھی۔ اس لیے کہ حضورؐ عبدالشمس کے حریف، اور رقیب ہاشم کی اولاد میں تھے۔

۶۵۶ء میں حضورؐ کے چچیرے بھائی علیؓ ابن ابی طالب خلافت کے لیے چنے گئے۔ علیؓ ابن ابی طالب ہاشمی تھے۔ ابوسفیانؓ کا بیٹا معاویہؓ عبدالشمس کی اولاد میں تھا۔ حضرت معاویہؓ اس وقت شام کے گورنر تھے۔ حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کو خلیفہ ماننے سے انکار کر دیا۔

عبدالشمس کی آل یعنی ابوسفیانؓ کے بیٹے معاویہؓ اور بنی ہاشم کی نسل علیؓ ابن ابی طالب کے درمیان پانچ سال تک خانہ جنگی ہوتی رہی۔ حضرت معاویہؓ

Marfat.com

نے دمشق کو اپنا اڈہ بنا رکھا تھا۔ حضرت علیؓ کا دارالخلافہ کوفہ تھا۔
۶۶۱ء میں علیؓ ابن ابی طالب کو شہید کیا گیا۔ حضرت معاویہؓ نے خلافت پر قبضہ کر لیا۔ بنی امیہ کو حکمران خاندان میں تبدیل کر دیا۔ حضرت معاویہؓ کے خاندان والوں نے ۶۶۱ء سے ۷۵۰ء ۹۰ سال اسلامی دنیا پر حکومت کی۔
رسول اللہؐ کے نواسے حسینؓ کو امویوں نے کربلا کے میدان میں بے دردی سے شہید کیا۔ کربلا عراق میں واقع ہے۔ سانحہ کربلا ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء کو وقوع پذیر ہوا۔

امویوں اور بنی ہاشم کی آپس کی رقابتوں نے مسلم دنیا کو دو حصوں میں بانٹ کر رکھ دیا۔ ان کا یہ اٹھایا ہوا فتنہ آج ہمارے اپنے زمانے تک موجود ہے۔
جو لوگ علیؓ ابن ابی طالب اور ان کے خاندان والوں کے دعویٰ خلافت کی تصدیق کرتے ہیں اور ان کو خلافت کا حقدار ٹھہراتے ہیں شیعہ کہلاتے ہیں انہوں نے اپنے فرقے کی علیحدہ تشکیل کر کے عام مسلمانوں سے مختلف راہ اختیار کی۔

بنی امیہ کے دوران حکومت یعنی ۶۶۱ء سے ۷۵۰ء تک مسلمانوں نے چین کو چھوڑ کر دنیا کا ایک بڑا علاقہ فتح کر لیا۔ وہ علاقہ جو تہذیب و تمدن کا رکھوالا تھا ۷۱۲ء تک چین کی سرحدوں تک عرب پہنچ گئے۔ تبت کے شمال تک جا کر وہ سارا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا جو آج مغربی پاکستان کہلاتا ہے۔ ۷۳۲ء میں مغربی دنیا میں جہاں تک وہ پہنچ سکتے تھے وہاں تک پہنچے۔ ان کو مرکزی فرانس کے علاقہ TOURS میں شکست ہوئی۔ یہ مقام انگلستان کی بندرگاہ DOVER سے صرف ڈھائی سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ عرب ایک ایسی قوم تھی جو بدرویوں کے چھوٹے چھوٹے قبائل پر مشتمل تھی۔ ہمیشہ آپس میں

Marfat.com

برسرپیکار رہتی تھی۔ عرب کا ریگستان ان کی جائے پناہ تھا۔ اپنی اس حالت کو چھوڑ کر دنیا کے ایک وسیع اور عریض حصے پر قبضہ کر لینا دُنیا کی تاریخ میں ایک حیران کن اور چونکا دینے والا واقعہ ہے۔ عرب شہنشاہیت کے جغرافیائی حدود ۷۳۲ء میں اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ حضورؐ کے انتقال کے پورے ایک سو سال بعد۔ ۷۵۰ء میں حضورؐ کے چچا عباسؓ کی اولاد نے بنی امیہ سے بغاوت کی۔ اموی تختۂ اقتدار کو الٹ کر خود حکومت پر قابض ہو گئے۔ اموی حکمران ابوسفیان کی اولاد میں تھے۔ اب عباس کی اولاد نے مسلم شہنشاہیت کی زمام اپنے ہاتھ میں لی۔ بنی امیہ کے بنائے ہوئے دارالسلطنت کو چھوڑ کر انہوں نے بغداد کو سلطنت کا مرکز قرار دیا۔ ایک خاندان سے حکومت نکل کر دوسرے خاندان میں آئی۔ اس سے دو قسم کے نتائج پیدا ہوئے۔

عراق ہمیشہ سے ایران کا حصہ رہا تھا۔ دمشق ہزاروں سال سے یونان اور رومیوں کے تحت رہا۔ مسلم دارالسلطنت کا شام سے بغداد منتقل کر دینے کا فوری اور پہلا اثر یہ ہوا کہ اسلام نے مشرقیت کو اپنانا شروع کر دیا۔

دوسری چیز جو ہوئی وہ یہ کہ عباسیوں نے بڑی حد تک ایران کے مسلمانوں کی مدد کی۔ ان کے تعاون سے بنی امیہ کی بساط سیاست الٹ کر رکھ دی۔ جب عباسیوں نے اچھے طریقے سے حکومت کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو احسان شناسی کے طور پر بڑے بڑے اور اہم اہم عہدوں پر ایرانیوں کو فائز کرنا شروع کر دیا۔ اموی دورِ حکومت میں ساری عرب سلطنتوں میں ذمہ دار عہدوں پر صرف عرب ہی مقرر کیے جاتے تھے۔ عرب ہی حکمرانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ سارے بڑے بڑے عہدے عربوں ہی کو دیے جاتے تھے۔ عباسیوں کے دور میں عرب شہنشاہیت ایک بین الاقوامی مسلم حکومت اور سلطنت میں تبدیل ہو گئی۔

Marfat.com

عرب شہنشاہیت اپنے عروج کے زمانے میں

۷۰۰ء تا ۸۵۰ عیسوی

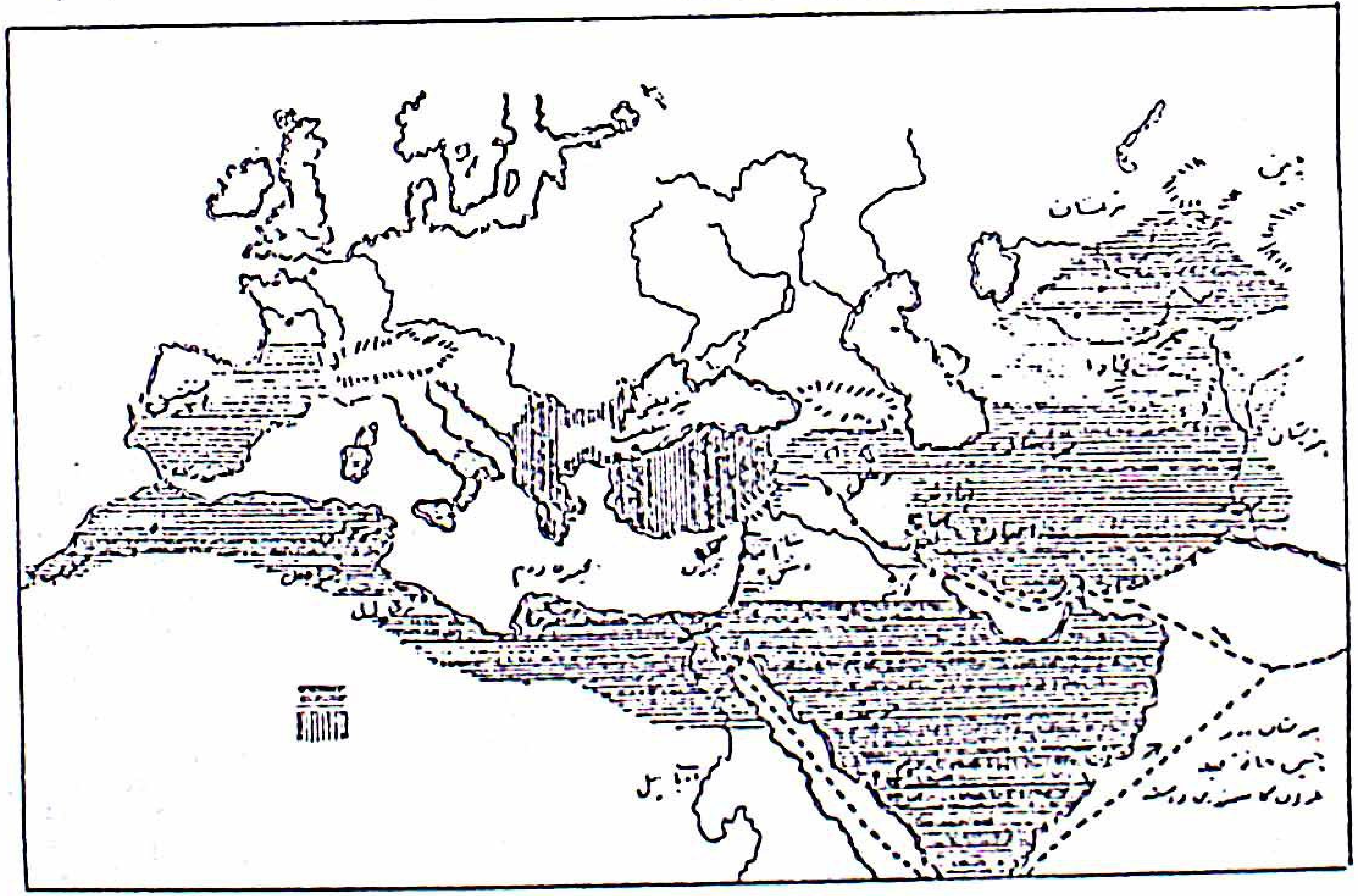

Marfat.com

اموی دورِ حکومت میں عربوں نے کئی ممالک فتح کیے تھے۔ عرب سلطنت میں توسیع کی تھی۔ عربوں کی فوجی قیادت بنی امیہ کے لوگ ہی کیا کرتے تھے۔ ۷۵۰ء کے بعد عربوں کی کوئی ایسی عظیم اور قابل ذکر فتوحات نہیں رہیں۔ اب یہ وسیع اور عریض مسلم سلطنت صرف مدافعانہ صورت اختیار کیے ہوئے تھی دن بدن اس میں سکڑ آتی جارہی تھی۔ وسعت میں کمی ہوتی جارہی تھی۔ عباسی بہ حیثیت فاتح امویوں کے مقابلے میں کم کامیاب رہے۔ عباسیوں نے اپنے دورِ حکومت میں یعنی ۷۵۰ء سے ۸۶۱ء کے درمیان اپنی دولت، علم، ثقافت اور تہذیب میں غیر معمولی ترقی کی۔

عباسیوں کے ایک سو دس سالہ دورِ حکومت میں بغداد دنیا کا سب سے زیادہ امیر ملک تھا۔ عیش و عشرت کا گہوارہ تھا۔ ان کے دور میں دنیا میں بغداد سے بڑا عشرت کدہ کوئی اور نہیں تھا۔ یہ دور وہ تھا جبکہ یورپ کی قومیں وحشت اور بربریت کے دائرے سے نکل کر نیم وحشی بن رہی تھیں۔ یورپ کی تاریخ میں یورپ کے اس زمانے کو تاریک عہد سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاریکی اور اندھیرا صرف یورپ پر چھایا ہوا تھا۔ اسلامی دنیا روشن سے روشن تر تھی۔ دولت، علم اور ثقافت کے دیے جل رہے تھے۔

عرب کی تہذیب و ثقافت کی بنیادیں یونان، روم اور ایران کے خمیر سے کھڑی کی گئی تھیں۔ یونان، روم اور ایران تہذیب و ثقافت کے سرچشمے تھے عرب کی نئی تہذیب نے ان تینوں کی تہذیبوں سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ یونانی فلسفیوں اور ماہرین طبیعات کی کتابوں کے عربی ترجمے کیے گئے۔ عربی تہذیب و ثقافت پر ان کا اطلاق کیا گیا۔ علم کے سارے شعبوں میں مسلمانوں نے قابل قدر اضافہ کیا۔ اس کی وجہ سے ان کی ثقافت مالا مال ہوگئی۔ نویں صدی عیسوی میں

Marfat.com

عباسی خلفاء کی سرپرستی میں میڈیکل کالجس کھلنے لگے۔ میڈیکل کے طلباء کو چار سال کی ٹریننگ لینی پڑتی تھی۔ چار سال کے عملی تجربے کے بعد ان کے باقاعدہ امتحانات ہوتے تھے۔ جب وہ اپنا آخری امتحان کامیاب کر لیتے تھے تو ان کو اپنا دواخانہ یا سرجری کھولنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ سولہویں صدی عیسوی تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں عربوں کی لکھی ہوئی کتابیں شاملِ نصاب تھیں۔ عربوں کی تحقیقات کو مستند اور مدلل سمجھا جاتا تھا۔

عرب کے ماہرین فلکیات نے زمین کا قطر ناپا۔ ایسی صحیح پیمائش کی تھی کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یورپ والوں سے آٹھ سو سال پہلے انہوں نے معلوم کر لیا تھا کہ زمین چپٹی اور ہموار نہیں ہے۔

انسانی علوم میں جو عظیم الشان اور قابل قدر اضافہ ہوا وہ ریاضی کی وجہ سے ہوا۔ یہ وہی عرب تھے جنہوں نے دنیا کو صفر سے روشناس کرایا، صفر کا استعمال سکھایا۔ ہمارے موجودہ اعداد کا صفر کے ساتھ لکھنا جیسے ۱۰، ۱۰۰۰ یا ہزار، دس ہزار یہ عربوں ہی کا بتایا ہوا طریقہ ہے۔ موجودہ فن ریاضی کی ساری بنیاد عربوں کے اسی صفر کی دریافت کی رہین منت ہے۔ ان کے بتائے ہوئے صفر ہی کی بنیادوں پر موجودہ علم ریاضی کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

رومنوں کا اعداد لکھنے کا فرسودہ طریقہ فن ریاضی کی ترقی میں ایک سدِ راہ بنا ہوا تھا۔ الجبرا، جومیٹری کی دریافت بھی عربوں ہی نے کی۔ علم مثلث، مثلث کے درمیان تناسب، لوگارتم، مستوی، خط مماس وغیرہ کو عربوں ہی نے دریافت کیا۔ عربوں نے دنیا کو فن ریاضی کی باریکیوں سے روشناس کرایا۔

یونانیوں نے مختلف علوم و فنون میں ترقی کر کے دنیا میں اپنا جو مقام پیدا کر لیا تھا اور ساتھ ہی دنیا کی ترقی میں جو حصہ لیا تھا اسی طرح عربوں نے ریاضی میں نئی نئی

Marfat.com

اختراعات، جدتیں اور اضافے کر کے ہم کو سائنس کے ایک نئے دور میں داخل ہونے کا موقع دیا۔

مسلم ممالک میں عرب فلاسفہ، حکماء، اطباء، ریاضی داں اور عالموں کی کاوشوں کو کتابی صورت میں عوام کے آگے پیش کیا گیا۔ نویں صدی کے بغداد میں کتب فروشوں کی ہزاروں دکانیں تھیں۔ عربوں نے کاغذ بنانے کی ابتدا کر دی تھی۔ عربوں ہی نے یورپ کو کاغذ سے روشناس کیا۔ اسپین اور سسلی کے عربوں نے یورپ والوں کو سب سے پہلے کاغذ دکھایا۔ اس وقت جبکہ اسلامی اسپین کے کاشتکار اور دیہاتی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ عیسائی یورپ کے بادشاہ، شہزادے اور امراء کی اکثریت اَن پڑھوں پر مشتمل ہوتی تھی۔

عربوں نے اپنی فرمانروائی کے زمانے میں سمندروں پر اس طرح حکومت کی کہ ان کے بحری بیڑے ہر طرف چلا کرتے تھے۔ دنیا کے جہاز ان کے حکم سے اور ان کی نگرانی میں بحیرہ روم اور بحیرہ ہند سے گزرا کرتے تھے۔ ان کے کارگو شپ اور دوسرے تجارتی جہاز انڈونیشیا اور مشرق بعید کو باقاعدہ جایا کرتے تھے۔ چین کے کینٹن میں عرب تاجروں کے تحفظات تھے۔ یہ تحفظات اسی نوعیت کے تھے جیسے انیسویں صدی عیسوی میں شنگھائی میں یورپی اقوام کے۔

اس وقت جبکہ یورپ کے حکمران اپنی رقمی بچت کو سکوں کی صورت میں تھیلیوں میں بند کر کے اپنی کوٹھیوں میں محفوظ رکھا کرتے تھے۔ عربوں نے باقاعدہ بنکوں کی ابتدا کر دی تھی۔ اپنے بینکوں کی اعلیٰ پیمانے پر تنظیم کر رہے تھے۔ عرب تجارت پیشہ اور سوداگر اپنے چیکوں کو کینٹن میں کیش کرواتے تھے۔ ان کے اکاؤنٹس بغداد میں رہا کرتے تھے۔

ساتویں صدی سے گیارھویں صدی عیسوی تک عربوں کو صنعت و حرفت میں

Marfat.com

اجارہ داری حاصل رہی۔ شمال اور مغربی یورپ اس وقت محض زرعی علاقے تھے سمندر پار تجارت کا ان کے ہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یورپ میں لوگ خاندانی ضروریات کے مطابق اجناس خوردنی کی کاشت کر لیا کرتے تھے۔ سیدھا سادا کپڑا بنا لیتے تھے۔ ضروریات کی معمولی چیزیں تیار کر لیتے تھے۔

مسلم دنیا میں کپڑے کی صنعت انتہائی عروج پر تھی۔ کارکردگی، نفاست اور منفعت کے لحاظ سے ان کے کپڑے کی صنعت اپنی مثال آپ تھی۔ عربوں کی سلطنت اپنے وقت کی وہ سب سے بڑی سلطنت تھی جہاں دنیا بھر کے مقابلے میں سب سے زیادہ ریشمی اور سوتی کپڑا بنایا جاتا تھا۔ زری کا کام سب سے زیادہ اور بہتر ہوتا تھا۔ قالین اور مخمل بنانے میں بہت آگے تھے۔ موصل کا ململ اور دمشق کا منجر اور جامدانی بہت مشہور تھا۔ قالین کو روزمرہ استعمال میں لایا جاتا تھا جبکہ یہی قالین کئی صدیوں بعد یورپ میں تعیش کے طور پر استعمال ہونے لگے۔

ان کی دوسری صنعتوں میں اسلحہ سازی، سونے چاندی کا کام، زر کا کام، رنگین ٹائیل، مٹی کے برتن اور شیشہ گری وغیرہ شامل تھے۔

عمارت سازی کو انہوں نے ایک فن میں تبدیل کر دیا۔ مشرق اور مغرب کی عمارتوں کو پیش نظر رکھ کر ان دونوں میں انہوں نے امتزاج پیدا کیا۔ قدیم و جدید کو ملا کر ایسی عمارتوں کو وجود میں لائے جو دنیا کی خوبصورت ترین عمارتیں کہلائیں۔ ایسی عمارتیں انہوں نے بنائیں جن کو دنیا کی نظروں نے پہلی بار دیکھا۔ اس سے پہلے دنیا نے ایسی عمارتیں نہیں دیکھی تھیں۔

عربی ثقافت نے قدیم بدویوں کے شاعرانہ شعار کی بھی حفاظت کی۔ فن شاعری کو وہ سارے فنون کا امام مانتے ہیں۔ یہی وہ عرب ہیں جنہوں نے نظموں اور غزلوں کو ترنم سے پڑھنا یورپ والوں کو سکھایا۔

Marfat.com

یونانیوں اور لاطینیوں کے قدیم شعراء ترنم میں پوشیدہ خوبصورتی اور اس کی فنی ماہیت کو سمجھنے نہ پائے تھے۔ ان کے پلے یہ بات نہیں پڑی تھی کہ نظموں کو ترنم سے زیادہ اثر انگیز کیا جا سکتا ہے۔

عربوں کے کارناموں کی اگر تفصیلات بیان کی جائیں تو فہرست اتنی لمبی ہوگی کہ پڑھنے والے اکتا جائیں گے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی رہے گا کہ حضورؐ کے انتقال کے بعد ہ سو سال تک مسلمانوں نے دنیا پر حکومت کی۔ دنیا کو اپنے زیر اثر رکھا۔ فوجی اور ثقافتی اعتبار سے پوری دُنیا پر وہ اسی طرح چھائے رہے جیسے گذشتہ ڈھائی سو سال سے یورپ اور امریکہ۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ کس طرح ہوا۔ عرب کے ایک اُمی رسول اور آپ کے دیہاتی بدویوں نے کس طرح ایسی بیش بہا اور انمول ثقافت سے دُنیا کو روشناس کروایا۔ طوالت سے بچنے اور کتاب کی ضخامت کو کم کرنے کے لیے مختصر طور پر ہم اس کا جائزہ لیں گے۔

حضورؐ نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ساتویں صدی عیسوی میں مرکزی عرب کے باشندے اپنے آپ کو جنگ کے لیے وقف کریں گے، بنیادی طور پر ذات اقدسؐ سراپا مذہب کا پیکر تھی۔ آپ میں وہ مقناطیسی کشش تھی جو لوگوں کے دلوں کو فتح کر لیتی تھی۔ لوگوں کے دلوں کو فتح کر کے آپ فاتح زمانہ بنے۔ ہمیشہ آپ کی کوشش یہی رہتی تھی کہ لڑائی جھگڑوں سے گریز کیا جائے۔ خون خرابے سے احتراز کیا جائے۔ حضورؐ اپنے دلائل سے لوگوں کو قائل کرتے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں اپنی بات اتارنے کا حضورؐ کو ملکہ حاصل تھا۔ بہ نسبت ان لوگوں کے جو حضورؐ کی زندگی میں اور حضورؐ کی سرکردگی میں مختلف مہمات میں حصہ لیا کرتے تھے۔ فوجی اعتبار سے آپ کے ماننے والے آپ کے انتقال کے بعد

Marfat.com

زیادہ کامیاب رہے۔ بہت سے مغربی اہلِ علم جن کی علمیت میں کوئی کلام نہیں لیکن ان کو اپنی زندگی بھر یہ موقع نہیں ملا کہ وہ بدویوں کے ساتھ رہیں یا ان کے ساتھ زندگی کا کچھ حصہ بسر کریں اس خیال کو اپنائے ہوئے ہیں کہ بدوی خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ ہلاکو اور جلاد ہوتے ہیں۔ ان کی اس بہیمانہ خصلت کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی جنگجو یانہ روش کے پیچھے حرص، لالچ اور لوٹ کھسوٹ کا جذبہ کام کرتا ہے۔ ان کے اس سوچنے کے انداز کو ان کے خیال کے مطابق حضورؐ کے طریقۂ کار سے بھی تقویت ملتی ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے مالِ غنیمت کی امید دلا دلا کر ہی تو لوگوں کو اپنی طرف کیا تھا۔

ذاتی طور پر میں ان لوگوں کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ عربوں کو ہمیشہ میں نے جذباتی پایا۔ مذہبی دعوت پر لبیک کہتے سنا۔ وہ ان معنی میں بہت ہی فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ میرا یہ ایقان ہے کہ بدویوں نے اسلام کو جو اپنایا وہ حضورؐ کی تبلیغ اور مذہب کے بلاوے پر اپنایا۔ مال و دولت کا لالچ مذہب کو تبدیل نہیں کرواتا۔

دنیا کی تمام بڑی بڑی مذہبی تحریکات کی طرح اسلامی تحریک بھی آہستہ آہستہ ٹھنڈی پڑنے لگی۔

حضورؐ نے مسلمانوں کے ایمانی جذبے کو جس طریقے سے ابھارا تھا وہ جذبہ وقت کے ساتھ ساتھ ٹھنڈا پڑتا گیا۔

حضورؐ کے انتقال کے پچاس سال کے اندر ہی حضورؐ کے ماننے والے جنہوں نے ایک وسیع و عریض سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی اب سیاسی رسّہ کشی کا شکار ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود سیدھے سادے مسلم عوام اپنے ایمانی جذبے کی حفاظت کرتے رہے۔

Marfat.com

اگر ہم کو بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں حرص و ہوا کی مثالیں ملتی ہیں تو ان مثالوں کو سامنے رکھ کر یہ کلیہ قائم کر لینا کہ بدر اور حدیبیہ میں حصہ لینے والے بھی اسی حرص و ہوا کے شکار رہے تھے تو حق و انصاف کے ساتھ زیادتی کرنا ہے۔ سراسر بے انصافی کرنا ہے۔

عربوں کی تاریخ کے دھارے کا ہم حسبِ ذیل طریقے سے تجزیہ کر سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر حضورؐ نے عربوں کے آگے روحانی پیغام رکھا تھا۔ ان کی روحانیت سے اپیل کی تھی۔ لوگوں میں واقعی ایک نیا جوش اور ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔

لڑائیوں کے لیے بجائے مدد کے حضورؐ کی ذاتِ گرامی ایک رکاوٹ ثابت ہو رہی تھی۔ حضورؐ لڑائیوں کو صرف آخری حربے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مسائل کو گفت و شنید سے حل کرنے کے خواہاں تھے۔ آپ نے لوگوں میں جو جوش و جذبہ پیدا کیا تھا اس کی گرمی حضورؐ کے انتقال کے بعد بھی لوگوں میں باقی رہی۔ آپؐ کی ذاتِ گرامی کی غیر موجودگی کی وجہ سے لوگ اپنے حسبِ منشاء جنگیں لڑتے رہے۔ اپنی راہ آپ نکالی۔ ان لوگوں نے جتنی لڑائیاں لڑیں معجزانہ حد تک اُن کو اس میں کامیابیاں ہی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ان کے برخلاف حضورؐ کی زندگی میں جو لڑائیاں لڑی گئیں ان میں بعض میں کامیابی ہوئی اور بعض میں ناکامی۔

حضورؐ کے انتقال کے پچاس سال کے اندر ہی تنظیم سے عاری، تربیت سے ناواقف اور معاوضے سے بے نیاز عرب قبیلوں نے ایرانی شہنشاہیت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بیزنطینی سلطنت کو اپاہج کر کے رکھ دیا۔ یہ جوش و خروش اتفاقی رہا۔ فتوحات حاصل کرنے کا زمانہ حضرت معاویہؓ کی

وفات یعنی ۶۸۰ء تک رہا۔

۶۸۰ء کے بعد دو بنیادی تغیرات رونما ہوئے۔

۱۔ مذہبی جوش و خروش جاتا رہا۔ گو حضرت معاویہؓ کی وفات کے ۵۰ سال بعد تک بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس کی بڑی وجہ گذشتہ ۵۰ سال کی عظمت و شان اور رُعب و دبدبہ تھی۔

حضورؐ کے انتقال کے سو سال بعد یعنی ۷۳۲ء میں اسلامی فتوحات کا یہ سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اس وقت اسلامی سلطنت اتنی پھیلی ہوئی تھی کہ پوری دُنیا میں ان کی برابری کرنے والا کوئی اور نہیں تھا۔ یہ اس وقت تک دُنیا کی سب سے بڑی اور عظمت والی حکومت رہی جب تک کہ خود مسلمانوں نے آپس کے اختلافات، اندرونی خلفشار اور افراتفری سے اپنی ہی سلطنت کو اپنے ہی ہاتھوں مائل بہ تنزل نہ کر دیا۔

۲۔ دوسرا بنیادی تغیر جو وقوع پذیر ہوا وہ یہ تھا کہ ۶۸۰ء کے بعد عرب قبیلوں کے افراد کی فراہمی مشکل ہو گئی۔ یہ ایک ایسا اہم نکتہ ہے جس کو موجودہ مغربی مصنفین نے سرے سے نظر انداز کر دیا ہے۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ شام، عراق اور مصر فتح کر لینے کے بعد عربوں کی اکثریت ان مفتوحہ علاقوں میں جا کر آباد ہو گئی تھی۔

میں جہاں تک سمجھتا ہوں ایسا کہنا بالکل غلط ہے اور گمراہ کن ہے۔ یہ ایسا نکتہ ہے جو قابلِ تشریح ہے۔

سب سے پہلی بات یہ کہ آج بھی جزیرہ نمائے عرب کی پوری آبادی دریائے نیل کے دھانے پر رہنے والے لوگوں سے بہت ہی کم ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں مصر ایک خوش حال ملک تھا۔ آبادی بہت ہی گنجان تھی۔ عرب کی آبادی

Marfat.com

زیادہ تر جنگجو قسم کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ یہ عین ممکن ہے کہ ساتویں صدی میں مرکزی عرب میں رہنے والوں کی تعداد مصر میں رہنے والے لوگوں کی تعداد کے مقابلے میں آج سے بھی بہت کم ہو۔

شام اور عراق بھی رومی اور ایرانی صوبے رہ چکے تھے۔ لوگ وہاں بھی کثرت سے رہتے تھے۔ یہ دونوں ملک شائستہ اور تہذیب یافتہ تھے اگر ان تینوں ممالک کی جملہ آبادی کا حساب کیا جائے تو یہ عرب کے باشندوں سے تعداد میں کئی گنا زیادہ تھی۔

کس طریقے سے عربوں کا بہاؤ ان ملکوں کی طرف ہو سکتا تھا اور کس طریقے سے وہ شام، عراق اور مصر کو اسلامیت میں ڈھال سکتے تھے۔

اگر عرب موسلا دھار بارش کی طرح بھی ان پر ٹوٹ پڑے تھے اور ان پر قابض ہو چکے تھے تو ان ملکوں کے اصلی باشندوں کو کیا ہو گیا تھا کہ صورتحال سے انہوں نے خاموشی سے نمٹ لیا۔

عربوں نے جب ان ملکوں کو فتح کیا تو وہاں پر نہ ہی کسی قسم کا کوئی قتلِ عام ہوا اور نہ ہی مقامی باشندوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور نہ ہی مقامی باشندوں نے اپنے ملک کو چھوڑا۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ مغرب کے موجودہ صاحبانِ علم کے نزدیک "بدویت" ایک انتہائی مکروہ لفظ ہے اور تکلیف دہ زندگی کا دوسرا نام ہے۔ بحث برائے بحث کی خاطر کہا جا سکتا ہے کہ فاتح عرب موقع کے متلاشی تھے۔ اپنے بوسیدہ خیموں سے نکل کر شام کے محلات میں عیش و عشرت سے لطف اندوز ہونے کے خواہاں تھے۔

عملی طور پہ بدویوں نے کسی اور ہی ردِّ عمل کا اظہار کیا۔ بہت سی حکومتوں

Marfat.com

Marfat.com

نے تعلیم، تربیت، قانون حتیٰ کہ تشدد کے ذریعے بدویت کو دبانے اور اسے ختم کرنے کی کوشش کی۔ سرباران حکومتوں کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بدوی اپنی زندگی کی رسم و راہ نہیں بدلنا چاہتے تھے۔ تبدیلی کی وہ سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔

حضور کی زندگی میں جن بدوی قبیلوں کا ذکر آتا ہے مثلاً جہینہ، آج بھی یہ قبیلہ اسی علاقے میں اسی طریقے سے زندگی گزار رہا ہے جیسے ان کے آباؤ اجداد ساتویں صدی عیسوی میں گزارا کرتے تھے۔

بنیادی طور پہ انسانی فطرت ہمیشہ قدرتی ماحول کو ترجیح دیتی ہے شہر سے دُور کھلے میدانوں کو پسند کرتی ہے۔ شہر کے ہنگاموں سے دُور اور بہت دُور قدرت کے شاہکار زندگی کے لیے جاذب نظر اور پُرکشش ہوتے ہیں ایک مقام سے دوسرے مقام پہ منتقل ہونا دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ ہر رات ایک نئے مقام پر سونا، سردیوں کی راتوں میں آگ جلانا، آگ کے اطراف بیٹھے رہنا، نئی نئی خیمہ گاہ، صبح صبح سورج طلوع ہونے کا نظارہ۔ سرِشام سُورج غروب ہونے کا منظر۔ یہ اور اسی قسم کے جلوے آج بھی ہم شہر میں رہنے والوں کے لیے ہماری آرزو اور ارمانوں کا حاصل ہوتے ہیں ان ہی کی تلاش میں ہم چھٹیاں گزارنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔ اسی تمنا کو ساتھ لیے کوئی پیدل چلتا ہے۔ کوئی کیمپ میں ٹھہرنا پسند کرتا ہے۔ کوئی کاروان کرایہ پہ لیتا ہے۔ تو کوئی کسی اور طریقے سے رختِ سفر باندھتا ہے۔

شام، عراق اور مصر پہ فوجی فتوحات کے نشہ نے کبھی بھی بدویوں کو اس بات کی طرف مائل نہیں کیا کہ وہ ان خوشحال اور امارت پسند ملکوں میں جا کر متوسط درجے کی خوش حالی اختیار کریں۔ نہ شام کی خوش حالی نے ان کو اپنی طرف مائل کیا اور نہ ہی مصر کی قدیم تہذیب نے۔ اس کے برخلاف ان

فتوحات نے ان کی بدویانہ زندگی کو پہلے سے زیادہ باوقعت بنا دیا۔ جیسے جیسے اسلامی حدود میں اضافہ ہونے لگا ان کی بدوی زندگی کے لیے نئے نئے میدان اور نئے نئے قدرتی ماحول میسر آنے لگے۔ ان کی تمناؤں کے قدم دشت امکاں کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگے۔

بدوی قبیلوں کے وہی گنے چنے افراد شہروں میں رہنے کو گوارا کر رہے تھے جو حکومت کے تنخواہ دار تھے۔ بدویوں کی اکثریت رواں دواں رہی۔ مشرقی ایران، جنوبی افریقہ، اسپین اور دوسرے مقبوضہ علاقوں کے نئے نئے میدانوں میں وہ اپنے خیمے گاڑتے جا رہے تھے۔

اب عرب کے قبیلے دو مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ پہلی جماعت تو وہ رہی جس نے یکے بعد دیگرے فتوحات کی مہموں میں بھرپور حصہ لیا۔ ان مہموں کی قیادت کی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے شمالی افریقہ، اسپین، ترکی اور ہندوستان پہ اپنا اسلامی علم لہرایا۔ باقی وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنے اپنے پیدائشی مقامات پہ زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ عرب کے ریگستان ان کی آماجگاہ بنے رہے۔

شام، فلسطین اور مصر میں زمینات پر کاشت کرنے کے لیے بہت ہی کم لوگ ان مقامات پہ آباد ہوئے۔ عرب فتوحات نے مقامی لوگوں کے مقامی شعار اور اخلاقی اقدار کو بدلنے میں بہت ہی کم حصہ لیا اور ان کو ان کے حال پہ چھوڑ دیا۔

عرب بدویوں نے اپنے آپ کو نہ ہی شامی بنایا اور نہ ہی مصری۔ اس کے باوجود ان کی فتوحات کے پیش نظر ان کی قدر و منزلت میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ ہر مفتوحہ قوم کے نزدیک عرب ہونا بڑی ہی قدر و منزلت کی بات تھی۔

حضورؐ نے خود ہی ایک ایسا راستہ تجویز فرما دیا تھا جس پر چلتے ہوئے

Marfat.com

مفتوحہ اقوام کو نہ ہارنے کا غم ہوتا تھا اور نہ ہی اپنی شکست پر ذلت کا احساس۔ جو کوئی ایک بار کلمہ طیبہ اپنی زبان سے ادا کر دے وہ کلمہ گو ہو جاتا تھا۔ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر قانونی اور سماجی برادری میں برابر کا حصہ دار بن جاتا تھا۔ فاتح اور مفتوح میں کوئی فرق نہیں رہتا تھا۔ نہ فاتح میں غرور باقی رہتا تھا اور نہ ہی مفتوح میں احساس شکست۔ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہو جاتے تھے۔

اپنے اپنے قبیلے والوں کے سامنے بھی اُن کو اسلام کو قبول کر لینے کی وجہ سے نظریں چُرانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ وقتِ واحد میں مسلمان بھی رہتے تھے اور اپنے قبیلے کے فرد بھی۔

وہ دستاویزات اب بھی موجود ہیں جن پر حضورؐ کے انتقال کے تقریباً سو سال بعد کی تاریخیں پڑی ہوئی ہیں۔ ان دستاویزات میں مسلم اور عرب کو ہم معنیٰ استعمال کیا گیا ہے۔

دلچسپ بات تو یہ ہے کہ جوش و خروش کے ابتدائی زمانے میں مسلمانوں کو جو فتوحات ہوئیں ان میں ان قبیلوں نے وہی طریقۂ کار اختیار کیا جن کو وہ قبیلہ وارانہ جنگوں میں استعمال کرتے تھے۔

ساتویں صدی کے دوران شام میں اور بعد میں بغداد میں عباسی خلفاء کے عہد میں عربوں نے باقاعدہ فوج کی صورت اختیار کر لی۔ فوجی تنظیم، فوجی تربیت، ڈسپلن اور پیشہ وارانہ فوج کے اصول و قواعد کا ان پر اطلاق ہوا۔ جس طریقے سے بیزنطینی فوجوں کو جنگ کے لیے تیار کیا جاتا تھا انہی خطوط پر عرب فوجوں کی تنظیم نو کی گئی۔

ان فوجوں کے عہدہ دار اور سردار اب اصل عربوں کی اولاد نہیں رہے تھے مفتوحہ ممالک کے باشندوں ہی کو ان فرائض کے لیے چُنا جاتا تھا۔ یہی وہ عنصر

Marfat.com

تھا جس نے ہمارے اپنے خیال میں بغداد کے عباسی عہد کو ایک درخشاں اور زریں عہد بنا دیا تھا۔ اس دور میں علم کی شمعیں آب و تاب کے ساتھ روشن تھیں ان کی روشنی سے تمام دُنیا فیض یاب ہو رہی تھی۔ عرب ثقافت اب مسلم ثقافت میں تبدیل ہو گئی۔ مسلمانوں کی زبان عربی زبان قرار پائی۔ اس زریں عہد کے مسلم مؤرخین، فلاسفہ، ریاضی دان اور دوسرے فن دان عرب بدویوں کی اولاد نہیں تھے۔ یہ ایک ایسی نسل سے تھے جو مختلف الخیال، مختلف مکاتب فکر کے حامل، مختلف اخلاقی اقدار سے تعلق رکھنے والوں کے باہمی میل ملاپ اور اتصال سے وجود میں آئی تھی۔ عباسی خلفاء نے جس معاشرت اور تہذیب کو اپنی سرپرستی اور نگرانی میں پروان چڑھایا تھا یہ اسی تہذیب کے پروردہ تھے۔ ترکی، ایرانی، یونانی، آرمینین، اطالوی، ہندی اور اسی طرح سے بہت سی قوموں کے افراد کو اپنے قریب کر کے مسلم دنیا کی نئی قوموں کو وجود میں لایا گیا تھا۔

عباسیوں کے زرّیں عہد کو عربوں کے عہد سے تعبیر کیا جائے یا کسی اور عہد سے، اس سے نفس واقعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ نفس مضمون کو سمجھیں تو ہم کو مشرق وسطیٰ کے اخلاقی اقدار کے معموں اور ان کی پیچیدگیوں کو پیشِ نظر رکھنا پڑے گا۔

اخلاقی اقدار کی ان پیچیدگیوں کو ذہن میں لانے کے لیے ہمارے سامنے ایک زندہ مثال ہے۔ امریکہ کے لوگوں کی زبان انگریزی ہے۔ رہن سہن کا طریقہ انگریزوں سے ملتا جلتا ہے اس کے باوجود بھی اس ملک کے مختلف مقامات میں رہنے والوں کے اخلاقی اقدار کی ترکیب و ماہیت میں اتنا اختلاف واقع ہے کہ ان سب کے اشتراک سے ایک نئی امریکن قوم ظہور میں لانی پڑی۔ اگر دیکھا جائے تو امریکہ کی صورتحال میں پیچیدگی ذرا کم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ امریکہ میں

Marfat.com

جرمن، اطالوی، یونانی اور بہت سی ایسی قومیں آباد ہیں جو ابھی تک اپنے آپ کو امریکی قومیت میں جذب نہیں کر سکیں اور اپنی قومی انفرادیت کو باقی رکھے ہوئی ہیں۔ جب یہ لوگ واقعی اپنے آپ کو مقامی لوگوں میں جذب کر دیں گے اور پورے طریقے سے اختلاط عمل میں آجائے گا تو جغرافیائی حدود میں امریکہ ہی میں ان کو ایک مقام سے نکال کر دوسرے مقام پر آباد کرنے میں اتنی زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔

عرب ممالک میں ایسا کرنا ناممکن ہے۔ عربیت کو اپنائے ہوئے لوگ جیسے شامی، مصری اور الجیرین۔ ان کی رگوں میں بہت ہی کم عربی خون ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ ان میں سے ہر ایک مختلف قوم ہے ہر قوم اپنے ہی ملک میں رہتی آئی ہے۔

حضورؐ کے انتقال کے سو سال بعد ہی عرب کے اصلی باشندے رموز خسروی سے بے بہرہ کر دیے گئے تھے۔ سیاست سے بے دخل کر دیے گئے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے ورثے میں جو جنگی بہادری اور شجاعت چھوڑی وہ تاریخ کا باب بن گئی۔ عرب کے اصلی باشندوں ہی نے افغانستان اور اسپین جیسے دور دراز مقامات پر اسلامی جھنڈا لہرایا تھا۔ ان کی بہادری اور شجاعت نے ان ممالک کو ان کے زیر نگیں کیا تھا۔ ان ہی فاتحین کی بہادرانہ اور دلیرانہ صفات اور خصوصیات کا گہرا اثر مغربی یورپ پر پڑا اور مغربی اقوام نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے جنگی طریقوں کو اپنایا۔ اس کے برخلاف شام، مصر اور عراق والوں نے ان عربوں کے جنگی نظریات کو تسلیم کیا اور نہ ہی ان کو اپنانے کی کوشش کی۔

دسویں صدی عیسوی میں عرب سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس کی بڑی

Marfat.com

وجہ قریش کی آپس کی رقابت اور وہی پرانی دشمنی رہی۔ ایک نیا خاندان جو اپنے آپ کو علیؓ ابن ابی طالب کی اولاد بتلاتا تھا ۹۷۳ء میں مصر میں اقتدار پر قابض ہوگیا۔ انہوں نے عباسی خلفاء کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ یوں بھی عباسیوں پر اس وقت زوال کے آثار تھے۔

۱۰۵۵ء میں ترک سلجوق بغداد پر قابض ہوگیا۔ یہ مرکزی ایشیا کا ایک سفاک اور وحشی خانہ بدوش سردار تھا۔

۱۰۸۷ء میں صلیبی شام میں پہنچے۔

۱۲۵۰ء میں مملوک مصر پر قابض ہوئے۔ یہ ترک تھے۔

آخر کار ۱۵۱۷ء میں عثمانی ترکوں نے شام اور مصر کو فتح کر لیا۔ پھر عراق اور الجیریا پر قابض ہو گئے۔

عربوں کے اقتدار نے جو آفاقیت اختیار کی اور ہمہ گیر سلطنت کی بنیاد ڈالی اس کی تہہ میں دو باتیں ملتی ہیں۔ یہی وہ دو ذریعے تھے جو اُن کے عروج کا باعث بنے۔

ایک ذریعہ جو سب سے بلند اور اعلیٰ تھا وہ رسول اللہ کی مذہبی تعلیمات تھیں دوسری بات جو کارگر ہوئی وہ عرب قبائل کی شجاعت، بہادری اور لڑنے مرنے کا جذبہ تھا۔ ان کے اسی جذبے نے اسلام کے نئے عقیدے کو اسپین سے چین تک پھیلا کر اسے آفاقی بنا دیا۔ اسلام کو ہمہ گیر کر دیا۔ اسپین، مراکش اور افغانستان تک جا کر عرب قبائل کی تلوار رک گئی۔ جو آگے بڑھتے رہے وہ ان مقامات تک پہنچ گئے اور جو پیچھے رہ گئے وہ خانہ بدوشی کی زندگی میں پھر سے لگ گئے۔

اسلام نے نہ صرف مفتوحین کو بلکہ فاتحین کو بھی اپنے آپ میں جذب کر لیا۔ جزیرہ نمائے عرب سے اپنا ناتا ختم کر کے عثمانیوں کو اس نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اسلام کے اثر سے ترک سیدھے سادے بن گئے۔ اسلام

Marfat.com

کے شیدائی بن گئے۔ شجیع اور بہادر بن گئے۔ ان خوبیوں کے باوجود وہ عرب نہ بن سکے۔ ان میں ایک طرف جنگی بہادری اور شجاعت کی کمی تھی تو دوسری طرف شام، ایران، عراق اور مصر کی تہذیب اور شائستگی کا فقدان تھا۔

Marfat.com

یادگار تاریخیں

حضورؐ کا انتقال ۶۳۲ء

مدینہ میں چار خلفاء کی خلافت

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ } ۶۳۲ء سے ۶۶۱ء تک

شام کے بنی امیہ کی حکومت (ابوسفیانؓ کا خاندان) ۶۶۱ء سے ۷۵۰ء تک)

بغداد کی عباسی حکومت ۷۵۰ء سے ۸۶۱ء تک

گو یہ ۱۲۵۸ء تک بغداد میں رہے لیکن ان کی حیثیت شطرنج کے ایک مہرے جیسی تھی۔

بنی فاطمہ کی حکومت ۹۷۳ء سے ۱۱۷۱ء تک

فاطمہؓ حضورؐ کی چہیتی صاحبزادی کا نام ہے

ترک، سلجوق کا بغداد پر قبضہ۔ ۱۰۵۵ء

صلیبی جنگیں ۱۰۹۸ء سے ۱۲۹۱ء تک

شام اور مصر پر عثمانیوں کا قبضہ ۱۵۱۶ء

عثمانی ترک تھے

عربی بولنے والے ممالک سے عثمانیوں کا اخراج ۱۹۱۸ء

Marfat.com

اسلام کا پھیلاؤ

بحیثیت مذہب

ایسے مادی زمانے میں جبکہ ہر چیز کو سائنس کے علم اور حساب و کتاب کی ترازو میں تولا جاتا ہے۔ ہمیں یہ بات بتلائی گئی ہے کہ ہر عمل کا ایک ردِ عمل ہوتا ہے۔ ہر حرکت کا ایک سبب ہوتا ہے۔ جب عمل اور ردِ عمل اور حرکت اور اس کے سبب میں تناسب قائم کر لیا جاتا ہے، اس کی وجہ معلوم کر لی جاتی ہے، تو مسئلہ کے حل کرنے میں آسانی خود بخود ہوتی ہے۔ ایسے حل کو بغیر کسی الجھن کے ضابطہ کی صورت دی جا سکتی ہے۔ ضابطہ کو حسبِ ضرورت استعمال کرنے کے لیے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ سارے برآمد شدہ نتائج کو متعلقہ فائل میں رکھ کر اس فائل کو الماری میں اس کی مقررہ جگہ پر رکھ دیا جاتا ہے۔

تاریخ میں انسان کی شروع کی ہوئی جتنی تحریکات کا ذکر ہے بد قسمتی سے شاید ہی ان تحریکات کو کسی ایک مقصد یا منشاء سے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ انسانی زندگی بڑی ہی پیچیدہ رہی ہے۔ مختلف نقاط نظر اور مختلف فکر و عمل کے حامل انسانوں کے کارناموں پہ تبصرہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ان کے کارناموں پر کوئی جچی تلی رائے قائم کرنا اور بھی مشکل ہے۔ ان کے عمل اور ردِ عمل کو سامنے رکھ کر کوئی واضح نتیجہ اخذ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

جب ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ حضورؐ کے انتقال کے بعد اسلام نے جو

Marfat.com

عالمگیر صورت اختیار کر لی تھی اس کے کیا اسباب تھے تو اس سوال کا جواب ایک دو اسباب کی صورت میں بیان کر دینا سوال کی اہمیت کو گھٹا دینا ہے۔ جواب کی حد سے زیادہ آسان صورت دیگر سوال کرنے والوں کے ذہنوں میں ایک غلط تاثر پیدا کرتا ہے۔

یہ سوال اتنی زیادہ بار دہرایا گیا ہے کہ ہم کو بہر حال اس کا جواب دینا چاہیئے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اس موضوع کو دو حصوں میں تقسیم کریں۔

پہلے حصے میں عربوں کا اسلام قبول کرنا بیان کریں گے۔ دوسرے حصے میں غیر ممالک میں اس نئے مذہب کی اشاعت اور اس کے پھیلاؤ کا ذکر کریں گے۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ کی زندگی ہی میں دس ہزار سے زیادہ لوگوں نے آپ کی تعلیمات کو دل و جان سے قبول کر لیا تھا۔ حضورؐ کی تبلیغ اور آپ کے ارشادات کے وہ قائل ہو گئے تھے۔ اپنے آپ کو اسلام کے لیے وقف کر دینے والوں میں اکثریت یا تو مکے کے لوگوں کی تھی یا پھر مدینہ کے۔ ساتھ ساتھ وہ قبیلے بھی تھے جو ان دونوں مقامات کے قرب و جوار میں تھے اور جو ایمانی جوش و جذبے سے معمور تھے۔

جو قبیلے دور دور رہا کرتے تھے ان پر اسلامی تعلیم کا اثر کم ہوا۔ وہ حضورؐ کو ویسا ہی حکمران سمجھتے تھے جیسے لخمد یا بنی غسان کے حکمران ہوا کرتے تھے حضورؐ کے اثر و اقتدار میں جب اضافہ ہو گیا تو مختلف قبائل کے سردار آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ مسلمان ہو جاتے تھے۔ تحفے تحائف لے کر واپس ہوتے تھے۔ یہ بالکل سیاسی قسم کا شعار تھا جو عرب میں اس وقت سے چلا آ رہا تھا جبکہ تاریخ کے افق پر ابھی سویرا بھی نمودار نہ ہوا تھا۔ ان میں اکثروں نے حضورؐ کو ایک سیاسی رہبر اور سیاسی شخصیت کا روپ دے دیا تھا۔ اس ذہنیت کے

Marfat.com

نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے ہی حضورؐ کا انتقال ہوا۔ بہت سارے قبائل نے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ یہ بغاوت کی آگ سارے جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی تھی۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ اسلام کی کامیابی اور ترقی کا پہلا سبب حضورؐ کی ذاتِ گرامی تھی۔ اسلام کی اشاعت اور اس کی روز افزوں کامیابی کا سہرا حضورؐ کی اُس صلاحیت کے سر ہے جس کو کام میں لا کر آپ نے لوگوں کے دل موہ لیے تھے آپ نے لوگوں کے دلوں کو اس طرح سے اپنی طرف کر لیا تھا کہ زندگی میں جو بھی ایک بار آپ کا ہو گیا وہ پھر آپ کے دائرۂ اثر سے باہر نہیں نکلا۔

اسلام کے تیزی سے پھیلنے کا دوسرا سبب مقامی عربوں کی بھرم بھاری اور پیارا خالی والی روش تھی۔ ان کے عقائد اتنے کمزور تھے اور ان میں اتنا زیادہ خلا رہتا کہ ان کی یہ کمزوری اسلام کے پھیلنے میں بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ ان بُت پرستوں اور بے دینوں کے ہاں نہ اپنے مذہب کی اہمیت تھی اور نہ ہی وہ اسے اہمیت دیتے تھے۔ عرب بُت پرستی کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ کوئی ایسا محافظ یا سرپرست نہیں تھا جو بُت پرستی کی بقاء کے لیے سینہ سپر ہو کر میدان میں آتا۔ نہ ان میں کوئی تنظیم تھی نہ ہی آپس میں اتحاد و اتفاق۔ جو لوگ ان میں تجارت پیشہ تھے اور تجارتی سفر کے دوران عیسائیوں، یہودیوں اور آتش پرستوں سے ملتے تھے جب وہ اپنے مذہبی اصول و عقائد کا مقابلہ اہل کتاب کے مذاہب سے کرتے تو اپنے مذہب کو مسخرا پن قرار دیتے تھے۔ اس کا تمسخر اڑاتے تھے۔ پورے عرب میں کوئی ایک عرب بھی ایسا نہیں نکلا جس نے اپنے بتوں کی حفاظت اور مدافعت کی خاطر اپنی جان کی قربانی دی ہو۔ ان کی خاطر تلوار اٹھائی ہو یا بتوں کی خاطر جامِ شہادت پیا ہو۔ عربوں کے سامنے ان کے بتوں کی بے بسی اور مجبوری رکھی

Marfat.com

گئی۔ ان کو قائل کیا گیا کہ دیوتاؤں کی پوجا کرنا عقل و انصاف کے منافی ہے۔ عربوں کے قدیم شعار اور ان کی خاندانی اعلیٰ صفات کو ان کے آگے رکھا گیا۔ ان کے بڑوں کی داستانیں ان کے سامنے اس لیے دہرائی گئیں کہ وہ اپنے پس منظر سے واقف ہوں۔ روحانیت کی طرف مائل ہوں۔ زندگی کے اعلیٰ اقدار سے شناسا ہوں۔ بجائے بتوں کو اہمیت دینے کے ان کو اپنی آپ پہچان کے لیے کہا گیا۔ حضورؐ کی وحدانیت کی تعلیم اتنی ارفع و اعلیٰ تھی کہ اس کا مقابلہ کعبے کے بتوں کو پوجنے سے کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ہر وہ شخص جس میں تھوڑی بہت بھی سمجھ تھی وحدانیت کی تعلیم کو سمجھنے لگا تھا۔ عجیب بات ہے کہ عربوں میں سے کسی نے کبھی اپنے بتوں کی مدافعت کے لیے تلوار اٹھائی اس کے باوجود وہ اپنے پرانے اور روحانی رسم و رواج کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ جب ان سے بت پرستی چھڑوانے کی کوشش کی گئی تو ان میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی۔ جب ایک مرتبہ تمام قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا تو پھر اسلام اور قبیلہ داری وفاداری کے درمیان کوئی تنازعہ پیدا نہیں ہوا۔ عربوں اور اسلام میں مکمل سمجھوتہ ہو گیا۔ ہر عرب قبیلہ مسلمان تھا اور ہر عرب کسی نہ کسی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ جب بات یہاں تک آ پہنچی تو کوئی سبب نہ تھا کہ اسلام عربوں کی خوبیوں کی مخالفت کرتا۔

جب بدلہ لینے کا ذکر آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ حضورؐ نے کبھی بھی مسلمانوں سے یہ نہیں فرمایا کہ اپنے دشمن سے محبت کرو۔ آپ نے فرمایا کہ دشمن اس قابل ہیں کہ ان سے انتقام لیا جائے لیکن اگر مسلمان اپنے دشمن کو معاف کر دیں تو ان کی یہ معافی اللہ کی خوشنودی کا باعث ہوگی۔ حضورؐ کے اس فرمان کی روشنی میں عربوں کو یہ موقع ملا کہ اپنے قدیم قومی شعار کے مطابق آئندہ بھی لوگوں سے انتقام لیتے رہیں۔

Marfat.com

عربوں میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے کا تیسرا سبب یہ تھا کہ حضور کے انتقال کے بعد سب ہی قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ پرانی رقابت جو اسلام سے وفاداری اور قبیلہ وارانہ وفاداری کے درمیان چلی آرہی تھی وہ اب مفقود ہو چکی تھی۔

چوتھا سبب یہ رہا کہ جیسے ہی بیزنطینوں کے خلاف عربوں نے جنگ شروع کی آپس کے اختلافات کو ختم کر دیا۔ اسلام پر جو اعتراضات کیے جاتے تھے وہ بھی دب گئے۔ غیر مسلموں سے جنگ اب ان کے جذبات کو ابھارنے لگی۔ ان میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے لگی۔ جنگوں میں ان کی روحانیت کا عنصر نظر آنے لگا آپس کی قبیلہ وارانہ جنگوں سے زیادہ کشش اب انہیں غیر مسلموں کے خلاف جنگ کرنے میں نظر آنے لگی۔

جو لوگ کل تک بتوں کی پوجا کرتے تھے، زندگی کے مقصد سے ناآشنا تھے آج ان کو مذہب کے نئے تصور سے نوازا گیا۔ اس خدا کا تصور دیا گیا جو یکتا ہے، عظیم ہے، قہار اور جبار ہے جس کی ساری دنیا پر حکومت ہے۔ ساری کائنات پر حکومت ہے۔ خدائی کے اس تصور نے ان کی جذباتی دنیا میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ سونے پر سہاگہ ان کے ذہنوں میں یہ خیال بھی جم گیا کہ پروردگار نے ان کو اس لیے ایمان سے نوازا کہ وہ ساری دنیا کو فتح کریں۔ کائنات پر حکمرانی کریں۔ اس نئے نظریے اور نئے تصور نے عرب کے سیدھے سادے لوگوں کی روحوں میں ایک برقی رو دوڑا دی تھی۔

رسول اللہ کے انتقال کے بعد عرب قبائل نے متفقہ طور پر اس نظریے کو اپنایا کہ وہ خدا کے نائب ہیں۔ دنیا پر حکومت کرنا ان کا حق ہے۔ نیابت الٰہی کے نظریے کی بدولت وہ ہر موقع پر فاتح رہے۔ فتح و نصرت ہمیشہ ان کا ساتھ دیتی رہی۔

Marfat.com

بدر، اُحد اور حُنین میں ایک عرب دوسرے عرب سے لڑ رہا تھا۔ وہ آپس ہی میں برسرِ پیکار تھے۔ مسلمان اپنے مذہب کی خاطر لڑ رہے تھے۔ ان کا منشا تھا کہ قدیم رومانی زندگی کا، جس کے وہ عادی ہو چکے تھے خاتمہ کر دیا جائے۔ جیسے ہی انہوں نے اسلام قبول کر لیا اب وہ یونانیوں اور ایرانیوں کے مقابلے پر اُتر آئے۔ صورتحال نے پلٹا کھایا۔ اب قدیم اور رومانی طرزِ زندگی کا خاتمہ کرنا نہیں تھا بلکہ لڑنا اللہ کی راہ میں تھا۔ عربوں کی روایاتی اور تاریخی بہادری اب اسلام کی خدمت بجا لا رہی تھی۔ عرب میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے کا پانچواں سبب ان کی مسلسل کامیابیاں رہیں۔ دنیا میں کامیابی سے بڑھ کر کوئی اور نشہ نہیں ہوتا معمولی اور سادہ زندگی بسر کرنے والوں نے اب اپنے اللہ سے یہ امید لگا رکھی تھی کہ وہ اپنے ایماندار اور اطاعت گزار بندوں کو اسی دنیا میں انعام و اکرام سے نوازے گا۔ توریت میں بھی بارہا اس عقیدہ اور ایقان کا ذکر آ چکا ہے۔ موسیٰ کی قوم اپنے خدا سے توقع رکھتی تھی کہ وہ ان کو فتح سے نوازے گا۔ رسول اللہ کا بھی عقیدہ اور ایمان تھا کہ صاحبِ ایمان کو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی نوازے گا اور آخرت میں بھی۔

ایک زمانہ ایسا بھی آیا جس میں مذہبی لوگوں نے محسوس کیا کہ عملی طور پر ایسا ہونا ناممکن ہے۔

عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق جنت کے فرشتوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ رنج و الم سے جیسے نکل آئے ہیں۔

سینٹ پال کا بھی یہی کہنا ہے کہ رنج و الم اور تکلیف و مصیبت میں شادمانی اور راحت ہے۔

عرب کے بدوی بڑے ہی سادہ لوح تھے ان کو یقین تھا کہ ان کا خدا ان کو دولت، حکمرانی، کامیابی اور دنیا کی ہر نعمت سے سرفراز کرے گا۔ وہ سمجھتے تھے

Marfat.com

کہ خدا کی نظر کرم نے ان کو اپنی نعمتوں کے لیے چن لیا ہے۔ بیز نطینوں اور ایرانیوں پر ان کی فتح نے ان کے اس یقین میں اور پختگی پیدا کر دی۔ ان کو یقین ہو گیا کہ خدا واقعی لڑائیوں اور جنگوں میں ان کے ساتھ ہے ان کی مدد کر رہا ہے۔

عرب میں تیزی سے اسلام پھیلنے کا چھٹا سبب یہ تھا کہ وہاں کے لوگ اس پیغام کے اہل تھے۔ زمانہ اس کے لیے سازگار تھا۔ اسلام اصل میں عربوں کا مذہب ہے۔ قرآن عربی میں اتارا گیا ہے۔ قرآن کے عربی میں نازل ہونے کی وجہ سے انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ یہ خدا کی زبان ہے۔ جنت میں خدا عربی زبان ہی میں لوگوں سے ہمکلام ہو گا۔ عربوں کا انداز فکر بہت ہی سیدھا سادا ہوتا تھا۔ آج بھی ان کے سوچنے کے انداز میں وہی سادگی ملتی ہے۔ یونانیوں، شامیوں اور بحیرہ روم کے ساحل پر رہنے والے لوگوں کی طرح ان میں زیرکی اور چالاکی نہیں تھی۔ فلسفیانہ موشگافیوں سے کوسوں دُور تھے۔ ذہنی تیز فہمی نہیں تھی۔ اسلام یہودیت سے ان معنیٰ میں مشابہ تھا کہ مذہب کے خدوخال بہت ہی واضح، صاف اور بغیر کسی ہیر پھیر کے تھے۔ ایک خدائے واحد و برتر۔ ایمانداروں کے لیے جنت میں انعام واکرام۔ بدکاروں کے لیے دوزخ میں سزا۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ اسلام مشرق و مغرب میں تیزی سے جو پھیلا وہ خط استوا کے شمال میں ۱۵، اور ۳۵ درجہ کے عرض البلد میں دونوں طرف یکساں طریقے سے پھیلا۔ اس حصے میں ریگستان کا ایک لمبا سلسلہ چلا گیا ہے۔ مراکش سے لے کر پاکستان تک۔ اس حصے کا درجہ حرارت خط سرطان اور خط جدی سے بالکل مختلف ہے۔ غالباً ریگستانی علاقوں میں جو لوگ پیدا ہوتے ہیں وہ بہت ہی سادہ لوح اور سیدھی سادی ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں۔ آفریقہ کے باشندوں نے بڑے ہی جوش و خروش سے اسلام کو قبول کیا۔ عربوں سے

اخلاقی اور سماجی اعتبار سے رشتہ ناتا ہونے کے باوجود انہوں نے عربوں کے مذہب کو خوش آمدید کہا۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے زیر اقتدار یا ان کے زیر حکومت رہنا کبھی پسند نہیں کیا۔ عربوں کی حکومت کی انہوں نے سختی سے مخالفت کی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عرب کے لوگ شرک وبت پرستی سے اپنا ناتا توڑے ہوئے تو تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ کسی اعلیٰ اور برتر روحانی عقیدے کی تلاش میں تھے ان کے آگے یونانی مسیحیت کی وحدانیت کا پیغام بھی تھا۔ پہاڑی وعظ سے بھی وہ واقف تھے۔ پہاڑی وعظ میں جو سادگی اور سچائی تھی یہ سچائی اور سادگی ان کو وحدانیت کے اس پیغام میں نہیں ملتی تھی جو یونانی مسیحیت کی طرف سے ان کے آگے پیش کیا جاتا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں یونانی مسیحیت علمی اور منطقی موشگافیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ عقیدہ تناسخ پر لاحاصل بحث ومباحثہ ہوا کرتا تھا۔ مسئلہ تناسخ کی تشریح وتوضیح نت نئے طریقوں سے کی جاتی تھی۔ ان کی ان لاحاصل بحثوں کی وجہ سے عام لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ ان کی فلسفیانہ باتیں عام لوگوں کی سمجھ سے باہر تھیں ان کے آپس کے بحث ومباحثہ ایک دوسرے سے نفرت اور رائی کا پہاڑ بنانے نے عربوں کو اس کا موقع دیا ہی نہیں کہ وہ یونانی مسیحیت کی طرف توجہ بھی کریں۔

عرب سمجھ بوجھ کے لحاظ سے بھی یونانیوں کی پیچیدہ مسیحیت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ عیسائیوں کے نظریات جو محبت، خوشی اور امن کے تعلق سے تھے یونانیوں کی آپس کی کج بحثیوں کی وجہ سے عربوں کے علم میں نہ آسکے۔ عرب لوگ محبت، خوشی اور امن کے عیسائی تصوّر سے بے بہرہ رہے۔ اس وقت جبکہ عرب ایک پاکیزہ اور اعلیٰ مذہب کی تلاش اور جستجو میں تھے بیزنطینیوں

Marfat.com

مسیحیت ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام رہی۔

یہودیت میں وحدانیت کی ایک صاف اور صریح تعلیم تھی۔ عربوں کا رویہ یہودیت کے تعلق سے نرم اور مصالحتانہ تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک موقع پر حضورؐ نے مسلمانوں اور یہودیوں کی ایک مشترکہ فوج بھی بنانے کی امید ظاہر کی تھی تاکہ دشمنوں سے مقابلہ کیا جا سکے۔ مدینہ کے یہودیوں کی تعبوتی شان نے حضورؐ کی اس امید کو مایوسی میں تبدیل کر دیا۔ یہودیوں نے وہ موقع تو ہاتھ سے جانے دیا جس سے فائدہ اٹھا کر وہ مقامی لوگوں کو اپنے مذہب کی طرف مائل کر سکتے تھے اس کے برخلاف یہ حماقت ضرور کی تھی کہ اپنے سارے علمی ذخیرے کو کام میں لاتے ہوئے حضورؐ کی تضحیک کرنی شروع کر دی۔ لوگوں کے سامنے آپ سے مہمل سوالات کر کے آپ کو شرمندہ کرنے کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

عرب اپنے دل کی تسکین کے لیے وحدانیت کی تلاش میں تھے۔ ان کے سامنے وحدانیت کا جو تصور پیش کیا گیا اس میں پیش رو دو مذاہب کے وحدانی تصور کی آمیزش کی گئی اور ان کو بنیاد بنایا گیا۔ ایک ایسا تصور وحدانیت ان کے آگے رکھا گیا جو ان کی طرز فکر سے مطابقت رکھتا تھا۔ ان کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا۔ اس تصور میں اتنی پیاری عربی چاشنی تھی جو سارے جزیرہ نمائے عرب میں اس مذہب کو تیزی سے پھیلانے میں دو آتشہ کا کام کر رہی تھی۔

جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے کے اسباب جو اوپر بیان کیے گئے ہیں وہ بہت سوں کے لیے یقیناً قابلِ قبول ہوں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا تھا جو غیر عرب ممالک میں رہا کرتے تھے اور اس سرعت کے ساتھ اسلام کو قبول کرتے جا رہے تھے۔ یہ سوال اپنی جگہ اور بھی اہمیت اختیار کر لیتا ہے جب ہم ان ممالک کے لوگوں کا ذکر کرتے

Marfat.com

ہیں جن کو اپنی ہزاروں سالہ تہذیب و تمدن اور ثقافت پر ناز تھا۔ جو ایک حد تک وحدانیت پر بھی یقین رکھتے تھے۔

مغرب میں رہنے والی عیسائی اقوام کا عام طور سے یہ خیال ہے کہ اسلام کو تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے۔ بہت زیادہ تحفظات کے ساتھ ان کے اس خیال سے متفق ہونا پڑتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ حضورؐ کے انتقال کے بعد عرب کے مختلف قبیلوں میں بغاوت کی جو آگ پھیل گئی تھی اس کو بجھانے کے لیے طاقت کا استعمال کرنا پڑا۔ تلوار استعمال کی گئی۔ چند ہی مہینوں بعد جب مسلمانوں نے بیزنطینیوں اور ایرانیوں کے خلاف قدم اٹھائے تو اندرونی بغاوت کو کچلنے کے لیے جو خون بہایا گیا تھا اس کو سب ہی نے فراموش کر دیا۔ چونکہ غیر ملکیوں سے لڑنے کا معاملہ سامنے تھا اس لیے گھر کے جھگڑوں کو ہر ایک نے بھلا دیا۔ آپس کی ساری شکر رنجیاں اور غلط فہمیاں دُور کرنی پڑیں۔ غیر ملکیوں سے لڑنے کے لیے سارے عرب انتہائی جوش اور جذبے کے ساتھ میدان عمل میں کود پڑے۔ جس سرعت کے ساتھ مسلمانوں نے شام، مصر اور فلسطین کو فتح کیا اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔

سب سے دلچسپ ترین بات ان فتوحات میں یہ رہی کہ مفتوحہ اقوام کو اپنا مذہب تبدیل کرنے کے لیے مسلمانوں نے کبھی بھی مجبور نہیں کیا۔ کہیں بھی مجبور نہیں کیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ رسول اللہؐ نے عیسائیوں اور یہودیوں کو جبراً مسلمان بنانے کی کبھی بھی وکالت نہیں کی تھی۔

مدینہ کے یہودیوں پر جو نزلہ گرا تھا اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہودی قبیلوں نے حضورؐ کے پیغام کی مخالفت کرنی شروع کر دی تھی اسی لیے یا تو ان کو قتل کر دیا گیا یا پھر مدینہ سے بھگا دیا گیا۔

Marfat.com

دوسرے معنوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہودیوں سے مخالفت کی بڑی وجہ سیاسی رہی نہ کہ مذہبی۔ یہودیوں کی ساری تباہی کے باوجود کبھی انفرادی طور پر یہودی مدینہ میں رہا کرتے تھے۔ اپنی تجارت میں لگے ہوئے تھے۔ مدینہ میں رہنے والے بقیہ یہودیوں پر کبھی بھی کوئی ایسا اثر اور دباؤ نہیں ڈالا گیا جس سے مجبور ہو کر وہ اپنا مذہب بدلیں۔ جیسے ہی انہوں نے حضورؐ کی مخالفت کرنی ترک کر دی ان سے کسی بھی قسم کی کوئی باز پرس نہیں کی گئی۔

جہاں تک نصرانیوں کا تعلق ہے حضورؐ نے نصرانی قبیلوں سے معاہدے کیے تھے۔ نجران، جنوبی اردن، ایلہ اور دومہ کے عیسائی حکمرانوں نے حضورؐ کے ساتھ معاہدے کر رکھے تھے۔ قرآن میں ایسے کئی باب ہیں جن میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ پیغمبر کا کام لوگوں کو صرف تنبیہہ کرنا ہے۔ ان کے پیچھے پڑ جانا نہیں اپنے عقیدے کی طرف بلانا ہے۔ سلامتی کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔ لاحاصل خواہشات کے چکر میں نہیں پڑنا ہے۔ خدا پر اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں پر ایمان لانا ہے بعض جگہ کہا گیا ہے کہ خدا ہمارا بھی خدا ہے۔ خدا تمہارا بھی خدا ہے۔ ہمارے اعمال ہمارے ساتھ ہیں۔ تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں۔ تم میں اور ہم میں جھگڑا تو ہونا ہی نہیں چاہیئے۔ خدا ہم سب کو ایک کرے گا۔ ہم سب مل کر اس کی بارگاہ میں لوٹیں گے۔

قرآنی آیات کا جو مفہوم اوپر پیش کیا گیا ہے اگر اس مفہوم کے پیش نظر یہودی اور عیسائی ہی ہیں تو یہ اسلامی رواداری کی معراج ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا رواداری ہو سکتی ہے۔

آگے چل کر قرآن کے سورہ نور کی ۵۴ آیت میں ارشاد ہوتا ہے

" کہہ دو کہ خدا کی فرمانبرداری کرو اور رسول کے حکم پر چلو اگر منہ موڑو گے تو رسول پر جو ان کے ذمے ہے اور تم پر جو تمہارے ذمے ہے اور اگر تم ان کے فرمان پر چلو گے تو سیدھا راستہ پا لو گے اور رسول کے ذمہ تو صاف صاف (احکام) پہنچا دینا ہے۔

Marfat.com

قرآن کی یہ آیتیں صاف طور پر کہہ رہی ہیں کہ پیغمبر کا کام صرف تبلیغ کرنا ہے ارشاد و ہدایت ہے۔ طاقت کا استعمال نہیں۔

اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ قرآنی آیات نہ صرف جنگ نہ کرنے کی حامی بھر رہی ہیں بلکہ جنگ کرنے سے منع کر رہی ہیں تو پھر اس روشنی میں ہم مسلم فاتحین کے کارناموں پر نظر ڈالیں گے۔

حضورؐ کے انتقال کے دو سال بعد حضرت ابوبکرؓ جب شام پر حملہ کرنے کا حکم دے رہے تھے اپنی فوجوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "انصاف سے کام لو۔ عقیدے اور ایمان میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ بچوں کو نہ مارو۔ ضعیفوں اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ پھل دینے والے درختوں کو نہ کاٹو۔ اگر تمہارا گزر دوسرے مذاہب کے عبادت خانوں کی طرف سے ہو تو ان عبادت خانوں میں جو لوگ عبادت کر رہے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔"

جن لوگوں کو مفتوح یا مغلوب کیا گیا ان کے سامنے دو صورتیں رکھی گئیں۔ اسلام یا تلوار۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے عرب کو چھوڑ کر اسلام اور تلوار کا فارمولا جس طریقے سے استعمال میں لایا گیا وہ یہ تھا کہ دشمن کو جب اسلام کی اطاعت کے لیے کہا جاتا تھا ان کو تلوار دکھائی جاتی تھی۔ جب دشمن ہتھیار ڈال دیتے تھے تو تلوار نیام میں رکھ لی جاتی تھی۔ دشمنوں سے ہتھیار ڈلوانے کے لیے تلوار دکھائی گئی۔

میرا یہ بیان مزید تشریح طلب ہے۔ سب سے پہلی بات جو ہمیں یاد رکھنی چاہیئے وہ یہ کہ دشمن جیسے ہی مغلوب ہو جاتے تھے اور اسلام کے حلقہ میں داخل

Marfat.com

ہو جاتے تھے ان کو فاتحین کی برابری حاصل ہو جاتی تھی۔ فاتح اور مفتوح میں پھر کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا تھا۔ یہ ایک ایسی خاص بات تھی جو کشادہ دلی اور وسعت قلب کی بہترین ترجمانی کرتی تھی۔ تاریخ عالم میں ایسی مثال نایاب ہے کہ جس میدان پر لڑائی ہوئی ہو عین اسی جگہ کسی فاتح نے مفتوح کو اپنے برابر کا مقام دے دیا ہو۔

بعض بعض جگہ اس زرّیں اصول پر عمل نہیں کیا گیا۔ عربوں نے اپنی فتوحات کے نشہ میں سماجی طور پر اپنی برتری کا مظاہرہ کیا۔ مفتوحہ قوموں کو دوسرے درجے پر رکھا۔ ایسا عمل معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سرکاری پالیسی کے عین مطابق تھا۔

عرب فاتحین نے مفتوحین کے ساتھ جس وسعت قلبی اور نرمی کا مظاہرہ کیا اس کی بھی چند وجوہات تھیں۔ شکست خوردہ لوگوں کے سامنے جو متبادل صورت رکھی جاتی تھی وہ جزیہ تھا۔ زکوٰۃ کے سلسلے میں یہ کہا جا چکا ہے کہ عرب قبائل کسی بھی قسم کے ٹیکس ادا کرنے کو اطاعت اور فرمانبرداری کا ایک طریقہ سمجھتے تھے۔ جو لوگ ٹیکس وصول کرتے تھے وہ ٹیکس کو اپنی سیاسی برتری کا ایک نشان سمجھتے تھے۔ یہودیوں اور عیسائیوں پر جزیہ عاید کرنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ ان سے اس طریقے سے اپنی برتری منوائی جائے۔

مختلف ادوار میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے جزیے وصول کیے گئے جزیے کی متعینہ رقم میں حالات کے لحاظ سے کمی بیشی ہوا کرتی تھی۔ اس لیے ہمارے واسطے یہ مشکل ہے کہ جزیہ کی شرح کو یہاں پاؤنڈ اور پنس کے حساب سے پیش کریں۔ عام طور پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر آدمی کو دو پاؤنڈ یا ۵ ڈالر جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اگر اس کا پانچ یا دس گنا بھی انہیں دینا پڑتا تو یہ اتنی بڑی رقم نہیں تھی کہ وہ ادا نہ کر سکتے ہوں۔ یہ جزیہ صرف مردوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ محتاجوں، راہبوں اور چرچ میں رہنے والوں سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ یہ لوگ جزیے سے مستثنیٰ

Marfat.com

قرار دیے گئے تھے اس معمولی اور حقیر رقم کو جزیے کے طور پر ادا کر دینے کے بعد عیسائی اور یہودی فوجی خدمات کی ادائیگی سے اپنے آپ کو مستثنیٰ کر لیتے تھے صرف مسلمانوں کے فرائض میں فوجی خدمات شامل تھیں۔

جزیے کے طور پر ایک معمولی رقم ادا کر دینے کے بعد فوجی خدمات سے چھٹی پا جانا یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے واقعی ایک سستا سودا تھا۔ جزیہ وصول کرنے کے بعد مسلمانوں کا یہ فرض بن جاتا تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے جان و مال کی حفاظت کریں۔ مسلمانوں کے ذمے فوجی فرائض کے علاوہ زکوٰۃ کی ادائیگی بھی تھی۔ یہودی اور عیسائی زکوٰۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہودیوں اور نصرانیوں کے ساتھ خاصی رعایت کی جاتی تھی۔ مالی اعتبار سے بھی ان کا جزیہ مسلمانوں کی زکوٰۃ کے مقابلے میں انفرادی طور پر بہت ہی کم ہوتا تھا۔

خالد ابن ولیدؓ نے حبشہ کے شہریوں کے ہتھیار ڈال دینے کو قبول کر لینے کے بعد ان کو اپنے خط میں لکھا کہ اگر ہم تمہاری حفاظت کریں تو تمہارے لیے جزیہ واجب الادا ہو گا۔ اگر ہم تمہاری حفاظت نہ کر سکیں تو تم کو جزیہ دینے کی ضرورت نہیں۔

واقعہ تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے حفاظت کرنے کے فرض کو انتہائی خوش اسلوبی اور دیانتداری کے ساتھ نبھایا۔ ۶۳۵ء میں انہوں نے دمشق پر قبضہ کیا۔ شام کے ایک بڑے حصے کو بغیر لڑائی کے اپنے قبضے میں لے لیا۔ وہاں کے عیسائیوں سے جزیہ وصول کیا۔ مسلمانوں کے اس قبضہ کرنے کے دوسرے ہی سال بیزنطینیوں کی ایک تازہ دم فوج نے عربوں کو شام چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ شام چھوڑنے سے پہلے مسلمانوں کے کمانڈر ابو عبیدہؓ نے حکم دیا کہ جن ذمیوں سے جزیہ وصول کیا گیا ہے وہ سب کا سب ان کو لوٹا دیا جائے۔ ابو عبیدہ نے کہا کہ عربوں نے یہ جزیہ ذمیوں کی جان و مال کی حفاظت کے بدلے میں وصول کیا تھا۔ اب چونکہ مسلمان شام

Marfat.com

کے ذمیوں کے جان و مال کی حفاظت کرنے کے موقف میں نہیں ہیں اس لیے جمع کیا ہوا جزیہ واپس کر دیا جائے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ دنیا کی تاریخ میں کوئی واقعہ اس نوعیت کا ہو کہ کسی حکومت نے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برا نہ ہو سکنے کی وجہ سے عوام سے وصول کیے ہوئے ٹیکس کو عوام میں پھر سے لوٹا دیا ہو۔

آغاز اسلام سے قبل صحرائے شام کے بہت سے بدوی قبائل عیسائیت کو اپنا مذہب بنائے ہوئے تھے۔ جب مسلمانوں نے شام اور عراق پر حملہ کیا تو شام کے یہ عیسائی عرب مسلمانوں کی طرف سے لڑنے لگے اس لیے کہ ان کا طرزِ زندگی عربوں سے ملتا جلتا تھا۔ ان کی زبان عربی تھی۔ جب مسلمانوں کی طرف سے اہلِ کتاب بھی جنگ میں حصہ لیتے تو ان سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ ان کو اپنا مذہب بدلنے کے لیے بھی نہیں کہا جاتا تھا۔

عربوں اور مسلمانوں کے طرز فکر میں تھوڑا بہت جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی ایک مثال ہمارے سامنے ہے۔ حبشہ میں رہنے والے ایک عیسائی قبیلے تغلب نے اپنے آپ کو عیسائی ہی رکھا۔ پہلے تو ان کو جزیہ دینے پر مجبور کیا گیا لیکن بعد میں ان سے جزیہ لینا اس لیے بند کر دیا گیا کہ وہ عرب تھے۔

یہ بات بڑے ہی تعجب کی ہے کہ اموی خلفاء کے زمانے میں یعنی ۶۶۱ء سے ۷۵۰ء تک عربوں نے خود ہی یہ کوشش کی کہ مقبوضہ علاقوں کے لوگ مسلمان نہ ہونے پائیں۔ بجائے دیگر اقوام کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے وہ ان کے اسلام قبول کرنے کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ بجٹ کا توازن قائم رکھنے کے لیے خزانہ عامرہ ہمیشہ جزیہ پر بھروسہ کرتا تھا۔ چونکہ مسلمان جزیہ ادا نہیں کرتے تھے اس لیے ایک بڑی تعداد میں لوگوں کا اسلام قبول کر لینا

مسلمانوں کے بجٹ کو خسارے میں ڈالنے کا باعث بن سکتا تھا۔ جب غیر مسلموں نے مسلمان ہو جانے پر اصرار کیا تو جزیہ وصول کرنے والوں کو ہدایت کی گئی کہ لوگوں سے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی جزیہ وصول کیا جائے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ جزیہ کی ادائیگی لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کا ایک بڑا سبب بنی۔ اس لیے نہیں کہ جزیہ ان کے لیے ایک رقمی بار تھا بلکہ اس لیے کہ جزیہ کا ادا کرنا ان کے لیے ایک سُبکی اور تحقیر کا باعث تھا۔ اس کے ادا کرنے کو وہ اپنی ذلت سمجھتے تھے۔

مفتوحہ نسلوں کے تعلق سے عربوں کا رویہ ہمیشہ رواداری اور لطف و کرم کا رہا۔ مفتوحہ اقوام کی جان و مال کی حفاظت مسلمان کیا کرتے تھے۔ مفتوحہ اقوام کے قابل افراد کو مختلف فرائض منصبی پہ فائز کرتے تھے۔ ان کو اچھی ملازمتیں دی جاتی تھیں۔ اثر و اقتدار کا ملجا اور ماویٰ کون تھے اس کے پہچاننے میں کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی شہادت اور گواہی کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ایک مسلمان کے عہد اور اس کی قسم کا بہ مقابلہ غیر مسلم زیادہ پاس رکھا جاتا تھا۔ ملک کے تمام انتظامی اور فوجی اعلیٰ عہدے مسلمانوں کو دیے جاتے تھے۔ کلرکی اور معمولی قسم کے کام دوسروں سے لیے جاتے تھے۔ ایک مسلمان عیسائی عورت سے شادی کر سکتا تھا لیکن ایک مسلمان عورت کسی عیسائی کو اپنا شوہر نہیں بنا سکتی تھی۔ اس قسم کی عدم مساوات کی مثالیں مسلمانوں میں پائی جاتی تھیں۔

عیسائیوں اور یہودیوں کو کبھی بھی دِق نہیں کیا گیا۔ غیر ضروری طور پر مسلمانوں نے ان کو تنگ نہیں کیا۔ یہودی اور عیسائی مسلمانوں سے زیادہ مالدار رہے۔ اس کے باوجود وہ سماجی اونچ نیچ کا شکار بنے رہے۔ مسلم سوسائٹی میں ان کو کم تر سمجھا جاتا تھا۔

Marfat.com

مسلمانوں کا سیدھا سادا فارمولا جو لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شکل میں ہے۔ مسائل کو خود بخود حل کر دیتا ہے۔ جیسے ہی غیر مسلم اس کلمے کو ادا کر دیتے تھے۔ فاتحین کی صف میں شامل کر لیے جاتے تھے۔ مسلمان ہو جانے کے بعد عرب عورتوں سے شادی کر سکتے تھے۔ حکومت اور فوج کے بڑے سے بڑے عہدے حاصل کر سکتے تھے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ مفتوحہ علاقوں کے افراد زیادہ سے زیادہ تعداد میں خود سے اسلام قبول کرنے کے خواہاں تھے۔ ان کے لیے اب اسلام میں کشش تھی۔ جاذبیت تھی۔ دین تو تھا ہی دنیا بھی ان کو مل رہی تھی۔ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی جزیہ کی ادائیگی کا حکم تک ان کو مسلمان بننے سے نہ روک سکا۔

ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ عربوں کی ابتدائی فتوحات میں مسلمانوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی یہودیوں اور عیسائیوں نے تلوار کے ڈر سے اپنا مذہب تبدیل کیا۔

شام فتح ہو جانے کے بعد کئی نسلوں تک شام کے عیسائی اپنے ہی مذہب پر قائم رہے۔ لبنان میں آج تک عیسائی رہتے آ رہے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ نصاریٰ اور یہود کو اس بات تک کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ پر اپنے مذہبی قانون کا اطلاق کریں۔ اپنے تنازعات کے فیصلوں کے لیے حاکمانِ عدالت کا اپنی برادری میں سے انتخاب کر لیں۔

مسلم نظریات کی رُو سے تمام قانون مذہب سے جنم لیتے ہیں۔ قانون کی اساس مذہب ہی فراہم کرتا ہے۔ مذہب ہی کے سرچشمے سے قانون کی ندیاں بہتی ہیں مسلمانوں کے اپنے قانون کا ماخذ قرآن اور احادیث ہیں۔ اسی لیے عیسائیوں اور

Marfat.com

یہودیوں کے لیے یہ ضروری قرار نہیں دیا گیا کہ وہ اسلامی قانون پر عمل پیرا ہوں۔
چونکہ عیسائیوں اور یہودیوں کو جبراً مسلمان بنانے سے احتراز کیا گیا، اسی منطق
کے پیش نظر ان پر اسلامی قانون کے اطلاق کی بھی شرط نہیں رکھی گئی۔

ہر مذہب اپنے بنیادی عقیدے اور ایمان کی روشنی میں اپنے قانون آپ
مرتب کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عربوں نے تو اپنے مفتوحہ لوگوں کو اسلام
قبول کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا تھا اس کے باوجود شام اور مصر کے یہودیوں
اور عیسائیوں نے مخالفت کیوں نہیں کی۔ مسلمانوں کو ان کی مخالفتوں کا سامنا
آخر کیوں نہ کرنا پڑا؟

اس کا پہلا سبب تو بیزنطینی چرچ کی تنگ نظری رہی۔ بازنطینی ایک ہزار
سال تک شام کے لوگوں کا خون چوستے رہے۔ ان کو اپنے رنگ میں رنگنے کی
کوشش کرتے رہے۔ شام کے شہریوں میں رہنے والوں کی بڑی اکثریت یونانیوں
پر مشتمل تھی یا یونانی خون اپنی رگوں میں لیے ہوئے تھی۔ شام ہمیشہ سے شرانگیزیوں
کا گہوارہ بنا رہا۔ فرقہ بندی، خفیہ جماعتوں اور مذہبی اور سیاسی گٹھ بندیوں کا وہ
عرصے سے گڑھ رہا ہے۔ ساتویں صدی کا یہ ملک آج سے یا اپنے زمانے سے
پہلے کے شام سے مختلف نہیں تھا۔ ان کا کام ہی یہ ہوتا تھا کہ ہر شرانگیزی
کی سرپرستی کریں۔ مختلف دھڑے بندیوں میں جی کھول کر حصہ لیں، مختلف قسم کے
عقائد کی اپنے ملک کو آماجگاہ بنائیں۔

بیزنطینیوں نے رواجی چرچ کے ساتھ اپنا ناتا جوڑنا چاہا۔ جو عیسائی اس کے
لیے تیار نہیں تھے۔ ان کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔

مسلم حملہ آور یونانی کج بحثوں سے بہت مختلف تھے۔ انہوں نے عیسائیوں

Marfat.com

سے رواداری برتنے کا وعدہ کیا۔ اپنے برابر سمجھنے کا وعدہ کیا۔ وہ عیسائی جنہوں نے اپنے آپ کو رواجی چرچ کے ساتھ وابستہ نہیں کیا تھا اب وہ مسلمانوں کے عدل وانصاف، رواداری اور مساوات کے گُن گانے لگے۔ یہی وہ عیسائی تھے جو اپنے ہی ملک میں اپنے ہی ہم مذہبوں کے ہاتھوں ظلم وستم کا نشانہ بن رہے تھے اس ظلم وستم سے بچنے کی خاطر حکمراں مسلمانوں سے عدل وانصاف اور رحم وکرم کی امید باندھنے لگے تھے۔ مسلمانوں نے ان کی امیدوں کا پاس رکھا۔ ان کے ساتھ انتہائی رواداری اور مذہبی غیر جانبداری کا سلوک کیا۔

عرب خلفاء کے زمانے میں عیسائیوں کی قسمت کا ستارہ بڑے ہی عروج پر رہا۔ دربار میں اہم مناصب ان کو دیے جاتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کے اہم کام ان کے تفویض کیے جاتے تھے۔ دربار کے حکیم اور اطباء یہ ہوتے تھے۔ شام کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی بڑی مدد کی۔ مسلمانوں کے لیے یہ ایک بڑا سہارا ثابت ہوئے۔ پروفیسر آرنلڈ کے الفاظ میں عیسائیوں کا مسلمانوں کی طرفداری کرنا۔

"یونان کے مذہبی عالموں اور ماہرین الہیات کی خالی خولی دینیات کو اس کے خلاف ایک بغاوت تھی"

یہ صحیح ہے کہ فتوحات کے ابتدائی زمانے میں جبکہ مسلمان سراپا جوش وجذبہ کے پیکر ہوا کرتے تھے اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ تبلیغ اور تعلیم کے ذریعہ عیسائیوں کو اسلام کی طرف راغب کریں۔

اسلام کی سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی ہے۔ ان پڑھ لوگوں کے لیے تو اسلام کی سادگی ایک نعمت ہے۔ رواجی چرچ اپنے مذہبی عقائد ومسائل میں بال کی کھال اتارنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اسلامی عقائد کی سادگی اسلام کی فوری قبولیت کا باعث بنی۔

Marfat.com

مصریوں نے تو شامیوں کے مقابلے میں اور بھی جلدی اسلام قبول کیا تھا اسی آسانی سے چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیت کو بھی قبول کر لیا تھا۔ مصر کے لوگ ہمیشہ سے خاموشی پسند رہے ہیں۔ اقتدار کے آگے ہمیشہ سے سر جھکائے رہے ہیں۔ بہت ہی رکھ رکھاؤ کے لوگ ہیں۔ مصریوں کے برخلاف شامی ہمیشہ سے مفسد اور شر انگیز ہوتے آئے ہیں۔

جب شام کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ربط وضبط بڑھا تو عیسائیوں نے اسلام پر اپنا اثر ڈالنا شروع کیا۔ قرون اولی کے مسلمان بہت ہی سیدھے سادے تھے۔ شاید ہی ان کو علم الٰہیات یا دینیات کے دقیق مسائل سے کوئی دلچسپی رہی ہو۔ جب مسلمانوں نے عیسائیوں سے مناظرہ اور بحث ومباحثہ شروع کیا تو خود بھی اس بات پر مجبور ہوئے کہ فریق مخالف کو اپنے دلائل سے قائل کرنے کے لیے مختلف کتابوں کا مطالعہ کریں۔ مطالعے کی روشنی میں بحث کو کامیاب بنائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے عمیق اور وسیع مطالعے نے علم الٰہیات کی بنیاد ڈالی۔ مسلمانوں نے خود اپنا نیا فلسفہ دنیا کے آگے پیش کیا۔

غیر عرب ممالک میں جہاں کہیں بھی اسلام گیا مقامی اثرات سے متاثر ہوا۔ مختلف اثرات کو قبول کیا۔ غیر عرب قوموں نے اسلام پر مختلف قسم کے اثرات ڈالے۔ شام میں اسلامی ذہنیت پر عیسائیوں کے طرزِ فکر کی گہری چھاپ پڑی۔ بہت سے یوروپین کی نظروں میں اسلام ایک ایسا گھناؤنا مذہب ہے جس میں دنیا بھر کی برائیاں جمع ہیں۔ ان کی نظر میں یہ ایک تکلیف دہ مذہب ہے۔ ظالم ہے۔ وحشیانہ عقائد کا حامل ہے۔ انتہا پسندوں کی آماجگاہ ہے ایک ہاتھ میں تلوار ہے تو دوسرے ہاتھ میں اسلامی جھنڈا ہے جس پر ہلال کی شکل اتری ہوئی ہے۔

Marfat.com

اسلام یا مسلمانوں کے تعلق سے جو تصوّر باندھا گیا ہے۔ وہ صرف گذشتہ بیس برس کی پیداوار ہے۔ گذشتہ بیس برس سے مغربی اقوام کے ذہنوں میں مسلمانوں کے تعلق سے اس قسم کا خاکہ بننے لگا۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ بحیرہ روم کے سیاست دانوں نے خصوصاً مصریوں نے اسرائیل کو صفحہ ہستی سے ختم کر دینے کی دھمکیاں دے رکھی ہیں۔

صرف وہی لوگ حقیقت سے روشناس ہو سکتے ہیں جن کو کئی سال تک اسلامی ملکوں میں رہنے کا موقع ملا ہو جو لوگ روانی کے ساتھ عربی میں بات چیت کر سکتے ہیں۔ وہ میرے اس تاثر کی تصدیق کریں گے کہ عرب بڑے ہی شریف النفس ہوتے ہیں۔ ہمدرد ہوتے ہیں۔ ملنسار ہوتے ہیں۔ برابری اور مساوات ان کے معاشرے کی روح رواں ہے۔ ان کی خوش طبعی اور زندہ دلی، اپنے ہمسایوں کا خیال اور ان کی مدد، ان کی عورتوں کے اخلاق حسنہ، اُن کی اپنے بچوں سے محبت، یہ ساری باتیں مسلمانوں کے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتی ہیں۔ جس سے اُنس ہونے لگتا ہے۔

یہاں اتنا اضافہ کر دینا ضروری ہے کہ مسلم ممالک میں رہنے والے عیسائیوں میں بھی وہی صفات پائی جاتی ہیں جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں ہوتا کہ یہ خصوصیات بحیرہ روم کے خطہ میں رہنے والوں کی خصوصیات ہیں۔ کیا ان خصوصیات کا مذہب سے کوئی تعلق ہے ؟ کہنے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ شام اور مصر کے عیسائی جبکہ وہ عیسائیت کو چھوڑ کر اسلام کے دائرے میں داخل ہو رہے تھے کیا ان خصوصیات کو اپنے ساتھ اسلام میں نہیں لائے تھے ؟

پھر سے میں یہ کہوں گا کہ تمام انسانی تحریکات اتنی پیچیدہ سے پیچیدہ تر

Marfat.com

ہیں کہ ان کی علت کی تخصیص نہیں کی جا سکتی۔

بہت سے عیسائی خیالات چور دروازے سے اسلام میں داخل ہوئے ہیں اس سلسلے میں ایک مثال کا دے دینا بہت کافی ہے۔

بخاری میں ایک روایت ہے "کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ خدا نے فرمایا ہے کہ میں اپنے نیک بندوں کو اس طرح سے تیار کر چکا ہوں کہ ان جیسے لوگوں کو اب تک نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سُنا اور جس کو انسان کا دل ماننے کے لیے کبھی تیار ہی نہ ہو"

انجیل میں لکھا ہے کہ "آنکھ نے نہ دیکھا ہے۔ کان نے نہ سُنا ہے۔ نہ کسی آدمی کے دل میں یہ بات گئی ہے ان چیزوں کے تعلق سے جن کو خدا نے تیار کیا ہے ان لوگوں کے لیے جو اس سے محبت کرتے ہیں"

بخاری معتبر راویوں میں ہیں۔ احتیاط کے ساتھ انہوں نے قلم اٹھایا ہے احادیث کی روایات میں وہ بہت محتاط تھے۔ ایک لمحے کے لیے بھی ان کو اس الزام سے ملوث نہیں کرتا کہ انہوں نے جان بوجھ کر عبارت کی چوری کی ہے اور انجیل کی آیات کو حضورؐ سے منسوب کر دیا ہے۔

امام بخاری کے مہتم بالشان کارنامے کو کتابی صورت میں دیے جانے سے آٹھ سو سال قبل سینٹ پال نے ان جملوں کو CORINTHIANS II کی نویں سطر میں لکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ شام کے لوگ سینٹ پال کی اس تحریر اور مضمون سے واقف ہوں اور ان جملوں کو حضورؐ کے آگے بیان کر دیا ہو۔ بلاشبہ بے شمار طریقوں سے عیسائیت اور اسلام نے ایک دوسرے پہ اپنا اثر ڈالا۔ ایک مذہب کی باتیں دوسرے مذہب میں داخل ہوئیں۔

اسلام کا ندر اور ساتھ ہی سختی اس بات کا باعث بنی کہ قسطنطنیہ کے

Marfat.com

کلیساؤں میں جو پتلے اور مذہبی نشانیاں رکھی ہوئی تھیں ان کا ناس کیا گیا۔ سیاست کی بنیادی سطح پہ تو عیسائیت اور اسلام میں بعض اوقات سخت رقابت رہی مگر جب ان دونوں مذہبوں کی جڑوں کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پیوست اور جڑی ہوئی ہیں۔

میرے نزدیک عیسائیت مسیح کی تعلیمات کا نام ہے۔ موجودہ کلیساؤں کی فرسودہ رسومات اور چرچ کے اپنے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون عیسائیت تو نہیں۔ اسلام کی اشاعت جب غیر ممالک میں ہونے لگی تو غیر عرب لوگوں نے اپنے اپنے اثرات اسلام پر ڈالنے شروع کیے۔

حضورؐ نے رہبانیت اور گوشہ نشینی کو سخت ناپسند فرمایا تھا۔ اس کے باوجود حضورؐ کی زندگی میں لوگوں نے گوشہ نشینی اور رہبانیت اختیار کر لی جب اسلام دوسری قوموں میں پہنچا تو اسلامی رہبانیت اور گوشہ نشینی میں اور اضافہ ہو گیا۔

صوفی وہ شخص کہلاتا ہے جو دنیا سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ دنیا کے جھمیلوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ دنیا کو ترک کر کے اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ روحانی طور پر براہ راست خدا سے رابطہ قائم کیا جائے۔ صوفی کا منشا اور مقصد خودی کو عروج اور بلندی پر لے جانا رہتا ہے۔ اس کے لیے وہ مراقبہ کرتا ہے۔ مراقبے میں سراپا محبت کا تصور رہتا ہے۔ وصل کی خواہش رہتی ہے۔ فنافی اللہ ہو جانا چاہتا ہے۔

انسانی نسل کی ہر شاخ میں ان لوگوں کی کمی نہیں جن کو روحانی صلاحیتیں عطا کی جاتی ہیں۔ عربستان کے عرب بہ حیثیت مجموعی اس معاملے میں بھی علی طور پہ خاص الخاص بنے رہے۔ حضورؐ کے انتقال کے سو سال کے اندر ہی اسلام

Marfat.com

میں صوفیار کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوگیا تھا۔ خصوصاً کوفہ، بصرہ اور عراق میں کافی صوفی منظر عام پر آتے رہے۔ نامی گرامی اور مشہور و معروف صوفیار کا تعلق زیادہ تر ایران سے رہا۔ ایران کے بعد دوسرا نمبر صوفیار کو وجود میں لانے کا اسپین کا تھا۔

خدا کے تعلق سے رسولؐ خدا نے جو تعلیم دی ہے وہ یہی ہے کہ خدا رب العالمین ہے۔ عظیم اور اکبر ہے۔ ساری شان اور عظمت کا وہ مستحق ہے اپنے بندوں کے تعلق سے رحیم وکریم ہے۔ ان تمام خدائی صفات کو بیان کر دینے کے بعد آپ نے خدا کو خدا رکھا۔ بندے کو بندہ۔ بندہ بندہ ہی رہے گا۔ خدا نہیں بنے گا۔

قرآن میں بکھری ہوئی چند آیات ایسی مل جاتی ہیں جس سے یہ مفہوم نکالا جاتا ہے کہ اللہ کی روح کبھی انسان میں بھی اُتر آتی ہے۔ ذات باری کا براہ راست تعلق کسی کی بھی انفرادی روح سے ہو جا سکتا ہے۔

قرآن پاک کے سورہ ق کی پندرھویں اور سولہویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اور ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ جو خیالات اس کے دل میں گزرتے ہیں ہم اُن کو جانتے ہیں۔ ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ دو لکھنے والے جو دائیں اور بائیں بیٹھے ہیں وہ لکھ لیتے ہیں۔"

مسلم صوفیار نے اس قسم کی آیات کو اپنی مطلب برآری کے لیے استعمال کیا۔ ان آیات سے وہ اپنے نظریات کی صداقت کا استدلال کرتے رہے یہ کہنے لگے کہ ذات باری کی جلوہ گری انسان میں بھی ہو سکتی ہے۔ ان کے نزدیک یہی وہ مقام ہے جو عین وصال کہلاتا ہے۔

حضورؐ کے انتقال کے دو سو سال بعد صوفیوں نے اپنے آپ کو اسلامی تصوف کا نمائندہ ظاہر کرنا شروع کیا۔ ایران کے شیعہ فرقے نے یہ بات گڑھ لی کہ خدا کی روح حضرت علیؓ اور ان کے جانشینوں میں حلول کر گئی تھی۔ یہ ایک ایسا نظریہ اور عقیدہ ہے جو صاف طور سے دکھائی دیتا ہے کہ عیسائیوں سے اخذ کیا گیا تھا ان کے اس عقیدے پر مسیحیت کی چھاپ تھی۔

اسلامی صوفیاء اور مسیحی صوفیاء کی تحریروں میں بڑی مشابہت ہے۔ جب وہ روحانیت کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو بقول ان کے ظاہری عبادات پیچھے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ شریعت محض ایک رسم رہ جاتی ہے احکام دینی ایک ڈھکوسلہ معلوم ہوتے ہیں۔ سارے مذاہب ان کی نظروں میں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے بہت بڑے اور مشہور صوفی مولانا جلال الدین رومی لکھتے ہیں کہ اس سے محبت کرو جس سے فرشتوں نے محبت کی۔ انبیاء نے محبت کی۔ سبھوں نے محبت کی۔ اسی کی وجہ سے ہم زندہ ہیں۔ اسی کی وجہ سے زندگی ہے۔ اسی کی وجہ سے ہر حرکت ممکن ہے۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں "محبوب میں فنا ہو جاؤ۔ اس طرح سے فنا ہو کہ میں اور تو کا جھگڑا ہی باقی نہ رہے۔ صرف ایک ہی ایک رہے"

اسلام اور مسیحیت کی اصل اور بنیاد میں کئی ایک باتوں کی مشابہت ہونے کے باوجود جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا یہ دونوں مذاہب ایک دوسرے سے دُور ہوتے گئے۔ کئی صدیوں تک آپس میں فکر و نظر کی لین دین ہوتی رہی۔ مغربی ممالک کی دولت مہندی اور اثر اقتدار کے عروج نے عیسائیوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا۔

Marfat.com

اسلام اور مسیحیت میں جو فکری تبادلے ہوتے رہے اور اس ماحول میں جن لوگوں نے علمی خدمات انجام دیں ان میں ایک بہترین مثال الغزالی کی ہے۔ محمد الغزالی پیدائشی ایرانی تھے۔ اپنے آپ کو عربیت کا جامہ پہنا لیا تھا۔ حضورؐ کے انتقال کے ۴۲۶ سال بعد ۱۰۵۸ء میں یہ پیدا ہوئے۔

غزالی اپنے زمانے میں علم و فضل کے امام تھے۔ بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں درس دیا کرتے تھے۔ سامعین اور شاگردوں کا اتنا بڑا ہجوم رہتا تھا کہ مدرسہ کھچا کھچ بھر جاتا تھا۔ اپنے وقت کا یہ امام، علم و فضل میں یکتا، ہزاروں کو درس و تدریس سے فیض یاب کرنے والا، آفتاب رشد و ہدایت، ایک دم ساری دنیا کو چھوڑ کر صوفی بن جاتا ہے۔ اپنے آپ کو زہد و تقویٰ کی اس منزل پر پہنچاتا ہے جہاں اس کے پاس ایک پھوٹی کوڑی نہیں رہتی۔ دنیا کے گورکھ دھندوں کو لات مار کر افلاس و تنگدستی کو اپنے آپ پر طاری کر لیتا ہے۔ خواہش وصل اس کو سرگرداں کیے رہتی ہے۔ خدا سے ملنے کے لیے وہ بے تاب رہتا ہے۔ اسی کیفیت میں آپ نے اپنی مشہور عالم کتاب احیاء العلوم والدین لکھی۔ مذہبی تعلیمات کو از سر نو پھر سے پیش کیا۔

یہاں پر امام غزالی کا ذکر کرنے کی اس لیے سوجھی کہ ہم اسلام اور مسیحیت کے درمیان جو فکری تبادلے ہوتے رہے ان پر روشنی ڈالیں۔ امام غزالی عیسائیت سے خوب واقف تھے۔ پروفیسر Hitti نے اپنی کتاب "عرب کی تاریخ بنانے والے" میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے پہاڑ پر جو وعظ و نصیحت کی تھی بڑی ہی سخاوت، فیاضی اور دریا دلی کے ساتھ امام غزالی نے اُسے اپنی کتاب میں پیش کر دیا۔ انجیل میں بیان کردہ بہت سی تشبیہات اور استعارے امام غزالی استعمال کرتے رہے۔ اس قسم کا فکری تبادلہ یا لین دین یک طرفہ نہیں

Marfat.com

تھا۔ یہ فکری ٹریفک دونوں طرف سے تھی۔ تھامس AQUINAS مسیحیت کے ایک بہت ہی بڑے عالم مانے جاتے ہیں۔ NAPLES کی یونیورسٹی میں انہوں نے امام غزالی کی کتابوں کا بہت ہی گہرا مطالعہ کیا۔ نصاب میں انہوں نے امام غزالی کی کتاب کو شامل کروایا۔

DANTE, PASCAL اور MAIMONIDES جو یہودیوں کے بہت ہی بڑے فلسفی تھے امام غزالی کے خیالات اور ان کے طرز فکر سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ انہوں نے استفادہ یہاں تک کیا کہ امام غزالی کے جواہر پاروں کو اپنانے کی کوشش کی۔

امام غزالی کی تعلیمات کا خلاصہ ہے "جس تناسب سے ہماری چاہت اور ہماری محبت اپنے اللہ سے ہوگی عین اُسی تناسب سے اُس کی عنائتیں اور مہربانیاں ہمارے شامل حال ہوں گی۔"

حضورؐ کے انتقال کے بعد اسلام کے تیزی سے پھیلنے کے اسباب وعلل پر ہم نے روشنی ڈالنے کی کوشش کی۔ اپنی تحقیقات کی روشنی میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے کے جو اسباب رہے ان کے پیش نظر قطعیت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ طاقت اور تلوار کے استعمال سے اسلام نہیں پھیلا۔ جنگی اور فوجی مہموں نے اسلام کی اشاعت نہیں کی۔ اسلامی جنگیں کبھی بھی اسلام کو تیزی سے پھیلانے کا واحد اور بڑا سبب نہیں بنیں۔

ہم اس موضوع پر اختصار کے ساتھ ہی قلم اٹھا سکتے ہیں۔ لکھا تو بہت کچھ جاسکتا ہے لیکن ہم نے کوشش کی ہے کہ مختصراً آپ کے سامنے اسلام کی اشاعت کے اسباب وعلل پیش کردیں۔

لوگوں کا یہ کہنا کہ اسلام کی نشر واشاعت کے لیے تلوار استعمال کی گئی

جزوی طور پر اپنے اندر صداقت رکھتا ہے۔ اگر عرب فتوحات عمل میں نہ آتیں تو ایک بڑی تعداد میں مسلمان اسپین، مراکش، ایران اور ہندوستان میں نہ پہنچے ہوتے۔ جب ایک مرتبہ عربوں نے دور دراز کے ملکوں میں اپنے قدم جما لیے تو اس کے بعد انہوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ یہودیوں، عیسائیوں اور آتش پرستوں کو اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرنے کو کہیں۔ اس کے برخلاف ان عرب فاتحین نے اپنے مفتوحین کے ساتھ انتہائی رواداری کا سلوک کیا۔ مفتوحہ اقوام نے مسلمان فاتحین کے اس رویے کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ مراکش سے لے کر شمالی ہندوستان تک جو ریگستان کا سلسلہ چلا گیا ہے ان علاقوں میں رہنے والوں کے لیے سیدھی سادی اسلامی تعلیمات بڑی ہی پرکشش اور موزوں ثابت ہوئیں۔ انہوں نے اس مذہب کو اپنے لیے انتہائی موزوں اور مناسب سمجھا۔

شام اور مصر میں ایک عیسائی فرقے نے دوسرے عیسائی فرقے پر جو ظلم وستم کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اس کی وجہ سے ان دونوں ممالک میں رہنے والوں نے اسلامی آغوش میں پناہ لینے کو ترجیح دی۔

سونے پر سہاگہ یہ کہ عربوں کو جب پے در پے فتح حاصل ہو رہی تھی تو عام لوگوں نے یہ سمجھا کہ عربوں کو غیب سے مدد مل رہی ہے۔ خدا یقیناً ان کے ساتھ ہے۔ ان کی طرف سے خود لڑ رہا ہے۔

اسلام جب وہاں پہنچا جہاں کے لوگ عقل وخرد میں عربوں سے آگے تھے اور روحانیت سے بھی آگاہ تھے تو انہوں نے اسلام کو اپنے مقامی سانچوں میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ اس میں کچھ اس قسم کی رد و بدل اور ترمیمات کیں جس کے بعد اسلام ان کی مرضی اور منشاء کے مطابق بن گیا۔ اسلام کو مقامی

Marfat.com

رنگ میں رنگ دینے کی وجہ سے نئے اور مقامی لوگوں کو اسلام میں اور بھی جاذبیت نظر آنے لگی۔

باوجود ان ناقابلِ تردید تاریخی حقائق کے مغربی مصنفین اب بھی یہی رٹ لگائے جاتے ہیں کہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت تلوار کے ذریعے ہوئی۔ یہ مصنفین اپنی ہٹ دھرمی کو برقرار رکھنے کے لیے اُن قتل و غارتگریوں کا حوالہ دیتے ہیں جو وقتاً فوقتاً تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں نے کیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی وارداتیں اتفاقی رہی ہوں اس قسم کی وارداتوں میں عباسیوں کا بیزنطینیوں کے ساتھ سلوک یا سلجوق ترکی یا تیمور لنگ کا طریقہ کار یا انیسویں صدی میں عثمانیوں کا آرمینیہ کے لوگوں پر ظلم و ستم۔ اسی قسم کی چند ایک باتیں ان کے پیش نظر رہتی ہیں۔

چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں سے چُن چُن کر چند حادثات اور واردات کو بطور شہادت پیش کرنا ہی ٹھہرا تو پھر مسیحیت کی تاریخ بھی اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں عیسائیوں نے بھی دوسرے اہلِ مذاہب کے قتلِ عام کیے ہیں ان کو بھی بطور ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۹۹ء میں مسیحیوں نے پہلی مرتبہ جب یروشلم کو اپنے قبضے میں لیا تو مدافعت کرنے والے بہت سارے مسلمانوں کا انہوں نے قتل عام کیا۔ ۱۱۹۱ء میں رچرڈ نے دو ہزار سات سو مسلمانوں کو قیدی بنایا۔ انتہائی سرد مہری کے ساتھ ایک قصاب کی طرح ان سب کے گلے کاٹ دیے۔

۷۱۲ء میں جب مسلمانوں نے اسپین پر قبضہ کیا تھا تو مفتوحین کو اپنے اپنے مذہب پر عقیدہ و عمل کی پوری آزادی دی تھی۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو

Marfat.com

صرف جزیے کی ادائیگی کے لیے کہا گیا تھا۔ مسلمانوں کے برخلاف سولہویں صدی عیسوی میں جب عیسائی حکمران پھر سے اسپین میں برسرِ اقتدار ہوئے تو انہوں نے قتل و غارت، ظلم و ستم قید و بند اور مسلمانوں پر دہشت انگیزی کے وہ بازار گرم کیے کہ خدا کی پناہ۔ نہ صرف یہ سب کچھ کیا بلکہ تیس لاکھ مسلمانوں کو اسپین سے نکال دیا۔ مسلمانوں کو نکال کر ہی عیسائیوں نے اسپین میں دم لیا۔

اس قسم کی بحثوں کے وقت بڑا ہی مغالطہ ہوتا ہے۔ وہی دقت پیش آتی ہے کہ کون سے عمل کا کون سا ردِ عمل ہے کس اثر کا کیا سبب تھا۔ انسانی معاملات ہمیشہ سے بڑے ہی نازک اور پیچیدہ واقع ہوئے ہیں۔ مسیحیوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام اس لیے نہیں کیا تھا کہ ایسا کرنا ان کے مذہب کی رُو سے جائز ہے یا عیسائیت نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اس قتلِ عام کی تہہ میں اگر غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ گیارھویں صدی عیسوی میں شمال مغربی یورپ کے رہنے والے نیم وحشی تھے اسی لیے نیم وحشی عیسائیوں نے یروشلم کے مسلمانوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا۔

تیمور لنگ نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ بغداد اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں رہنے والوں کو روئے زمین سے نیست و نابود کرنے کی کوشش کی۔ اسلام ایسا کرنے کی تو اجازت نہیں دیتا ہے چونکہ تیمور اور اس کے سارے ساتھی نیم وحشی تھے اس لیے انہوں نے اپنی فطرت سے مجبور ہو انسانیت کا بے دردی سے خون بہایا۔

ان تاریخی واقعات کو بحث میں لاتے ہوئے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے ان لوگوں کے درمیان ایک حد قائم کریں جو کسی بھی مذہب سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں۔ ہم کو دو قسم کے لوگ ملتے ہیں۔ ایک تو وہ معدودے چند

Marfat.com

ہوتے ہیں جو اپنے اپنے مذہب کی تعلیمات سے واقف ہوتے ہیں۔ شریعت اور طریقت کا ان کو علم ہوتا ہے۔ صدق دل سے وہ اپنے مذہبی احکام پر عمل پیرا ہونے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ دوسری طرف اسی مذہب کے ماننے والوں میں اکثریت ان کی ہوتی ہے جو مذہب کا لیبل اپنے آپ پر لگا لیتے ہیں۔ چونکہ ان کی پیدائش ایک عیسائی یا مسلم گھرانے میں ہوئی ہے اس لیے وہ اپنے آپ کو عیسائی یا مسلمان سمجھتے ہیں ان کے نام چونکہ عیسائی یا مسلمان جیسے ہوتے ہیں اس لیے وہ اپنے آپ کو نام کے مطابق مذہب سے وابستہ کرتے ہیں۔

اگر کوئی یورپ میں عیسائی خاندان میں پیدا ہوجاتا ہے تو عیسائی کہلاتا ہے ایشیا کے کسی مسلم گھرانے میں پیدائش ہو تو مسلمان کہلاتا ہے۔

چند سال پہلے میری حیرت اور تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جبکہ مجھے اپنے ایک یہودی دوست کا خط ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ عیسائیت ہمیشہ سے ایک ظالمانہ اور بہیمانہ مذہب رہا ہے۔ میری آنکھوں کو مشکل ہی سے اس عبارت کا یقین آیا۔ میں یہ سمجھتا رہا کہ میری آنکھیں مجھے دھوکہ دے رہی ہیں۔

کیا عیسائیوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ امن قائم کرنے والے پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ اسی لیے تو ان کو خدا کے بچے کہا جاتا ہے۔ کیا عیسیٰ مسیح نے یہ نہیں کہا تھا کہ اپنے دشمنوں سے محبت کرو۔ اگر وہ تم کو بد دعا دیں تو تم ان کے لیے دعا کرو۔ جو تم سے نفرت کرتے ہیں ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔

آگے چل کر میرے یہودی دوست نے اپنے خط میں اس ظلم و ستم کا ذکر کیا تھا جو یورپ میں عیسائیوں کے ہاتھوں یہودیوں پر ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں آہستہ آہستہ آنے لگا کہ دوسرے مذاہب پر اتہام لگانا کتنا آسان ہے

سارے جرائم اور اعمال خبیثہ کا کسی بھی مذہب سے ناتا جوڑ دینا کتنا سہل ہے۔ انجیل میں کسی جگہ بھی ایسا نہیں لکھا گیا ہے جس کی روشنی میں یہ کہا جا سکے کہ یورپ میں یہودیوں پر جو ظلم وستم ڈھایا گیا ہے وہ انجیل کے احکام کے مطابق ہے۔ یورپ کی جن اقوام نے اس ظلم وستم کو روا رکھا وہ وحشی تھے۔ ظالم اور جفا کار تھے۔ حریص اور لالچی تھے۔ خبطی اور جنونی تھے انہوں نے جو کچھ کیا وہ سراسر مسیحیت کی تعلیم کے منافی تھا۔ مذہب کے اصولوں کے خلاف تھا۔

ان تمام باتوں کی روشنی میں بہ حیثیت مجموعی ہمارے لیے سوائے ماننے اور تسلیم کرنے کے کوئی چارہ نہیں کہ اگرچہ اسلام نے جنگیں لڑی ہیں اور بعض حالات میں جنگ کرنے کا حکم بھی دیا ہے لیکن بنیادی طور پر اسلام کو تلوار سے نہیں پھیلایا گیا اس کے برخلاف خصوصاً عرب فاتحین نے اعتدال پسندی سے کام لیا۔ دوسرے مذاہب کے تعلق سے رواداری کا مظاہرہ کیا۔ یقیناً ان کی فتوحات میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا گیا مگر مفتوحہ عوام نے اسلام کو آہستہ آہستہ قبول کیا۔ مفتوحہ اقوام کو ان کا مذہب بدلوانے کے لیے کبھی بھی طاقت اور زور کا استعمال نہیں کیا گیا۔

اس باب میں ہم نے اسلام کا مقابلہ مروجہ عیسائیت سے کیا ہے۔ اسلام وہی ہے جو گذشتہ ۱۴ سو سال سے چلا آرہا ہے۔ اسلام کو لوگ اس کی اپنی اصلی ہیئت اور ماہیت ہی میں مانتے چلے آرہے ہیں۔

عیسائیوں کا ہمارا اپنا مسئلہ موجودہ زمانے کے لحاظ سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ آج خود خدا کی ذات پر اعتراضات کی لوچھاڑ ہے۔ یہ اعتراضات اور سوالات ان لوگوں کی طرف سے ہوتے ہیں جو کسی بھی چیز کو ماننے سے اس وقت تک انکار کرتے ہیں جب تک کہ وہ اس چیز کی موجودگی کو اپنے حواس خمسہ

Marfat.com

سے ثابت نہ کرلیں۔ اپنی طاقت، قوت، سماعت، بصارت اور ذائقہ کی حس کو وہ ہمیشہ استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ مادی دور میں وہ صرف مادہ ہی کے قائل ہیں۔

اپنی دنیا اور اپنے ماحول سے پرے جو چیز ہے اس کے باوجود یا اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا تصور ان کے ذہن میں نہیں آتا۔ مادی دنیا سے باہر کی ہر چیز کا وہ انکار کرتے ہیں۔ یہی انکار ان کو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری سے منحرف رکھتا ہے۔

انسان کی تخلیق کے پیچھے ایک بڑا ہی پیارا عنصر موجود ہے۔ وہ یہ کہ لاشعوری طور پر انسان اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کر دیتا ہے جس کو وہ اپنی ذات سے عظیم تر سمجھتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان جذبات سے مغلوب ہو کر ہمیشہ اپنے دل کی آواز پر لبیک کہتا ہے۔ آمنا اور صدقنا کہتے ہوئے اپنا تن من دھن سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ عظیم تر مقصد کے لیے خوشی خوشی وہ اپنے آپ کو وقف کر دیتا ہے۔ ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق اپنے مقصد کا تعین کرتا ہے۔ کوئی کمیونزم کی طرف مائل ہو جاتا ہے کوئی قومیت کے محبت کو سجدہ کرنے لگتا ہے۔ کوئی فاشیزم کو اپنا لیتا ہے۔

انسانی جذبات کے بہاؤ کا کوئی نہ کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی راستہ ہوتا ہے۔ مادی ذرائع سے وہ اپنی جبلت کی تسکین کرتا ہے۔ اپنے آپ کو وہ مقصد کے لیے وقف تو ضرور کر رہا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے تسکین کے محور کو مادی صورت میں اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہا ہے۔ اس کے باوجود بھی اس کو اطمینان قلب اور ذہنی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ جب اس میں بھی اس کو ناکامی ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ سے مایوس ہو جاتا ہے اس کا وجدان

ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی انانیت چلّانے لگتی ہے۔ اس کا نفس اس کو مُردہ نظر آتا ہے۔ اپنے آپ کو وہ اتنا اپاہج اور معذور تصوّر کرنے لگتا ہے کہ اس کی زندگی اس کے نزدیک مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو تاش کا ایک پتّہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ شطرنج کا مہرہ دکھائی دیتا ہے۔

اس تہذیب جدید کا پیدا کردہ معمہ صرف اسی صورت میں حل ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے اپنے مذہب کی طرف لوٹیں۔ جس فرقے سے چاہیں ہم اپنے آپ کو وابستہ کر لیں مگر مذہب کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے آج کل کی عوامی تحریکات جس بڑے پیمانے پر ظہور پذیر ہوتی ہیں ان میں گھر کر ہر فرد اپنے آپ کو گم شدہ تصور کرتا ہے۔ ایک نشان بے نشان سمجھتا ہے۔ مشینوں سے پیدا کردہ انبار میں اس کی حیثیت ایک اتنے حقیر اور بے مایہ ذرہ کی ہے جس کو دیکھنے کے لیے بھی ایک خوردبین کی ضرورت پڑتی ہے۔

خدا کی ہستی اس قابل ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کے لیے آمادہ بھی کہ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ اور حقیر سے حقیر انسان پر بھی اپنی نظر کرم ڈالے اس کو اپنی رحمتوں کے دامن میں سمیٹے۔

صرف یہی رابطہ انسان کو دنیا بھر کی غلامیوں سے نجات دلا سکتا ہے۔ حقیقی معنیٰ میں اس کو آزادی حاصل ہو سکتی ہے اللہ سے صحیح رابطہ قائم کرنا ہی اپنے آپ کو بندگی کے سانچے میں ڈھالنا ہے اس کے بندوں کی خدمت اور دلجوئی کرنا ہی اپنی روح کو جلا دینا ہے۔ جسمانی یا ذہنی طریقوں سے انسانیت پر ظلم کرنا اپنے آپ پر اور اپنے خدا پر ظلم کرنا ہے۔

Marfat.com

اختتام

یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والی لڑائیاں اوران کی آپس کی رقابتیں انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ رہی ہیں۔ یہودیت نے پہلی بار دنیا کو توحید کا درس دیا۔ اس مذہب نے بھوڑی بہت ایسی ہدایات بھی دیں جن سے دوسرے مذاہب کی عزت وتکریم کا پہلو نکل آتا ہے۔ عیسائیت نے اپنے مذہب کی بنیاد ہی محبت پر رکھنے کا دعویٰ کیا۔ اسلام نے ان دونوں مذاہب کے تعلق سے بہتر رویے کو اختیار کرنے کی تاکید کی۔

ہم کو پھر ایک بار ہر مذہب کی ان دو جماعتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں سے ایک جماعت تعداد میں کم لیکن اپنے عقیدے اور ایمان میں پختہ ہوتی ہے۔ حتی الامکان اپنے مذہبی احکامات کی پابندی کرتی ہے۔ دوسری جماعت ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو یہودی، عیسائی اور مسلمان اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ان گھرانوں میں پیدا ہوئے۔ یہ نام کے یہودی، عیسائی اور مسلمان صرف باتوں سے اپنا کام چلاتے ہیں۔ ان کے اغراض و مقاصد صرف لفاظی پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جذبات کے محکوم ہوتے ہیں۔ اُن کو اُن کے جذبات مغلوب کیے رہتے ہیں۔

غرور اور انانیت انسان کی ایک ایسی کمزوری ہے جو تاریخ میں مختلف

تباہیوں کا واحد سبب بنی۔ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان جو رقابت رہی ہے وہ محض انسانوں کی اپنی خود نمائی کی وجہ سے رہی ہے نہ کہ آپس کے مذہبی اختلافات کی وجہ سے۔ خدا کی خدائی اور اس کی عظمت و بزرگی کے اگر ہم قائل ہیں تو کیا ہم کو یہ زیب دیتا ہے کہ ان لوگوں کو قتل کر دیں جو ہمارے اپنے عقیدوں سے ذرا بھی ہٹے ہوئے ہوں۔ ان کے ساتھ زیادتی کریں اور ان کو زندہ جلا دیں۔

اپنی انا کو تسکین دینے کی خاطر ہمیشہ ہم یہی کہتے ہیں کہ جو راستہ ہمارا ہے وہی حق کا راستہ ہے۔ باقی کی ساری نسل آدم غلطی اور گمراہی کا شکار ہے۔ اس عام تاثر سے گریز مشکل ہے کہ مسلمانوں نے اگرچہ کہ ان کی نیت اس کی نہیں تھی مذہبی جنگوں کی ابتدا کی۔ قصداً اور عمداً انہوں نے لڑائیاں نہیں لڑیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مدینہ کے مہاجرین نے قریش کے کاروانوں پر جو حملے کیے تھے وہ تمام اسلامی جنگوں کا پیش خیمہ تھے یا نہیں۔ قدیم یونانیوں رومنوں اور ایرانیوں کے نزدیک مذہب کبھی بھی جنگ کی بنیاد نہیں بنا۔ اُن لوگوں نے مذہب کی خاطر کبھی بھی کوئی لڑائی نہیں لڑی۔ مذہبی اختلافات مذہبی لڑائیوں کا باعث نہیں بنے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات ایک مذہب کے کسی خاص فرقہ نے اپنے ہی مذہب کے کسی اور فرقے کے ساتھ ظلم و زیادتی کی ہے لیکن اس کی بڑی وجہ ان کا یہ ایقان رہا کہ ان سے مختلف عقیدہ رکھنے والے حکومت کے لیے خطرہ کا باعث ہیں۔

۶۳۳ء میں عربوں نے جان بوجھ کر بیزنطینی اور ایرانی حکومتوں پر حملے کیے۔ حضورؐ کی تعلیمات نے ان کے رگ و ریشہ میں ایک آگ لگا دی تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جب انہوں نے یکے بعد دیگرے مختلف ملکوں کو زیر نگیں کرنا

Marfat.com

کیا تو عیسائیوں، یہودیوں اور آتش پرستوں کو مذہب بدلنے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ بلاشبہ انہوں نے اسلام کے نام پر دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ منصوبہ کی تکمیل کے لیے چل نکلے۔ اس عمل کے ردِ عمل میں تین سو سال بعد ان پر جوابی حملے شروع ہوئے۔ حملہ کرنے والوں نے عیسائیت کے نام پر حملہ کیا عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی یہ تعلیم بھول گئے کہ اپنے دشمنوں سے پیار کرو۔ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دو۔ عیسیٰ مسیحؑ کی ان بنیادی تعلیمات کو مسیحیوں نے نظر انداز کر دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ صلیبی جنگوں میں مسیحیوں نے درندگی کا مظاہرہ کیا۔ مسلمانوں سے چار ہاتھ آگے انہوں نے ظلم و ستم کو روا رکھا۔ ان سفاکانہ واقعات کو ان کے اپنے مذہب سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام نے کم ظلم کرنے کی اجازت دی ہے اور مسیحیت زیادہ ظلم کرنے کو کہتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مغربی یورپ کے مسیحی اس زمانے میں نیم جنگلی تھے اس لیے انہوں نے جنگلی پن کا مظاہرہ کیا۔ مسلمان عام طور سے قدیم تہذیب و تمدن سے وابستہ رہے تھے اس لیے انہوں نے دیکھ بھال کر کام کیا۔

تاریخی واقعات اتنے مختلف عناصر کا مجموعہ واقع ہوئے ہیں کہ ان کے تجزیہ کے لیے بڑے ہی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ یہ بات بڑی بحث طلب رہی ہے کہ عیسائیوں کی آپس کی مذہبی لڑائیاں مسلمانوں اور عیسائیوں کو آپس میں لڑنے کے لیے مثال کا کام دینے لگیں یا پہلے کی مذہبی جنگیں بعد کی مذہبی جنگوں کا سبب بنیں۔

قدیم مذہبی فرقے جنہیں حکومت وقت دبا کر رکھتی تھی ان کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ حکومت کو ان فرقوں کی وفاداری پر بھروسہ نہیں ہوا کرتا تھا حکومت کو یہ خطرہ لگا رہتا تھا کہ کسی وقت بھی مخالف فرقے بغاوت اور غداری کے

Marfat.com

مرتکب ہو سکتے ہیں۔

تیرھویں صدی میں جنوبی فرانس نے ALBIGENSES کو بری طریقے سے کچل کر رکھ دیا۔ پوپ نے حکومت وقت کے اس اقدام کی حمایت کی۔ اس لیے کہ وہ لوگ ملحد تھے انہوں نے بادشاہ وقت کی بالادستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اسی طریقے سے نیدرلینڈ میں اسپین والوں نے پروٹسٹنٹ پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے اس کی وجہ بھی مذہبی اور ساتھ ہی ساتھ سیاسی رہی۔

ہمارے اپنے زمانے میں روس اور امریکہ بھی اسی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ جزوی طور پر نظریاتی اختلاف۔ کمیونزم بہ مقابلہ سرمایہ داری۔ بڑی حد تک دو بڑی طاقتوں کو ایک دوسرے کے مدمقابل کر دیتا ہے۔ اس کی تہہ میں حسد کارفرما رہتا ہے۔

اسلام اور مسیحیت کے درمیان اسی قسم کی سیاسی رقابتوں نے غلط فہمیوں کی ایک وسیع اور گہری خلیج حائل کر دی ہے۔ مغربی دنیا میں تو ایسا کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں مقامی عیسائیوں نے مسلمانوں کے درمیان کسی نہ کسی طرح اپنے وجود کو برقرار رکھا۔ یہ لوگ مسلمانوں کے درمیان اپنی زندگی گزارتے آئے۔ مسلمانوں نے ان سے کبھی بھی تعصب نہیں برتا۔ اس کے برخلاف مغربی اقوام میں اسلام کے خلاف سخت تعصب پایا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے تعلق سے مغربی یورپ اور جنوبی امریکہ میں رہنے والوں کی اکثریت کا یہ خیال ہے کہ یہ لوگ بے دین ہیں۔

یہودیوں کے تعلق سے البتہ یہ بات ماننے کے لیے تیار ہیں کہ یہودی مذہب مسیحیوں کے مذہب کا جوڑواں بھائی ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ بہ نسبت یہودیت کے اسلام عیسائیت سے بہت زیادہ قریب ہے۔

Marfat.com

جیسا کہ ابتداء میں بیان کیا جا چکا ہے کہ میری زندگی کا آدھے سے زیادہ حصہ مسلمانوں اور صرف مسلمانوں کے درمیان گزرا۔ مسلمانوں سے اکثر و بیشتر مجھے مذہبی اور نیم مذہبی بحث کا موقعہ ملا۔ کسی بھی شخص کے لیے جو مسلمانوں کے درمیان رہتا ہو یہ ناگزیر ہے کہ وہ ان سے مذہب پر بات چیت نہ کرے اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی زبان پر رات دن اللہ کا نام رہتا ہے۔ ہمارے درمیان اکثر ایسے موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی کہ کون سی بات اللہ کو پسند ہے کون سا اقدام خدا کی مرضی کے مطابق ہے۔ اس سلسلے میں ہم میں اتفاق بھی ہوا کرتا تھا۔ اختلاف بھی ہوتا تھا۔ ان تجاویز کی حمایت اور وکالت بھی کی جاتی تھی جن کی بنیادوں پر ہمارا عمل اللہ کی خوشنودی کا باعث ہو۔

اس طریقہ سے اخلاقی ضابطہ حیات کے مختلف ابواب پر ہم ہمیشہ متفق ہوا کرتے تھے۔ مذہبی لوگوں کا اس طریقے سے تعاون حاصل کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ دس میں سے نو مذہبی فرائض و ذمہ داریوں کی ادائیگی میں عیسائیت اور اسلام ایک جیسے ہیں۔

اگر ہم اپنی دماغی اختراعات اور کج بحثی کو کام میں لاتے ہوئے مختلف مذہبی احکام کی من مانی تاویل و تشریح کرتے تو یقیناً ہم میں ہر قدم پر اختلاف رونما ہوتے۔ انسانی دماغ اس قابل نہیں ہوتے کہ پورے طریقے سے خدا کو سمجھ سکیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ان موضوعات پر خواہ مخواہ الجھنا اور دوسروں کو الجھانا بے مقصد اور بے فائدہ ہوا کرتا ہے مسلمانوں سے ان کے مذہبی عقائد پر بحث کرنا اور مختلف مذہبی عقائد کے آپس کے اختلافات کا اُن سے ذکر کرنا میری نظر میں ایک سخت غلطی ہے چونکہ وہ اپنے عقیدوں پر سختی سے جمے رہتے ہیں اور ان کو اپنا عقیدہ اتنا عزیز

Marfat.com

ہوتا ہے کہ اس بحث کا اختتام اکثر وبیشتر غصہ، تناؤ اور جذباتی بھڑکاؤ کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ ان سے دشمنی اور مخالفت پیدا ہو جاتی ہے۔

چند مشنریوں کو میں نے چارلس ڈی فوکاٹو کی پیروی کرتے پایا۔ اُن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہم کو اپنے مذہب کی فوقیت اور برتری کا اظہار کرنا چاہیئے اس کی بہتر اور واحد صورت یہی ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو نمونے کے طور پر پیش کریں۔ اپنی زندگیوں سے ہم اپنے اعلیٰ مذہب کی عکاسی کریں۔

ہماری مخلوط فکر و نظر کے منبع کی نشان دہی ہمارے اپنے مشاہدے ہی سے ہو سکتی ہے اس کے لیے ہم کو ضروری نہیں کہ ہم مغرب کے عیسائیوں کے مغرور طرزِ عمل کو دیکھیں۔ ان کا یہ طرزِ عمل صنعتی انقلاب کا نتیجہ ہے ایک زمانہ وہ تھا جبکہ نفرت زیادہ کی جاتی تھی اور غرور و تکبر زیادہ ہوا کرتا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں مغرب کے لوگوں میں یہ بات پھیلائی گئی کہ اسلام غربت اور تنگدستی کی طرف رہبری کرتا ہے۔ جمود کی طرف مائل کرتا ہے۔ آگے کی طرف نہیں بلکہ پیچھے کی طرف لے جاتا ہے۔

جن لوگوں نے مسلمانوں کے تعلق سے ان خیالات کو عوام میں پھیلایا اب وہ اس بات سے خوش ہو رہے تھے کہ ان کی غلط بیانی اپنا کام کر گئی اور اس طرح سے ذہنی طور پر ایک طرح کی برتری مسلمانوں پر حاصل کر لی۔ بدقسمتی سے وہ نرے جاہل نکلے۔ ان کو تاریخی حقائق کا پتہ ہی نہیں تھا۔ وہ تاریخ سے واقف ہی نہیں تھے وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ اسلام سات سو سال تک دولت، ثقافت، امارت اور قوتِ اقتدار میں ساری مغربی عیسائی مملکتوں سے بہت آگے تھا اس کے بعد کے سات سو سال میں حالات اس کے برعکس ہوتے

Marfat.com

گئے۔ مدرخصت ہوا۔ جزر کی باری آئی۔ مغربی یورپی اقوام مسلم ممالک میں گھس پڑیں جبکہ اپنے عروج میں مسلمان یورپ میں پہنچ چکے تھے۔ تہذیب و تمدن اور حکومتوں کے عروج و زوال کے یہ چکر چلتے ہی رہتے ہیں۔ تاریخ میں بار بار اس قسم کے واقعات لوٹ لوٹ کر آتے رہے۔ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی رہی۔

مختلف مذاہب کے بچوں تک کا یہ عقیدہ کہ ان کا مذہب صرف انہیں کو بچائے گا اور باقی دنیا مجرم قرار دی جائے گی انصاف پر مبنی تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ چرب زبانی نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ لوگ جن کو کسی خاص مذہب کی تعلیم دی گئی ہو اگر وہ اسے رد کریں تو واقعی مجرموں میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ اُن لوگوں کو مجرم کیسے قرار دیا جا سکتا ہے جنہوں نے مذہب کے تعلق سے کچھ سُنا ہی نہ ہو۔

میں ایک جاہل آدمی ہوں۔ علمی اور دینی ماحول مجھے نصیب نہیں ہوا اس کے باوجود مسلمانوں کے درمیان میرے طویل قیام نے مجھے اس بات کا قائل کر دیا ہے کہ تمام لوگ جو خدا پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے احکام کی تعمیل کی کوشش کرتے ہیں ایک ہی راہ پہ گامزن ہیں۔ شریعت اور طریقت میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کا بڑا سبب ان کے تہذیب و تمدّن کا فرق ہے۔ اس تعلیم کا اثر ہے جو ان کو ان کے گھرانوں سے ملی۔ ان موروثی خیالات کا نتیجہ ہے جو ان کو اپنے آباؤ اجداد سے ملے۔ اگر خدا واقعی محبت ہے تو ہماری ناقص عقل میں یہ بات پوری نہیں اترتی کہ وہ ان لوگوں کو سزا کیوں کر دے گا جن کو زندگی کے صحیح راستے سے واقف کروایا ہی نہیں گیا۔ اگر لوگوں کو بہتر راستے کا علم ہو جائے اور باوجود واقفیت کے اس راستے پہ گامزن نہ ہوں تو یقیناً وہ سزا کے مستحق ہوں گے۔ جو لاعلم ہیں وہ بہر حال قابلِ معافی ہیں۔

Marfat.com

اگر ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ دوسرے مذاہب والوں کی بہ نسبت ہم خدا کی مرضی اور منشاء کو پورا کرنے کے زیادہ اہل ہیں تو یقیناً ہمارا یہ فرض بن جاتا ہے کہ ہم زندگی کی اُن راہوں پر چلیں جس کو دیکھ کر دنیا کے اچھے لوگ ہماری اچھائی اور خوبیوں کی وجوہات دریافت کرنے لگیں۔

دوسرے مذاہب کے لوگوں سے غرور و تکبّر کے ساتھ پیش آنا اس بات کا ثبوت دینا ہے کہ ہم میں رواداری نہیں ہے۔ ہم نیم دلی کے ساتھ اپنی زندگی کے دن یونہی گزار رہے ہیں۔ اگر ہم رواداری کے لفظ اور اس کے مفہوم سے ناآشنا ہیں تو پھر ہماری زندگی کی رسم و راہ ایسی ہے جس کو دیکھ کر نہ صرف دوسروں کو بلکہ اپنے آپ کو بھی ڈر ہونے لگے۔

تمام شُد

خدا کے فضل و کرم سے اس کتاب کا ترجمہ آج بتاریخ ۲۷ر جون ۱۹۷۳ء یوم چہارشنبہ رات کے ایک بجے مکمل ہوا۔

اس کتاب کے ترجمے میں تقریباً ایک سال کا عرصہ لگا۔

اس کی طباعت کے لیے کتابت کا کام جناب سید قاسم محمود کی توجہ سے یکم جنوری ۱۹۸۷ء کو شروع ہوا۔ اور فروری ۱۹۸۹ء میں ختم ہوا۔ جناب شاہ مصباح الدین شکیل نے نظرِثانی اور پروف ریڈنگ کا کام انجام دیا۔

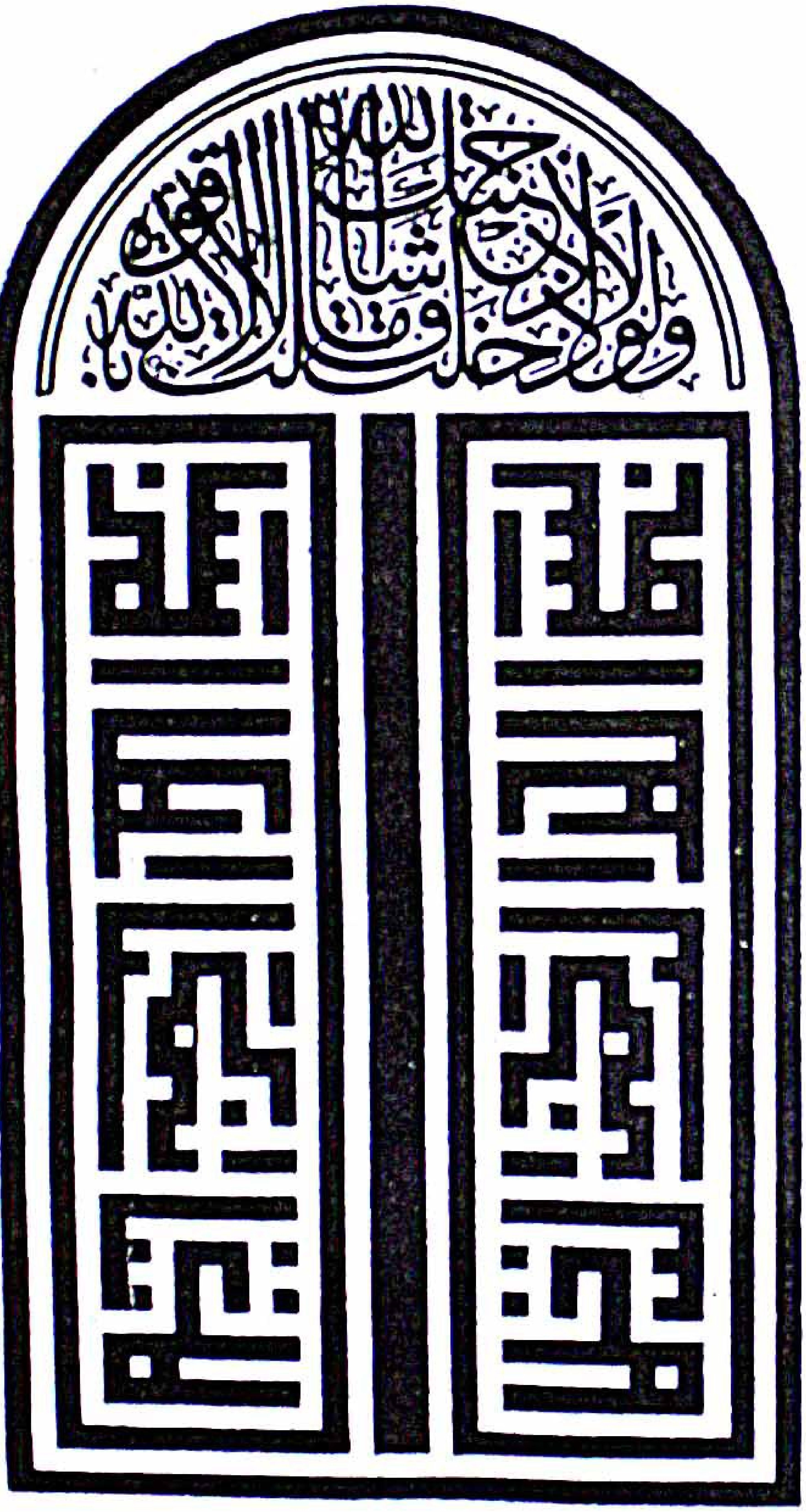
ولولا إذ دخلت جنتك قلت ما شاء الله لا قوة إلا بالله

Marfat.com

An Urdu Translation of

General Galib Pasha's

The Life and Times of Muhammad ﷺ

Translated By:

Habib Haiderabadi

297.9921 م 28 ب

69837-U-67

بیکن بکس

BEACON BOOKS

• قذافی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

• گلگشت، ملتان فون: 520791

...31-32, 0320-4821459

E-mail:beaconbookspakistan@hotmail.com

ISBN 969 - 534 - 020 - 2

Rs. 375/-

Design-Angle

Marfat.com

باہر میدان میں لڑائی جائے اور حضورؐ اس کے لیے پہل کریں۔ ان کے اصرار پر آپ اپنے گھر تشریف لے گئے۔ اسلحہ زیب تن کیا۔

یہ عمل آپ کے کردار کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ لوگوں کا یہ خیال کہ آپ نڈر اور بے لگام شخصیت کے مالک تھے اور بقول گرلیس تشدد پسندوں کے سربراہ تھے بالکل مہمل ہے آپ اپنے فیصلوں میں جلد بازی نہیں کرتے تھے۔ فیصلہ صادر کرنے میں ہمیشہ توقف سے کام لیتے تھے۔ بعض مسلمان اس توقف کے تصور کو قبول کرنے سے ہچکچاتے ہیں بعض یہ کہتے ہیں کہ آپ کا یہ عمل آپ کی تبلیغ کے طریقوں میں سے ایک طریقہ تھا۔ آپ جب وحی والہام کی بناء پر کوئی قدم اٹھاتے تو اس میں غلطیوں کی کوئی گنجائش ہی نہ رہتی تھی۔ جب خود اپنی طرف سے کوئی بات کرتے تو بعض اوقات اس میں انسانی کمزوریوں اور خامیوں کے عناصر شامل ہو جاتے تھے۔ انسانی کمزوریاں اس بات کی طرف نہ صرف اشارہ کرتی ہیں بلکہ شہادت دیتی ہیں کہ حضورؐ کی کامیابیوں کے پیچھے ہمیشہ غیبی ہاتھ رہا ہے۔

قرآن کے تیسرے پارے میں اُحد کی جنگ کا ذکر آیا ہے اس میں یہ بیان نہیں کیا گیا ہے کہ آپ پہلے خود اس خیال کے علمبردار تھے کہ شہر میں رہ کر دشمنوں کا مقابلہ کیا جائے مگر رائے عامہ سے متاثر ہو کر اپنا خیال بدل دیا۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو قرآن میں ضرور اس بات کا ذکر ہوتا کہ آپ نے فیصلہ کرنے میں غلطی کی اور مسلم نوجوانوں پر یہ الزام ضرور لگا ہوتا کہ ان کی ضد کی وجہ سے مسلمانوں کی اُحد میں شکست ہوئی۔ گو بعد کے مورخین نے اس کا ذکر ضرور کیا ہے کہ آپ پہلے پہل شہر ہی میں رہ کر لڑنا پسند کر رہے تھے لیکن مورخین کا یہ بیان قرآن کے بیان سے میل نہیں کھاتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپکے شیدائیوں نے بعد میں چل کر یہ بات گڑھ لی ہو تا کہ اُحد کی جنگ میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی اس سے آپ کو مُبرّا قرار دیں۔

Marfat.com

حیات و عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تصنیف
جنرل گلب پاشا
ترجمہ
حبیب حیدرآبادی